

عظیم اسلامی شخصیات



PDFBOOKSFREE.PK

کلیم چغتائی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ایک ضروری گزارش!

معزز قارئین کرام! اس کتاب کو عام قاری کے مطالعہ، اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی اور ثوابِ دارین کے خاطر پاکستان ورچوئل لائبریری پر شائع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری یہ کاوش پسند آئی ہے یا آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے کوئی راہنمائی ملی ہے تو برائے مہربانی میرے اور میرے والدین کی بخشش کے لئے اللہ رب العزت سے دُعا ضرور کیجئے گا۔ شکریہ

طالب دُعا سعید خان

ایڈمن پاکستان ورچوئل لائبریری

www.pdfbooksfree.pk

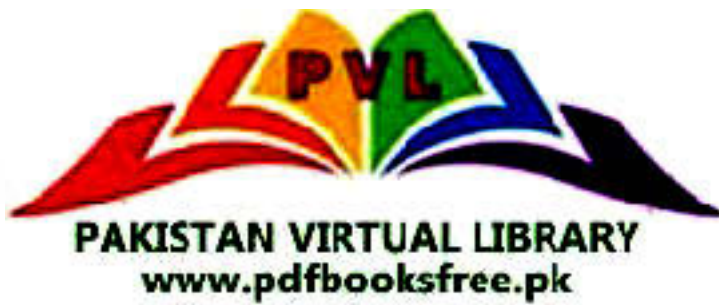
عظیم اسلامی شخصیات

کلیم چغتائی / مختار احمد کاشف

ترتیب نو	:	حسن علی / آر، این خان
پبلشرز	:	ادارہ کتاب گھر
کمپوزنگ	:	MAK کمپوژرز، ٹاؤن شپ، لاہور

فہرست

صفحہ نمبر	شخصیات	نمبر شمار
۵	امام ابن عبد البر	۱
۱۰	بدرالدین العینی	۲
۱۵	شیخ احمد شاکر	۳
۱۹	شاہ ولی اللہ	۴
۲۴	حافظ ابن قیم	۵
۲۸	امام شافعیؒ	۶
۳۲	رفاعہ رافع الطہطاوی	۷
۳۷	ابن قطلوبغا	۸
۴۳	حضرت امام احمد بن حنبلؒ	۹
۴۸	حضرت عبداللہ بن مبارک	۱۰
۵۳	حضرت امام مالکؒ	۱۱
۵۸	حضرت امام بخاری	۱۲
۶۴	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	۱۳
۶۹	حضرت سعد بن ابی وقاصؓ	۱۴
۷۴	حضرت بلالؓ	۱۵
۷۹	حضرت ابوذر غفاریؓ	۱۶
۸۴	حضرت ابو ہریرہؓ	۱۷
۸۹	حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ	۱۸
۹۴	حضرت سلمان فارسیؓ	۱۹
۱۰۰	حضرت قاطمۃ الزہراءؓ	۲۰
۱۰۶	حضرت امّ ایمن رضی اللہ عنہا	۲۱
۱۱۱	حضرت نسیمہ بنت کعب	۲۲
۱۱۷	ابن نفیس	۲۳
۱۲۶	امام ابن حزمؒ	۲۴



نمبر شمار	شخصیات	صفحہ نمبر
۲۵	حافظ علی بن المدینی	۱۳۰
۲۶	امام ابن تیمیہؒ	۱۳۵
۲۷	امام ذہبیؒ	۱۴۰
۲۸	اسماعیل پاشا	۱۴۵
۲۹	عبدالرحمن الداخل	۱۴۹
۳۰	ابوجعفر منصور	۱۵۴
۳۱	سلطان محمد فاتح	۱۵۸
۳۲	ہارون الرشید	۱۶۳
۳۳	محمد بن قاسم	۱۶۸
۳۴	سلیمان اول	۱۷۴
۳۵	صلاح الدین ایوبی	۱۷۹
۳۶	عماؤ الدین زنگی	۱۸۳
۳۷	محمد بن ابی عامر (المنصور)	۱۸۸
۳۸	عبدالرحمن الاوسط	۱۹۳
۳۹	الپ ارسلان	۱۹۸
۴۰	بہلول لودھی	۲۰۲
۴۱	ولید بن عبدالملک	۲۰۶
۴۲	حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ	۲۱۱
۴۳	شاہ رخ	۲۱۷
۴۴	فیروز شاہ تغلق	۲۲۱
۴۵	منصور ذہبی	۲۲۶
۴۶	مسعود غزنوی	۲۳۱
۴۷	ملک الظاہر بہمن	۲۳۵
۴۸	الغ بیگ	۲۴۰
۴۹	ناصر الدین قباچہ	۲۴۴
۵۰	سکندر لودھی	۲۴۸
۵۱	اورنگ زیب عالمگیر	۲۵۲

پیش لفظ

ادارہ کتاب گھر <http://www.kitaabghar.com> جنوری ۲۰۰۴ء میں قائم کیا گیا تھا، اور ادارہ کتاب گھر نے نئی نسل کو کتابیں پڑھنے کی طرف راغب کرنے کے لئے مفت کتابوں (e-books) کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں وسائل کی کمیابی اور وقت کی کمی کے باعث یہ سلسلہ ذرا سست رہا، لیکن اب الحمد للہ بے شمار لوگ ہم سے رابطہ کر رہے ہیں اپنی تصانیف کتاب گھر میں بھجوانے کے لئے اور اس کے لئے ہم ان حضرات کے مشکور ہیں کہ وہ اس کار خیر میں ہمارے ساتھی بنے۔

علم فن کی دنیا بھی عجیب ہے۔ اس میں کسی کی بالادستی ہمیشہ قائم نہیں رہتی ہے۔ جس نے رشتہ ناطہ جوڑا اور قدردانی کی اس کے یہاں ٹھہرے گی اور ذرا بے توجہی محسوس کی تو بوریا بستر سمیٹ کر اس سے رخصت ہو جائے گی۔

پائے مرانگ نیست ملک خدا تنگ نیست

اسی اصول و ضابطہ پر علم کی تاریخ اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔ دنیا کے اسٹیج پر ایسی بہت سی قومیں نمودار ہوئیں اور مٹ گئیں جنہوں نے علم کی قدردانی کی اور دنیا کے معاش و معیشت میں اپنا اثر قائم کیا۔ ہندوستان، مصر، روم، یونان کی قدیم تاریخ اس کی شاہد ہیں۔ مسلمان قوم نے چھٹی صدی عیسوی میں جس طرح علم کی داغ بیل ڈالی اور مخصوص اصولوں اور ضابطوں کے تحت علم کی آبیاری کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مسلمانوں کی علمی ترقیاں ہمہ جہت ہیں۔ یہ کسی خاص فن یا موضوع تک محدود نہیں رہی ہیں۔ عہد بنو امیہ اور بنو عباس کی علمی سرگرمیاں آج کی علمی اور تمدنی ترقیوں کی اساس کہی جاسکتی ہیں۔

یہی وہ ہمارے اسلاف تھے جنہوں نے ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انہیں کے علمی اور فنی کارناموں سے ایک ہزار سال تک پوری دنیا بقتہ نور بنی ہوئی تھی۔ انہیں روشنی کے اجالوں سے نہ صرف ہمارے بام و در (اچین، بغداد وغیرہ) منور تھے بلکہ اغیار کے خیاباں بھی معطر تھے۔ یہی وہ ہمارے اسلاف تھے جو آسمان علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے مگر عالم اسلام پر ایک ایسا تاریک دور بھی آیا جب ان کے علمی و فنی کارناموں کی روشنی ماند پڑ گئی، ان کے اجالے پھیکے پڑ گئے۔ یہ وہ دور تھا کہ ہمارے اسلاف کی فکری اور تحقیقی کاوشیں ست پڑ گئیں اور قوم آپسی چپقلش کا شکار ہو گئی۔

عظیم اسلامی شخصیات محترم کلیم چغتائی اور مختار احمد کاشف کے مضامین پر مشتمل کتاب ہے۔ دنیائے اسلام کی نامور شخصیات کے بارے میں یہ معلوماتی مضامین ”رابطہ ملکزین“ میں گاہے بگاہے چھپ چکے ہیں، اپنے قارئین کے لیے ادارہ کتاب گھر نے ان مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی شکل میں آن لائن کیا ہے۔ یہ انتخاب چونکہ کسی کتاب کی شکل میں نہیں مرتب کیا گیا تھا بلکہ انفرادی مضامین تھے، اس لیے اس میں کئی ایک جلیل القدر شخصیات کا ذکر موجود نہیں ہے۔ یہ کمی آئندہ ایڈیشن میں پوری کر دی جائے گی۔ ہمیں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے۔ آپ اگر اپنی کوئی پسندیدہ کتاب ”کتاب گھر“ پر دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ای میل کیجئے یا آپ اپنی کتابوں کی کمپوزنگ بھی بھیج سکتے ہیں اگر وہ کتاب گھر کے معیار پر پوری اتری تو ہم اسے آپ کے نام کے ساتھ آن لائن کر دیں گے۔ ہمیں آپ کی آراء، تنقید اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔

حسن علی خان (ویب ماسٹر)
ادارہ کتاب گھر

امام ابن عبدالبر

(آپ کو آپ کے علمی کارناموں کی وجہ سے ”حافظ المغرب“ کہا جاتا ہے)

وہ لکڑہاروں کی ایک بستی تھی!

اشبیلیہ میں واقع اس بستی کا نام ہی ”حی الخطابین“ یعنی ”لکڑہاروں کی بستی“ تھا۔

اس بستی کی ایک گلی سے دو بزرگ گزر رہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ نوجوان کو قدرت نے بہترین مردانہ وجاہت سے نوازا تھا۔ اس کی ملیح رنگت، اس کے تروتازہ چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔

گلی سے گزرنے والے بزرگوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: ”اس نوجوان کا چہرہ بہت خوبصورت ہے۔“

دوسرے بزرگ بھی بہت خوبصورت چہرے اور صحت مند جسم کے مالک تھے۔ انہوں نے سادہ لیکن صاف ستھرا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ انہوں نے پہلے بزرگ کی بات سنی تو ایک لمحے کا توقف کیے بغیر بولے:

”آپ نے تو صرف چہرہ دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے لباس کے اندر جو شخصیت پوشیدہ ہے وہ اتنی خوبصورت نہ ہو۔“

یہ بزرگ تھے امام ابن عبدالبر جنہوں نے اپنے رفیق محترم امام ابن حزم کے سامنے اپنی رائے کا برملا اظہار فرمایا۔ امام ابن عبدالبر قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، علم الرجال، تاریخ اسلام، تاریخ ادب، صرف و نحو، شعر و ادب اور طب کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کا تعلق سرزمین اندلس سے تھا اور آپ کو آپ کے علمی کارناموں کی وجہ سے ”حافظ المغرب“ کہا جاتا ہے۔ اہل اندلس کو امام ابن عبدالبر پر اس قدر فخر ہے کہ وہ امام ابن عبدالبر کے زمانہ حیات کو ”عصر ابن عبدالبر“ کے نام سے پکارتے ہیں، یعنی ”ابن عبدالبر کا زمانہ“۔

حافظ امام ابن عبدالبر کا اصل نام یوسف ہے، ان کے بیٹے کا نام عمر تھا، اس لیے ان کی کنیت ابو عمر ہے۔ ان کے والد کا نام ابو محمد عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم ہے یعنی ”عبدالبر“، امام ابن عبدالبر کے والد کے دادا کا نام ہے اور اس نسبت سے آپ ابن عبدالبر مشہور ہوئے۔

امام ابن عبدالبر 25 ربیع الاول 368ھ (یکم نومبر 978ء) کو قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ یہ ہشام بن الحکم کا زمانہ خلافت تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اندلس، علمی، ثقافتی اور تمدنی اعتبار سے بلند مقام پر تھا۔ امام ابن عبدالبر کے دادا محمد بن عبدالبر انمری قرطبہ کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ فقہ و حدیث میں بھی ان کو کافی مہارت حاصل تھی وہ بہت عبادت گزار انسان تھے۔ امام ابن عبدالبر کے والد ابو محمد عبداللہ بھی اپنے زمانے کے فقیہ تھے۔ قرطبہ کے علماء و فقہاء میں ان کا شمار ہوتا تھا وہ بھی بڑے عابد اور تہجد گزار تھے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابو محمد عبداللہ اپنے زمانے کے ادیب اور فن بلاغت کی مشہور شخصیت تھے۔ آپ کبھی اندلس سے باہر نہیں گئے، انہوں نے جو کچھ سیکھا، اندلس میں رہ کر ہی سیکھا۔ ابن عبدالبر نے اپنے والد کے فن حدیث پر ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے۔ ابن عبدالبر کے دادا اور والد دونوں کا انتقال ایک ہی سال 380ھ (990ء) میں ہوا۔ اس وقت حافظ ابن عبدالبر کی عمر 12 سال تھی۔

امام عبدالبر نے نہایت چھوٹی عمر سے ہی علم سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ: ”چھوٹی عمر میں سیکھا ہوا علم ایسا ہی ہے جیسے پتھر پر لکیر کھینچ دی گئی ہو جو کسی طرح مٹ نہیں سکتی۔“

امام ابن عبدالبرؒ کی والدہ کے بارے میں تاریخ خاموش ہے لیکن اتنا ضرور ثابت ہے کہ ان کی والدہ کی صحیح تربیت، سچی مامتا اور دین داری و پرہیزگاری نے ابن عبدالبرؒ کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ تاریخ زیادہ تر ان ماؤں کا ذکر کرتی ہے جنہوں نے سیاسی یا معاشرتی میدان میں کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ ابن عبدالبرؒ کی والدہ ”خاتون خانہ“ تھیں اور اسلامی طرز زندگی کا پاکیزہ نمونہ تھیں، دینی علوم سے بخوبی آشنا تھیں۔

امام ابن عبدالبرؒ نے علم کے حصول کا آغاز قلم اور تختی سے کیا۔ انہوں نے لکڑی کی تختی پر لکھ لکھ کر علم سیکھا۔ اپنے والد کی نگرانی میں قرآن و حدیث کی تعلیم بھی پائی۔ علم کے حصول کے لیے اپنے والد کی وفات کے بعد ابن عبدالبرؒ کو بہت محنت کرنا پڑی۔ اس کے لیے انہوں نے سفر بھی کیے۔ ابن عبدالبرؒ کہا کرتے تھے: ”جس نے اپنے بیٹے کو بچپن ہی سے ادب سکھانا شروع کر دیا، اس نے گویا جوانی کو اپنی آنکھ کے لیے ٹھنڈک بنا لیا“ اور ”نرم و نرمی پر چھوڑا ہوا نقش پائیدار ہوتا ہے۔“

امام ابن عبدالبرؒ نے 389ھ (999ء) انفس نحوی کی شاگردی اختیار کی جو علم نحو میں دنیا کے امام مانے جاتے ہیں۔ ابن عبدالبرؒ نے صرف ونحو اور دیگر ابتدائی علوم کی تحصیل سے بھی قبل 381ھ (991ء) سے علم قرآن، علم حدیث اور علم فقہ کے اسباق پڑھنا شروع کر دیے تھے اور 21 سال کی عمر میں ابن عبدالبرؒ ”علم صرف ونحو، علم قرآن و حدیث اور علم فقہ سب ہی شعبوں میں امتیاز پیدا کر چکے تھے۔ ابن عبدالبرؒ نے احمد بن عبد الملک بن ہشام الاشہلی سے فقہ کی تعلیم پائی جو ابن الملکوی کہلاتے تھے۔ ابن عبدالبرؒ اپنے استاد ابن الملکوی کے ساتھ تقریباً سات برس تک وابستہ رہے۔

ابن الفرہی کی علمی مجالس میں شریک ہو کر ابن عبدالبرؒ نے فقہ، حدیث، ادب، علم الرجال اور علم الجرح میں کمال حاصل کیا۔ ابن الفرہی کے بارے میں ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: ”وہ علم کے تمام تر فنون اور شعبوں میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ فقیہ زمانہ تھے حدیث اور علم رجال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عمدہ تصانیف کے مالک تھے۔“

ابن عبدالبرؒ نے ابن نصر اور حمد بن قاسم البرزازی کے علاوہ اپنے زمانے کے تصوف پسند علماء، زاہدوں، لغت کے ماہروں، فلسفیوں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کی مجلس میں بھی شرکت کی۔ انہوں نے مسجد مسرور، مسجد سرتج، مسجد ابی عبیدہ، مسجد الغازی اور مسجد الغبری کی درس گاہوں سے بھی علمی فیضان پایا۔

ابن عبدالبرؒ نے قرطبہ کے گرد و نواح کے بڑے بڑے شہروں اور وہاں کی علمی درس گاہوں تک کا سفر بھی کیا اور وہاں کے علماء، فقہاء، امراء سے رابطہ قائم کیا۔ اشہلیہ میں انہوں نے اسماعیل بن علی القرشی کے درس میں شمولیت اختیار کی اور ان کی علمی روشنی سے اپنے قلب و نظر کو منور کیا۔

قرطبہ کی مسجد متعہ میں ابن عبدالبرؒ، ابو عمر بن عبد اللہ اطمیت کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ آپ قرآن کی تعلیم کے ماہر تھے۔ ابن عبدالبرؒ نے ان سے ساتوں قرأتوں کا علم سیکھا اور حدیث کا درس بھی لیا۔ اس کے علاوہ اہل سنت کی مدافعت کرنا، بدعات اور من مانی رسوم کی مخالفت کرنا، نیکی، پرہیزگاری کی زندگی گزارنا، ابن عبدالبرؒ نے انہی سے سیکھا۔ اس کے علاوہ خلف بن قاسم سے ابن عبدالبرؒ نے قرآن کریم کی ساتوں قرأتوں، تجوید اور حدیث کا درس لیا۔

ابن بشکوال نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ ابن عبدالبرؒ کو قرطبہ سے شہر بدر کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے وجہ نہیں بتائی، فتنہ برپا آزمائش کی وجہ سے شہر بدر کیے گئے یا سیاست میں حصہ لینے کی بناء پر..... تاہم ابن عبدالبرؒ نے کبھی کوئی سیاسی منصب نہیں پایا۔ ذاتی طور پر ابن عبدالبرؒ سکون پسند، امن دوست اور متحمل مزاج تھے۔

ابن عبدالبرؒ بہت عمدہ شاعر بھی تھے، وعظ و نصیحت پر مبنی اور موقع کے مطابق اشعار کہنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ابن عبدالبرؒ اسلاف کی طرح سلطان وقت اور حکمرانوں سے برابر میل جول رکھتے تھے، ان کے ہاں دعوتوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے جواب میں دو شعر کہے، جن کا مفہوم یہ ہے کہ امراء کے ساتھ میرے کھانا کھانے کو جو شخص برا سمجھتا ہے، اس سے کہہ دیں کہ تم اپنی اس جہالت کی

وجہ سے بے وقوفوں کے زمرے میں شمار ہوتے ہو۔

ابن عبدالبرؒ اندلس کے شرق و غرب میں علمی سفر کرنے کے علاوہ دانیہ شہر بھی گئے۔ وہاں انہوں نے مجاہد بن عبداللہ العامری سے سبع قرأت کا علم حاصل کیا۔ دانیہ میں ابن عبدالبرؒ 432ھ (1040ء) تک رہے پھر وہ واپس آ گئے اور بطلموس کے حاکم مظفر بن الاقطس کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ مظفر بن الاقطس نے ابن عبدالبرؒ کو لشبو نہ کا قاضی بنا دیا۔ (لشبو نہ آج کل پرتگال کا حصہ اور اس ملک کا دار الحکومت ہے اور لڑ بن کہلاتا ہے۔) اس کے علاوہ شترین (موجودہ سانتا مر یہ) کی عدالت میں بھی آپ کو قاضی کا عہدہ دیا گیا تھا۔ آپ لشبو نہ اور شترین دونوں کے قاضی رہے۔

ابن عبدالبرؒ نے دانیہ میں بہت اچھا وقت گزارا۔ دانیہ کے لوگ علوم قرآن کے دلدادہ تھے چنانچہ ابن عبدالبرؒ نے ان کی خاطر چار کتابیں قرأت کے موضوع پر لکھیں جن کے نام یہ ہیں:

- 1- البیان عن تلاوت القرآن
- 2- الاكتفاء فی قرأة نافع و ابی عمر بن العلا
- 3- الانصاف فیما فی بسم اللہ من الخلاف
- 4- التجوید والمدخل الی علم القرأت بالتحدید

علم کی تعریف، مقصد، اس کے حصول کے طریقے، آداب اور اسالیب اور فوائد پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ابن عبدالبرؒ نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام جامع بیان العلم و فضلہ ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے، علم کی افادیت کے موضوع پر ایک مختصر اور جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔ عبدالرحمن غلاوی نے اس کتاب پر ایک سیر حاصل بحث بھی کی ہے اور یوں اس عظیم کتاب کا ایک طرح سے سرسری جائزہ اور اختصار بھی ترتیب کر دیا ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے عبدالوارث بن سفیان، خلف بن قاسم، عبداللہ بن یوسف، احمد بن قاسم الطاہری، خلف بن سعید کے علاوہ ابوالمطرف المغنازعی اور قاضی یونس سے ہر علم میں استفادہ کیا یہاں تک کہ فقہ و حدیث میں ایک مستند حیثیت کے مالک بن گئے اور لوگوں نے ان کو حافظ المغرب کا خطاب دے دیا۔ بلاغت و فصاحت میں ابن عبدالبرؒ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ خط و کتابت میں ان کو کمال حاصل تھا۔ خلیفہ معتضد نے ان کو وزارت قلم و سیف دے رکھی تھی۔ اس لیے ان کو ”ذو الوزارتین“ یعنی دو وزارتوں والا بھی کہا جاتا ہے۔

حاسدوں نے ابن عبدالبرؒ کے بیٹے کی پذیرائی کو برداشت نہ کرتے ہوئے سازش کی اور ان کو قید خانے میں بند کر دیا۔ ایسے میں ابن عبدالبرؒ نے اپنے بیٹے کو قید سے چھڑانے کے لیے معتضد سے درخواست کی تو اس نے اسے فوراً رہا کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفہ کی نظر میں ان کا کتنا اونچا مقام تھا۔ اس واقعے کے بعد ابن عبدالبرؒ نے اپنے بیٹے ابو محمد عبداللہ کو نصیحت کی کہ امراء کی ہم نشینی کو ترک کر دے اور آپ کے ہونہار بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ باپ کی نصیحت کا ایسا اثر ہوا کہ وہ میدان کارزار کا مجاہد بن گیا۔

ابن عبدالبرؒ کی بیٹی یعنی عبداللہ بن یوسف بن عبدالبرؒ کی بہن زینب اپنے زمانے کی نیک، پارسا اور عالم خاتون تھیں۔ ان کے والد یعنی ابن عبدالبرؒ نے ان کو روایت حدیث و قرآن کی اجازت دے دی تھی۔ بلنسیہ میں محمد بن احمد بن علی اللخمی سے ان کا نکاح کر دیا گیا۔ زینب کا بیٹا عبداللہ 443ھ (1051ء) میں پیدا ہوا تھا۔ ابن عبدالبرؒ نے ان کو بھی اپنی تصانیف کی روایت کی اجازت دے دی تھی۔

اہل اندلس پر صلیبی جنگوں کا خطرہ بڑھا تو ابن عبدالبرؒ کی غیرت جوش میں آ گئی۔ اس عرصے میں ایک شہر بریشتر بھی عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا جو اندلس کے مشرق میں واقع ہے۔ ابن عبدالبرؒ نے تمام فقہاء، علماء، ادیبوں اور صوفیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ان کو صلیبی یلغار کے سامنے ڈٹ جانے پر آمادہ کیا۔ 457ھ (1065ء) میں بریشتر پر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

امام ابن عبدالبرؒ ہمیشہ ہنستے مسکراتے بات کرتے، نیکی، بھرپور اعتماد، امانت داری، دانائی، زندگی کی لطافتوں سے حظ اٹھاتے۔ عقل مندی اور سنجیدگی، وقار، خوش دلی، حسن معاملگی، کو جمع کر دیا جائے تو امام ابن عبدالبرؒ کی سیرت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ آپ کے دوست امام ابن حزمؒ نے اپنی کتاب میں ان کے بارے میں ایسا ہی لکھا ہے۔ صبر، تحمل، شجاعت، بلند ہمتی، خاموشی اور مشقتوں کو برداشت کر لینا ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ کتابوں کے مطالعے سے اپنے دل کی پریشانی اور فکر کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عدل و انصاف اور بے خوف رہ کر سچ کا ساتھ دینے والے ابن عبدالبرؒ کی شخصیت آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے کئی کتابیں تصنیف کیں، ابوعلی نستانی نے لکھا ہے کہ ”موطا“ کے بارے میں ابن عبدالبرؒ کی تصنیف ’التمہید‘ ایک جلیل القدر تصنیف ہے۔ امام ذہبیؒ کہتے ہیں کہ یہ ضخیم کتاب ستر جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلدوں سے مراد یہاں اجزاء ہیں۔ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ فقہ و حدیث میں میرے علم کے مطابق کوئی بھی ابن عبدالبرؒ جیسا نہیں ہے۔ ان سے برتر و اعلیٰ تو دور کی بات ہے۔ اس کے علاوہ ’الاستاذ کا رُنا‘ نامی کتاب بھی ابن عبدالبرؒ کی علمیت کی شاہد ہے۔ ’الاستیعاب‘ وہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ابن عبدالبرؒ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ کتاب صحابہؓ کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ ’جامع بیان العلم و فضلہ‘ اس پر مستزاد ہے۔ ابن خلکان اپنی کتاب وفیات الاعیان میں لکھتے ہیں: ’ابن عبدالبرؒ کو تصنیف و تالیف میں کافی مہارت حاصل تھی اور وہ اس کام میں پوری جان لڑا دیتے تھے۔‘

ابن عبدالبرؒ کی چند دیگر کتب کے نام درج ذیل ہیں:

- 1- الکافی فی مذہب مالک: 15 جلدوں میں ہے۔
- 2- الاکتفاء: نافع اور ابو عمر کی قرأت پر ہے۔
- 3- القصص: الموطا کا اختصار ہے۔
- 4- کتاب الایماء: راویوں کے قبائل کا ذکر ہے۔
- 5- کتاب الانتقاء: اس میں امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے اقوال کا ذکر ہے۔
- 6- کتاب البیان: اس کا موضوع تلاوت القرآن ہے۔
- 7- کتاب الاجوبہ الموعبہ
- 8- کتاب الکئی: کئیوں پر مشتمل ہے۔
- 9- کتاب المغازی
- 10- کتاب الفرائض
- 11- کتاب اشعار ابی التاہیہ

’الاستاذ کا رُنا‘ نامی کتاب سے پتا چلتا ہے کہ ابن عبدالبرؒ کے تقریباً 116 اساتذہ تھے جبکہ سعید احمد اعراب کے قول کے مطابق ان کی تعداد 123 ہے۔

ابن عبدالبرؒ کے شاگردوں کی تعداد 47 ہے جن میں امام ابن حزمؒ، امام حافظ حمیدیؒ جیسے جلیل القدر علماء فقہاء بھی شامل ہیں۔ امام ابن عبدالبرؒ بیچ الآخر کے آخری جمعے کی رات 463ھ (30 جنوری 1071ء) میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر 95 برس کے قریب تھی۔ ان کے شاگرد اور ہم نشین ابوالحسن طاہر بن مفوز المعافری نے ابن عبدالبرؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ امام خطیبؒ بغدادی حافظ مشرق اور امام ابن عبدالبرؒ حافظ مغرب دونوں کا انتقال ایک ہی دن میں ہوا۔

☆ ابن عبدالبرؒ بے شمار تصانیف کے خالق ہیں ان کی ملاقاتیں معمر علماء سے رہی ہیں اس لیے ان کو سند عالی کی روایت کا اعزاز و

شرف حاصل ہے۔ 'سند عالی' سے مراد روایت حدیث کا ایسا سلسلہ ہے جس میں کم عمر شخص معمر ترین شخص حدیث روایت کر رہا ہو۔ اس طرح کے سلسلہ اسناد میں راویوں کے نام بہت کم پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طلبہ بہت زیادہ ہیں اور اس طرح ان کی تصانیف کو بھی بہت قبول عام حاصل ہوا۔ ابو عمر ابن عبدالبر علم کے سمندروں میں سے ایک سمندر ہیں ان کی علمی فضیلت تمام بلاد و ممالک میں پھیل چکی ہے۔ (امام ذہبی)

☆ ابن عبدالبر اندلس بھر کے عالم و امام ہیں۔ انہوں نے احادیث و روایت کے متن اور سند دونوں کی تصحیح کی۔ موصول اور منقطع حدیث کے درمیان حد فاصل قائم کی۔ (فتح بن خاقان)

☆ حدیث کے فن میں اندلس کی سرزمین میں ابو عمر ابن عبدالبر کی شخصیت بے مثال ہے۔ وہ مغربی دنیا کے سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں۔ (ابوالولید الباجی)

☆ ابن عبدالبر اپنے زمانے کے امام اور یگانہ روزگار تھے۔ (ابن بشکوال)

☆ حافظ ابو عمر یوسف بن عبدالبر انصاری علم شریعت اور روایت حدیث کے باب میں اہل اندلس کے امام ہیں۔ اس سرزمین کے وہ عالم فاضل ہیں جو علمی میدان میں سب پر سبقت لے گئے ہیں۔ ان کے آثار (کتابیں اور تصانیف) کو دیکھ کر سب پتا چل جائے گا۔ (احمد بن سعید الاندلسی صاحب المغرب)

☆ حفظ و اتقان (ٹھوس علم) کی بنیاد پر ابن عبدالبر کو اپنے زمانے کی سرداری حاصل ہے۔ آپ مجتہدائمہ کے رتبے تک جا پہنچے ہیں۔ (السیوطی)

☆ ابن عبدالبر علمائے اندلس کے شیخ ہیں اندلس کے محدثوں میں سب سے بڑے ہیں اندلس کی سرزمین میں موجود تمام علماء سے بڑھ کر سنت ماثورہ کو یاد رکھنے والے حافظ ہیں حفظ (قوت حافظہ اور حفاظت علم) اور اتقان (چٹنگی علم) میں یہ اپنے زمانے کے سردار ہیں۔ (ابن فرحون)

☆ لوگوں نے مؤطا پر تعلیقات لکھی ہیں اور کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ دو کتابیں ان سب سے بہترین ہیں اور یہ دونوں امام ابن عبدالبر کی ہیں۔ یعنی التمهید اور الاستذکار۔ (ابن کثیر)

☆☆☆

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

بدرالدین العینی

فقہ حنفی کے جید عالم، جنہوں نے بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں

ملک شام میں قحط پڑ گیا تھا۔

پورے ملک میں افراطی کی کیفیت تھی۔ جو لوگ صاحب حیثیت تھے وہی اجناس اور دیگر اشیائے ضرورت منہ مانگے داموں خرید کر اپنی ضروریات پوری کر رہے تھے۔ جبکہ وہ لوگ جو غریب تھے وہ ان چیزوں کی قیمت ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے گھروں میں بھوک و افلاس نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ شہر عین تاب میں بھی یہی کیفیت تھی۔ لیکن یہاں ایک ذی علم اور کریم النفس شخص نادار اور غریب لوگوں کو اپنی جیب خاص سے اشیائے خورد و نوش اور سامان ضروریات فراہم کر رہا تھا۔

قحط کوئی ایک دو دن تک نہیں رہا تھا بلکہ اس کے اثرات ایک طویل عرصہ تک برقرار تھے، لیکن اس شخص کی جیبیں پر کوئی شکن تک نہ آئی تھی۔ جب تک قحط کی صورت حال برقرار رہی اس نے یتیموں، غریبوں اور ناداروں کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔

قدرت نے اس صاحب علم اور فیض رساں شخص کو رمضان المبارک میں ایک بیٹے سے نوازا۔ عین تاب کے فیاض، رحم دل اور خدا ترس شہاب الدین کے بیٹے کو دنیا بدرالدین العینی کے نام سے جانتی ہے۔ بدرالدین العینی، فقہ حنفی کے جید عالم، جنہوں نے اتنی زیادہ مقدار میں کتب تحریر کی ہیں کہ ان کا شمار کرنا بہت دشوار ہے۔

علامہ العینی کا پورا نام احمد بن حسین بن یوسف بن محمود العین تابی الحنفی ہے جبکہ ان کی کنیت ابو النشاء اور ابو محمد ہے۔ آپ 26 رمضان المبارک 762ھ (30 جولائی 1361ء) میں شام کے شہر عین تاب کے لیکن نامی کوچے میں پیدا ہوئے۔ عین تاب کو پانیوں اور باغوں کا شہر کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں نہروں، چشموں اور باغوں کی کثرت تھی۔ یہ عین تاب پہلے دلوک کے نام سے مشہور تھا، دلوک اب تباہ شدہ قلعے کی طرح ہے اور اس کے قریب عین تاب شہر آباد ہے۔ یہ شہر ماضی میں حلب کے زیر انتظام تھا۔

تاریخ فقہ اسلامی آپ کو بدرالدین العینی کے نام سے جانتی ہے، مختصر ان کو علامہ العینی کہا جاتا ہے جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب الہدایہ کے شارح ہیں، انہوں نے الہدایہ کی شرح کا نام البنایہ رکھا۔

علامہ عینی کا خاندان نیکو کاری، تقویٰ، خدا ترسی، پرہیز گاری، علم و فقہ اور دانائی میں مشہور تھا۔ ان کے والد اور دادا دونوں ہی سرکاری عدالت میں قاضی (جج) کے عہدے پر فائز تھے۔ علامہ عینی کے والد شہاب الدین احمد بن موسیٰ 725ھ (1325ء) میں شہر حلب میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور پھر عین تاب شہر میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہاں ان کو قاضی اور امام مسجد کے عہدوں پر ایک ساتھ تعینات کر دیا گیا۔ شہاب الدین جمعے اور پیر کی شب کو مسجد میں پابندی کے ساتھ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے طریقہ وعظ و خطابت کی پیروی کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہر شب کو عوام کو خواہ مخواہ دینی باتوں کے بہانے بٹھا کر ان کے اندر بیزاری پیدا کی جائے۔

علامہ عینی کے والد شہاب الدین نیک انسان تھے مال دار تھے، غرباء سے حسن سلوک کرنے میں ان کو روحانی سکون ملتا تھا۔ علماء اور طلباء کا بطور خاص خیال رکھتے تھے کیونکہ یہ لوگ صرف اور صرف اللہ کے دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے والدین اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر

شہر، قریہ اور بستی بستی گھومتے ہیں۔ ان کے اس علمی سفر سے ان کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔

علامہ عینی کا گھرانہ دین دار اور علمی گھرانہ تھا، عینی کے والد نے عینی کو نہایت چھوٹی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کی ہدایت کی چنانچہ عینی حفظ قرآن میں مصروف ہو گئے۔ پھر والد نے ان کو حصول علم کے لیے مختلف اساتذہ سے استفادہ کرنے کی ترغیب دینی شروع کر دی۔

علامہ عینی کو سب سے پہلے محمود بن احمد بن ابراہیم القزویٰ کی شاگردی میں دیا گیا۔ علامہ القزویٰ اچھے اور اعلیٰ پائے کے خوشنویس بھی تھے۔ خوش خطی میں ان کی نظیر نہ تھی۔ علامہ عینی نے قرآن پاک کی ساتوں قرأتوں کا علم بھی اپنے شہر عین تاب میں رہ کر حاصل کیا۔ چنانچہ المعراج الحنفی سے علامہ عینی نے حفص کی قرأت سیکھی۔ فقہ کا علم عینی نے اپنے والد ہی سے سیکھنا شروع کیا، اس کے بعد شمس محمد الراعی سے صرف و نحو، عربی زبان اور منطق کے اسباق پڑھے۔ علامہ آمدی کی حکیمانہ تحریر اور کتاب علم و ہنر رمز الکنوز، پڑھی، شمس محمد الراعی کی علمی مجلس ہی میں ایوب الرومی نے قطب الدین الرازی التختانی کی کتاب شرح مطالع الانوار کو پڑھ کر سنایا، عینی نے اس پوری کتاب کی سماعت کا شرف حاصل کیا۔ علم صرف (کلموں کی شناخت کا علم) میں علامہ عینی نے احمد بن علی بن مسعود کی تالیف 'مراح الارواح' کو بغور سنا۔ قطب الدین الرازی کی شرح شمس کی سماعت سے فارغ ہوئے تو شافعیہ ابن حاجب کی اس شرح کی سماعت کا آغاز کیا، جسے علامہ جار بردی نحوی نے لکھا ہے۔

علامہ عینی نے نحو میں زحشری کی المفصل اور صدر الشریعہ المحبوبی کی التوضیح علی من التلخیص کو جبریل بن صالح البغدادی کو پڑھ کر سنایا اور اس کے مشکل مقامات کو سمجھا، عینی نے زحشری ہی کی الکشاف کو بھی پڑھا اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب مجمع البحرین کا مطالعہ بھی کیا، پھر جبریل بن صالح ہی نے ان کو صاغنی کی شرح مشارق الانوار کو روایت کرنے کی اجازت دی۔

علامہ عینی نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب القدوری کو میکائیل بن حسین بن اسرائیل سے پڑھا۔ خلافت کے موضوع علامہ نسفی کی 'المنظومہ' پڑھی اور ابن ساعاتی کی مجمع البحرین کو ایک بار پھر میکائیل کے درس میں ختم کیا۔ اس بار عینی نے اس کتاب کی صرف سماعت پر اکتفا کی۔ جن لوگوں نے عینی پر متعصب حنفی ہونے کا الزام لگایا ہے، ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ عینی صرف اور صرف فقہ حنفی کے عالم تھے اور اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ وہ متعصب تھے۔ علامہ عینی کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر قول پر عمل کرتے اور اگر حنفی فقہ میں مل جاتا تو پھر اس پر عمل کرتے۔ علامہ عینی نے فقہ کے چاروں مذاہب پر لکھی ہوئی حسام الدین الہادی کی کتاب 'التجار الزاخرہ' کو ان ہی سے پڑھا۔ 'الکشاف' کا بیشتر حصہ ان کی علمی درس گاہ میں سماعت کیا۔

ان تمام علمی کتب میں کمال حاصل کرنے کے بعد علامہ عینی اس قابل ہو گئے کہ ان کو براہ راست ان کے والد ہی کا نائب قاضی مقرر کر دیا گیا۔ علامہ عینی کی علمی حیثیت کا اعتراف اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ آپ کے شاگردوں میں نہ صرف حنفی بلکہ شافعی اور مالکی علماء کے نام بھی آتے ہیں۔ اگر عینی متعصب ہوتے تو ان کو شافعی اور مالکی علماء میں اتنی پذیرائی نہ ملتی۔

علامہ عینی نے اپنے شہر کے علماء و فقہاء سے ہی علم حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے دیگر شہروں میں جا کر بھی مختلف علماء و فقہاء سے مختلف علوم سیکھے، راج کتب پڑھیں اور سنیں۔ علامہ عینی نے حلب شہر میں جمال یوسف بن موسیٰ المملطی سے اکتساب علم کیا۔ علامہ مرغینانی کی الہدایہ کو ان کی درس گاہ میں حاضر ہو کر باقاعدگی سے سنا۔ نیز فقہ حنفی کی دوسری مشہور کتاب 'شرح الاحکام' کی سماعت بھی کی۔

علامہ عینی نے البہنسا جا کر وہاں کے عالم ولی الدین البہنسی سے بھی علم حاصل کیا، کتب میں علاء الدین الکفادی سے اور مملطیہ میں بدر الدین الکشافی سے متعدد علم حاصل کیے۔ عینی نے حج بھی کیا اور پھر واپس دمشق آ گئے۔ عینی 788ھ (1386ء) میں بیت المقدس کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ وہاں علاء الدین السیرامی کی علمی شخصیت سے متاثر ہو کر عینی نے واپسی کا خیال ترک کر دیا اور ان کے ساتھ ہی مصر چلے گئے۔ قاہرہ پہنچ کر مدرسہ 'ظاہریہ برقوقیہ' میں جا ٹھہرے۔ انہیں علاء الدین السیرامی نے اپنا نائب بنالیا۔ عینی نے الہدایہ کا زیادہ تر حصہ علاء الدین السیرامی سے بھی پڑھا۔ قاہرہ میں قیام کے دوران عینی نے فن حدیث کی طرف خاص طور سے توجہ دی اور فن حدیث کے تمام تر تکنیکی پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا۔

علامہ عینی نے فقہی علوم کی تحصیل احمد بن خاص الترمذی سے کی۔ محاسن الاصلاح کا بیشتر حصہ بھی عینی نے اس کتاب کے مؤلف سراج الدین البلقینی سے پڑھا۔ ابوالفتح العسقلانی کی علمی درس گاہ میں سات قراءات پر مشتمل شاطبیہ کی سماعت کی۔

علامہ عینی نے ابن الکویک سے قاضی عیاض کی مشہور کتاب ”الشفاء“ پڑھی، ابن الکویک نے عینی کو اس کتاب کی روایت کی اجازت بھی دی اور پھر ہر اس کتاب کی روایت کی اجازت عطا کر دی جسے وہ خود روایت کرنے کے مجاز تھے۔

علامہ عینی نے نور الدین الغدی میں سنن دارقطنی پڑھی اور اسی سال نسائی کی سنن کبریٰ اور تہذیب ابن مالک کو بھی مکمل پڑھ ڈالا۔ اب علامہ عینی علم فقہ وحدیث کے بلند ترین مرتبے پر فائز تھے۔ اس کے باوجود علامہ عینی کی علمی تشنگی کم نہیں ہوئی۔ انہوں نے تغریٰ برمش الترمذی سے طحاوی کی شرح معانی الآثار اور امام بغوی کی مصابیح السنہ کو پڑھا۔ جوہری کی صحاح کی سماعت سراج الدین عمر کی مجلس میں کی اور اس طرح حافظ نور الدین البیہقی کی درس گاہ میں پہنچ کر انہوں نے ضروری کتب کی سماعت کو بھی مکمل کر لیا۔ تقریباً 794ھ (1392ء) میں عینی دمشق پہنچے اور وہاں نجم بن الکشک الحنفی سے مدرسہ نور یہ دمشق میں رہ کر صحیح بخاری کے اوائل سے چند ضروری مقامات کی تشریح وتوضیح چاہی۔ اس طرح عینی کے علم میں مزید اضافہ ہوا۔

علامہ عینی کا اپنا بیان ہے کہ انہوں نے شمالی بلاد کا دورہ 800ھ (1398ء) کے بعد شروع کیا اور اس پورے سفر میں صحیح بخاری ان کے ہمراہ رہی۔ اس کے بیشتر مقامات کی تشریح کو انہوں نے مختلف علماء کے علمی بیانات کی روشنی میں مکمل کیا۔

792ھ (1390ء) میں ایک شخص منطاش اشرفی نے حاکم وقت ظاہر برقوق کے خلاف بغاوت کردی۔ عینی اس وقت عین تاب میں تھے، انہوں نے منطاش کی اس باغیانہ حرکت کا سخت نوٹس لیا۔ انہوں نے اپنے وعظوں، جمعہ کے خطبوں میں منطاش اشرفی اور اس کے حامیوں کے قتل کو جائز قرار دے دیا۔ اس کی خبر منطاش تک پہنچ گئی۔ منطاش نے جب عین تاب پر قبضہ کیا تو عینی قلعہ میں جا کر محفوظ ہو گئے لیکن عینی نے اپنے موقف کو تبدیل نہیں کیا۔ اللہ نے حالات کو بدلا، منطاش نے شکست کھائی اور 793ھ (1391ء) میں عینی اس قلعے سے باہر آ گئے، پھر حلب چلے گئے اور چند دنوں کے بعد مصر چلے گئے۔

مصر میں آ کر عینی نے یہاں کے اکابرین سے بات کی۔ 801ھ (1399ء) میں ملک ظاہر برقوق کا انتقال ہو گیا تو اکابرین کی مدد سے تقی الدین المقریزی کی جگہ علامہ عینی کو تعینات کر دیا گیا۔ علامہ عینی کا یہ پہلا باقاعدہ سرکاری عہدہ تھا۔ 801ھ کے بعد سے لے کر آخر دم تک علامہ عینی نے مختلف شعبہ ہائے علوم پر علمی مواد جمع کیا، ان کو ترتیب دیا اور باقاعدہ تالیف وتصنیف اور تدریس وتعلیم کے فرائض انجام دیتے رہے۔

819ھ (1416ء) میں مدرسہ مؤیدیہ کی داغ بیل ڈالی گئی تو عینی کو یہاں کا مدرس حدیث بنا دیا گیا۔ عینی آخر دم تک یعنی 855ھ (1451ء) تک اس عہدے پر فائز رہے۔ عینی مدرسہ محمودیہ میں بھی فقہ کے مدرس رہے لیکن بعد میں وہ اس منصب سے بدر محمود بن عبید اللہ اردبیلی کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

علامہ عینی زیادہ تر جن کتب کی تدریس وتعلیم انجام دیتے رہے، ان میں ان کتب کے نام آتے ہیں: صحیح بخاری، صحیح مسلم، المصابیح، شرح البخاری، ادب میں مقامات حریری پر اپنے ذاتی حواشی پر اکتفا کرتے، تاریخ پر درس بھی دیتے۔ ان مذہبی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ علامہ عینی تین اہم سرکاری اور مذہبی عہدوں پر بھی فائز رہے۔ ان میں ”حسبہ“ اعلیٰ درجے کا عہدہ تھا، اس منصب پر فائز شخص کا کام تھا قانون ونظم (لاء اینڈ آرڈر) بحال رکھنا، لوگوں کے روزینوں اور روزگار کا اہتمام کرنا، صنعتی امور کی دیکھ بھال کرنا اور جو شخص معیشت اور صنعت کے ذریعے سے ناجائز دولت کمائے، اس پر گرفت رکھنا۔ ”نظر الاحباس“ بھی ایک نہایت ذمہ داری کا منصب تھا، اس منصب پر فائز شخص کا فرض تھا تمام جامع مساجد اور عام مساجد کے خطیبوں اور مؤذنوں کا خیال رکھنا، مساجد کی دیکھ بھال کرنا، فوجی چھاؤنیوں کے امور انتظامی اور معاشی مسائل پر نظر رکھنا، صوفیوں کی خلوت گاہوں، علمی مدارس اور دیار مصر کے نواح میں موجود درس گاہوں کے اخراجات کا اہتمام کرنا، گویا یہ منصب وزارت اوقاف کی طرح کا تھا جسے

علامہ عینی نہایت دین داری، عقل مندی و ذہانت سے نبھاتے رہے۔ تیسرا عہدہ ”قضاء القضاة“ آج کل کے چیف جسٹس کی طرح کا عہدہ تھا اس اعتبار سے علامہ عینی نے چیف جسٹس کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور ان کو بخوبی سرانجام دیا۔

علامہ عینی نے ان تینوں عہدوں کو بہت اچھے طریقے سے نبھایا اور یہ تینوں عہدے ان کو محض ان کی ذاتی علمی و اخلاقی استعداد کی بناء پر دیے گئے۔ تین عہدوں کے علاوہ عینی مزید چودہ (14) مختلف عہدوں پر محض اپنی ذاتی قابلیت اور پاکیزگی کردار کی بنا پر فائز رہے۔

علامہ عینی نہایت خوش مزاج اور خوش گفتار انسان تھے۔ عینی کا معاشرتی رویہ قابل رشک تھا ہر کوئی آپ کے حسن اخلاق سے متاثر تھا۔ آپ شعر گوئی میں کمال تو نہیں رکھتے تھے لیکن شعر کہتے ضرور تھے، عینی نے الملک المؤید کی سیرت کو منظوم شکل میں لکھا۔ علامہ عینی نے جامعہ ازہر کے قریب ہی ایک مدرسہ تعمیر کروالیا تھا اس مدرسے میں عینی نے اپنی تمام تر ذاتی کتب کو جمع کر دیا اور ان کو طلبہ اسلام کے نام وقف کر دیا تھا۔

عینی عمر کے آخری حصے میں افلاس کا شکار ہو گئے تھے چونکہ صاحب حیثیت و املاک رہے تھے اس لیے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی تمام املاک فروخت کر کے اپنی ضروریات کو پورا کیا۔ حتیٰ کہ آپ کو اپنی کئی کتابیں بیچنا پڑیں۔ چنانچہ آپ نے وقف کتب کے سوا تمام ذاتی کتب کو فروخت کر ڈالا۔ ان کی وقف کتب کو بعد میں دارالکتب المصریہ میں منتقل کر دیا گیا۔

علامہ عینی کا نکاح ام الخیر سے ہوا یہ نیک خاتون تھیں ان کا انتقال 819ھ (1416ء) میں ہوا۔ علامہ عینی نے ان کو اپنے مدرسہ کے احاطے میں ہی دفن کیا۔ ان سے عینی کی سات اولادیں ہوئیں۔ عینی کے ایک بیٹے عبدالرحیم بھی تھے مشہور قصر عینی، انہی عبدالرحیم کے بیٹے امیر شہابی احمد سے منسوب ہے جو قاہرہ میں ہے۔

علامہ عینی بھی امام ابن تیمیہ کی طرح بے حد خوش خط تھے اور نہایت زود نویس بھی۔ یہاں تک کہ فقہ حنفی کی کتاب ”القدوری“ کی نقل کو عینی نے ایک ہی رات میں تیار کر ڈالا۔

علامہ عینی نے ہر شعبہ علمی میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ عینی کی کتابیں ان کے زمانے کی علمی ثقافت کی سچی تصویر پیش کرتی ہیں۔ سخاوی کے قول کے مطابق علامہ عینی کی تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے استاد یعنی علامہ عینی کے بعد شاید ہی کوئی اس قدر تصانیف کا مالک رہا ہو ان کی کتابوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ کم از کم وہ ان کو گن نہیں سکتے۔

علامہ عینی کی چند کتب کے نام درج ذیل ہیں جو علمی دنیا میں اپنی لودے رہی ہیں۔

1- البنایہ فی شرح الہدایہ: علامہ عینی کی اس کتاب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ الہدایہ فقہ حنفی کی اہم ترین کتاب ہے جس کے مصنف المرغینانی ہیں، البنایہ اسی الہدایہ کی شرح ہے۔

2- رمز الحقائق شرح کنز الدقائق: دو جلدوں میں ہے فقہ حنفی کی مشہور کتاب کی شرح ہے۔

3- الروض الزاہر فی سیرۃ الملک الظاہر الططر: علامہ محمد زاہد الکوثری نے اس کتاب پر اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ عینی نے اس کتاب کو بطور خاص بادشاہ ظاہر تتر کی خدمت میں پیش کیا۔

4- السیف المہندی فی سیرۃ الملک المؤید: الروض الزاہر کے نہج پر لکھی ہوئی یہ کتاب ملک مؤید کی سیرت پر مبنی ہے اور اس سے ضخیم تر ہے۔

5- ملاح الارواح فی شرح مراح الارواح: احمد بن علی بن مسعود کی کتاب مراح الارواح کی شرح ہے اصل کتاب صرف کے موضوع پر ہے۔

6- عمدۃ القاری فی شرح الصحیح للبخاری: یہ کتاب ترکی میں طبع ہوئی ہے۔ اس کے گیارہ اجزاء ہیں۔

7- المقاصد الخویہ فی شرح الشواہد و شرح الالفیہ: اس کتاب کا مشہور نام الشواہد الکبریٰ ہے۔

8۔ فرائد القلائد فی مختصر شرح الشواہد: یہ اوپر والی کتاب کا خلاصہ ہے اور الشواہد الصغریٰ کے نام سے مشہور ہے۔

علامہ عینی کی کئی کتب گوشہ گمنامی میں پڑی ہیں اور ان کو باقاعدہ شائع کرانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ ان میں بہت سے قلمی نسخے بھی ہیں جن کا موضوع صرف، فقہ حنفی، شعبہ حدیث ہے۔ علامہ عینی نے متعدد شیوخ و اساتذہ سے علم کے موتی جمع کیے ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتب کے حواشی بھی لکھے۔ سیرۃ اور شرحیں بھی مرتب کیں۔ علامہ عینی کے شاگردوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے ان میں مالکی، شافعی اور حنفی شامل ہیں۔

فقہ حنفی کے شہسوار علامہ بدرالدین العینی 93 سال کی عمر پر اکرمنگل کی شب 4 ذی الحجہ 855ھ (28 دسمبر 1451ء) کو انتقال کر گئے۔ اگلے روز جامع ازہر میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں جم غفیر نے شرکت کی۔ علامہ عینی کو ان کے مدرسہ کے اندر ہی سپرد خاک کیا گیا۔



علامہ عینی علماء کی نظر میں

☆ ابن ترقی بردی لکھتے ہیں: عینی بے شمار علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ فقہ، نحو، اصول، صرف اور لغت عربی کے عالم بے نظیر تھے۔ ان علوم کے علاوہ دیگر شعبہ ہائے علمی میں بھی ان کا بڑا عمل دخل رہا ہے اور ان میں ان کی خدمات برابر رہی ہیں خاص طور پر تاریخ میں۔

☆ امام سخاوی فرماتے ہیں: علامہ عینی حافظ تاریخ، عالم لغت، صرف و نحو کے ماہر، عربی دانی میں باکمال، ہر فن علم میں برابر کے شریک تھے۔ مطالعہ اور تحریر سے کبھی نہ اکتاتے تھے۔

☆ ابن الخطیب الناصریہ فرماتے ہیں: عینی امام عالم فاضل ہیں۔ کئی علوم میں ان کا برابر کا حصہ ہے، باحشمت ہیں، بامروت ہیں۔

☆ ابن ایاس الحنفی لکھتے ہیں: عینی اپنے زمانے کی نادر علمی شخصیت تھے اور عالم فاضل، عمدہ تصانیف منظر عام پر لائے ہیں۔

☆ احمد بن مصطفیٰ طاش کبریٰ زادہ کی نظر میں: عینی امام عالم علامہ، عربیت اور صرف و نحو کے عارف باکمال، لغت کے حافظ ہیں۔ فقہی کتابوں میں آپ کی قلمی کاوشیں لائق صد تحسین ہیں۔

☆ ابوالمعالی الحسن لکھتے ہیں: علامہ عینی روایت میں منفرد، معاندین اسلام کے خلاف اللہ کی حجت، بدعت پرستوں کے مقابلے میں اللہ کی عظیم نشانی، علامہ بدرالدین عینی.....! ہم مسلمانوں کا ان کی وفات پر افسوس کرنا ہر لحاظ سے بجا ہے۔



اجالے ماضی کے

ڈاکٹر ابوطالب انصاری (انڈیا) کی علمی کاوشوں کا نتیجہ، اسلامی تاریخ کے عظیم فرزندوں کا احوال، جس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے عظیم مسلم شخصیات کے مختصر تعارف اور ذکر شامل ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں، مفسرین، محدثین، فقہاء، ائمہ اور علماء کا ذکر ہے، دوسرے باب میں شعراء، ادباء اور مصلحین، تیسرے باب میں مورخین، جغرافیہ دان اور سیاح، چوتھے باب میں اطباء و سائنس دان، پانچویں باب میں فلاسفہ اور متکلمین، چھٹے باب میں سلاطین و فاتحین اور آخری باب میں مجاہدین آزادی اور سیاست دان شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی، کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شیخ احمد شاہ

عظیم عالم، فقیہ، محدث، مفسر اور محقق جنہوں نے کفر والحاد کے خلاف بھرپور علمی جہاد کیا

وہ سترہ برس کا ایک نوجوان تھا جو مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھا ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔ اس زمانے کے مصر کے مشہور عالم عبدالسلام الفتی بھی وہاں موجود تھے وہ اس نوجوان کے مطالعے میں انہماک سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ اس کے پاس آئے تاکہ اس سے دریافت کیا جاسکے کہ وہ کیا مقاصد رکھتا ہے اور آگے چل کر کیا بنے گا۔

علامہ الفتی اس نوجوان کے پاس پہنچے تو اس نے اپنا مطالعہ ترک کر دیا اور ان کی جانب متوجہ ہوا۔

”بیٹا..... کیا پڑھ رہے تھے؟“ علامہ الفتی نے اس نوجوان سے دریافت کیا۔

”میں عربی ادب کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔“ نوجوان نے ادب سے جواب دیا۔

علامہ الفتی نے کہا: ”بیٹا! تم جانتے ہو کہ آج کے دور میں عالم اسلام میں..... خاص طور پر دین اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”آپ فرمائیے کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ نوجوان نے ان سے رہنمائی چاہی۔

”تم اپنی ساری توجہ قرآنی ادب اور اسلام کی دینی تاریخ پر مرکوز کر لو..... دور حاضر کے فتنے سے خود کو بھی بچاؤ اور دوسروں کو بھی..... میں بھی یہی کام کر رہا ہوں۔“

نوجوان کے دل پر اس مشہور عالم علامہ الفتی کی باتوں کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنی توجہ کو آہستہ آہستہ تاریخ حدیث، علم حدیث اور فن حدیث کی طرف موڑ لیا۔ اس طرح نہ صرف یہ نوجوان اپنے عہد میں اسلام دشمن تحریک سے بچا بلکہ اس کی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے دوسرے لوگ بھی فتنوں سے محفوظ رہے۔ یہ نوجوان تھے مصر کے عظیم دینی شخصیت علامہ شیخ احمد شاہ۔ ایک بڑے عالم، فقیہ، محدث، مفسر، محقق اور ادیب..... انہوں نے متعدد اہم علمی موضوعات پر گراں قدر کتابیں تصنیف کیں، حدیث، فقہ اور تاریخ کی کئی مشہور کتابوں پر تحقیق کر کے ان کی شرحیں لکھیں اور امت مسلمہ کو لاحق روحانی امراض کی درست تشخیص کر کے ان کا علاج تجویز کیا۔ برصغیر پاک و ہند کے تقریباً سبھی علماء کرام نے شیخ احمد شاہ کے اوصاف حمیدہ اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

آپ کا پورا نام شیخ احمد بن محمد شاہ بن احمد بن عبدالقادر ہے۔ آپ کے والد محمد شاہ نے انہیں شمس الائمہ (اماموں کے آفتاب) اور ابو الاشبال (شیر بچوں کا باپ) کے لقب سے نوازا تھا۔ ان کا شجرہ نصب حسین بن علی بن ابی طالبؑ سے جا ملتا ہے۔

شیخ احمد شاہ 79 جمادی الآخر 1309ھ (30 جنوری 1892ء) کو مصر کے شہر قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بھی اپنے زمانے کے عظیم فقیہ تھے۔ مصر کے قاضیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی ولادت مصر میں جرجا بستی میں ہوئی۔ جامع ازہر سے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور چار سال تک سوڈان میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد آپ کو اسکندریہ کے علماء کا رئیس بنادیا گیا۔ انہوں نے جامع ازہر میں وکالت کے فرائض بھی نبھائے اور مصر کی مجلس علماء کے رکن بھی رہے۔ انہوں نے کئی تالیفات اور سیاسی مقالے لکھے۔

شیخ احمد شاہ نے اپنے والد کی کئی تالیفات کو از سر نو شائع کیا۔ ایک کتاب احمد شاہ نے اپنے والد کی زندگی میں ہی ان کی شخصیت پر لکھی جس کا نام محمد شاہ کریم من اعلام العصر تھا۔ محمد شاہ 1358ھ (1939ء) میں انتقال فرما گئے مگر وہ اپنے بعد کے عہد کے لیے احمد شاہ کی صورت میں اپنا علمی ورثہ چھوڑ گئے۔ احمد شاہ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ جس کام کو ان کے والد شروع کر چکے ہیں اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ان کا دینی و اخلاقی فریضہ ہے۔

شیخ احمد شاہ کو کادوھیال جس طرح ایک علمی گھرانہ تھا اسی طرح ان کے نہیلی رشتہ دار بھی علم و فضل میں شہرت رکھتے تھے۔ احمد شاہ کے نانا شیخ ہارون بن عبدالرزاق نے بھی جامع ازہری میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ وہ جامع ازہری میں ایک شعبے کے شیخ بھی تھے۔ عربی زبان میں ان کو خوب مہارت حاصل تھی۔ ان کی بھی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی وفات 1336ھ (1918ء) میں ہوئی۔

سوڈان میں مہدی سوڈانی کے انقلاب کی آتش کو برطانوی سامراج نے خاموش کر دیا تو وہاں کے حالات ایک نئی ڈگر پر آ گئے۔ شیخ احمد شاہ ان دنوں تقریباً آٹھ سال کے تھے جب ان کے والد کو سوڈان میں چیف جسٹس کے عہدے پر تعینات کر دیا گیا۔ احمد شاہ کو بھی اپنے والد کے ساتھ سوڈان منتقل ہونا پڑا۔ شیخ احمد شاہ نے اپنے ہونہار بیٹے کو گارڈن کالج میں داخل کر دیا جہاں انہوں نے چار سال تک تعلیم حاصل کی پھر وہ اپنے والد کے ساتھ 1321ھ (1904ء) میں واپس اسکندریہ آ گئے۔ یہاں ان کے والد کو اسکندریہ کی مجلس علماء کا صدر نشین بنادیا گیا اور شیخ احمد شاہ نے اسکندریہ انسٹیٹیوٹ میں اپنی تعلیم کا دوبارہ آغاز کیا۔

شیخ احمد شاہ کو عربی ادب، عربی زبان، نثر اور شعر سے بہت دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں مصر میں صرف علامہ الفتی ہی ایک ایسی ادبی شخصیت تھے جن کو لغت عربی اور ادب عربی میں سند مانا جاتا تھا۔ عبدالسلام الفتی کی توجہ نے احمد شاہ کی کایا ہی پلٹ دی۔ الفتی نے عربی ادب کا کام احمد شاہ کے بھائی علی کے سپرد کیا، علم حدیث، فن حدیث اور تاریخ حدیث کے شعبے میں کام کی رفتار خاصی سست تھی چنانچہ علامہ الفتی نے اس کام کو احمد شاہ کے سپرد کر دیا۔ شیخ احمد شاہ نے 1327ھ (1909ء) میں باقاعدہ طور پر علم حدیث کو سیکھنا شروع کیا۔ انہوں نے حدیث کی قرأت اور اس کی فنی تعلیم کو کئی ایک مشائخ کی علمی مجلسوں میں بیٹھ کر مکمل کیا۔

شیخ احمد شاہ نے امام بغوی کی تفسیر القرآن اسکندریہ ہی میں اپنے والد شیخ محمد شاہ سے پڑھی۔ اس کے علاوہ تفسیر علامہ محمود النسی، صحیح مسلم، سنن ترمذی اور ترمذی کی شامل محمدیہ اور صحیح بخاری کا ایک جز پڑھے۔ ان کتابوں کی تکمیل کے بعد اپنے والد ہی سے اصول فقہ میں جمع الجوامع، 'المہاج' پر علامہ اسنوسی کی شرح، فقہ حنفی کی کتاب 'الہدایہ' جیسی کتب کا درس بھی لیا۔ شیخ احمد شاہ نے اپنے والد محمد شاہ کے علاوہ شیخ محمود ابودقیقہ سے بھی اکتساب علم کیا۔ ان سے احمد شاہ نے فقہ اور اصول فقہ کی خصوصی تعلیم حاصل کی۔

شیخ احمد شاہ کے والد جب قاہرہ آئے تو انہیں جامع ازہر کا رئیس المشائخ بنادیا گیا۔ شیخ احمد شاہ اور ان کے بھائی شیخ علی بھی جامع ازہر سے منسلک ہو گئے۔ ان دونوں نے جامع ازہر میں موجود مصری علماء سے روابط استوار کر لیے۔ مصر کے دیگر شہروں سے جو علماء و طلبہ یہاں مزید تعلیم کے لیے آتے ان سے مختلف موضوعات پر سوال پوچھتے اور یوں اپنی علمی پیاس بجھاتے۔ احمد شاہ کی شیخ احمد بن شمس الشنقیطی سے ملاقات جامع ازہری میں ہوئی۔ انہوں نے احمد شاہ کو اپنے تمام تر علم کو آگے بڑھانے اور اسے عام کرنے کی باقاعدہ تحریری طور پر اجازت دی اور اس سلسلے میں ان کو علمی سند بھی عطا کی۔ اس کے بعد علامہ شیخ عبداللہ بن ادریس النسوسی (جنہیں مغربی دنیا کا عالم اور محدث کہا جاتا ہے) سے احمد شاہ نے صحیح بخاری کا ایک بڑا حصہ پڑھ کر، صحیح بخاری اور صحاح ستہ میں شامل دیگر کتب کی روایت کی اجازت حاصل کی۔

احمد شاہ کی ملاقات قاہرہ میں شیخ طاہر الجزاری سے بھی ہوئی اور شیخ امام محمد رشید رضا مصری کی علمی مجلسوں میں بھی بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ 1336ھ (1917ء) میں شیخ احمد شاہ نے "شہادۃ عالمیہ" کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد ان کو مدرسہ ماہر میں مدرس کا عہدہ دیا گیا پھر ان کو نج کے دفتر میں افسر کا عہدہ دیا گیا، گویا وہ نائب جج کے طور پر کام کرتے رہے اس کے بعد ان کو قاضی بنادیا گیا اور 1371ھ (1951ء) تک وہ

اسی عہدے پر ہے۔

احمد شاہ اپنے زمانے کے عالم، فقیہ، ادیب، قائد، محدث، مفسر اور محقق تھے۔ ان کی فقہی، تفسیری اور تحقیقی کتب میں ادب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ علماء نے ان کی خوبیوں کو سراہا ہے اور ان کی علمی کاوشوں کا اعتراف کیا ہے۔ پاک و ہند کے تقریباً سبھی علماء نے ان کے اوصاف حمیدہ اور علمی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ شیخ امام عبدالعزیز، الشیخ الہمام ابن شمیم، شیخ محمد حامد لفتی، جیسے علماء کا متفقہ بیان ہے کہ احمد شاہ حدیث میں خاصی دسترس رکھتے ہیں اور یہ کہ اس فن میں وہ بہت سے محدثین سے افضل ہیں۔ نیز فقہ میں بھی ان کو سبقت حاصل ہے۔ علمائے شریعت نے احمد شاہ کو بہت سراہا ہے۔

احمد شاہ اپنے زمانے کے واحد محقق تھے جنہوں نے مختلف کتب خانوں میں جا کر قدیم مخطوطات (قلمی نسخوں) تک رسائی حاصل کی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت تحقیق کے کام کو بطور احسن سرانجام دیا۔

احمد شاہ کی علمی کوششیں لاتعداد ہیں ان کی یہ کوششیں کتابی شکل میں سامنے آئی ہیں۔ احمد شاہ نے علم الحدیث میں امام سیوطی کی کتاب الالفیہ کی از سر نو تحقیق کی۔ ضروری توضیحات حاشیے میں تحریر کیں اور اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔ احمد شاہ نے الفیہ العراقی فی مطلع الحدیث پر بھی تحقیق کی۔ حدیث کی اصطلاحات پر علامہ عراقی کی کتاب 'الالفیہ' کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کے مشکل مقامات کی وضاحت کی۔ اس کے ادبی رموز کو بیان کیا۔ علوم حدیث پر حافظ ابن کثیر کی مرتب کردہ کتاب الباعث الحشیت شرح اختصار علوم الحدیث پر احمد شاہ نے وضاحتیں لکھیں، تحقیقی جملوں کا اضافہ کیا اور جہاں ضرورت محسوس کی، تصحیح بھی کی اور اس کو نقل بمطابق اصل کی شرط کے ساتھ منظر عام پر لائے۔ اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ احمد شاہ کو علمی آراء پر تنقید و تبصرہ کرنے پر کس قدر عبور حاصل تھا اور کس طرح وہ اپنی علمی پختگی کی بدولت ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دیتے تھے۔

احمد شاہ نے امام ترمذی کی سنن (جسے جامع بھی کہتے ہیں) پر نہایت علمی شرحیں تحریر کی ہیں۔ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شاہ کو مخطوطات (قلمی نسخوں) کا موازنہ مطبوعہ عبارت کے ساتھ کرنے میں مہارت حاصل تھی۔

ابن حجر العسقلانی کی کتاب نخبیۃ الفکر کی ایک شرح تو شاہ ولی اللہ دہلوی نے "نزهۃ النظر" کے نام سے کی تھی۔ دوسری شرح احمد شاہ نے کی جسے دارالمعارف قاہرہ نے چھپوانے کا اہتمام کیا۔ مسند امام احمد بن حنبل کی تدوین نو کا کام شیخ احمد شاہ نے اس وقت شروع کیا تھا جب وہ سترہ سال کے تھے۔ احمد شاہ مسند امام حنبل کے ایک ایک لفظ کو پڑھتے اور قدیم مخطوطوں کی مدد سے اصلاح و تصحیح کرتے۔ حدیث کے باب میں احمد شاہ کی یہ تحقیقی خدمت سب سے بڑھ کر ہے۔

ابن صریحی "تفسیر طبری" کے نواجزاء میں پائی جانے والی احادیث کی مختلف اسناد پر کام بھی احمد شاہ نے کیا۔ انہوں نے اس کتاب کے چار دیگر حصوں پر الگ مفید معلومات کا اضافہ بھی کیا۔ احمد شاہ اس کام کو مکمل کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے بعد میں اس کام کو ان کے چھوٹے بھائی محمود شاہ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

سنن ابی داؤد کا خلاصہ علامہ منذری نے مرتب کیا تھا۔ احمد شاہ نے اس پر تحقیق کی، قدیم قلم نسخوں سے اس کا موازنہ کیا، اس کے ساتھ خطابی کی معالم السنن اور ابن قیم الجوزیہ کی تہذیب بھی شائع کی گئی۔ اس تحقیق کے ہر مرحلے میں احمد شاہ کے ساتھ شیخ محمد حامد لفتی بھی شریک رہے۔

شیخ احمد شاہ نے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ فقہی کتب بھی تحریر کیں۔ فقہی مسائل کے علاوہ انہوں نے اصول فقہ پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کی تحریروں نے قرآن و سنت کے فیضان کو عام کیا۔ ان کو فقہ کے متعلق گہری معلومات حاصل تھیں۔ وہ ہر روایت کو محض روایت سمجھ کر قبول نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو خوب چھان پھٹک کر اور اس میں خوب غور و خوض کرنے کے بعد اس سے استدلال کرتے تھے چنانچہ احمد شاہ نے ابن حزم

ظاہری اندلسی کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام پر تحقیق کی اس پر حاشیے لکھے اور پھر اپنی علمی، فقہی اور اصولی آراء بھی پیش کی ہیں۔ اس طرح ابن حزم کی یہ کتاب علماء اور علمی شوق رکھنے والوں کے لیے آسان سے آسان تر ہو گئی۔ اس کتاب کو کئی بار چھپوایا گیا۔

فقہ کے باب میں احمد شاہ کی دوسری کوشش 'رسالہ شافعی' ہے۔ احمد شاہ نے امام شافعی کے رسالے کے مشکل مقامات کا حل پیش کیا اور اپنی ذاتی قابلیت، مطالعہ اور فقہی مہارت کے ذریعے انہوں نے جا بجا مفید اشارے تحریر کیے۔ اس طرح اس کتاب کو احمد شاہ کی تحریروں کی روشنی میں پڑھ کر سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ رسالہ امام شافعی کو نئی سچ دھج سے منظر عام پر لانا احمد شاہ کے عظیم علمی کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ احمد شاہ نے اس کتاب پر کام کرتے ہوئے ان اصل کتب کا سہارا لیا جنہیں خود امام شافعی کی اپنی زندگی میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس طرح احمد شاہ کے لیے یہ معلوم کرنا اور بھی آسان ہو گیا کہ امام شافعی نے جب کوئی فقہی رائے پیش کی تھی اور دیگر علماء و فقہانے اس سے اختلاف یا اتفاق کیا تھا تو اس کی کیا وجوہ تھیں۔ اس طرح کے موازنے سے رسالہ شافعی کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی۔ دوسری وجہ خود احمد شاہ کی اصول فقہ کے بارے میں ذاتی قابلیت ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں کھل کر آزادی رائے سے کام لیا ہے اور اپنے فقہیہ نظریات، اقوال اور آراء تحریر کی ہیں جن میں مذہبی تعصب کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

شیخ احمد شاہ کی چند اور کتب کا تذکرہ جو انہوں نے تحریر یا مرتب کیں: قواعد الاصول و معاقبہ الاصول، العمدۃ فی الاحکام، اور اصول فقہ پر عمدہ بحث الروض المربع بشرح زاد المستقنع (فقہ اور اصول فقہ سے متعلق)، الروضۃ الندیہ شرح الدرر المنہیہ، نظام الطلاق فی الاسلام: یہ احمد شاہ کی نادر اور دلکش تحریروں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے اسلام میں طلاق کے نظام کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ جا بجا اپنی قیمتی فقہی آراء کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔

احمد شاہ نے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی طرح "عقائد اسلامیہ" کے عنوان پر روشن تحریر چھوڑی ہیں۔ احمد شاہ نے فن تفسیر اور فن قرأت قرآن کے سلسلے میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے تفسیر جلالین کو از سر نو دارالمعارف قاہرہ سے چھپوایا۔ اس تفسیر کو منظر عام پر لانے میں ان کے بھائی علی بن محمد شاہ نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد حافظ ابن کثیر کی تفسیر ابن کثیر کا اختصار 'عمدۃ التفسیر' کے نام سے مرتب کیا۔ احمد شاہ اس کے پانچ ہی حصے مکمل کر سکے۔

احمد شاہ کی دینی، ادبی اور علمی کاوشوں سے ان کے دور کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی ہر کتاب ان کے عہد کے سیاسی و دینی احوال و کوائف کی جھلک ضرور پیش کرتی ہے۔ ان کی کتب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی کفر و الحاد کے کارکن اپنا کام کر رہے تھے وہ مذہبی جماعتیں بھی تھیں جو ذاتی نظریات کی بناء پر اسلاف سے اختلاف کر کے فرقہ پرستی کو ہوا دے رہی تھیں۔ احمد شاہ نے امت مسلمہ کو لاحق روحانی امراض کی صحیح تشخیص کی اور اس کے قلع قمع کے لیے تجاویز بھی پیش کیں جو ان کی مختلف ادبی، فقہی، کلامی، تحقیقی اور علمی تحریروں کی شکل میں موجود ہیں۔ انہوں نے اسلاف کے ساتھ نئی نسل کے کمزور پڑ جانے والے رشتے کو پھر سے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔

شیخ احمد شاہ 20 ذی القعدہ 1377ھ (8 جون 1958ء) کو وفات پا گئے۔ ان کی اچھی یادیں، ان کی تحریروں کی شکل میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔



شاہ ولی اللہ

اصلاح امت مسلمہ کی بھرپور اور ہمہ گیر تحریک کے عظیم قائد، لائق تکریم مجتہد اور بہت بڑے عالم دین

باغ بہت خوبصورت تھا۔!

سرسبز و شاداب درختوں کی شاخیں، ٹھنڈی ہوا میں جھومتی تھیں۔ مختلف پودوں پر خوش رنگ پھول اپنی بہار دکھاتے تھے۔ فضا پرندوں کی سیریلی چہکار سے وقفہ وقفہ گونج اٹھتی۔

چند نوجوان، باغ میں سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ نوجوانی کا زمانہ شوخی اور جولانی سے بھرپور ہوتا ہے تاہم یہ نوجوان اپنے انداز و اطوار سے بہت سلجھے ہوئے مہذب اور نیک نفس نظر آتے تھے۔ وہ باغ کے قدرتی حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان نوجوانوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ باغ سے باہر نکل آئے اور ایک طرف کوچل دیے۔ آگے جا کر ان سب کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

نوجوان نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو اس کی ملاقات، اس کے والد محترم سے ہوئی۔ نوجوان نے ادب سے سلام کیا۔ والد محترم نے سلام کا جواب دینے کے بعد دریافت فرمایا:

”کہاں گئے تھے؟“

نوجوان نے بتایا کہ وہ چند دوستوں کے ساتھ باغ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ والد محترم نے اچانک ایک سوال کر دیا۔

”کیا تم نے وہاں کوئی ایسی چیز حاصل کی جو تم سے بطور یادگار باقی رہے؟“

نوجوان، والد محترم کا سوال سن کر سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ وہ اپنے والد کی ہر بات پر پوری توجہ دینے کی کوشش کرتا تھا اس نے والد کی اس نصیحت کو بھی گرہ میں باندھ لیا اور ہر کام کو انجام دیتے ہوئے انہماک کا مظاہرہ کیا کہ گویا وہ اس سے ایسی نصیحت یا درس حاصل کرنا چاہتا ہو جو اس کی زندگی پر مثبت اثرات ڈال کر اسے یادگار بنادے۔

اس نوجوان نے علم حاصل کرنے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی اور بہت جلد بہت بڑے عالم بن کر ابھرے۔

یہ تھے حضرت شاہ ولی اللہ جنہوں نے اپنی پوری زندگی نہ صرف علم کو عام کرنے میں صرف کردی بلکہ مسلمانوں کو صدیوں کے جمود سے نجات دلائی، معاشرے میں پھیلی ہوئی بے شمار برائیوں کا خاتمہ فرمایا، امت مسلمہ کو گروہ بندیوں سے نجات دلا کر متفق اور متحد کرنے کی موثر کوششیں فرمائیں اور ایک ایسی کامیاب تحریک اصلاح چلائی جو بعد میں دعوت دین اور اصلاح معاشرہ کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں کے لیے بنیاد اور قوت ثابت ہوئی۔ شاہ ولی اللہ، امت مسلمہ کے عظیم محسن ہیں۔

شاہ ولی اللہ 4 شوال 1114ھ (10 فروری 1703ء) کو (بھارت کے) ضلع مظفرنگر کے ایک گاؤں ’پھلت‘ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم بھی ایک بڑے عالم اور پاک باطن بزرگ تھے اور انہیں صوفیاء میں بڑا مقام حاصل ہے۔ شاہ ولی اللہ کا سلسلہ نسب اپنے والد محترم کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ محترمہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔

شاہ عبدالرحیم نے دینی علوم کی تعلیم کے لیے دہلی میں ایک مدرسہ ”رحیمیہ“ کے نام سے قائم کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ولی اللہ ابو الفیاض قطب الدین احمد رکھا۔ شاہ عبدالرحیم نے یہ نام بلند مرتبہ بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی نسبت سے رکھا تھا، لیکن بعد میں ولی اللہ ہی مشہور ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم ہی سے حاصل کی۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کو مدرسہ رحیمیہ میں داخل کروادیا گیا۔ آپ نے سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ آپ نے کم عمری ہی میں بہت وسیع مطالعہ کر لیا۔ 14 برس کی عمر میں آپ کی شادی کر دی گئی۔ شاہ ولی اللہ نے اس دوران میں قرآن پاک میں غور و تدبر کی تعلیم بھی حاصل کی اور اپنے والد محترم سے بیعت کے ساتھ ساتھ تصوف کے تمام تقاضوں اور مراحل سے آگہی حاصل کی۔ شاہ ولی اللہ نے تقریباً 17 برس کی عمر کو پہنچنے تک اس زمانے میں رائج علوم عربیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، کلام، معانی، منطق، فلسفہ، تصوف، طب اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی۔ آپ نے ان علوم کی باقاعدہ سند اور تدریس کی اجازت حاصل کی۔

شاہ ولی اللہ کی عمر 17 برس تھی اس وقت آپ کے والد محترم رحلت فرما گئے۔ والد کی رحلت کے تقریباً 12 برس بعد تک شاہ ولی اللہ دہلی میں درس دیتے رہے۔ 1143ھ (1730ء) میں آپ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے۔ حج بیت اللہ کے بعد آپ نے 14 ماہ تک حرمین تشریف میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپ نے حرمین کے بلند مرتبہ اساتذہ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، مسند دارمی، شیخ ابوطاہر مدنی سے پڑھی موطا امام محمدؒ، کتاب الآثار کی تعلیم شیخ تاج الدین مفتی مکہ مکرمہ سے حاصل کی۔ موطا امام مالک، تین بار شیخ ابوطاہرؒ، شیخ تاج الدین اور شیخ وفد اللہ سے پڑھی۔ شاہ ولی اللہ نے شیخ عبداللہ بن سالم البصری سے حدیث کی سند کی اجازت حاصل کی۔

شاہ ولی اللہ رجب 1145ھ (دسمبر 1732ء) میں واپس دہلی پہنچے۔ آپ نے اپنے والد محترم شاہ عبدالرحیم کی درس گاہ ”رحیمیہ“ میں تدریس شروع کر دی۔ اس درس گاہ میں دیگر کئی قابل اساتذہ بھی درس دینے لگے۔ بہت جلد شاگردوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ درس گاہ چھوٹی محسوس ہونے لگی تو سربراہ مملکت محمد شاہ نے دہلی ہی میں ایک وسیع اور شاندار حویلی شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ شاہ صاحب نے درس گاہ اس حویلی میں منتقل کر دی۔

شاہ ولی اللہ کی پیدائش جس زمانے میں ہوئی وہ مغلیہ سلطنت کے آخری طاقت ور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا آخری دور تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد، مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔ ملک میں خانہ جنگی اور بد امنی شروع ہو گئی۔ حکمران محمد شاہ کے زمانے میں مہاراشٹر کے مرہٹوں نے بغاوت کی اور پانچ سال میں وسط ہند کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ چند برس بعد گجرات پر بھی مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔

اُدھر شمال سے ایرانی حکمران نادر شاہ نے تباہ کن حملہ کیا۔ دہلی میں قتل عام ہوا اور بڑی بربادی پھیلی۔ نادر شاہ مغلوں کا خزانہ اور قیمتی اشیاء لوٹ کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ملک میں بغاوتیں ہونے لگیں اور چند سال میں دکن، سندھ، بنگال اور اودھ میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ پھر کشمیر بھی دہلی کے بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

مسلمان نہ صرف سیاسی لحاظ سے کمزور ہو گئے تھے بلکہ وہ اخلاقی اعتبار سے بھی زوال کی طرف جا رہے تھے۔ دولت سے محبت، آرام طلبی، عیش و عشرت، خود غرضی، بے ایمانی اور اسی قسم کی بہت سی خرابیاں ان میں پیدا ہو گئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مسائل پر اختلافات پیدا ہونا عام تھا۔ لوگ مختلف بنیادوں پر گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ علماء اور صوفیاء کا حال بھی مختلف نہ تھا وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے حرمین شریفین سے واپسی پر، امت مسلمہ میں اتحاد پیدا کرنے اور اصلاح کے عظیم اور کٹھن کام کا آغاز فرمایا۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے مختلف علمی اور فقہی طبقوں کے درمیان مفاہمت اور قربت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے اہل علم اور ان کے پیروکار عوام کے درمیان اختلافات بہت کم ہو گئے۔ اعتدال کی روش اختیار کی جانے لگی، تعصبات دور ہونے لگے اور ایسے امور کی طرف توجہ دی جانے لگی جن پر سب متفق تھے۔

شاہ ولی اللہ نے معاشرے میں بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کا عظیم اور کٹھن کارنامہ نہایت منظم اور مؤثر انداز سے انجام دیا۔ آپ نے ایک جانب تو پوری تاریخ اسلام کا تنقیدی جائزہ لیا اور بے حد باریک بینی سے یہ واضح کیا کہ اسلام قبول کرنے والی مختلف اقوام نے اپنے دینی عقائد میں کون کون سی غیر اسلامی باتیں شامل کر لیں اور ان کے اعمال، اخلاق، تہذیب، تمدن اور سیاست میں کس طرح نامناسب اور گمراہ کن تبدیلیاں آ گئیں۔ پھر شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی پستی، بد حالی، زوال اور گمراہی کے دو بنیادی اسباب بیان فرمائے۔ ایک، اقتدار کا خلافت سے بادشاہت کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانا۔ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں مسلمانوں میں پھیلی ہوئی خرابیوں کی تفصیل بیان فرمائی اور ان کی وجوہ سے آگاہ فرمایا۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے زوال کے صرف اسباب ہی بیان فرمائے بلکہ ان کو دور کرنے کے طریقے بھی سمجھائے۔ آپ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنے اور ایک دوسرے کے فقہی مسلک کی عزت کرنے کی تعلیم دی۔ شاہ صاحب نے مسلمانوں کو اجتہاد اور تحقیق پر راغب فرمایا اور اجتہاد کے اصول و قواعد اور اس کی شرائط بھی بیان فرمائیں۔ اجتہاد سے مراد قرآن اور حدیث کی روشنی میں اسلام کی روح اور شریعت کے منشا کے مطابق مسائل کا حل دریافت کرنا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے امت مسلمہ کو صدیوں سے بھولا ہوا یہ سبق یاد دلایا کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر پوری طرح نافذ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے اسلام کے پورے کے پورے اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کر دیا۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی نظریاتی تربیت کے لیے درس و تدریس، وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کی جو عظیم خدمات انجام دیں ان ہی کی بنا پر مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی اور اس کے بعد جتنی بھی اسلامی تحریکیں چلائی گئیں جن میں تحریک پاکستان بھی شامل ہے وہ سب شاہ ولی اللہ کی جدوجہد اور انتھک محنت سے پر رکھی جانے والی نظریاتی بنیادوں پر چلائی گئیں۔

شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاح کے لیے بہت سے اہم کارنامے انجام دیے۔ اس زمانے میں ہندوؤں کے اثرات کی وجہ سے بیوہ کی شادی کو برا سمجھا جانے لگا تھا۔ شاہ صاحب نے اس رسم کی مخالفت کی۔ انہوں نے مسلمانوں کی خوشی اور غم کے مواقع پر فضول رسموں سے روکا۔ شاہ صاحب نے تصوف کی بھی اصلاح فرمائی۔

شاہ ولی اللہ کا ایک اہم کام، قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی اور لوگ قرآن پاک کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے۔ شاہ صاحب کے ترجمے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ قرآن کریم کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔

شاہ ولی اللہ نے تعلیمی نصاب کے پرانے نظام میں اصلاح و ترمیم کی اور اسے الجھنوں سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے امیروں اور غریبوں کے درمیان پائی جانے والی طبقاتی کشمکش کو دور کرنے کے لیے قرآن و سنت سے اقتصادی اور معاشی نظریے پیش کیے۔

شاہ ولی اللہ نے سیاسی پہلو کو بھی بڑی اہمیت دی۔ آپ نے حکمرانوں، عہدے داروں اور سپاہ کے حالات کا مکمل جائزہ لیا۔ درست حکمرانی کے اصول بیان فرمائے، اسلامی نظام حکومت کی تشریح کی اور حاکم اور رعایا کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے طریقوں کی تعلیم دی۔

شاہ صاحب نے بادشاہ وقت، امراء اور دیگر عہدیداروں سے رابطے قائم کیے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

شاہ ولی اللہ کے دور میں مہاراشٹر کے مرہٹوں نے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1737ء میں وہ مہاراشٹر سے دہلی تک کے علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔ مغل بادشاہ، محمد شاہ اور اس کے جانشین احمد شاہ، سلطنت کے زوال کو روکنے میں ناکام ہو گئے۔ مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک عہدیدار شہاب الدین نے احمد شاہ کو معزول کر کے اس کے جانشین عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا اور اس کے لڑکے شاہ عالم ثانی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا مگر شاہ عالم فرار ہو کر الہ آباد چلے گئے اور انگریزوں کی پناہ حاصل کر لی جو بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد الہ آباد تک آ گئے تھے۔ ادھر شرقی سمت سے انگریز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے، ادھر افغانستان میں احمد شاہ ابدالی نے اقتدار سنبھال لیا تھا اور اب وہ برصغیر پر حملے کر رہے تھے۔ 1747ء سے 1769ء کے درمیان انہوں نے برصغیر پر 9 حملے کیے۔ تیسری طرف مرہٹوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر انہیں مرہٹوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے اور مسلمانوں کو مرہٹوں سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ روہیلے سردار نجیب الدولہ اور چند دوسرے امراء بھی اس کارروائی میں شریک ہو گئے۔

احمد شاہ ابدالی، شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ایک بار پھر برصغیر آئے۔ دہلی کے قریب پانی پت کے مشہور میدان جنگ میں مسلمانوں اور مرہٹوں کے درمیان، 14 جنوری 1761ء کو زبردست جنگ ہوئی جو پانی پت کی تیسری جنگ کہلاتی ہے۔ مرہٹہ فوج کی تعداد 3 لاکھ تھی اور مقابلے پر مسلمانوں کی فوج میں صرف 90 ہزار سپاہی تھے لیکن اللہ نے مسلمانوں کو فتح سے نوازا۔ 2 لاکھ مرہٹے جنگ میں مارے گئے۔ احمد شاہ ابدالی کی اس بھرپور جنگی کارروائی کے نتیجے میں مرہٹوں کی سیاسی اور فوجی طاقت بہت کمزور ہو گئی اور انہیں سنبھلنے میں بہت وقت لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد دہلی میں اپنی حکومت قائم نہیں کی اور اقتدار مغلوں کے سپرد کر کے واپس چلے گئے جس کے نتیجے میں مملکت پھر سیاسی انتشار کا شکار ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ کی ایک شادی، آپ کے ماموں شاہ عبید اللہ کی صاحبزادی ہوئی اور دوسری شادی مولوی سید حامد سونی پتی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دوسری اہلیہ سے چار صاحبزادے پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں: شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی۔ یہ چاروں صاحبزادے علوم دینیہ کے ماہر تھے۔

شاہ عبدالعزیز 60 برس تک دینی علوم اور حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔ شاہ رفیع الدین نے پہلی بار اردو زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کی اردو میں تفسیر لکھی جو آج بھی پڑھی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے چوتھے صاحبزادے شاہ عبدالغنی کے بیٹے شاہ اسماعیل شہید کا تاریخ میں بڑا مقام ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور انہوں نے سید احمد کے ساتھ مل کر تحریک مجاہدین چلائی اور معرکہ بالاکوٹ میں شہادت کا مرتبہ پایا۔ سید احمد شہید، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک دعوت و اصلاح کس قدر مؤثر اور ہمہ گیر تحریک تھی جس کے اثرات سیکڑوں برس بعد تک بھی قائم رہے۔

شاہ ولی اللہ نے قرآن کریم، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، سیرت سمیت تقریباً ہر موضوع پر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد 100 کے لگ بھگ ہے۔ شاہ صاحب کو عربی اور فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ان دونوں زبانوں میں شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ فارسی میں اشعار کہتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی چند مشہور تصانیف کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

☆ تفسیر فتح الرحمن بترجمہ القرآن: یہ قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس کے ساتھ ایک تفصیلی مقدمہ ہے جس میں ترجمے کے

اصول بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن پاک کے اردو تراجم کے لیے شاہ صاحب کا یہ ترجمہ بنیاد بنا۔

☆ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: تفسیر کے اصولوں پر کتاب

☆ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء والمرسلین: قرآن مجید میں کیے گئے انبیاء کرام کے قصوں پر منفرد تبصرہ ہے۔

☆ حجتہ اللہ البالغہ: فقہ، اسرار شریعت اور تصوف کے علاوہ احادیث کے ایک اہم ذخیرے کی علمی اور عقلی تشریح ہے۔

☆ ازالۃ الخفا عن خلافت الخلفاء: خلافت راشدہ کے حق میں تفصیلی کتاب ہے۔

☆ فیوض الحرمین: قیام حجاز کے دوران، مشاہدات اور علم الکلام و تصوف کے مباحث پر مشتمل ہے۔

☆ الخیر الکثیر: فلسفہ، طبیعیات اور تصوف کے مباحث بیان کیے گئے ہیں۔

☆ طبیب النعم فی مدح سید العرب والعجم: شاہ صاحب کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے۔

☆ تمہیمات الالہیہ: شاہ ولی اللہ کی قلبی کیفیات اور وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔

شاہ صاحب کے مکاتیب کی تعداد بھی خاصی ہے اور آپ کی بعض تصانیف اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کا ذکر تو ملتا ہے لیکن اصل مخطوطات نہیں مل سکے۔

شاہ ولی اللہ نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اصلاح

میں بسر فرمایا۔ 29 محرم الحرام 1176ھ (20 اگست 1762ء) کو ظہر کے وقت علم و دانش کا یہ چمکتا دمکتا سورج غروب ہو گیا اور ایک عالم کو سو گوار کر گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔

☆☆☆

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان جج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

حافظ ابن قیم

حدیث، فقہ، سیرت، تصوف، فلسفہ اور صرف و نحو کے بہت بڑے عالم

چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر چند طلبہ معمول کے مطابق اپنے محترم استاد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس بار اس محفل میں چند ایسے لوگ بھی شامل تھے جو استاد محترم سے کچھ سوال پوچھنا چاہتے تھے۔

اچانک استاد محترم مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے اور طلبہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، ان کی محفل ہر لحاظ سے علمی و ادبی اور دینی محفل ہوتی تھی۔ ان کی آواز، لہجہ اور الفاظ ایسے تھے کہ محفل میں موجود ہر شخص دم سادھے ان کے درس سے مستفید ہو رہا تھا، ہر شخص ان کی گفتگو میں کھویا ہوا تھا، محفل پر ایک سحر سا طاری تھا۔ درس کے آخر میں ایک شخص نے سوال کیا: ”استاد محترم! فقہ و حدیث میں آپ کو کمال حاصل ہے لیکن کبھی آپ کی طرف سے قرآن پاک کی تفسیر کے بارے میں کوئی خاص بات سننے میں نہیں آئی۔ آپ اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟“

محترم استاد مسکرائے اور فرمایا: ”میری تفسیر کا انداز دوسرے علماء سے مختلف ہے، میں ان باتوں کو تفصیل سے بیان نہیں کرتا، جن کا ذکر دوسروں نے پہلے ہی اپنی تفاسیر میں کر دیا ہے۔ میں صرف ان باتوں کو لیتا ہوں، جن پر لوگوں کے مختلف اقوال نظر آتے ہیں، جس میں اختلاف کی وجہ معلوم کر کے اس میں نظری و عقلی اور فکری و علمی سبب کا کھوج لگاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ قرآن پاک کی روشنی میں اختلاف دور کرنے کی صورت تلاش کی جائے، جب قرآن مجید سے ایسا کام ہو جائے تو پھر کسی دوسرے ذریعے سے تائید حاصل کرنا ضروری نہیں رہ جاتا ہے۔ میری تفسیر میں آپ کو سب کچھ ملے گا لیکن نظری، علمی اور ادبی بحث بھی ضرور ملے گی، اس طرح قرآن کی اہمیت اور عقائد کی اصلیت نکھر کر سامنے آتی ہے، میرے محترم استاد ابن تیمیہ کا بھی یہی اسلوب رہا ہے۔“

یہ جواب سن کر محفل پر سکوت طاری ہو گیا۔ سائل اپنے سوال کا تسلی بخش جواب پا چکا تھا۔

سوال کا تفصیلی اور تسلی بخش جواب دینے والے تھے..... حافظ ابن قیم..... امام ابن تیمیہ کے شاگرد، حافظ ابن قیم کو علم حدیث و فقہ، سیرت، تاریخ، علم کلام، صرف و نحو، فلسفہ اور علم تصوف پر مکمل عبور حاصل تھا۔ آپ کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ، ساڑھے چھ سو برس گزر جانے کے باوجود آج بھی لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

حافظ ابن قیم کا پورا نام ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن ابی بکر ہے لیکن آپ علمی دنیا میں ’ابن قیم الجوزیہ‘ کے نام سے مشہور ہیں۔ یسری السید محمد کی تحقیق کے مطابق حافظ ابن قیم 691ھ/1292ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ اس وقت صلیبیوں کو خطہ عرب سے نکلے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔

ابن قیم کو الجوزیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کو اس مدرسے سے نسبت علمی حاصل تھی، جس کی بنیاد یوسف بن عبد الرحمن بن علی بن الجوزی نے ڈالی تھی۔ الجوزی کا انتقال 656ھ/1258ء میں ہو گیا تھا۔ ابن قیم کے والد ابو بکر بن ایوب اس مدرسے کے نگہبان یا قیم تھے اس بناء پر آپ ’ابن قیم‘ کے نام سے مشہور ہوئے۔

ابن قیم نے جس خاندان میں آنکھ کھولی، وہ علم و فضل اور تقویٰ میں مشہور تھا۔ یہ خاندان اس وقت حوران کے قریب ایک گاؤں زرع نامی گاؤں میں رہتا تھا جو دمشق سے تقریباً 55 میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ گاؤں اب از رع کہلاتا ہے۔ یہ خاندان بعد میں دمشق میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔

ابن قیم نے بہت سے علماء سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ علم الفرائض (وراثت کا علم) اپنے والد سے حاصل کیا، اس لیے کہ ان کو علم الفرائض میں خاصی مہارت حاصل تھی اور اس میں ان کا بڑا نام تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن قیم کے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نہایت عبادت گزار تھے، تکلفات سے دور رہتے تھے ان کی ساری توجہ عوام و خواص کے اخلاق کی اصلاح پر رہتی تھی۔ علماء کی نظر میں ابن قیم جیسے متقی و پرہیز گار عالم کی خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ ان کے والد نہایت ہی نیک، عبادت گزار، شریف النفس اور خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے گویا زیادہ سیاسی ابتری کا زمانہ دیکھا لیکن اس کے باوجود وہ مدرسہ الجوزیہ کے ساتھ ساتھ مدرسہ صدریہ (جو دربار الریحان میں واقع تھا) کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ وہ حساب داں بھی تھے اس لیے ابن قیم نے ان سے حساب بھی سیکھا اور ایک مدت تک مختلف علوم و فنون میں اپنے دور کے مشہور شیوخ سے تکمیل کی۔ 712ھ/1312ء میں جب ابن تیمیہ مصر سے دمشق میں مقیم ہوئے تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور 728ھ/1328ء میں ان کی وفات تک ان کے پاس رہے۔

اس طویل صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن تیمیہ کا رنگ ان پر غالب آ گیا۔ وہ ابن تیمیہ کے صحیح جانیشیں اور ان کے علوم کے صحیح معنوں میں حامل تھے۔ ابن قیم اپنے استاد کے ہر اچھے کام میں ان کے پیروکار تھے۔ جس طرح ابن تیمیہ خود نماز فجر کے بعد خصوصی اذکار میں مشغول ہو جاتے تھے اسی طرح ابن قیم بھی نماز فجر کے بعد ذکر الہی میں مصروف رہتے، یہاں تک کہ دن چڑھ آتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ میرا ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میری بدنی قوتیں جواب دے جائیں گی۔ ان کے مطابق صبر اور فقر کے ذریعے ہی دین کی امامت حاصل ہو سکتی ہے۔

ابن قیم نے شہاب النابلسی سے حدیث کی سماعت کی اس کے علاوہ دیگر کئی اساتذہ سے بھی حدیث کا علم حاصل کیا۔ لغت عربی ادب اور عربی زبان کے لب و لہجہ میں مہارت حاصل کی۔ اصول اور فقہ کی تعلیم ابن قیم نے شیخ صفی الدین، الہندی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے حاصل کی۔ ابن قیم بھی اپنے استاد ابن تیمیہ کی طرح بلا کی قوتِ حافظہ رکھتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عبارت کے اصل مفہوم کو اہمیت دیتے تھے۔ اگر مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر اس کو آپ اپنے طور پر موقع کی مناسبت سے مؤثر انداز میں پیش کر سکتے ہیں، گویا ابن قیم علوم کی روایت لفظی کو تسلیم کرنے کی بجائے روایت بالمعنی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ روایت لفظی سے گریز بھی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ روایت کرتے وقت ابن قیم کے ہاں لفظ بدل سکتے ہیں ان کے معنی نہیں!

ابن قیم کو علم نحو میں خاصی مہارت تھی۔ اس کے ساتھ ان کو بہت سے عربی اشعار بھی زبانی یاد تھے۔ ابن قیم بحث مباحثہ کرنے میں پیش تھے ابن قیم اپنے استاد ابن تیمیہ سے بھی مناظرہ کرتے۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابن قیم کو ہر صنفِ علم پر کتابیں اکٹھا کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے ان کتابوں کو پڑھ کر اتنا کچھ علم اپنے اندر سمو لیا کہ اس کا احاطہ اور اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ابن قیم کی کتابیں اس قدر زیادہ تھیں کہ بعد میں ایک عرصے تک ان کے خاندان کے افراد یعنی ان کی اولاد ان کتابوں کو فروخت کرتی رہی، اونے پونے نہیں، بلکہ جہاں انہوں نے دیکھا کہ اس کتاب کو خریدنے والے علماء ہیں اور وہ اس کتاب کی مدد سے بہت سارے طلبہ کو فیض پہنچائیں گے تو وہ ان کو اس شرط پر فروخت کرتے کہ اس کے نسخے ضرور تیار کروالیے جائیں۔

فقہ اور اصول میں ابن قیم کی تین کتابیں بہت مشہور ہیں، ایک 'تو' اعلام الموقعین' جو تین جلدوں میں ہے، دوم 'الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیہ' اور 'الصلاۃ و احکام تارکھا' (یعنی نماز اور اس کو ترک کرنے والے کے بارے میں احکامات) ابن قیم نے 'مدارج السالکین' کے نام سے بھی کتاب لکھی جس کا موضوع تصوف ہے۔ یہ کتاب دراصل علامہ ہرودی کی کتاب 'منازل السائرین' کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عدۃ

الصابرین، ذخیرۃ الشاکرین، القوائد، روضۃ الحسین اور زہرۃ المشائقین نامی کتابیں بھی تالیف کیں۔

علم الکلام میں ابن قیم نے شفا العلیل، الصواعق المرسلہ، اجتماع الجیوش، الکافیۃ الشافیۃ، حاوی الارواح اور الروح نامی کتابیں تحریر کیں۔ فقہ اور سیرت کے موضوع پر ان کی مشہور کتاب 'زاد المعاد' ہے اس میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر سیرت و غزوات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ فقہی مسائل کا تذکرہ بھی مناسبت کے خیال سے کر دیا گیا ہے تاریخ کے موضوع پر ابن قیم نے اخبار النساء لکھی۔ ان کتابوں کے پیش نظریہ کہنا قطعی طور پر ممکن ہے کہ ہم ابن قیم کو محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، مسلم فلاسفر اور تصوف کا ماہر تسلیم کریں۔

ابن قیم علماء کی نظر میں

ابن قیم اپنی علمی، دینی اور عقلی سوچ کی بناء پر ہر دلعزیز تھے۔ علماء میں ان کا مقام نمایاں تھا۔ ابن ناصر الدمشقی فرماتے ہیں: تفسیر، اصول اور قرأت نیز عبارتوں کے مفہوم سمجھنے میں ابن قیم کو خاصی برتری حاصل تھی۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں: ابن قیم خود کو صحیح دلائل میں جکڑ کر رکھتے تھے اور دوسروں کو صحیح دلائل کا پابند ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ صحیح دلائل کو کس مہارت سے وہ عمل میں لاتے تھے یہ ایک حیرت ناک علمی جسارت تھی۔ سچ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے اور اس میں کسی کا ذرا بھی لحاظ نہ کرتے۔ حافظ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: ابن قیم بڑے علماء میں سے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، فروعی مسائل، اصول فقہ اور عربی دانی میں ان کا پایہ بہت اونچا ہے۔

علامہ ملا علی قاری فرماتے ہیں: جس نے ابن قیم کی مدارج السالکین شرح منازل السائرین کا مطالعہ کر لیا، اس کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ منازل السائرین کے مصنف کس قدر اونچے پائے کے ہیں اور مدارج السالکین کے نام سے اس کی شرح کرنے والے ابن قیم کس پائے کے عالم ہیں۔ دونوں عالم ہی اپنی مثال آپ ہیں۔ اکابرین اہل سنت والجماعت سے ہیں اور اس امت کے اولیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ ابن رجب 'طبقات الحنفیہ' میں امام ذہبی کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ابن قیم کو حدیث سے لگاؤ تھا۔ اس کے تمام تر فنون میں دلچسپی لیتے رہے۔ رجال حدیث کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اخذ کرتے رہے۔ فقہ کے اندر بھی وہ بہت محنت کرتے۔ فقہی مسائل نہایت عمدگی سے تحریر کرتے اور علم نحو میں خاص طور سے مہارت رکھتے تھے۔

قاضی برہان الدین الزری فرماتے ہیں: آسمان کی چھت کے نیچے ابن قیم سے بہتر کوئی عالم نہیں، مدرسہ صدریہ کے مدرس رہے اور مدرسہ الجوزیہ میں طویل عرصے تک امام کے عہدے پر فائز رہے اور انہوں نے اس قدر علمی تحریریں چھوڑی ہیں کہ ان کا صحیح احاطہ مشکل ہے۔ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ابن قیم بہادر تھے وسیع علم کے مالک تھے اختلافی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسلاف کے مذہب میں ان کو بصیرت حاصل تھی۔

محمد المقری فرماتے ہیں: ابن قیم شاگردان ابن تیمیہ اور ان کے ساتھیوں میں مرتبہ علمی کے اعتبار سے سب سے بڑے ہیں۔ سید نعمان آلوسی فرماتے ہیں: ابن قیم وہ شخصیت ہیں جنہوں نے حنبلی مسلک کی صحیح ترجمانی کی۔ اس کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں، ان کو دور کر کے امام احمد بن حنبل کے مسلک کو از سر نو زندہ کیا۔

ابن تیمیہ کی طرح ابن قیم بھی آزمائے گئے۔ ابن تیمیہ کی آزمائش کا تذکرہ ہم ان کے مضمون میں کر چکے ہیں۔ ابن قیم نے جو موقف پیش کیے تھے وہ اصولی اعتبار سے درست تھے لیکن دیگر علماء ان سے ناخوش تھے اور معاصرانہ چشمک کی بناء پر سلطان وقت کے کان بھر کر ان کو جیل میں بند کروا دیا گیا، لیکن اللہ نے ان کی مدد کی اور یہ جیل سے باہر آ گئے لیکن جس مسئلے میں ان کو غلطی محسوس ہوئی، تاج الدین السبکی نے ان کو بلا کر

اصل مسئلہ بتایا تو یہ فوراً مان گئے اس لیے کہ اصل اور حق بات کو ماننا ابن تیمیہ کی طرح ابن قیم کی بھی عادت تھی۔

ابن قیم نے اپنے علم کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ کتابوں کی صورت میں ان کا علمی و دینی ورثہ ابد تک مسلمانوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ ابن قیم نے اپنے زمانے میں اپنے علم کو بنی نوع انسان کی اصلاح و ہدایت کے لیے عام کرنے کی خاطر اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے۔ آپ کے درس کے فارغ التحصیل اپنے زمانے کی جلیل القدر علمی و دینی شخصیات بن کر نمودار ہوئے۔

ابن قیم کے مشہور اور معروف شاگردوں میں درج ذیل علماء کے نام آتے ہیں۔

1۔ حافظ امام زین الدین الدمشقی الحسنبلی زاہد وثقہ عالم دین حدیث، فقہ اور تاریخ میں ان کی کتابیں بہت افادیت کی حامل ہیں۔ یہ مرتے دم تک ابن قیم کے ساتھ رہے۔

2۔ حافظ ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ نے مصنف، امام ذہبی نے ان کو امام، مفتی اور فقیہ بتایا ہے۔ یہ ابن تیمیہ کے شاگرد بھی ہیں اور ابن قیم کے بھی۔

3۔ ابن قدامہ الصالحی۔ یہ عالم ابن قیم کے عمدہ شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے ملاقات کے دوران میں کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہے۔ یہ حدیث، اس کے انواع، معرفت رجال اور حدیث کے علل سے بخوبی واقف تھے۔

4۔ محمد بن عبدالقادر النابلسی نے ابن قیم سے فقہ سیکھی، ان کی اکثر تصانیف کو ان کے سامنے ہی پڑھا۔

حافظ ابن قیم کے بھائی زین الدین بن ایوب بھی عالم شخصیت تھے۔ ان کے مشہور شاگردوں میں ابن رجب کا نام بھی آتا ہے۔ زین الدین کے بیٹے یعنی ابن قیم کے بھتیجے بھی اچھے عالم گزرے ہیں۔ ابن قیم کے خاندان کی چوتھی شخصیت اسماعیل کے بیٹے عبدالملک شرف الدین ہیں ان کے بارے میں ابن العماد لکھتے ہیں: ان کے پاس بہت عمدہ علوم کا ذخیرہ تھا۔ حاضر دماغ، ذہن اور حاذق وزیرک تھے۔ مفتی اور مدرس بھی تھے بہترین مناظر تھے، اپنے زمانے کی بہت ہی نادر اور عمدہ شخصیت تھے۔ مدرسہ صدریہ میں اپنے والد کی وفات کے بعد ان ہی کو تدریس کا عہدہ ملا تھا۔ ان کے خاندان کی پانچویں شخصیت عبدالملک کے بیٹے برہان الدین ابراہیم بن شمس الدین ہیں۔ انہوں نے اپنے والد ہی سے علمی حصول کی ابتدا کی۔ دیگر علماء سے بھی انہوں نے کسب علوم کیا۔ یہ مدرسہ صدریہ میں مدرس بھی رہے اور بہت مشہور ہو گئے۔ علم نحو میں ان کو خاصی دسترس حاصل تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن قیم نے اپنے تمام علوم کو اپنے پورے خاندان کے لوگوں کے لیے ایک بہترین ورثے کی شکل میں چھوڑا۔

محمد مسلم الغنیمی فرماتے ہیں کہ ابن قیم کو دنیا بھر کے مذاہب کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل تھیں۔ ان کی تالیفات ہر علمی موضوع پر دستیاب ہیں۔ ابن قیم کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر پڑھ لیجیے آپ کو یقین ہونے لگے گا کہ اس کے مصنف کو اس موضوع پر پورا کمال حاصل ہے جس پر اس کتاب کا دار و مدار ہے اور واقعی اس موضوع پر اس کتاب سے عمدہ تر کوئی اور کتاب لکھی نہیں جاسکتی۔ اس حقیقت کا احساس آج بھی نمایاں طور پر قاری کو ہوتا ہے۔

ابن قیم کی پوری زندگی جہاد قلم اور خدمت دین میں گزری۔ 23 رجب 751ھ / 26 ستمبر 1350ء کو عشاء کے بعد اس نابغہ روزگار شخصیت کا انتقال ہو گیا۔ ان کو ان کے ہم عصر علماء نے فخر الدین، تاج الدین، عز الدین، شرف الدین، بہاء الدین، زین الدین، نور الدین اور شمس الدین جیسے خطابات والقباب سے نوازا تھا۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ابن قیم اپنے زمانے کی محبوب ترین شخصیت تھی اس لیے بعض خود پسند علماء کو ان سے حسد بھی تھا لیکن آج ان سب کی آنکھیں اشکبار اور دل سوگوار تھیں۔ ابن قیم کے جنازے میں شہرے کے قاضیوں، سرکردہ لوگوں، ہر خاص و عام نے شرکت کی۔ اگلے روز نماز ظہر کے بعد دمشق کی جامع اموی میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جامع صبراح کے قریب قبرستان میں باب صغیر کے پاس ابن قیم کو دفن کیا گیا۔



امام شافعیؒ

علم فقہ میں آپ کا مقام بے حد بلند ہے

سینکڑوں برس پرانی بات ہے۔ ایک نوجوان یمن سے علم فراست کی تکمیل کر کے اپنے وطن واپس آ رہا تھا۔ اس زمانے میں آج کی طرح نہ تو تیز رفتار ہوائی جہاز تھے نہ ہوا سے باتیں کرتی ٹرینیں۔ زیادہ تر سفر بار برداری کے جانوروں کے ذریعہ طے ہوتا تھا۔ نوجوان ابھی اپنی منزل سے دور تھا کہ رات نے ڈیرے ڈال دیے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ نوجوان نے سوچا رات یہیں بسر کی جائے۔ اسے ایک مکان کے سامنے ایک شخص ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ اس شخص کی پیشانی ابھری ہوئی تھی اور آنکھیں نیلی۔ نوجوان نے اپنے علم فراست سے کام لیتے ہوئے اس شخص کے بارے میں غور کیا۔ نوجوان کا وجدان کہتا تھا کہ یہ شخص اچھا نہیں ہے، بہر حال نوجوان نے اس شخص سے رات بھر قیام کی بات کی اور وہ شخص راضی ہو گیا۔

میزبان بہت خوش اخلاق ثابت ہوا۔ اس نے نوجوان کو رات بسر کرنے کے لیے کمرہ دیا۔ اچھا بستر مہیا کیا۔ پُر تکلف کھانا کھلایا۔ گھوڑے کے لیے گھاس کا انتظام کیا۔ نوجوان شش و پنج میں تھا۔ اس نے سوچا یا تو علم فراست ہی غلط ہے یا پھر یہ شخص جلد ہی کوئی حرکت کرے گا۔ صبح ہوئی، نوجوان نے اٹھ کر تیاری کی رخت سفر باندھا میزبان سے ملاقات کی اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا:

”آپ مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو محمد بن ادریس کا مکان دریافت کر لیجئے میرے ہاں قیام فرمائیے گا۔“

ابھری پیشانی اور نیلی آنکھوں والے میزبان نے پوچھا ”یہ تو بتائیے کہ آپ کی کوئی امانت میرے پاس تھی یا آپ نے میرے اوپر کبھی احسان کیا تھا؟“

نوجوان نے کہا ”نہیں“

اس پر میزبان نے سوال کیا ”میں نے آپ کا اتنا خیال رکھا۔ اتنا آرام پہنچایا اس کا معاوضہ کہاں ہے؟“

نوجوان نے معاوضہ دریافت کیا۔ خوش اخلاق میزبان نے ہر چیز کا معاوضہ بتا دیا۔ نوجوان نے تمام رقم ادا کر دی اور پوچھا ”اور کچھ؟“ اس شخص نے کہا ”اب صرف مکان کا کرایہ باقی ہے۔“

نوجوان نے شب ب سری کا کرایہ بھی ادا کیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا اب وہ مطمئن تھا کہ واقعی فراست کا علم، علم ہے!

یہ نوجوان تھے حضرت محمد بن ادریس جو امام شافعیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کو علم فراست ہی نہیں بلکہ فن لغت، فن تاریخ علم الانساب، فن نحو، عروض، تیر اندازی اور حکمت میں بھی کمال حاصل تھا لیکن آپ کی اصل وجہ شہرت علم فقہ میں آپ کا بے حد بلند مقام ہے۔

آپ کا نام محمد، کنیت ابو عبد اللہ اور لقب ”ناصر الحدیث“ ہے۔ آپ کو شافعیؒ آپ کے جد اعلیٰ حضرت شافعیؒ کی نسبت سے کہا جاتا ہے جو صحابی تھے۔ ساتویں پشت پر آپ کا سلسلہ نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے آپ کی والدہ محترمہ یمن کے ممتاز قبیلے ”ازد“ سے تعلق رکھتی ہیں۔

امت مسلمہ کے اس محسن کی پیدائش بیت المقدس سے دو منزل کے فاصلے پر واقع غزہ میں رجب 150 میں ہوئی (یہ عجب اتفاق ہے کہ اسی سال، امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ کا انتقال ہوا) مدت رضاعت کے دو سال بعد والدہ آپ کو یمن میں نواح میں آباد اپنے قبیلے ”ازد“ لے گئیں۔

آپ نے اپنے ماموں کے پاس آٹھ سال گزارے۔ قدرت نے آپ کو ذہانت، فہم و فراست اور حافظہ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ صرف سات سال کی عمر میں آپ قرآن پاک حفظ کر چکے تھے اور دس سال کے ہوئے تو مؤطا امام مالکؒ آپ کو یاد ہو چکی تھی۔

بیٹے کی غیر معمولی ذہانت کو دیکھتے ہوئے والدہ نے انہیں چچا کے پاس مکہ مکرمہ بھیج دیا تاکہ علم الانساب حاصل کریں، اس زمانے میں نسب دانی باقاعدہ ایک علم کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا سیکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ محمد بنؒ اور یس مکہ مکرمہ پہنچ گئے ایک ماہر النسب کے پاس گئے، اس نے مشورہ دیا کہ کوئی ذریعہ معاش پیدا کرو پھر علم سیکھنا۔ اس وقت آپ دس سال کے تھے خالق حقیقی نے جس بچے کو مسلمانوں کا امام بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کے حصول علم کے شوق کا یہ عالم تھا کہ کسی عالم سے کوئی حدیث یا مسئلہ سنتا اسے سنتے ہی یاد کر لیا کرتا اور ہڈیوں پر لکھ لیا کرتا۔ امام شافعیؒ خود فرماتے ہیں۔ ”میں اتنا غریب تھا کہ کاغذ تک خریدنے پر قادر نہ تھا، اس لیے ہڈیوں پر لکھا کرتا، ان ہڈیوں کو منگنے میں احتیاط سے محفوظ کر لیتا۔“

آپ کے چچا کی مالی حالت کمزور تھی، اس لیے آپ کے شوق کو دیکھنے کے باوجود آپ کی مدد سے قاصر تھے۔ ایک دن آپ کو علم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں حضرت مسلم بن خالدؒ رحمۃ اللہ علیہ فقہ و حدیث کے امام اور مفتی ہیں۔ آپ ان کے پاس پہنچ گئے۔ مفتی مسلم بن خالدؒ اس نوعمر لڑکے کی ذہانت، ذکاوت اور حافظہ سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنے حلقہٴ درس میں شامل کر لیا۔ تین سال تک فقہ و حدیث کی تعلیم دی، مفتی صاحب کی مجلس میں اکثر امام مالکؒ کا تذکرہ رہتا تھا جو مدینہ منورہ میں درس دیا کرتے تھے، چنانچہ مفتی مسلم بن خالدؒ کے نوجوان شاگرد نے امام مالکؒ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، مفتی صاحب نے امام مالکؒ کے نام ایک خط لکھ کر حوالے کیا۔

مفتی مسلم بن خالدؒ نے امام مالکؒ کو مخاطب کر کے لکھا تھا ”میں جس نوجوان کو آپ کی خدمت اقدس میں بھیج رہا ہوں، وہ آپ کی فیوض و برکات سے مستفید ہونے کا واقعی مستحق ہے۔ اس میں غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔“

امام مالکؒ کے نام خط تو مل گیا لیکن اب سفر کے اخراجات کیوں کر پورے ہوں۔ نہ تو محمد بنؒ اور یسؒ (امام شافعیؒ) کے پاس اتنی رقم تھی نہ آپ کے چچا کے پاس اتنا سرمایہ تھا لیکن علم حاصل کرنے کا شوق آپ کو کشاں کشاں حضرت مصعب بن الزبیرؒ کے پاس لے گیا۔ عرض مدعا کی تو حضرت مصعبؒ نے کسی سے سفارش کر کے سودینار دلوادے۔ رقم ملتے ہی آپ نے سفر کے انتظامات کیے اور مدینہ منورہ جا پہنچے۔

مدینہ منورہ میں حضرت امام مالکؒ کے مکان پر پہنچ کر دستک دی۔ خادمہ آئی، نام پوچھ گئی۔ پھر امام مالکؒ تشریف لائے۔ آپ نے مفتی بن خالدؒ کا خط پیش کیا۔ امام مالکؒ نے خط پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا فرمایا: ”سبحان اللہ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اب اس قابل رہ گیا کہ وہ سفارشوں سے حاصل کیا جائے۔“

امام مالکؒ کی برہمی دیکھ کر محمد بنؒ اور یسؒ (امام شافعیؒ) آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ ”میں عبدالمطلب کے خاندان کا انسان ہوں“ پھر اپنا حال اور قصہ بیان کیا۔ امام مالکؒ بے پناہ فراست کے مالک تھے، انہوں نے اس نوجوان کی طرف کچھ دیر دیکھا پھر فرمایا ”نام کیا ہے؟“ جواب ملا ”محمد بنؒ اور یسؒ!“

امام مالکؒ نے فرمایا: محمد اللہ سے ڈرو، گناہوں سے بچو بے شک تمہاری شان بہت بلند ہوگی۔“ پھر فرمایا: ”کل آنا اور اپنے ساتھ ایک شخص لیتے آنا جو تمہارے لیے قرأت کرے۔“

امام شافعیؒ خود بیان کرتے ہیں: ”دوسرے دن میں امام مالکؒ کے پاس پہنچا۔ کتاب (مؤطا) میرے ہاتھ میں تھی، میں نے خود ہی قرأت شروع کر دی۔ امام کی ہیبت سے مرعوب ہو کر جب میں ارادہ کرتا کہ اب قرأت روک دوں تو امام مالکؒ پسندیدگی سے فرماتے!

”صاحبزادے! اور..... اور!!“

محمد بنؒ اور یسؒ (امام شافعیؒ) تین سال تک امام مالکؒ سے علم حاصل کرتے رہے دیگر 81 شیوخ سے بھی سند حاصل کی۔ پھر آپ مکہ

مکرمہ واپس چلے آئے۔ اس کے بعد یمن میں قیام فرمایا، اس دوران آپ نے قبیلہ ہزریل میں تیر اندازی، فن لغت، فن تاریخ، علم الانساب، فن نحو، عروض اور علم فراست میں کمال پیدا کیا۔ آپ بہترین طبیب بھی تھے جالینوس، ارسطو، بقراط اور دیگر حکمائے روم و یونان کی کتب پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ کی غیر معمولی فراست کا ایک واقعہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، آپ کے استاد امام حمیدی فرماتے ہیں ”ایک بار میں اور امام شافعیؒ مکہ سے باہر چلے، راستے میں ایک شخص ملا۔ میں نے امام شافعیؒ سے پوچھا: ”فراست سے کام لے کر بتائیے کہ اس شخص کا ذریعہ معاش کیا ہے؟“ امام شافعیؒ نے فرمایا: ”یہ شخص بڑھئی یا درزی معلوم ہوتا ہے۔“ اس شخص سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: ”میں پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ آج کل درزی ہوں۔“

آپ کو تیر اندازی میں کمال حاصل تھا۔ خود فرماتے ہیں: ”مجھے دو چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ ایک تیر اندازی، دوسرے علم، تیر اندازی میں تو واقعی میں نے کمال حاصل کیا۔ باقی رہا علم۔“ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے حاضرین میں سے بعض نے کہا: ”خدا کی قسم، آپ کا علم تیر اندازی کے فن سے بھی زیادہ کامل ہے۔“

آپ باکمال افراد کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ ایک شخص تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ جیب سے تین دینار نکال کر دیے اور افسوس ظاہر کیا کہ مزید رقم نہیں ہے، اگر پاس اور دینار ہوتے تو وہ بھی دے دیتا۔ امام مالکؒ کے انتقال کے بعد آپ نے تحصیل علم کے لیے متعدد سفر کیے۔ بغداد جا کر حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ سے تین سال تک علم حاصل کیا۔ امام محمدؒ سے تین سال تک حصول علم کے بعد امام شافعیؒ مکہ معظمہ واپس تشریف لے آئے اور درس و افتاء کا سلسلہ شروع کیا۔ نو سال تک آپ حرم پاک میں درس دیتے رہے۔ اسی زمانے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے ملاقات ہوئی، اسی دوران آپ نے اجتہاد، استنباط اور فقہ کے اصول تیار کیے جو آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں یمن کا گورنر مکہ مکرمہ آیا ہوا تھا۔ قریش کے سرداروں نے اس سے سفارش کی کہ امام شافعیؒ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں، ان سے سرکاری خدمت لی جانی چاہیے۔ گورنر نے آپ کو بخران کا عامل بنادیا۔ جس شخص نے اللہ کی کتاب مقدس اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اوڑھنا، بچھونا بنا رکھا تھا، اس پر بھلا رشوت یا خوشامد اثر انداز ہو سکتی تھی؟ آپ مقدمات کے فیصلے نہایت عدل و انصاف کے ساتھ فرماتے رہے۔ آپ نے پنچایت کے طور پر سات قابل اعتماد افراد کی ایک کمیٹی بنادی تھی۔ معمولی جھگڑوں کا تصفیہ کمیٹی ہی میں ہو جاتا۔

بہت سے مفاد پرستوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انہوں نے امام شافعیؒ کے خلاف خلیفہ ہارون رشید کے کان بھرے کہ امام شافعیؒ سادات میں سے ہیں اور شاید خلیفہ کے خلاف تحریک چلانے والے ہیں۔ ہارون نے امام صاحب کو فی الفور بغداد بھیجنے کا حکم صادر کر دیا۔ جب امام صاحبؒ کو ہارون رشید کے دربار میں پیش کیا گیا تو چمڑے کے فرش پر بٹھا دیا گیا اور آپؒ کو شہید کر دینے کے لیے تلوار لے آئی گئی۔ اس وقت اس مرد جری نے ایسی پُر درد تقریر کی کہ ہارون کانپ اٹھا۔ اس نے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ سے پوچھا ”کیا ان کے خلاف شکایت درست ہے؟“ امام نے فرمایا:

”ان کے بارے میں جو شکایت کی گئی ہے، وہ ان کی شان سے بعید ہے علم میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔“

ہارون نے امام شافعیؒ کے قتل کا حکم منسوخ کر کے آپ کو نظر بند کر دیا، چند دنوں بعد کسی نے امام شافعیؒ کے ایک علمی مباحثہ کی تفصیل ہارون کے سامنے بیان کی۔ ہارون لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ”ذرا پھر سے سناؤ۔“ سنانے والے نے علمی مباحثہ کی تفصیل دہرائی۔

ہارون نے فوراً امام شافعیؒ کی رہائی کے احکامات جاری کر دیے۔ ایک بار ہارون رشید نے امام صاحب کو بلوایا اور کہنے لگا کہ آج جب میرے دربار میں سب لوگ جمع ہوں، آپ درس دیں۔ آپ نے نہایت مؤثر درس دیا۔ ہارون کا حال یہ تھا کہ بھرے دربار میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔

جب ذرا سنبھلا تو آپ کی خدمت میں پچاس ہزار درہم پیش کیے۔ آپ نے اسی وقت چالیس ہزار درہم نادار علماء، یتیموں، یتیموں اور مساکین میں تقسیم کر دیے۔

کتنی بار لوگوں نے آپ کی خدمت میں رقوم پیش کیں لیکن آپ نے ہمیشہ ان رقوم کا بڑا حصہ غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر بار غریبوں میں رقم بانٹنے کے بعد آپ اللہ سے دعا فرماتے:

”الہی! مجھے حرص دنیا سے ہمیشہ محفوظ رکھنا۔“

ایک بار عید کے دن گھر میں کھانے پینے کا مناسب سامان نہ تھا، اہلیہ نے آپ سے کہا ”آپ اپنی قوم کے ساتھ تو بڑی صلہ رحمی کرتے رہتے ہیں، آج عید ہے، گھر میں سامان نہیں، کسی سے قرض ہی منگوا لیں۔“ آپ نے ایک شخص سے ستر دینار قرض منگوائے، راستے میں مساکین نے گھیر لیا۔ پچاس دینار ان میں بانٹ دیے، بیس دینار لے کر گھر پہنچے۔ ابھی اہلیہ کو رقم دینے نہ پائے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی۔ آپ باہر تشریف لے گئے۔ ایک شخص منتظر تھا۔ اس نے رو رو کر اپنا حال سنایا اور مدد مانگی۔ امام صاحب نے بچے ہوئے بیس دینار اس کے سامنے رکھ دیے کہ جس قدر چاہے اٹھالے اس نے تمام دینار اٹھا لیے اور بولا ”مجھے تو ابھی اور ضرورت ہے۔“

آپ گھر میں پہنچے اہلیہ کو قصہ سنایا۔ اہلیہ نے ناراضگی سے کہا ”آپ یہی کرتے رہتے ہیں۔“ امام صاحب خاموشی کے ساتھ سو گئے۔ صبح ہوئی تو خلیفہ ہارون کے وزیر جعفر بن یحییٰ برکی کا قاصد آیا اور بلا لے گیا۔ جعفر نے آپ کو بے حد تعظیم سے بٹھایا اور کہنے لگا:

”آج رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ واقعہ آپ ہی سنا دیجیے۔“

امام صاحب نے واقعہ سنا دیا۔ جعفر نے بہت اصرار کر کے ایک ہزار دینار آپ کو پیش کیے۔

امام شافعی رات کا ایک تہائی حصہ نوافل، ذکر الہی اور توبہ استغفار میں صرف کرتے تھے۔ قرأت اس قدر پراثر تھی کہ جب آپ قرأت فرماتے تو سننے والے رو پڑتے۔

رات کی تاریکی میں چراغ بجھا کر غور و فکر کیا کرتے، آپ کا خیال تھا کہ چراغ کی روشنی میں خیالات یکسو نہیں رہتے۔ تصنیف و تالیف کا کام مسجد میں بھی کیا کرتے تھے، اس موقع پر دوسروں کی کتابوں سے بھی مدد لیتے اور ان کے مواد کو پرکھتے۔

آپ کی تصانیف کی کل تعداد 113 ہے۔ ان میں ”کتاب الامم الرسالہ اصول احکام القرآن، سنن الشافعی مشہور ہیں۔

198ھ میں امام صاحب مصر تشریف لے گئے۔ 30 رجب 204ھ کو عصر کے وقت آپ کی طبیعت بگڑ گئی، عشاء کی نماز ادا کی اور گڑ گڑ کر

دعا مانگی۔ دعا سے فارغ ہو کر لیٹے ہی تھے کہ اللہ نے اپنے پیارے بندے کو اپنے پاس بلا لیا۔

آپ کو قاہرہ کے باہر قراۃ الصغریٰ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ کا مزار آج بھی قائم ہے۔

☆☆☆

رفاعہ رافع الطہطاوی

مصر میں علمی بیداری پیدا کرنے والی قدآور شخصیت

ان کی عمر ابھی تقریباً آٹھ برس تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھریلو حالات تو پہلے ہی تنگ دستی کا شکار تھے والد کے انتقال کے بعد تو گھریلو زندگی مزید عسرتوں اور مصائب کا شکار ہو گئی۔

ان کی والدہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی قسم کی بے بسی اور یتیمی کا احساس نہ ہونے دیں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے بیٹے کی سرشت میں رفعتوں کی محبت بھری ہوئی ہے لہذا وہ اسے کسی طرح کی پستیوں میں نہیں دیکھنا چاہتی تھیں ان کی والدہ نے ان کا داخلہ جامعہ ازہر میں کروایا۔ اپنی انتہائی نفیس چیزیں بیچ کر بیٹے کی تعلیم کے اخراجات پورے کیے انہوں نے اپنے ذاتی زیورات، سونے کی بالیاں اور نگین وغیرہ تک فروخت کر دیے تاکہ ان کا بیٹا اپنی تعلیم مکمل کر سکے۔ اس بچے نے جامعہ ازہر میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ جی لگا کر مروجہ علوم اور نصابی کتب کو پڑھا، ان کی علمی لگن، دینی رغبت اور کچھ کر جانے کے عزم نے ان کو بالآخر علم کے میدان میں ایسا مقام عطا کر دیا کہ وہ اپنی عمر کے دیگر طلباء کے درمیان ایک قد آور اسلامی شخصیت بن کر ابھرے۔

یہ تھے رفاعہ بن رافع الطہطاوی جنہوں نے علم فقہ، علم حدیث، علم نحو، علم الہندسہ، جغرافیہ اور تاریخ میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ مصری قوم رفاعہ پر فخر کرتی ہے کیونکہ انہوں نے مصر کو رفعتوں سے آشنا کیا، مصری قوم رفاعہ کو جدید مصر اور اس کی بیداری کا علمبردار قرار دیتی ہے۔

رفاعہ کی ولادت 11 جمادی الآخر 1216ھ (19 اکتوبر 1801ء) کو جرجا شہر کے ایک قرینے طہطا میں ہوئی، اسی نسبت سے انہیں طہطاوی کہا جاتا ہے۔ رفاعہ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسینؑ سے جاملتا ہے۔

رفاعہ کی ولادت کے وقت ان کے گھر کے مالی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ رفاعہ نے ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ صرف سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ ابتدائی تعلیم اچھے نمبروں سے پاس کی پھر 1232ھ (1817ء) میں جامعہ ازہر میں پڑھنے چلے گئے وہاں ان کی خدا داد صلاحیتوں سے ان کے اساتذہ بہت متاثر ہوئے۔ شیخ حسن محمود العطار جیسے شفیق اور لائق استاد نے رفاعہ پر توجہ دینا شروع کر دی۔ شیخ العطار کا کہنا تھا کہ تمام مسلم ممالک کو جدید علوم میں مل کر ترقی کرنی چاہیے اور مغرب سے وہ سب کچھ سیکھ لینا چاہیے جو اس کے پاس ہے اور دراصل ہمارا اسلامی ورثہ ہے۔ شیخ العطار شاعر بھی تھے اور طب کے ماہر بھی۔ رفاعہ اکثر شیخ عطار کے گھر پر جا کر بھی ان سے اکتساب علم کرتے۔

رفاعہ نے بہت قلیل مدت میں فقہ، حدیث، لغت عربی اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ انہوں نے آٹھ برس میں اعلیٰ تعلیم مکمل کر لی پھر جامعہ ازہر میں تعلیم و تدریس بھی شروع کر دی۔ شیخ عطار کی مشفقانہ توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفاعہ کو 1240ھ (1824ء) میں ایک مصری بیٹالین میں امام مقرر کر دیا گیا۔ رفاعہ اس عہدے پر تین سال تک فائز رہے۔ یہ محمد علی پاشا کا زمانہ تھا جو خود یوان مصر کے خاندان کے بانی کہے جاتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی تک مصر کے حاکم کو ”خدو“ کہا جاتا رہا ہے۔ محمد علی پاشا نے مصر کو ترقی دینے کے لیے مصری علماء کی ایک جماعت کو جدید علوم کی تحصیل کی غرض سے یورپ بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اس جماعت کا قائد رفاعہ کو مقرر کیا 1241ھ (1825ء) میں علماء کی یہ جماعت پیرس روانہ ہو گئی۔

شیخ رفاعہ نے اپنے استاد کے حکم کی تعمیل میں اپنے سفر فرانس اور قیام فرانس کے دوران میں تمام تر مشاہدات کو ان کی جزئیات سمیت قلم

بند کیا اور پھر ہر قدم پر مصر کی صورت حال کا ان مشاہدات کے تناظر میں جائزہ لیا۔ رفاعہ نے اقتصادی، سیاسی، اجتماعی، فکری، ثقافتی اور علمی انداز سے تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مصر کا ایک مسلمان آج کی دنیا میں کس طرح زندگی گزار رہا ہے اور پیرس کے لوگ کس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مصر کی ترقی کے لیے ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ کون سے امکانات ہیں جنہیں یہاں فرانس میں رہ کر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ شیخ رفاعہ کی کتاب ”تخلیص الابریز“ انہی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ یہ رفاعہ کی پہلی کتاب ہے جس نے مصر کے ایک عام شہری کی سوچ کو براہ راست متاثر کیا۔

مارسیلز کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی رفاعہ نے اپنے استاد شیخ عطار کے فرمان کے مطابق فرانسیسی زبان کو نہایت دلچسپی سے سیکھنا شروع کر دیا کیونکہ مصر کے لیے مغربی علوم اور سائنس کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے فرانسیسی زبان کو سیکھنا بہت ضروری تھا۔ رفاعہ نے (1246ء) 1830ء میں فرانسیسی اساتذہ کے رو برو مختلف موضوعات پر فرانسیسی زبان کے 12 مقالوں کا عربی ترجمہ پیش کیا۔ پیرس میں رہ کر رفاعہ نے ایک اور کتاب لکھی: ”قلائد الفاخری غرائب عوائد الاول والاولا“ اس میں رفاعہ نے ان موضوعات کا احاطہ کیا جو ہر ترقی پسند قوم کے لیے باعث توجہ بن سکتے ہیں۔

رفاعہ اور ان کے ثقافتی طائفے کے دیگر افراد نے فرانسیسی زبان کو پیرس میں رہ کر اچھی طرح سیکھا۔ تقریباً پانچ سال فرانس میں قیام کے بعد رفاعہ واپس مصر پہنچے تو کتابوں سے بھرا ہوا ایک صندوق بھی ساتھ تھا۔

رفاعہ کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ وہ مختلف مدارس کے نصاب کا جائزہ لیں اور اس میں ممکنہ ضروری اور ناگزیر تبدیلیاں لائیں۔ چنانچہ کن فرانسیسی کتب کا ترجمہ مصر کے لیے ضروری ہے ان کا انتخاب رفاعہ کو کرنا ہوتا۔ ایک وقت میں رفاعہ مدارس کے منتظم بھی ہوتے، طلباء کو مختلف الفاظ کے ترجمے اور مطالب بھی بتا رہے ہوتے اور ساتھ ساتھ کتابوں کی ادارت اور ترتیب کا کام بھی سنبھالے ہوتے۔ کتابوں کے تراجم اور ان پر نظر ثانی کا کام بھی ان ہی کے ذمے تھا۔

اس مصروف زندگی کو رفاعہ پندرہ برس سے اپنا معمول بنائے ہوئے تھے۔ اس طویل عرصہ کے دوران میں رفاعہ نے سیکڑوں فرانسیسی کتب کا عربی میں ترجمہ کر ڈالا۔ مصر کے بچے بچے کو معلوم ہو گیا کہ ہم دراصل بحیثیت مسلم قوم کیا تھے؟ فرانس نے ہمیں کیا سمجھا؟ اور ہم کس قدر اسلامی تشخص کی حفاظت کر سکے اور ہمارے اندر بحیثیت ایک قوم کے جو خرابیاں پائی جاتی تھیں ان کے اسباب کیا تھے اور ان خرابیوں کا ازالہ کس طرح ممکن ہے۔

محمد علی پاشا نے رفاعہ کو میڈیکل کالج میں ترجمہ کی ذمہ داری بھی سونپی تاکہ وہ امراض اور ادویات کے عربی، فرانسیسی ناموں کو ایک ساتھ بیان کریں۔ اس طرح ایک طبی لغت مرتب کر دیں۔

اس کے بعد رفاعہ کو اس طبی مدرسہ سے ”طرا“ میں قائم مدرسہ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں ان کا کام علم الہندسہ (جیومیٹری) انجینئرنگ اور فنون عسکری پر مشتمل فرانسیسی زبان میں مکمل ہوئی کتب کو عربی میں ڈھالنا تھا۔ چنانچہ بہت سی فرانسیسی کتب کے عربی تراجم اور ان کی اشاعت و طباعت کا اہتمام شروع ہو گیا۔ رفاعہ نے فرانسیسی زبان کی تعلیم پر اس قدر توجہ دی کہ اس کے سبب ان کی بینائی متاثر ہونے لگی لیکن رفاعہ نے اپنے مشن کی طرف سے لمحہ بھر بھی غفلت نہیں برتی۔

رفاعہ کی تعلیم نسواں کی کوششوں کے نتیجے میں ان کی مفید تجاویز اور مشوروں سے استفادہ کرنے کے لیے 1252ھ (1836ء) میں ان کو لجنہ تعلیم المرأة (تعلیم نسواں کمیٹی) کا ممبر بنادیا گیا۔ رفاعہ نے عورت کی تعلیم اور اس کی اہمیت پر تقاریر کیں اور مصر کے لوگوں میں اس بات کا احساس پیدا کیا کہ عورت کو اچھی اور ضروری تعلیم دلوائے بغیر اسلامی معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ رفاعہ وہ پہلے قائد ہیں جنہوں نے مصری عورت کو معاشرے میں اس کا اسلامی مقام دلوایا جو اس سے چھین چکا تھا۔

رفاع کا دوسرا بڑا کارنامہ ان کی معاشی زرعی اور صنعتی اصطلاحات ہیں اس وقت چھوٹے مزارعوں کی زندگی اجیرن تھی۔ رفاع کی کوششوں سے مصری عوام میں بیداری پیدا ہوئی۔

رفاع طہطاوی تہذیب و تمدن عرب کی نمائندہ یونیورسٹی کے قیام میں حصہ لینے والے پہلے شخص ہی نہ تھے بلکہ مصر کے قدیم نوادرات کے لیے عجائب گھر کی تعمیر کا تصور بھی سب سے پہلے رفاع نے ہی پیش کیا۔ 1835ء میں انہوں نے محمد علی کو قدیم نوادرات کی دیکھ بھال کے سلسلے میں چند تجاویز پیش کیں۔ یہ تجاویز وقائع مصریہ نامی مجلے میں چھپتی رہیں۔ نوادرات کی دیکھ بھال کی مہم کے سلسلے میں مصر کی حکومت کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جس کے پاس قدیم نوادرات موجود ہوں وہ مصر کے اس عجائب گھر میں جمع کرادے، چنانچہ ایسے تمام نوادرات مدرسۃ السنن کے پرنسپل کے حیثیت سے رفاع نے ہی وصول کیے۔

رفاع کو مصر کے پہلے اخبار الوقائع المصریہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ رفاع جدید مصر میں ”صحافت کے باپ“ مانے جاتے ہیں۔ رفاع نے فوج کے مجلوں کی بھی نگرانی کی جو عربی اور فرانسیسی زبانوں میں چھاپے جاتے تھے۔

1249ھ (1833ء) میں رفاع تورائیس قائم آرٹری اسکول چلے گئے جہاں انہوں نے ملٹری سائنس اور انجینئرنگ کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی کام کے دوران میں رفاع کے ذہن میں مصر کے اندر ایسی یونیورسٹی کے قیام کا خیال پیدا ہوا جو مشرقی زبانوں کے مدرسہ کے اسلوب پر کام کرے۔ یوں وہ بے شمار اسکولوں کو اسی یونیورسٹی کے زیر نفاذ لانا چاہتے تھے۔ اس سال ”تاریخ و جغرافیہ کے اسکول“ کا قیام اسی منزل کی جانب پہلا قدم تھا۔ 1250ھ (1834ء) میں مصر میں طاعون کی وبا پھیل گئی تو رفاع اپنے گاؤں طہطاوی واپس چلے گئے جہاں چھ ماہ کے قیام کے دوران میں انہوں نے ملطرون کی جغرافیہ کی کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ بخوبی مکمل کیا۔

رفاع نے 1251ھ (1835ء) میں اسکول آف لیٹریچر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام مدرسۃ الترجمہ رکھا۔ پہلے سال ہی اس میں طلبہ کی تعداد 80 ہو گئی۔

اب ابو زعبل کے کالج، لسانی مدارس اور ان کے ذیل میں آنے والے تمام تعلیمی ادارے، فقہ، علوم شرعیہ کے مدارس، رفاع کی زیر نگرانی دے دیے گئے۔ 1258ھ (1842ء) میں شعبہ تراجم قائم ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد رفاع کو قائم مقام کا منصب دیا گیا جو بڑا منصب تھا۔ 1262ھ (1846ء) میں رفاع کو ایک تنظیمی اور عسکری اعزاز دیا گیا اور اب وہ شیخ کی بجائے ”رفاع بک“ کہلانے لگے۔

محمد علی کے انتقال کے بعد عباس اول مصر کا حاکم بن گئے۔ ان کے خیالات پر قدامت پرستی کا رنگ غالب تھا۔ انہوں نے رفاع طہطاوی کے تمام روشن کارناموں کو بھلا دیا اور ان پر مصر کی زمین تنگ کر دی۔ رفاع کو سوڈان کے شہر خرطوم میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا، لیکن رفاع نے دل چھوٹا نہ کیا۔ خرطوم میں بھی بہت سے نوجوان ان کے شاگرد بن گئے۔ اس جلاوطنی کے زمانے میں انہوں نے اپنا ناول مکمل کیا جسے مواقع الافلاک فی وتالیع التیماک کے نام سے رفاع کے ایک شاگرد نے بیروت سے شائع کیا 1270ھ (1854ء) میں سعید پاشا نے اقتدار سنبھالا۔ انہوں نے سوڈان میں جلاوطن کیے گئے تمام افراد کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا، چنانچہ محمد علی کے دور میں جو ثقافتی منصوبے ادھورے رہ گئے تھے ان کو مکمل کرنے کے نئے عزم کے ساتھ رفاع مصر میں واپس آ گئے۔ سعید پاشا نے رفاع طہطاوی کو میونسپل کونسل میں رکنیت دی اور ترجمہ کا عہدہ بھی دیا، پھر انہیں المرصود میں ایک فوجی اسکول کا سربراہ بنایا گیا۔ بعد میں سعید پاشا نے اس اسکول کو بند کر دیا۔ رفاع کی کوششوں سے انہیں کمیشن آف اسکولز میں کام مل گیا۔ یہ ادارہ تعلیم سے متعلق قوانین تشکیل دیتا تھا۔ اس طرح رفاع نے نصاب تعلیم کی نگرانی اور اس میں ترامیم کرنا شروع کر دیا، پھر وہ اساتذہ کا تقرر بھی کرنے لگے۔

رفاع کو صرف دفتر میں بیٹھ کر کام کرنا بے مقصد لگتا تھا چنانچہ وہ مدارس میں خود جاتے اور جا کر دیکھتے کہ وہاں پڑھائی لکھائی، تربیت اور کھیلوں کا کام کیسا ہو رہا ہے، بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاقی پہلوؤں پر بھی نظر رکھی جاتی ہے یا نہیں۔

رفاع نے محسوس کیا کہ صرف ونحو یعنی عربی زبان کی گرامر کی جو کتب پڑھائی جا رہی ہیں وہ خاصی پرانی ہیں اور قدیم جامد اسلوب میں لکھی گئی ہیں جنہیں آج کا طالب علم آسانی سے نہیں سمجھ سکتا چنانچہ رفاع نے خود عربی صرف ونحو کی کتابیں لکھنا شروع کیں۔ نحو پران کی پہلی کتاب کا نام ”التحفة المکتبہ فی القواعد والاحکام والاصول النحویہ“ بطریقہ مرضیہ ہے۔ نحو کو آسانی سے سمجھانے کی طرف رفاع کی یہ کوشش بالکل نئی اور نہایت کامیاب رہی۔ رفاع نے دیکھا کہ طلباء کے لیے نصاب سے ہٹ کر کوئی کتاب ایسی نہیں جسے وہ شوق سے پڑھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دوسری کتاب ”مباحج الالباب المصریہ فی متاہج الاداب العصریہ“ لکھی جو بہت جلد منظر عام پر آ گئی۔

رفاع نے صرف تدریس، کتب کی نظر ثانی، تصحیح اور تقاریر پر اکتفا نہیں کی بلکہ انہوں نے کتابیں بھی تالیف کیں۔ اس سلسلے میں ’المرشد الامین للذہبات البنین‘ بھی ہے۔ رفاع کی ان کوششوں سے اتنا اچھا اثر پڑا کہ 1290ھ (1873ء) میں مصر میں طالبات کے تعلیمی ادارے کھلنا شروع ہو گئے۔

رفاع کے نزدیک علم کا حصول مرد اور عورت پر یکساں فرض ہے اور یہی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے، البتہ دونوں کو ان کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے معاشرے میں اپنے کام اور کردار کو متعین کرنا ہوگا اور پھر اسلامی تقاضوں کے مطابق دونوں کو ایک گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ایک ساتھ مگر متوازی چلنا ہوگا۔ ان کے نزدیک لڑکیوں کی تعلیم اس لیے بھی ضروری ہے کہ مستقبل کے بچوں کو ایک پڑی لکھی ماں ملے گی اور پڑھی لکھی ماں، ایک اُن پڑھ ماں کی نسبت زمانے کے لحاظ سے بہتر طور پر تربیت کر سکتی ہے اور جدید ضروریات کے مطابق اس کی سوچ پر شروع ہی اچھے نقوش ثبت کر سکتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کی خواتین میں تعلیم کا فقدان ہوگا تو وہ زیادہ تر وقت فضول گوئی اور بے کار کاموں میں گزاریں گی، لہذا بہتر یہ ہے کہ ان کو پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے زیور سے آراستہ کر دیا جائے، گھریلو صنعتیں سکھائی جائیں، اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق ان کو ضروری تعلیم بھی دی جائے۔ اپنے انہی نظریات کی وجہ سے رفاع کو مصر کی خواتین کی آزادی کا پہلا داعی کہا جاتا ہے۔

فرانس میں قیام کے دوران رفاع نے جن کتب و رسائل کا فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ کیا ان کے نام یہ ہیں:

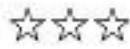
- 1- بندہ فی تاریخ الاسکندر الاکبر (اسکندر اعظم کی تاریخ کا مختصر جائزہ)
- 2- کتاب اصول المعاون
- 3- روزنامہ (تقویم، ڈائری) 1244ء جسے گومار نے مصر اور شام کے لیے تیار کیا تھا۔
- 4- کتاب دائرہ العلوم فی اخلاق الامم وعوائدہم۔ قوموں کے اخلاق و عادات پر مشتمل مختصر انسائیکلو پیڈیا
- 5- مقدمہ جغرافیہ طبیعیہ
- 6- قطعہ عن کتاب ملطرون فی الجغرافیہ
- 7- علم ہندسہ (جیومیٹری) کی کتاب لجندر (تین مقالات پر مشتمل ہے۔)
- 8- بندہ فی علم ہیئۃ الدنیا
- 9- قطعہ من عملیات رؤسا و ضباط العسکر یہ
- 10- اصول الحقوق الطبیعیہ الخا تعتمدها الافرنج
- 11- بندہ فی المیثولوجیا۔ جاہلیۃ الیوفان و خرافاتہم۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، مائی تھا لوجی کا ایک مختصر سا جائزہ لے کر ان کی جاہلیت و خرافات کا سرسری مطالعہ ہے۔
- 12- بندہ فی علم سیاسیات الصحہ: صحت کے بارے میں ہے۔

رفاعہ کئی کتب شائع کر چکے تھے جن میں الرشدا الامین، التختہ المکیہ، مباحج الباب، تخلص الابریز وغیرہ اور ایک مجلہ بھی جس کا نام ”رخصۃ المدارس“ جس کا پہلا شمارہ محرم الحرام 1287ء میں یعنی رفاعہ کی وفات سے تین سال پہلے شائع ہوا تھا۔

ان کی کتب کے علاوہ رفاعہ نے درج ذیل کتب بھی لکھیں۔

- 1۔ انوار توفیق الجلیل فی اخبار مصر و توثیق بنی اسماعیل
- 2۔ نہایت الایجاز فی سیرۃ ساکن الحجاز (سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم)

رفاعہ جدید مصر کے بانی تھے انہوں نے مصری عورت کو اسلام کی ثقافت سے آشنا کیا اور زندگی بھر اپنے مشن کے لیے کام کرتے رہے۔ آخر کار 29 ربیع الاول 1290ھ (27 مئی 1873ء) کو بیمار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جنازے میں شرکت کے لیے ہزاروں علماء و اساتذہ کرام جمع ہو گئے۔ رفاعہ طہطاوی کا جسد خاکی نماز جنازہ کے لیے جامعہ ازہر کے اندر رکھا گیا اور یہ اعزاز کسی عظیم شخصیت کے حصے میں ہی آتا ہے۔ انہیں جامعہ ازہر کے قریب الدرب الاحمر میں بستان العلماء کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔



داستان مجاہد

اسلامی تاریخی ناول نگاروں کے بے تاج بادشاہ، نسیم حجازی کا پہلا ناول داستان مجاہد، کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ ایمان افروز، دلوں کو گرمادینے والے واقعات سے بھرپور، حق و باطل کے معرکوں کی داستان۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ابن قطلوبغا

فقہ، اصول فقہ، فہم حدیث، منطق، صرف و نحو اور دیگر علوم کے ماہر

استاد محترم اچانک درس دیتے دیتے خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اللہ کا شکر ادا کیا، ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

درس میں حاضر طلبہ نے بھی اپنے استاد کی اس حالت کو دیکھا تو کچھ پریشان سے ہو گئے۔ شاگردوں میں سے ایک شاگرد نے جرأت کی اور اپنے استاد سے اس کیفیت کی وجہ دریافت کی۔

استاد محترم نے کہا: ”اللہ پاک کی نعمتوں کی قدر کیا کرو اور زندگی اس طرح گزارو کہ اگر اللہ کی نعمتیں فراواں ہوں تو تکبر نہ کرو بلکہ اور بھی عاجز و تواضع سے کام لو، میری بھی یہی عادت ہے۔ شاید تم کو معلوم نہ ہو کہ میں آٹھ نو برس سے زیادہ کا نہیں تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا، ہم بہت غریب تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد میری والدہ کے لیے میری پرورش اور تعلیم و تربیت ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میری والدہ نے مجھے پھر بھی علوم دین اور آداب سیکھنے کے لیے اساتذہ کی خدمت میں بھیج دیا۔

ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ مجھے تعلیم کے سلسلے کو روک کے کسب معاش کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔ میں سلائی بہت اچھی کر لیتا تھا۔ میں بغدادی سفید کپڑے کو کالے دھاگے سے اس طرح سینتا تھا کہ کالا دھاگہ نظر نہیں آتا تھا۔ میری اس مہارت نے اللہ کے فضل و کرم سے مجھے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچائے رکھا۔ اللہ کو وہ شخص بہت پسند ہے جو خود محنت کر کے اپنی روزی آپ کماتا ہے۔ لہذا تم بھی ایسا ہی کرو۔ آج میں یہاں جو تمہارے سامنے موجود ہوں تو وہ اس لیے کہ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے کام کی توفیق ملی۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ میں کسب معاش کی فکر سے بے خبر ہو کر از سر نو علم حاصل کرنے میں لگ گیا۔“

یہ بزرگ تھے قاسم ابن قطلوبغا..... جنہوں نے فقہ، اصول فقہ، صرف و نحو (گرامر) عربی لغت، علم المعانی (وہ علم جس سے الفاظ کے درست استعمال اور معنوں کے درست ہونے کا پتا چلتا ہے) علم البیان (ایک علم جس میں تشبیہ، اشعارہ، کنایہ وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے) منطق (عقلی دلائل سے حق اور ناحق میں تمیز کرنے کا علم) اور تصوف میں بڑا نام پیدا کیا۔

ان کا پورا نام زین الدین القاسم بن قطلوبغا ہے ان کی پیدائش محرم 802ھ (ستمبر 1399ء) میں قاہرہ میں ہوئی، یہ ابھی بچے ہی تھے کہ 810ھ (1407ء) میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔

ابن قطلوبغا نے جس زمانے میں آنکھ کھولی، اس وقت خاندان غلاماں کی حکومت تھی۔ ملک ظاہر برقوق کی وفات 801ھ میں ہوئی۔ غلام بادشاہوں میں ان کا شمار پچیسویں نمبر میں ہوتا ہے۔ ملک ظاہر برقوق نے غلاموں کو بکثرت سہولتیں فراہم کیں، ان کو شاہی محلات اور دفاتر میں اونچے عہدے دیے۔

ظاہر برقوق کے زمانے میں شیخ قاسم کے والد قطلوبغا تاریخ اسلام میں ایک مؤلف کی حیثیت سے ابھرے، چونکہ یہ بھی مملوک یعنی غلام تھے، اس لیے ان کو ان کے حسب لیاقت فوج میں ایک سپاہی یا مجاہد کا درجہ دیا گیا۔ قطلوبغا، امیر سودون بن عبداللہ الفخری الشیخونی کے غلام تھے۔

ظاہر برقوق کے زمانے میں غلاموں کی خصوصی تربیت کا اہتمام کیا گیا تھا ان کو ان کی طبیعت کے میلان کے مطابق تمام دینی اور مروجہ علوم سکھائے جاتے تھے۔ لغت عربی، عربی دانی، علم البیان، علم المعانی، صرف و نحو، علم الکلام، علم المنطق، اخلاقیات، فلکیات، جیومیٹری، طب، فقہ، حدیث، تفسیر ریاضی، طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور فنون لطیفہ تک کے علوم پڑھائے جاتے تھے اس لیے کہ ان لوگوں کو آگے چل کر اونچے اونچے عہدوں پر سرکاری اور سفارتی خدمات انجام دینا ہوتی تھیں اور پھر یہ زمانہ بھی آگیا کہ یہی ممالیک اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر آسمان علم و ہنر کی بلندیوں پر پہنچے انہی غلام علماء میں سے ایک قطلو بغا بھی تھے جن کے بیٹے قاسم بھی حنفی فقہ کے جلیل القدر عالم بن کر اسلامی تاریخ میں سنہری باب مرتب کر گئے۔

ابن قطلو بغا کو بے شمار علمی شعبوں میں مہارت سے نوازا اور ان میں خداداد صلاحیتیں بھی کافی موجود تھیں۔ ان کا نام کتابوں میں زین الدین بھی آیا ہے اور شرف الدین بھی اور یہ دونوں نام ان کے لقب ہیں ان کی کنیت ابو العدل ہے۔ غالباً اس لیے کہ آپ کی شخصیت عادلانہ رویہ کے لیے مشہور تھی۔ قاسم ان کا اصلی نام ہے اور ان کے والد کا نام قطلو بغا ہے۔

’قطلو بغا‘ ترکی زبان کا لفظ ہے جو دو لفظوں ’قطلو‘ اور ’بغا‘ سے مراد ہے میمون یا مبارک اور ’بغا‘ کا مطلب ہے سورما، عظیم..... گویا قطلو بغا کا مطلب ہے: ’عظیم مبارک ہستی‘ اس کو دوسرے لفظوں میں خوش قسمت اور کامیاب بطل (ہیرو) بھی کہا جاسکتا ہے۔ قطلو بغا خود تو عظیم سورمانہ بن سکے ان کا بیٹا ضرور میدان تصنیف و تالیف کا نیک بخت بطل و جلیل بن کر نکلا۔ قطلو بغا کے والد کا نام عبداللہ ہے ان کے نام کے ساتھ السودونی آتا ہے۔ چونکہ یہ بھی سودون کے مملوک تھے اس لیے السودانی مشہور ہوئے، الجمانی الحنفی المصری بھی انہی کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ مدرسہ الشرفیہ میں رہا کرتے تھے اور یہ اپنے زمانے میں قاسم الحنفی کے نام سے مشہور تھے۔ قاسم بن قطلو بغا کے دادا عبداللہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں مل سکیں شاید عبداللہ ہی وہ پہلے شخص تھے جو قاسم کے خاندان میں سب سے پہلے مصر کی سرزمین میں ایک مملوک (غلام) کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ السودون ہی کے غلام تھے جس کی وجہ سے ابن قطلو بغا کے نام کے ساتھ السودونی لکھا جاتا ہے اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ السودون نے قاسم کے والد قطلو بغا کو آزاد کر دیا تھا۔

سودون بن عبداللہ الفخری الشیخی، ظاہر برقوق کی حکومت کے ماتحت ایک جلیل القدر امیر و حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دیار مصر میں یہ نائب سلطنت تھے۔ یعنی یہ مصر کے بعد تمام دیگر اسلامی ممالک کے کفیل تھے اور وہاں اسلامی ممالک میں ان کا حکم اس طرح جاری و ساری رہتا تھا جس طرح کہ خود وقت کے سلطان مصر کا۔ مؤرخین نے ان کو سلطان ثانی بھی لکھا ہے۔

قاسم بن قطلو بغا بھی قطلو بغا کی غالباً اکلوتی اولاد تھے۔ سودون شیخونی کے زیر انتظام علاقوں میں قطلو بغا رئیس نو بہ تھے اس سے مراد یہ ہے کہ قطلو بغا کا کام سلطانی مملوکوں پر حکومت کرنا اور ان کو اپنے قابو میں رکھنا تھا۔ عام طریقے کے مطابق ایسے رئیس چار طرح کے ہوتے تھے ایک تو یک ہزاری (ایک ہزار کی فوج کا حاکم) ہوتا اور باقی تین طبل خانہ کے امیر کہلاتے یعنی اصطلیل شاہی اور شاہی اسلحہ خانے کے نگران ہوتے۔ قطلو بغا کو زراف کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا جس کا مطلب ہے تیز رفتار اونٹنی یا اونٹ۔ ابن قطلو بغا کی کم سنی میں ان کے والد کا انتقال کے بعد ان کی تربیت ان کی ماں نے ہی کی۔ والدہ نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے اپنے اس اکلوتے بیٹے قاسم کو قلمی نسخے لکھنے والے حضرات اور ایسے ہی دیگر عالموں کی خدمت میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا۔

والدہ یہ چاہتی تھیں کہ اگر وہ اپنے بچے کو خوب پڑھا لکھا کر اعلیٰ پائے کا عالم بننے میں مدد نہیں کر سکتیں تو کم از کم اتنا تو کر سکتی ہیں کہ اپنے بیٹے کو اس قابل بنائیں کہ وہ اپنے دین اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آشنا ہو جائے اور پھر اپنی روٹی کمانے کے قابل ہو سکے۔

قاسم ابن قطلو بغا کو اللہ پاک نے بلا کی قوت حافظہ اور یادداشت کی نعمت سے نوازا رکھا تھا۔ وہ جو تحریر پڑھتے، وہ ان کو زبانی یاد ہو جاتی اور اس کے مفہوم کا ایک ایک گوشہ پوری طرح ان کے فہم و ادراک کے سامنے روشن ہو جاتا، چنانچہ اپنی قوت حافظہ کی بدولت بہت ہی تھوڑی مدت میں انہوں نے قرآن مجید کو زبانی یاد کر لیا۔ پھر انہوں نے اپنے استاد العز بن جماع کی خدمت میں دینی کتب کے مطالعے کو باقاعدگی کے ساتھ مکمل کیا۔

العز بن جماعہ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، نحو اور لغت کے ماہر تھے اور کئی علوم کا سنگم تھے۔

تنگ دستی کی زندگی، احساس محرومی کی تلخیاں اور اسباب معیشت کی کمی کے ہاتھوں پریشان و مجبور ہو کر قاسم بن قطلوبغا نے کوئی کام سیکھنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچ سکیں۔ قدرت کو یہ منظور ہوا کہ قاسم بن قطلوبغا نے درزی کا کام سیکھ لیا اور اس پیشے میں انہوں نے بڑی مہارت حاصل کر لی۔ ابن قطلوبغا، سفید بغدادی کپڑوں میں کالے دھاگے سے سلائی کچھ ایسی مہارت سے کیا کرتے تھے کہ کالا دھاگا نظر نہیں آتا تھا چنانچہ قاسم بن قطلوبغا ایک اچھے ماہر فن درزی کے طور پر بہت مشہور ہوئے اور اس طرح ان کو اتنا کام ملنے لگا کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچ گئے۔

ابن قطلوبغا کے اندر حصول تعلیم کے شوق کو غربت و افلاس شکست نہ دے سکے۔ ان کا علمی شوق روز افزوں تھا، وہ علم کی محفلوں اور علماء کی مجلسوں میں باقاعدگی سے حاضر ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے، کتابیں لکھنے کا شوق بھی پورا کرتے اور علمی ماحول میں ہی رہنا پسند کرتے۔ چنانچہ درزی کے پیشے میں مہارت حاصل کرنے کے بعد قاسم بن قطلوبغا دوبارہ علم کے حصول کی طرف لگ گئے۔ اب کی بار انہوں نے فن تجوید قرآن کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور اس فن کو آپ نے شمس الدین محمد بن احمد الزرقاتی، الحسنی کی خدمت میں رہ کر مکمل کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ قاسم بن قطلوبغا نے علاء الدین محمد بن محمد البخاری العجمی الحنفی العلامہ کے سامنے فن تفسیر میں زانوئے تلمذ طے کیا۔ زبان عربی کی لغوی، صرفی و نحوی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھا اور یوں قاسم بن قطلوبغا اپنے زمانے کے ائمہ کی صف میں شمار ہونے لگے۔

امام ابو حنیفہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے احمد بن محمد النعمانی الفرغانی کی خدمت میں رہ کر قاسم بن قطلوبغا نے علوم حدیث کی تربیت و تعلیم پائی۔ کئی علمی شعبوں میں بھی انہوں نے خوب قابلیت حاصل کی اور ان کی مہارت سے متاثر ہو کر بڑے بڑے سرکردہ لوگ ان کے حلقہ درس میں باقاعدہ حاضر ہو کر علمی فیوض و برکات حاصل کرنے لگے۔ قاسم بن قطلوبغا نے حنفی فقہ کے امام احمد بن محمد سے حدیث کے علوم کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے زمانے کی مشہور شخصیت حافظ ابن حجر العسقلانی سے بھی فن حدیث کے اندر بنیادی رہنمائی حاصل کی اور پھر عسقلانی ہی کی تربیت کی بدولت انہوں نے اس فن میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

مشہور عالم سراج الدین عمر بن علی بن فارس المصری اور پھر علاء البخاری سے فقہ کی تعلیم پائی۔ ان دو شخصیتوں کے علاوہ قاسم بن قطلوبغا نے محمد الدین اسماعیل بن علی بن محمد الزمرجی البیضاوی، نظام الدین یحییٰ بن یوسف السیرامی، عزالدین عبدالسلام بن احمد بن عبدالمعظم القیلوی اور عبداللطیف، افتخار الدین الکرمانی الحنفی سے بھی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

فقہ الگ چیز ہے اور اصول فقہ ایک الگ فن ہے۔ فقہ میں اسلامی قانون مدون ہو چکا ہوتا ہے جبکہ اصول فقہ، فقہی مسائل کو طے کرنا اور حتمی اور صحیح ترین حل ڈھونڈنے کے کام آتا ہے۔ ایک فقیہ ان اصولوں کی مدد سے فقہی قوانین مرتب کرتا ہے، لہذا فقہی کتابوں کو پڑھنے کے بعد ان اصول کو جاننا بہت ضروری ہوتا ہے، جن کی مدد سے فقہ کی کتابیں مرتب کی جاتی ہیں۔ چنانچہ فقہی تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد فقیہ بننے کے لیے اصول فقہ میں مہارت بہت ضروری ہوتی ہے۔ قاسم بن قطلوبغا نے اس کی کو علاء البخاری، سراج الدین، شرف الدین بن موسیٰ السبکی الشافعی کی زیر تربیت پورا کیا۔ اصول دین میں قاسم بن قطلوبغا نے علاء البخاری کے بعد شمس الدین بن محمد البساطی المالکی النحوی (جو اپنے عہد کے چیف جسٹس بھی تھے) سے رہنمائی حاصل کی۔ ان کے علاوہ سعد الدین بن عبد اللہ المعروف ابن الدیری سے بھی اصول دین کی تعلیم مکمل کی۔ فرائض اور میقات کے باب میں ناصر الدین محمد بن عبد الوہاب بن محمد البار بناری کی رہنمائی ان کے بہت کام آئی۔ باربنار، دمیاط کے قریب ایک گاؤں ہے جس کی نسبت سے انہیں باربناری کہا جاتا ہے۔

حساب میں قاسم بن قطلوبغا کے استاد کا نام ہے سید علی العجمی الحنفی المتونی جو ابن المجدی کے شاگرد تھے۔ عربی زبان کے لہجے اور عربی لغت میں مہارت کے لیے انہوں نے علاء البخاری، تاج الفرغانی، المجد الزمرجی اور شرف السبکی کی شاگردی اختیار کی۔ ان چاروں اساتذہ سے

قاسم بن قطلوبغا نے اور علوم بھی سیکھے۔ صرف ونحو کی تعلیم انہوں نے السیاطی سے حاصل کی۔ علم المعانی اور علم البیان میں العللاء البخاری، نظام السیر امی اور البساطی ہی ان کے استاد تھے البتہ منطق کا درس آپ نے شرف الدین السبکی سے لیا۔

قاسم بن قطلوبغا نے علم کی تلاش میں دور دراز کے سفر بھی کیے، اس سلسلے میں انکا پہلا سفر شام کے شہروں کی طرف تھا، اس سفر میں انکے ساتھ تاج الدین النعمانی بھی تھے۔ اس طرح سفر کے دوران میں وہ ان سے اکتساب کرتے رہے۔ انہوں نے نعمانی سے الخوارزمی کی کتاب ”جامع مسانید ابی حنیفہ“ اور ابن الصلاح کی ”علوم الحدیث“ کو سبقاً پڑھا۔ نعمانی نے قاسم بن قطلوبغا کو ان کتابوں کی روایت کی خصوصی اجازت دی۔ قاسم بن قطلوبغا کی عمر اس وقت 21 سال تھی۔ اگر قاسم بن قطلوبغا کو فقہی اور حدیث کے عالم، لڑکپن سے میسر آ جاتے تو یہ اجازت انکو بہت پہلے مل چکی ہوتی۔ قاسم بن قطلوبغا نے اسکندریہ شہر میں کمال بن خیر اور قاسم التروجی سے بھی علمی فیوض و برکات حاصل کیے۔ انہوں نے ایک سے زائد بار حج کیے اور ہر بار یقیناً انہیں مکہ اور مدینہ میں بہت سارے علماء کی زیارت اور ان سے کسب علم کرنے کی سعادت ضرور حاصل رہی ہوگی۔ بیت المقدس کی زیارت کے دوران بھی انہوں نے یقیناً وہاں موجود علماء سے علمی جواہرات اکٹھے کیے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قاسم بن قطلوبغا حج سے لوٹ کر مصر کے شہر قاہرہ میں تشریف لائے تو ان کی بات بات سے علم کے سوتے پھوٹے نظر آ رہے تھے۔ حج بیت اللہ اور پھر قدس شریف کے سفر نے روحانی برکات کے علاوہ علمی برکات سے بھی قاسم کے دامن کو بھر دیا۔

قاسم بن قطلوبغا نے کبھی اچھے روزگار کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کی نہ ہی خود کو لوگوں کے سامنے اس انداز سے نمایاں کیا کہ وہ ان سے متاثر ہو کر ان کو کسی اعلیٰ عہدے کی پیشکش کریں، ورنہ ان کے زمانے میں ان کے جیسے دیگر علماء اچھے منصبوں پر فائز تھے اور ان کی مالی حالت بھی ان سے بہت اچھی رہی لیکن شاید قاسم بن قطلوبغا نے کبھی ان خطوط پر سوچا نہیں۔ وہ انتہائی قناعت پسند تھے اپنے زمانے کے مشہور فتاویٰ گو عالم، خطیب، مدرس اور متنوع و مختلف علوم کے حامل ہونے کے باوجود ان کو ان کے مقام کے حسب حال کبھی کوئی عہدہ نہیں ملا بلکہ جہاں جہاں آپ نے ایک مدرس کی حیثیت سے کام کیا وہاں بھی ان کے لیے یہ عہدہ ان کے شایان شان نہ تھا بلکہ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے ملنا چاہیے تھا۔ زیادہ تر انہوں نے بھی مدرسہ صوفیۃ الاشرفیہ کی تدریس پر قناعت کر کے زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار دیا۔

سجاولی فرماتے ہیں: ابن حسان کے بعد ابن قطلوبغا نے قیہ بیہر سیہ میں تدریس حدیث کے فرائض ضرور سنبھالے لیکن چونکہ ابن حجر کے نواسے اس عہدے میں رغبت رکھتے تھے اس لیے انہوں نے از خود اس عہدے کو خیر باد کہہ دیا۔ اس کے بعد جانبک الجدادی نے باب قرافہ میں ان کو اپنے ایک مدرسے کا شیخ بنادیا۔ لیکن وہ زیادہ عرصے اس مدرسے میں نہ رہے۔ چونکہ قاسم بن قطلوبغا کو کوئی منصب بھی زیادہ عرصے تک نبھانے کا موقع نہیں مل سکا، اس لیے ان کے معاشی وسائل اور مالی حالات کبھی نہ سدھر سکے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے جو قلمی، علمی، دینی اور تاریخی معلومات کتابوں کی شکل میں چھوڑی ہیں، وہ اتنا موقع اور قیمتی ذخیرہ ہے جس نے ان کے نام کو اب تک کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

علامہ سخاوی فرماتے ہیں: قاسم بن قطلوبغا نے نہایت مضبوطی سے کمال الدین بن الہمام الحنفی کے دامن کو تھامے رکھا۔ یہ عالم فقہ و اصول فقہ میں علامہ مشہور تھے، نحو و صرف میں بے مثال تھے، علم المعانی، علم البیان اور تصوف میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ قاسم بن قطلوبغا نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ ابن قطلوبغا نے اوپر مذکورہ علوم میں ہی مہارت حاصل کرنے پر بس نہیں کی بلکہ ادبی کتب اور شعری دیوانوں پر بھی ان کی گہری نظر رہی، ان کو بہت سارے اشعار یاد تھے۔

قاسم بن قطلوبغا کو علم کی بارگاہ میں خاصی باریابی حاصل رہی، چنانچہ علماء نے ان کے علمی مقام کو تسلیم کیا اور ان کی پارسائی، اچھی عادات اور قوت حافظہ کی تعریف کی ہے۔ قاسم بن قطلوبغا اپنی قوت حافظہ، روشن فکر اور تیز ذہانت کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے، علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ علم کے حوالے سے لوگ ان کا ذکر کرتے، فتویٰ دینے اور درس دینے میں ان کو مشائخ و مفتی کا سامنا حاصل تھا۔

ابن قطلوبغا..... دیگر علماء کی نظر میں

- ☆ ابن الدیری نے قاسم بن قطلوبغا کو شیخ، عالم اور روشن خیال اور عقل مند و ذہین لکھا ہے۔
- ☆ امام ابن حجر عسقلانی نے قاسم بن قطلوبغا کو امام، علامہ، محدث، فقیہ اور حافظ بتایا ہے۔ شیخ قاسم نے جب ابن حجر نے ان کو شیخ فاضل کا لقب دیا اور بے مثال و یگانہ محدث کامل کا خطاب دیا۔ پھر یوں کہا: تحریر و قرأت میں انہوں نے میرے سامنے اس کتاب کو مکمل کیا، انہوں نے کئی علمی فوائد تحریر کیے اور کئی مواقع پر چونکا دینے والی باتیں لکھی ہیں کہ داد کے قابل ہیں۔
- ☆ الزین رضوان اپنے ایک علمی مجموعہ میں یوں لکھتے ہیں: قاسم بن قطلوبغا اپنے فن میں ماہر حنفی فقیہ ہیں، انہوں نے اپنی تحریروں میں علمی فوائد کو سمو کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہوں نے بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا۔
- ☆ شیخ قاسم بن قطلوبغا کے اپنے شاگرد البرہان الیقاعی لکھتے ہیں: قاسم بن قطلوبغا بے شمار علوم کی ہر شاخ میں گہری مہارت رکھتے تھے۔ فقہ، حدیث اور اصول فقہ وغیرہ میں انہوں نے کمال حاصل کیا۔
- ☆ علامہ سخاوی فرماتے ہیں: قاسم بن قطلوبغا امام و علامہ ہیں، علم کے ہر فن میں بھرپور حصہ لیتے ہیں، ادب اور اس سے متعلق بے شمار باتوں کو خوب یاد رکھتے ہیں۔ علمی باتوں کو کتابوں کے گوشے گوشے سے نکال کر اپنے حافظے کی تختی پر نقش کر لیتے ہیں، اس فن میں یہ پیش پیش ہیں، بہت بولتے ہیں اور اچھا بولتے ہیں، مناظرے پر مکمل قدرت رکھتے ہیں اور مد مقابل کو دلائل کے ذریعے رام کر لینے میں ماہر ہیں لیکن ان کا حافظہ ان کی تحقیق سے بھی اچھا ہے۔ ان کو نقاد کا مقام حاصل ہے۔
- ☆ ابراہیم صالح لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ ان کی باتیں ان کے قلم سے زیادہ اچھی ہیں، تقریر کرنے کے جملہ آداب کو بجالاتے ہیں، بیزاری پیدا نہیں ہونے دیتے، خشک کلام بالکل نہیں کرتے۔

قاسم بن قطلوبغا کی تحریروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے قلم سے پہلی تصنیف اس وقت منظر عام پر آئی جبکہ ان کی عمر 18 سال تھی اور پھر قلم آپ کے ہاتھ سے اس وقت چھوٹا جب ملک الموت نے آپ کی روح قبض کی۔ اس طرح قاسم بن قطلوبغا نے اپنی پوری ساٹھ سالہ زندگی میں مسلسل خدمتِ لوح و قلم ہی انجام دی۔ آپ بلا شک ایک اچھے مؤلف اور بہترین مصنف ہیں، بہت سی کتابوں کے شارح بھی ہیں، کئی کتابوں پر آپ نے تشریحی و اصلاحی تحریریں بھی فراہم کیں۔

قاسم بن قطلوبغا نے کم و بیش 103 کتابیں تحریر کیں، جو مختلف فنون علم پر مشتمل ہیں، ان کتابوں کے موضوعات ہیں: اصول فقہ، فقہی مسائل، تخریج احادیث، عقائد، علم الکلام، مشائخ کے حالات زندگی، منطق، علم البیان اور فن حدیث قاسم بن قطلوبغا نے جن علماء کی کتابوں کی شرحیں مرتب کیں ان کے اسماء یہ ہیں۔ ابن حجر عسقلانی، قاضی عیاض، ابن سینا، تفتازانی سعد الدین، ابن الہمام اور علامہ بغوی۔

قاسم بن قطلوبغا نے جن کتابوں کی احادیث کی نشاندہی کر کے ان کو حوالوں سمیت بیان کیا اور ان کتابوں کی اہمیت کو بڑھایا، ان میں سے چند کے نام ہیں: اتحاف الاحیاء، بدایۃ الہدایہ، احادیث الہز ودی، شرح الاقطع علی القدوری، جواہر القرآن، عوارف المعارف (شہاب الدین سہروردی)

قاسم بن قطلوبغا نے ان کتب کی شرح بھی مرتب کی: فرائض الکافی، مختصر القدوری، مختصر المنار، ورد الجارفی المذہب الاربعہ، النقایۃ (صدر الشریعہ) مشکاة المصابیح، منار النظر (ابن سینا)

الغرض، تفسیر کے ماسوا قاسم بن قطلوبغا نے کسی بھی علمی شعبے کو نظر انداز نہیں کیا، ان کی کتابوں کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاسم بن قطلوبغا کو اللہ پاک نے بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کے اندر علم کو سیکھنے، سمجھنے اور اس کو آسان اور سہل طریقے کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کی لگن تھی اور یہ سب کام انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ قابل تعریف یہ ہے کہ ارد گرد کا ماحول اور حکومتوں میں عدم استحکام ان کی علمی، فقہی، تاریخی اور تحقیقی کاوشوں میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا۔

قاسم بن قطلوبغا 77 سال کے ہو چکے تھے اور اس میں سے 60 سال انہوں نے خدمتِ علم کی۔ قلمی جہاد میں وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے، تکان اور بیزاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فقر و افلاس، تنگ دستی اور کثرتِ عیال کے باوجود وہ دین کی خدمت برابر انجام دیتے رہے۔ اس قدر محنت کے نتیجے میں وہ آخر کار بیمار رہنے لگے۔ ایک مدت تک بیمار رہنے کے نتیجے میں دوسرے امراض بھی لاحق ہو گئے۔ قاسم بن قطلوبغا کو قاہرہ کے اندر کئی بار اپنا گھر بھی بدلنا پڑا لیکن آخری بار یہ مرتے دم تک الدیلم نامی محلے میں آباد رہے۔ اسی محلے میں جمعرات کی شب 4 ربیع الآخر 879ھ (18 اگست 1874ء) کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اگلے دن صبح جامع المدارس کے سامنے بہت بڑے اجتماع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ عقبہ کی طرف منسوب باب المشہد میں ابن قطلوبغا کو ان کے والدین اور بچوں کی قبروں کے قریب دفن دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

اجالے ماضی کے

ڈاکٹر ابوطالب انصاری (انڈیا) کی علمی کاوشوں کا نتیجہ، اسلامی تاریخ کے عظیم فرزندوں کا احوال، جس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے عظیم مسلم شخصیات کے مختصر تعارف اور ذکر شامل ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں، مفسرین، محدثین، فقہاء، ائمہ اور علماء کا ذکر ہے، دوسرے باب میں شعراء، ادباء اور مصلحین، تیسرے باب میں مورخین، جغرافیہ دان اور سیاح، چوتھے باب میں اطباء و سائنسدان، پانچویں باب میں فلاسفہ اور متکلمین، چھٹے باب میں سلاطین و فاتحین اور آخری باب میں مجاہدین آزادی اور سیاستدان شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی، کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ

آپؒ نے عزیمت کی راہ کو اختیار فرمایا

روٹی پکانے کے لیے خمیر کی ضرورت تھی!

صالح کے گھر خمیر سے لیا گیا اور روٹی تیار کر لی گئی۔ جب روٹی پک کر سامنے آئی تو صالح کے والد محترم نے پوچھا: ”یہ روٹی کیسی ہے؟“

بتایا گیا کہ خمیر صالح کے گھر سے آیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا: ”اس نے تو ایک سال تک قاضی کے منصب کو اختیار کیا ہے اب اس کی روٹی ہمارے حلق سے نہ اتر سکے گی۔“

پوچھا گیا: ”اب ان روٹیوں کا کیا کریں!“

فرمایا: ”جب کوئی سائل آئے اور سوال کرے تو تفصیل سے روٹیوں کے بارے میں اسے بتا دیا جائے کہ خمیر صالح کے گھر کا ہے آٹا احمد کے گھر کا ہے اور احمد نے ان روٹیوں کو کھانے سے انکار کر دیا ہے اگر وہ ان روٹیوں کو لینا پسند کرے تو بہتر ہے، اسے دے دینا۔“

چالیس روز تک دروازے پر کوئی سائل نہ آیا، روٹیاں خراب ہو گئیں حتیٰ کہ ان روٹیوں کو دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا۔

یہ امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ جنہوں نے اپنے بیٹے کے گھر کے خمیر سے تیار شدہ روٹی تک کھانا گوارا نہ کیا، حالانکہ آپؒ کے صاحبزادے صالح نہایت متقی شخص تھے، لیکن چونکہ اصفہان میں ایک سال تک قاضی رہے تھے اور امام صاحب کے نزدیک اس وقت کی اسلامی حکومت اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے رہی تھی اس لیے امام صاحب سرکاری عہدوں پر فائز افراد سے کچھ لینا پسند نہ کرتے تھے۔

آپ کا نام احمد بن محمد بن حنبلؒ اور کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ آپ عربی النسل ہیں اور آپؒ کا تعلق قبیلہ شیبان سے ہے جو قبیلہ قریش کی شاخ ہے۔ ربیع الاول 164ھ / نومبر 780ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ربیع الثانی 164ھ / دسمبر 780ء میں آپؒ کے والد مرو سے بغداد منتقل ہوئے اور اس کے چند ماہ بعد آپؒ کی پیدائش عمل میں آئی۔ آپؒ کی والدہ محترمہ صفیہ بنت عبد الملک مرو سے بغداد آئی تھیں۔ ابھی آپؒ صرف تین سال کے تھے کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ آپؒ کے والد سرخس کے جرنیل تھے۔ والد کے انتقال کے بعد آپؒ کی تربیت کی تمام ذمہ داری والدہ محترمہ پر آ پڑی۔

اس دور میں بغداد علم کا مرکز تھا۔ آپؒ خود فرماتے ہیں: ”میں بچہ ہی تھا کہ حفظ قرآن سے فارغ ہو گیا۔ 14 سال کی عمر کو پہنچا تو تحریر و کتابت کی مشق و تحصیل میں منہمک ہو گیا۔“

آپؒ کا دور طالب علم بڑی تنگ دستی میں گزرا حتیٰ کہ حال یہ تھا کہ سوتے وقت سر کے نیچے تکیہ کی جگہ اینٹ رکھ لیا کرتے تھے۔ جب آپؒ نے 179ھ میں اپنی عمر کے 16 ویں سال میں قدم رکھا تو علم حدیث کی تحصیل کا آغاز کیا۔ آپؒ فرماتے ہیں: ”حدیث کا پہلا سبق میں نے امام ابو یوسفؒ سے حاصل کیا۔“

امام ابو یوسفؒ سے تین سال تک فقہ اور حدیث کا علم حاصل کرتے رہے، اس دوران امام محمدؒ سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد چار سال تک بغداد میں امام یثیم بن بشیر بن ابو حازمؒ سے علم حاصل کرتے رہے۔ آپؒ نے حصول علم کے لیے طویل سفر کیے۔ راستے میں زاوراہ ختم ہو گیا تو محنت مزدوری کی۔ آپ یمن اور شام بھی گئے۔

186ھ میں بصرہ اور 187ھ میں جاز تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت امام شافعیؒ سے ملاقات ہوئی۔ دوسری بار بغداد میں ملے اور امام شافعیؒ سے علم حاصل کیا۔ پھر امام شافعیؒ جب تک بغداد میں رہے، آپؒ ان سے جدا نہ ہوئے۔ امام شافعیؒ کو بھی آپؒ سے بہت محبت تھی اور وہ آپؒ کے تقویٰ کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے تحصیل حدیث کے لیے جو سفر کیے ان کے نتیجے میں آپؒ کو دس لاکھ سے زائد احادیث حفظ ہو گئیں۔ آپؒ کے اساتذہ کی تعداد سو سے زائد ہے۔

چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو آپؒ نے بغداد کی جامع مسجد میں باقاعدہ حلقہ درس قائم کیا۔ آپؒ کی مجلس درس عام طور پر نماز عصر کے بعد منعقد ہوتی تھی۔ نہایت باوقار مجلس ہوتی تھی۔ آپؒ کے درس میں سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار تک ہوتی تھی جن میں پانچ سو تو صرف لکھنے والے ہوتے تھے۔ آپؒ کے شاگردوں میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، ابوزر عہ جیسے عظیم المرتبت محدثین شامل ہیں۔

امام صاحب کا عظیم علمی کارنامہ مسند احمدؒ کی تالیف ہے جو تین ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ آپؒ نے دیگر کئی کتابیں، مثلاً کتاب السنہ تصنیف فرمائیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ”امام احمدؒ آٹھ علوم میں بے نظیر عالم فاضل سمجھے جاتے تھے۔ جن میں قرآن پاک، حدیث، فقہ، لغت شامل ہیں۔“ آپؒ کے بیان کردہ فقہی مسائل پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد عمل پیرا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید ان شدت پسند علماء کے خلاف تھے جو معتزلہ کہلاتے ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید عقلاً معلوم ہو سکتی ہے اس لیے وحی کے بغیر ہی اہل حکمت و عقل، توحید پر ایمان لا سکتے ہیں۔ ہارون کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مامون رجب 198ھ / فروری 814ء میں مسند خلافت پر بیٹھے۔ مامون معتزلہ سے متاثر تھے چنانچہ معتزلہ ان پر چھا گئے۔ انہوں نے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ یہاں سے امام صاحب کے دور ابتلاء کا آغاز ہوتا ہے جو کم و بیش 14 سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔

امام صاحب نے محسوس کیا کہ کتاب و سنت کے خلاف ایک عقیدہ کو عام کیا جا رہا ہے اگر مسلمانوں کو درست عقائد کی تعلیم نہ دی گئی تو امت مسلمہ کے بڑے حصہ کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اس طرح صحیح کو غلط سے الگ کر کے پیش نہ کرنے کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوگی۔ خلق قرآن کا مسئلہ اٹھانے والوں کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کریم اللہ کی دیگر مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے جبکہ امام صاحب نے واضح کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اس کی ایک صفت ہے۔ چنانچہ آپؒ خلق قرآن کے غلط عقیدے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؒ کی یہ جسارت وقت کے حکمرانوں اور ان کے گرد جمع مصاصین کو سخت ناگوار گزری اس لیے آپؒ پر مصائب و مظالم کا دروازہ کھل گیا۔

مامون کو خبر ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ امام احمدؒ اور امام محمد بن نوحؒ کو بیڑیاں پہنا کر عدالت میں حاضر کیا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ راستہ میں امام محمد بن نوحؒ ”عانہ“ کے مقام پر رب سے جا ملے۔ امام احمدؒ نے ان کی نماز جنازہ ادا کی اور سفر جاری رکھا۔ آپؒ راستہ میں دعا فرما رہے تھے کہ ”اے اللہ میری، مامون سے ملاقات نہ ہو۔“ چنانچہ ابھی آپؒ کا سفر جاری تھا کہ طرطوس کے مقام پر لوگ چیختے چلاتے آپؒ کے پاس آئے کہ مامون فوت ہو گئے ہیں۔

مامون کا انتقال رجب 218ھ / جولائی 833ء میں ہوا۔ اس کے بعد ابوالخلق، محمد بن ہارون المعتصم تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے ابن ابی داؤد کو منصب قضاء سونپ دیا، جو امام صاحب کے بدترین مخالفین میں سے ایک تھا اس کے حکم سے امام صاحب کو واپس بغداد لے جا کر قید کر دیا

گیا اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ جیل ہی میں آپؑ نے مجلس درس قائم کی۔ پاؤں میں بیڑیوں کے باوجود نماز کی امامت فرماتے تھے۔ چند دنوں بعد بغداد کا گورنر اسحاق بن ابراہیم جیل میں امام صاحب کے پاس پہنچا اور آپؑ سے دوستانہ انداز میں باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں اس نے پرانے تعلقات کا واسطہ دیا اور کہنے لگا۔

”کس قدر اچھا ہو کہ آپؑ امیر المومنین معتمد باللہ کی مخالفت ترک کر دیں۔“

امام صاحب نے انکار کر دیا۔ اس پر اسحاق نے پینتر ابدل کر دھمکی دی کہ آپؑ کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس پر بھی امام صاحب مرعوب نہ ہوئے تو اسحاق نے جھلا کر حکم دیا کہ امام صاحب کو مزید بوجھل بیڑیاں پہنا دی جائیں۔ اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو حکم دیا کہ جیل سے نکل کر پیدل چلیں۔ امام صاحب نے چلنے کی پوری کوشش کی لیکن ظالموں نے بیڑیاں اس قدر زنی ڈال دی تھیں کہ پاؤں اٹھانا ممکن نہ تھا۔ صبح امام صاحب کو خلیفہ معتمد کی عدالت میں پابجولاں پیش کیا گیا، وہاں امام صاحب کا بدترین مخالف ابن ابی داؤد اور اس کے دیگر ساتھی بھی موجود تھے۔ آپؑ نے طاقت کے اس مظاہرے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ابن ابی داؤد اور دیگر مصاحبوں نے خلیفہ کو بھڑکایا کہ یہ شخص ہم کو کافر بنا رہا ہے اور علماء سے کہا کہ خلق قرآن کے مسئلے پر مناظرہ کریں۔

مجلس مناظرہ کے لیے ملک کے کونے کونے سے علماء بلائے گئے۔ مناظرہ تین دن تک جاری رہا۔ امام صاحب نے نہایت مؤثر دلائل دے کر مخالفین کی زبان بند کر دی اور ان کے پاس ادھر ادھر کی ہانکنے کے سوائے کوئی راستہ نہ رہا۔ خلیفہ اس صورت حال سے بڑے پریشان ہوئے۔ ایک دن انہوں نے امام صاحب سے کہا:

”اے احمد! آپؑ کے مسئلے نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے، مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ اگر مجھ سے پہلے حکمران نے آپؑ کو گرفتار نہ کیا ہوتا تو میں کبھی اس قسم کی جرأت نہ کرتا، میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپؑ کا مسئلہ کسی طور حل ہو جاتا ہے تو میں کبھی کسی کو اس قسم کے مسائل کی وجہ سے گرفتار نہیں کروں گا۔“

مناظرہ کے تیسرے دن خلیفہ کو اس کے مصاحبین نے پٹی پڑھائی، جس پر خلیفہ نے کہا: ”اے احمد! مجھے خبر ملی ہے کہ آپؑ منصب جلیلہ کے خواہش مند ہیں، اگر آپؑ میری بات مان جائیں تو نہ صرف آپؑ کا شاہانہ استقبال ہوگا، بلکہ سرکاری ملازمین بھی آپؑ کے دائیں بائیں ہوں گے، آپؑ کو اچھے منصب پر فائز کیا جائے گا۔ آپؑ کی عظمت شان کے قصائد کہے جائیں گے اور آپؑ کی تشہیر کے لیے سرکاری ذرائع اختیار کیے جائیں گے۔“ امام صاحب نے جواب میں فرمایا: ”اے امیر المومنین! ہمارے سامنے قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ صحیح

احادیث کا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر آپؑ اپنا موقف ان کی روشنی میں واضح کر دیں تو مجھے آپؑ کا موقف اختیار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوگی۔“ اس واضح اعلان پر امام صاحب کے مخالفین آگ بگولہ ہو گئے، یکے بعد دیگرے سب نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ امام صاحب ان کے اعتراضات کے جوابات دیتے رہے جب مخالفین دلائل دینے سے عاجز آ گئے تو ابن ابی داؤد نے دھمکی دی کہ امیر المومنین نے آج قسم کھا کر کہا ہے کہ آپؑ کو شدید اذیتیں دی جائیں اور کوڑے برسائے جائیں۔ جب آپؑ کو کوڑے مارنے کی تیاری شروع ہوئی تو آپؑ نے نہایت جرأت کے ساتھ خلیفہ سے کہا:

”یاد رکھیے! جس طرح آج میں آپؑ کی عدالت میں کھڑا ہوں، اسی طرح ایک دن آپؑ کو بھی اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اے امیر المومنین اللہ کے جلال سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔“

خلیفہ معتمد پر ان کلمات کو سن کر سکتہ طاری ہو گیا۔ ابن ابی داؤد نے فوراً کہا: ”امیر المومنین آپؑ ایک کافر اور گمراہ انسان کی باتوں سے

متاثر ہو رہے ہیں۔؟“ امام صاحب نے کہا ”امیر المؤمنین! آپ میرے قتل کے معاملے میں اللہ سے ڈریں۔ قیامت کے روز کیا جواب دیں گے۔؟“

ایک قیدی ابو الہیثم جو امام صاحب کو کوڑے لگنے کا منظر دیکھ رہا تھا، کہتا ہے: ”میں نے کبھی اتنی قوت سے کسی کو کوڑے برستے نہیں دیکھے جب امام صاحب کو کوڑے سے زخم لگتا تو جلد ایک آلے سے زخم کی گہرائی ناپتے کہ کہیں اندر سوراخ تو نہیں ایک بار کوڑا ان کے کان پر لگا جس سے کان پھٹ گیا۔

کوڑے برس رہے تھے اور اللہ کے اس اولوالعزم اور صابر بندے کی زبان پر قرآن کی یہ آیت جاری تھی۔ (ترجمہ!) ”ہم پر وہی مصیبت آسکتی ہے جو اللہ نے پہلے ہی لکھ دی ہے۔“

اتنے کوڑے برسائے گئے کہ امام صاحب بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا، حتیٰ کہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ خاصی دیر بعد ہوش آیا تو خلیفہ نے کہا: ”اب بھی وقت ہے میری بات تسلیم کر لو۔“ امام صاحب نے انکار کر دیا تو تیسری بار کوڑے لگائے گئے۔ یہاں تک کہ امام صاحب پھر بے ہوش ہو گئے۔ اس پر خلیفہ کچھ خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے کوڑوں کا سلسلہ بند کروایا اور ابن ابی داؤد کے اصرار کے باوجود امام صاحب کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

ربیع الاول 220ھ میں واثق باللہ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ امام صاحب نہایت پر عزم ہیں، انہیں زد و کوب کرنا یا ایذا میں دینا مناسب نہیں، البتہ انہوں نے اپنے غم و غصہ کو فرو کرنے کے لیے حکم دیا کہ امام صاحب کے پیروکاروں پر ظلم توڑے جائیں، چنانچہ محدثین، فقہاء، معلمین، حتیٰ کہ موزنوں تک کو پکڑ کر ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ اکثر لوگ روپوش ہو گئے۔ بہت سے قید کر لیے گئے۔ امام صاحب کو ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ نماز کے لیے بھی نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ واثق کی وفات یعنی 232ھ تک آپ کا یہ دور ابتلاء جاری رہا۔

ذی الحجہ 232ھ / جولائی 848ء میں متوکل خلیفہ بنے۔ وہ عقائد کے اعتبار سے مامون، معتصم اور واثق سے مختلف تھے اور قرآن پاک کو مخلوق پاتسلیم کرنے والوں کو شدید لعن طعن کرتے تھے۔ ان کے دور میں صورت حال بدل گئی، لیکن یہ امام صاحب کے لیے آزمائشوں کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

آپ کے قدموں میں مال و دولت ڈھیر کیا جانے لگا۔ اعلیٰ عہدوں کی پیشکشیں ہونے لگیں۔ رہائش کے لیے آرام دہ اور خوشنما محل پیش کیے جانے لگے، لیکن مرد درویش صفت نے اس سامانِ تعیش کی جانب ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی۔

امام صاحب کے صاحبزادے عبداللہ بیان کرتے ہیں: ”متوکل نے والد محترم کو پیغام بھیجا کہ میں آپ کے دیدار کا متمنی ہوں اور آپ کی دعاؤں کا تبرک چاہتا ہوں، آپ قدم رنجہ فرمائیں۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچے۔ خلیفہ نے ہماری رہائش کے لیے ایک بہترین محل کا انتخاب کیا۔ امام صاحب محل میں داخل ہوئے تو متوکل نے اپنی والدہ سے کہا:..... ”امام صاحب کے محل میں داخل ہوتے ہی محل بقعہ نور بن گیا۔“

امام احمدؒ نے جس فقہ یعنی فقہ حنبلی کی بنیاد ڈالی وہ آج مسلمانوں کے چار اہم فقہی مسالک میں سے ایک ہے۔ فقہ حنبلی میں زیادہ اہمیت صحابہؓ کرام کی رائے کو دی گئی ہے۔ امام صاحب صحابہؓ کرام کی پیروی میں بہت سخت تھے۔ آپ کے حکیمانہ فیصلوں اور آراء کو بعد میں آپ کے شاگرد ابو بکر المروزی کے ایک شاگرد ابو بکر الخلالؒ محدث نے کتاب الجامع کی شکل میں مرتب کر دیا۔

امام صاحب نے اپنے اصول و عقائد سے متعلق دو بنیادی رسالے تصنیف کیے۔ ان میں سے ایک رسالہ، رسالہ الرد علی الجیمہ والزنادۃ میں آپ نے ایک فرقہ کے پیروکار جہم بن صفوان کے عقائد کی وضاحت اور تردید کی۔ یہ عقائد پورے خراسان میں پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے

رسالے ”کتاب السنہ“ میں آپ نے بعض دینی مسائل پر نظر ڈالی ہے اور اسلام کے تمام بڑے بڑے اصولوں کے مطابق اپنا موقف صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک ”کتاب الصلوٰۃ“ تحریر کی جس میں نماز، جماعت اور صحت کے ساتھ ادا کرنے کی ضرورت تحریر کی گئی ہے۔ ”مسند من مسائل احمد بن حنبل“ امام صاحب کے سیاسی اور مذہبی خیالات کے مطالعہ کے لیے اہم ہے۔ آپ نے ایک ”کتاب الورع“ بھی تصنیف فرمائی ہے جس میں ایسے مسائل کے بارے میں آپ کی آراء درج ہیں جن میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

فقہائے حنابلہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر دور میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا تا کہ فقہی مسائل کی ترتیب و تدوین کا عمل جامد ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قرآن حدیث کی روشنی میں فقہی مسائل ترتیب دیے جاتے رہیں۔

علم حدیث کے دائرے میں امام صاحب مستقل مجتہد کہے جاسکتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔ ”امام احمد بن حنبل“ کو اپنے شیوخ سے احادیث و اخبار کا جو انبار ملا تھا اس میں سے آپ نے اپنا مسلک خود قائم کیا۔“

انتقال کے وقت جب صاحبزادے نے طبیعت پوچھی تو فرمایا کہ جواب کا وقت نہیں ہے۔ بس دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ فرمادے۔ کیونکہ ابلیس لعین مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تیرا ایمان سلامت لے جانا میرے لیے باعث ملال ہے۔

77 سال کی عمر میں بیمار پڑ گئے۔ 9 دن تک بیمار رہے۔ عیادت کرنے والوں کی بھیڑ کا یہ حال تھا کہ بازار میں خرید و فروخت دشوار ہو گئی۔ ربیع الاول کے مبارک مہینے ہی میں آپ کی پیدائش ہوئی اور جمعہ 12 ربیع الاول 241ھ / 31 جولائی 855ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کو بغداد کے مقابر الشہداء میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے میں لاکھوں سوگواروں نے شرکت کی۔



گلدستہ اولیاء

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو اسلم لودھی کی عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت شاہ قبول اولیاءؒ، حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ، حضرت سلطان باھوؒ، حضرت حافظ محمد عبدالکریمؒ (موہری شریف)، حضرت خواجہ صوفی نواب الدین (موہری شریف)، حضرت الحاج محمد معصومؒ (موہری شریف)، حضرت شاہ کمال بخاریؒ، حضرت مخدوم حسام الدین ملتانیؒ، حضرت حافظ محمد اسحاق قادری نقشبندیؒ، حضرت سید سلطان احمد بخاریؒ، عاشق رسول حضرت صوفی بندے حسن خان، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس قادریؒ کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلدستہ اولیاء کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے تصدیق و تالیف سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک

عظیم محدث جنہوں نے حفاظت حدیث کے سلسلہ میں بڑا کام کیا

بادشاہ وقت اپنے محل میں نہایت شان و شوکت سے براجمان تھا۔ اچانک ایک شور اٹھا، بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔
”یہ کیسا شور ہے؟“

کچھ خدام شور کی حقیقت جاننے کے لیے لپکے۔ محل کے باہر لوگ ایک ہی سمت میں بھاگ رہے تھے۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، ہر شخص ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں تھا، زبردست دھکم پیل ہو رہی تھی بہت سے لوگوں کی جوتیاں تک ٹوٹ گئی تھیں لیکن ہجوم کے جوش و خروش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

بادشاہ ابھی تک حیران بیٹھا تھا۔

اس نے اپنے جن ملازمین کو شور کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا وہ ابھی تک نہ لوٹے تھے۔ بادشاہ کے اطراف جو چند افراد رہ گئے تھے۔ ایک ایک کر کے وہ بھی چلے گئے اور بہت بڑی سلطنت کا بادشاہ اس وقت اتنے بڑے محل میں یکہ وتہا رہ گیا تھا۔
بادشاہ کے محل میں ایک کنیز کھڑی لوگوں کو دوڑتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سادگی سے پوچھا۔ ”یہ بھگدڑ کیسی ہے؟ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“
”کسی نے اسے بتایا۔“ خراسان کے بہت بڑے عالم حضرت عبداللہ بن مبارک تشریف لائے ہیں لوگ ان کے دیدار کے لیے دوڑے جا رہے ہیں۔“

کنیز بے اختیار کہہ اٹھی اور اس کا یہ بے ساختہ جملہ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا۔

”اصل بادشاہت تو حضرت عبداللہ بن مبارک کی ہے نہ کہ ہارون الرشید کی، کہ بغیر پولیس اور اہلکاروں کے، لوگ بادشاہ کے لیے جمع ہی نہیں ہوتے۔“

کنیز نے بالکل سچ کہا تھا۔

ہارون الرشید کی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ ایک بار انہوں نے ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر نہایت اطمینان سے کہا تھا۔ ”تو جہاں تیراجی چاہے جا کر برس جاتا تیرا خراج بہر صورت میرے پاس آئے گا۔“

ہارون الرشید کی سلطنت ہند اور تاتار سے لے کر بحر اوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اندلس کے سوا کل اسلامی دنیا، ہارون کی تابع فرمان تھی اور یورپ کے پاس صرف روم اور یونان کی حکومتیں تھیں اور یہ دونوں حکومتیں بھی سلطنت عباسیہ کی باج گزار تھیں۔ سلطنت عباسیہ میں موجودہ سرزمین حجاز، شام، اردن، یمن، مصر، ایران، افغانستان، ترکی رومی، ترکستان آرمینیا، سندھ اور افریقہ کا بڑا حصہ شامل تھا۔

اتنی بڑی سلطنت کے باوجود لوگوں کے دلوں پر حکمرانی حضرت عبداللہ بن مبارک کی تھی۔

دلوں کا یہ بادشاہ، مملکت کے بادشاہ یعنی ہارون الرشید سے ملنے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ ہارون الرشید نے حضرت عبداللہ بن مبارک کو کئی بار ملاقات کی دعوت دی لیکن وہ گریز کرتے رہے۔ ابراہیم موصلی جن کا تعلق دربار شاہی سے تھا اور وہ حضرت عبداللہ بن مبارک کو بہت عزیز

رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ”ہارون الرشید نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے ملنے کی خواہش متعدد بار ظاہر کی لیکن میں ٹال دیتا تھا میں جانتا تھا کہ ابن مبارک کے سامنے دین و شریعت کے خلاف کوئی بات ہوگی تو وہ ہارون کو سختی سے روکیں گے بلکہ تنبیہ کریں گے اور یہ بات ہارون کی ناگواری کا سبب بنے گی اور پھر نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔“

حضرت عبداللہ بن مبارک جنہوں نے اپنے بے پناہ علم اور بلندی کردار کی بدولت ایک جہاں کو منور کیا ایک نہایت دین دار اور متقی باپ کے بیٹے تھے۔ آپ کے والد مبارک غلام تھے۔ ایک دن ان کے آقا نے حکم دیا کہ باغ سے میٹھا انار توڑ لاؤ۔ مبارک گئے اور ایک انار توڑ کر لے آئے۔ آقا نے انار چھیل کر چکھا تو کھٹا نکلا۔ آقا نے کہا میٹھا انار لے آؤ۔ مبارک دوبارہ گئے اور ایک انار توڑ لائے۔ آقا نے اس انار کو چکھا تو یہ بھی کھٹا نکلا۔ آقا نے ناراض ہو کر پوچھا۔

”تمہیں کھٹے اور میٹھے انار کی تمیز نہیں۔؟“

مبارک نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آپ نے مجھے انار توڑنے کی اجازت دی ہے کھانے کی تو نہیں۔“

آقا نے جو یہ جواب سنا تو دل میں بہت متاثر ہوا۔ آقا کی ایک لڑکی تھی جس کے لیے بہت سے اچھے اچھے پیام آرہے تھے۔ آقا نے ایک دن مبارک کو بلایا اور ان سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا مبارک نے کہا۔

”عہد جاہلیت میں لوگ خاندانی حسب نسب اور عزت و شہرت کو تلاش کیا کرتے تھے۔ یہودیوں کو مال کی جستجو رہتی تھی اور عیسائی حسن و جمال کو ترجیح دیتے تھے لیکن امت محمدیہ کے نزدیک معیار دین و تقویٰ ہے۔ اب آپ جس کو چاہیں ترجیح دیں۔“

آقا یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا بعد میں اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”میری لڑکی کے لیے مبارک سے زیادہ موزوں شوہر اور کوئی نہیں مل سکتا۔“ بیوی یہ سن کر حیران رہ گئی۔ ایک غلام سے شادی؟ اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ لڑکی کے لیے اچھی رشتوں کی کوئی کمی نہ ہو۔ اس نے اس رشتہ کی مخالفت کی لیکن آقا فیصلہ کر چکا تھا۔

مبارک کی شادی اپنے آقا کی بیٹی سے ہو گئی۔ اسی لڑکی سے 118ھ/736ء میں حضرت عبداللہ بن مبارک پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابو عبد الرحمن ہے اور اصلی وطن مرو ہے۔ چنانچہ مروزی کہلاتے ہیں۔

مرو میں ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حضرت ابن مبارک نے شام و حجاز، یمن و مصر، کوفہ اور بصرہ کے مختلف شہروں اور قصبوں کا سفر کیا اور بڑے بڑے اہل علم، شیوخ اور علماء سے فیض حاصل کیا۔

حضرت امام احمدؒ کہتے ہیں ”طلب علم کے لیے حضرت عبداللہ بن مبارک سے زیادہ سفر کرنے والا ان کے زمانے میں کوئی نہ تھا۔“

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اب سے ساڑھے بارہ سو سال قبل ذرائع آمد و رفت نہایت محدود تھے اور سفر کرنا موجودہ زمانے کے مقابلے میں بہت مشکل تھا۔

ان کے ممتاز اساتذہ میں امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان بن ثوری، سفیان بن عیینہ اور امام اوزرعیؒ جیسے جید علماء کرام اور فقہاء شامل ہیں۔

حدیث کا ذکر چھڑ جاتا تو ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ایک دن نماز عشاء کے بعد علی بن حسنؒ کے ساتھ کسی حدیث کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ ساری رات مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے گزر گئی اور انہیں احساس تک نہ ہوسکا۔ علم حدیث میں آپ کا مرتبہ امام حدیث کا ہے۔ آپ کی بیان کردہ روایات کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے۔

محدثین کو کسی حدیث میں اختلاف ہوتا تو حضرت عبداللہ بن مبارک کے پاس چلے آتے۔ حضرت فضالہؒ کہتے ہیں جب کبھی محدثین میں کسی روایت پر اختلاف ہوتا تو وہ کہتے ”اچھا اس اختلاف کو ”طیب حدیث“ کے پاس لے چلو“ طیب حدیث“ سے ان کی مراد حضرت عبداللہؒ

بن مبارک تھے۔

خلافت راشدہ تک حدیث کی روایت پر کچھ حدود و قیود عائد تھیں۔ خصوصاً حضرت عمرؓ اس معاملے میں بڑے سخت تھے لیکن بنو امیہ کے زمانے میں اس فتنہ نے بہت سراٹھایا۔ اس پر ائمہؒ حدیث نے بعض اصول مرتب کیے جن کی مدد سے حدیث کو پرکھا جاسکے۔ جو شخص اس زمانے میں ”قال النبی“ کے الفاظ زبان سے نکالتا، اس کی روایت کی صحت ہی نہیں اس شخص کے ذاتی حالات کے بارے میں تفتیش شروع کر دی جاتی تھی۔ جب تک اس کے ضبط احتیاط، قوت حافظہ اور اخلاقی حالت کے بارے میں اطمینان نہ ہو جاتا۔ ائمہؒ حدیث اس کی روایت قبول نہ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن مبارک نے بھی اس سلسلے میں بہت کام کیا۔ ابن عساکرؒ کہتے ہیں ہارون الرشید کے پاس ایک ملحد لایا گیا۔ ہارون الرشید نے اس کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ ملحد بولا کہ آپ ان ایک ہزار احادیث کا کیا کریں گے جو میں نے تیار کر کے ملک بھر میں پھیلا دی ہیں حالانکہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ ہارون الرشید نے اطمینان سے کہا۔ ”اے دشمن خدا! تو کس خیال میں ہے ابو اسحاق فزاریؒ اور حضرت عبداللہؓ بن مبارک جیسے نقاد یہاں موجود ہیں وہ ایک ایک حرف نکال کر باہر پھینک دیں گے۔“ اس کے بعد ملحد کو سزائے موت دے دی گئی۔

حضرت عبداللہؓ بن مبارک کی ذات قرآن پاک کی آیت (ترجمہ) ”اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔“ کا مکمل نمونہ تھی۔ آپؒ کے استاد حضرت سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں۔ ”میں نے صحابہ کرامؓ کے حالات پر غور کیا تو حضرت عبداللہؓ بن مبارک کے سوائے اس کے اور کسی بات میں صحابہ کرامؓ سے کم تر نہ پایا کہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر نہ تھی۔“

ایک بار حضرت عبداللہؓ بن مبارک نے شام میں کسی شخص سے قلم مستعار لیا۔ مرو پہنچ کر یاد آیا کہ وہ اس شخص کا قلم واپس کرنا بھول گئے ہیں واپس شام گئے اور قلم لوٹا آئے۔ واضح رہے کہ مرو، شام سے سینکڑوں میل دور ہے اور اس زمانے میں صرف گھوڑوں اونٹوں اور خچروں پر سفر ہوتا تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن مبارک کبھی مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے فرماتے تھے مہمان کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے اللہ اس کا حساب نہیں لیتا۔ سال کے بیشتر حصہ میں روزہ رکھتے تھے سخاوت کا یہ حال تھا کہ ایک لاکھ درہم سالانہ، صرف فقراء پر خرچ کرتے تھے۔

خراسان سے تجارت کا سامان حجاز لا کر فروخت کیا کرتے تھے ایک بار آپؒ کے شاگرد حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اس سے کہا ”آپؒ ہم لوگوں کو تو زہد و قناعت اور دنیا سے بے رغبتی کی تربیت دیتے ہیں اور خود قیمتی سامان کی تجارت کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”فضیل! یہ تجارت اس لیے کرتا ہوں کہ اس سے اپنی ذات کو مصائب سے اپنی عزت کو ذلت سے بچا سکوں اور خدا کی اطاعت میں اس سے مددوں اور اللہ نے جو مالی حقوق میرے ذمہ کیے ہیں ان کو بخوبی ادا کروں۔“

کسی نے شکایت کی کہ آپؒ اپنے شہر میں مال اتنی فراوانی سے خرچ نہیں کرتے جس فردانی سے باہر بھیجتے ہیں۔ جواب میں فرمایا: ”میں ان لوگوں پر مال خرچ کرتا ہوں جن کے علم و فضل اور صداقت و دیانت سے بخوبی واقف ہوں وہ علم دین کی طلب و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں مگر ان کی ذاتی ضرورتیں بھی ہیں اگر یہ لوگ ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جائیں تو علم ضائع ہو جائے گا اور اگر ہم ان کی مدد کرتے ہیں تو ان کے ذریعہ علم کی اشاعت ہوتی رہے گی اور منصب نبوت کے اختتام کے بعد علم دین کی اشاعت سے بڑھ کر کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔“

ایک شخص سات سو درہم کا مقروض تھا، کچھ لوگوں نے درخواست کی کہ اس کا قرض ادا کر دیں۔ آپؒ نے اپنے منشی کو لکھا کہ حامل رقعہ کو سات ہزار درہم ادا کر دیے جائیں۔ یہ تحریر لے کر وہ شخص منشی کے پاس پہنچا۔ اس نے تحریر پڑھ کر پوچھا۔ ”تمہیں کتنی رقم چاہیے۔؟“ اس نے بتایا کہ

میں سات سو درہم کا مقروض ہوں اور اسی کے لیے لوگوں نے سفارش کی تھی۔ منشی نے حضرت ابن مبارکؒ سے استفسار کیا۔ آپ نے جواب میں لکھا۔ ”تمہیں جس وقت میرا خط ملے اسی وقت تم اس شخص کو 14 ہزار درہم دے دو۔“ منشی نے ازراہ ہمدردی لکھا کہ اس طرح تو جلد ہی سرمایہ ختم ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہؒ بن مبارک نے سخت لہجہ میں لکھا۔

”اگر تم میرے ماتحت ہو تو جو حکم دیتا ہوں اس پر عمل کرو اور اگر تم مجھے اپنا مامور و محکوم سمجھتے ہو تو پھر تم آ کر میری جگہ بیٹھو اس کے بعد جو تم حکم دو گے میں اس پر عمل کروں گا۔ میرے سامنے مادی دولت و ثروت سے زیادہ قیمتی سرمایہ آخرت کا ثواب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو اچانک اور غیر متوقع طور پر خوش کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔“

آپؒ شام کے شہر طرس جایا کرتے تھے۔ راستہ میں رقبہ پڑتا تھا۔ وہاں ایک سرائے میں قیام کرتے تھے۔ اس سرائے میں ایک نوجوان بھی رہا کرتا تھا۔ جب تک آپؒ سرائے میں قیام کرتے وہ نوجوان آپؒ سے حدیثیں سنتا۔ ایک بار سرائے پہنچے تو نوجوان کو نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دس ہزار کے قرض کے سلسلے میں قید ہے۔ آپؒ نے قرض خواہ کو بلایا، رقم ادا کر دی اور وعدہ لے لیا کہ کسی سے تذکرہ نہ کرے گا۔ اسی رات آپؒ رقبہ سے روانہ ہو گئے۔

نوجوان رہا ہو کر سرائے میں پہنچا اسے آپؒ کی آمد کی اطلاع ملی اسے ملاقات نہ ہونے کا اتنا رنج ہوا کہ اسی وقت طرس کی سمت روانہ ہو گیا۔ خاصی دور جا کر حضرتؒ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت عبداللہؒ بن مبارک نے حال دریافت کیا۔ نوجوان نے بتایا کہ میں قید تھا، کوئی اللہ کا بندہ آ کر سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے قرض ادا کر کے مجھے رہائی دلوائی۔ آپؒ نے فرمایا۔ ”خدا کا شکر ادا کرو کہ اس مصیبت سے تمہیں نجات مل گئی۔“ محمد بن عیسیٰؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؒ بن مبارک کی وفات کے بعد قرض خواہ نے اس واقعہ کو لوگوں سے بیان کیا۔

تقریباً ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ سفر حج پر معمول تھا کہ سفر سے پہلے تمام رفقاء سفر سے کہتے کہ اپنی اپنی رقم میرے حوالے کر دیں، جب وہ لوگ رقم حوالے کر دیتے ہر ایک کی رقم الگ الگ تھیلی میں ہر ایک کے نام کے ساتھ مہر بند کرتے اور صندوق میں رکھ دیتے۔ سفر کے دوران خود خرچ کرتے، اچھا کھانا کھاتے، جب قریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ پہنچتے تو ہم سفروں سے کہتے کہ اہل و عیال کے لیے جو خریدنا ہو خرید لیں۔ اس سارے سامان کی قیمت خود ادا کرتے، جب واپس پہنچتے تو سب کی دعوت کرتے اور ہر ایک کو اس کی تھیلی لوٹا دیتے۔ یہ آپؒ کا زندگی بھر کا معمول رہا۔

مرو میں آپؒ کا اچھا خاصا کشادہ مکان تھا لیکن اسے چھوڑ کر کوفہ چلے آئے اور نہایت تنگ و تاریک مکان میں ٹھہر گئے۔ لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ ”جس بات کو تم پسند کرتے ہو یعنی عقیدت مندوں کا ہجوم، وہ مجھے ناپسند ہے اور یہاں تم گمنامی کی زندگی کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ مجھے پسند ہے۔“

ایک بار کسی سبیل پر پانی پینے گئے وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا، اچانک ایسا دھکا لگا کہ دور جا پڑے اٹھ کر اپنے ساتھی سے فرمایا۔

”زندگی اسی طرح گزارنی چاہیے کہ نہ ہم کو لوگ پہچانیں، نہ ہماری توقیر کریں۔“

جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا، حضرت عبداللہؒ بن مبارک کی زندگی، قرآن پاک کی آیت، ”اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“ کا نمونہ تھی۔ آپؒ زندگی کے ہر گوشے میں اسلام پر عمل پیرا تھے۔ آپؒ نے سال کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ تجارت اور درس و تدریس، جہاد اور سفر حج۔

اس زمانے میں رومیوں اور مسلمانوں میں بڑی کشاکش تھی کبھی رومی، اسلامی سرحدوں پر حملہ کرتے تو کبھی مسلمان پیش قدمی کرتے۔ ایک بار لشکر اسلام رومیوں کے خلاف صف آراء تھا۔ رومی فوج سے ایک سپاہی نکلا اس نے لڑنے کی دعوت دی، سلیمانؒ مروزی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی جانب سے بھی ایک سپاہی نکلا اس نے پہلے ہی وار میں رومی فوج کے سپاہی کا کام تمام کر دیا۔ پھر دشمن کے کئی سپاہی یکے بعد دیگرے

آئے اور ان سب کا یہی حشر ہوا۔ لوگوں نے یہ بہادری دیکھ کر، اس مسلمان مجاہد کو گھیر لیا۔ اس کے چہرے پر نقاب ہٹائی گئی تو دیکھا حضرت ابن مبارک ہیں۔

ایک بار ایک مجوسی سے برسر پیکار تھے مجوسی کی عبادت کا وقت آ گیا تو اس نے مہلت مانگی۔ جب وہ سورج کے سامنے سجدہ کرنے لگا تو آپؐ نے ارادہ کیا کہ اس کا کام تمام کر دیں لیکن فوراً ہی قرآن پاک کی آیت یاد آ گئی (ترجمہ) ”عہد کی پابندی کرو، عہد کی باز پرس ہوگی۔“ فوراً رک گئے۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد مجوسی کو واقعہ کا علم ہوا تو وہ مسلمان ہو گیا۔

آپؐ نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ امام ذہبیؒ نے ان کی صرف ایک کتاب ”کتاب الذہب“ کا ذکر کیا ہے لیکن ابن ندیم کے مطابق آپؐ نے کئی کتابیں لکھی جن میں کتاب السنن، کتاب تفسیر، کتاب الزہد اور کتاب البر و صلہ شامل ہیں۔

عظیم بزرگ نے داعی اجل کو لبیک ایسے عالم میں کہا، جب وہ شام کے علاقہ میں جہاد کے لیے گئے ہوئے تھے۔ 181ھ/997ء کی بات ہے۔ دوران سفر طبیعت خراب ہو گئی، صحرائے شام کے شہر ہیت میں ٹھہرے، ستوپینے کی خواہش ظاہر کی، ایک شخص نے ستوپیش کیا لیکن یہ شخص ہارون الرشید کا درباری تھا، اس لیے ستوپینے سے انکار کر دیا۔ وفات سے کچھ دیر قبل آواز گلے میں پھنس گئی انہیں خدشہ ہوا کہ زبان سے کلمہ شہادت نہ نکل پائے گا۔ انہوں نے اپنے شاگرد حسن بن ربیع سے کہا۔ ”دیکھو جب میری زبان سے کلمہ شہادت نکلے تو تم اتنی بلند آواز سے دہرانا کہ میں سن لوں، جب تم ایسا کرو گے تو یہ کلمہ خود بخود میری میری زبان پر جاری ہو جائے گا۔“ اسی حالت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

☆☆☆

نقش جیلانی

حیات و تعلیمات شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک مستند کتاب، جسے آپ تک پہنچایا ہے محمد یوسف جاوید (قلمی نام محمد ابوخلدون) نے۔ پہلے باب میں حضرت شیخ کی پیدائش سے لے کر ان کے سفر بغداد کے حالات کا ذکر ہے۔ دوسرا باب ان حالات کا جائزہ ہے جن سے حضرت شیخ سے پہلے اور ان کی زندگی میں امت مسلمہ گزر رہی تھی۔ تیسرا باب حضرت شیخ کی دینی تعلیم اور اس کے بعد حضرت حماد بن مسلم کی مجلس میں حاضری اور ان کی صحبت میں راہ طریقت طے کرنے کے بارے میں ہے۔ چوتھا باب حضرت کی زندگی کے دیگر حالات اور بعض اکابر امت کے ان کے بارے میں تاثرات پر مبنی ہے۔ پانچواں باب تصوف یا تزکیہ باطن کا ایک عمومی تعارف ہے اور ساتھ ہی اس بارے میں حضرت شیخ کی بعض تعلیمات بھی آ گئی ہیں۔ چھٹا باب حضرت شیخ کی تصنیفات کا ایک مختصر جائزہ ہے۔ ساتواں باب حضرت شیخ کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہی باب اس کتاب کا مرکزی باب ہے۔ اس میں عقائد، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات پر حضرت شیخ کے اقوال ان کی تصنیفات سے پیش کیے گئے ہیں۔ **نقش جیلانی**، کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ

آپؒ کے استاد نے آپؒ کا نام علم کا محافظ رکھ دیا تھا

عید کا دن تھا۔!

ہر طرف چہل پہل تھی، لوگ عمدہ لباس پہنے، عید کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کی طرف رواں تھے تاکہ گھر والوں کو عید کی مبارکباد دے سکیں لیکن ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس کے قدم اپنے گھر کی بجائے کسی اور سمت میں اٹھ رہے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ نوجوان اپنے گھر والوں سے خفا تھا یا اسے کسی دوست یا رشتہ دار سے ملنا تھا یا وہ کسی تفریح میں حصہ لینے کے لیے جا رہا تھا بلکہ وہ نوجوان ایک بہت بڑے عالم کے مکان پر جا کر رک گیا۔

نوجوان نے دروازے پر سے دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ بہت بڑے عالم نے نوجوان سے پوچھا۔

”تم عید کی نماز پڑھ کر گھر نہیں گئے؟“

”نہیں“

”کچھ کھا لو۔!“

”جی نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پھر کیا ارادہ ہے۔؟“

”حدیث بیان فرمائیے!“

بزرگ نے اس نوجوان کو کتاب لانے کا حکم دیا۔ نوجوان کتاب نکال کر لایا۔ بزرگ نے چالیس حدیثیں بیان کیں، نوجوان نے کہا۔

”اور فرمائیے۔!“

”یہی کافی ہیں۔“ بزرگ نے فرمایا ”اگر تم نے یہی حدیثیں یاد کر لیں تو تمہارا شمار حفاظ میں ہوگا۔“

”میں نے یاد کر لیں!!“ نوجوان نے انکشاف کیا۔

بزرگ نے نوجوان کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور فرمایا۔

”بیان کرو۔“

نوجوان نے وہ تمام چالیس حدیثیں لفظ بہ لفظ بیان کر دیں جو ابھی چند لمحوں قبل، بزرگ نے اس کے سامنے بیان کی تھیں۔

بزرگ کے لبوں کو جنبش ہوئی، انہوں نے فرمایا۔

”جاؤ! تم علم حدیث کے زبردست فقیہ ہو۔“ یہ نوجوان تھے مالکؒ بن انس جو آگے چل کر امام مالکؒ کہلائے اور بزرگ تھے امام ابن

الشہاب الزہریؒ جس سے علم کے حصول کے لیے مالکؒ نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ نماز عید کے بعد گھر چلے جائیں خود امام مالکؒ کے کہنے کے مطابق:

”میں نے سوچا کہ آج ایسا دن ہے کہ امام ابن الشہاب فارغ ہوں گے، اس لیے ان کے پاس چلا گیا۔“

علم دین حاصل کرنے کے لیے یہ شوق، جستجو، تڑپ اور لگن تھی جس نے امام مالکؒ کو مسلمانوں کے فقہ کے چار بڑے اماموں میں سے ایک کے بلند مرتبہ پر فائز کیا۔ آپؒ کی پوری زندگی ایک روشن مینار کی مانند ہے جس سے آنے والی نسلیں نور کی کرنیں لے کر اپنی سیرتوں کو منور کر سکتی ہیں۔ آپؒ کا نام مالک، کنیت ابو عبد اللہ اور لقب ”امام دارالہجرۃ“ یعنی مدینہ کا امام ہے۔ 93ھ/711ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بنی امیہ کی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ ولید بن عبد الملک حکمران تھے اور اسلامی حکومت مشرق میں ترکستان (چین) کا بل اور سندھ اور مغرب میں افریقہ اور اسپین تک پھیل چکی تھی۔ اسلامی حکومت کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایے کہ مملکت اسلامی میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا!! امام مالکؒ نے ایسے گھر میں آنکھیں کھولیں جو علم حدیث کی روشنی سے منور تھا۔ آپؒ کے دادا حضرت مالکؒ بن ابی عامر بڑے تابعی اور علماء میں سے تھے۔ والد انسؒ بن مالک محدث تھے بھائی تو پہلے ہی علم حدیث میں مشغول تھے۔

آپؒ نے قرأت میں اہل مدینہ کے امام حضرت نافع بن نعیمؒ سے قرأت سیکھی۔ پھر اس کمن لڑکے کے دل میں علم حدیث سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، گھر والوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، والدہ محترمہ معصوم بچے کی زبان سے یہ سن کر خوشی سے جھوم اٹھیں، فوراً عمدہ لباس پہنایا سر پر عمامہ باندھا اور کہا: ”جاؤ اور ابھی لکھو۔!“ والدہ کے شوق دلانے پر مستقبل کا یہ فقیہ، مسجد نبویؐ میں حضرت ربیعہؒ رائی کی درس گاہ کا طالب علم بن گیا۔ اس نووارد طالب علم کا حال یہ تھا کہ جو پڑھتا تھا اسے یاد کر لیتا تھا۔ روزانہ سبق پڑھنے اور لکھنے کے بعد یہ لڑکا بجائے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے، درختوں کے سائے میں جا بیٹھتا۔ ایک دن بہن نے دیکھ لیا۔ والد سے جا کر کہا کہ مالکؒ درختوں کے سائے میں بیٹھے ہیں۔ والد نے فرمایا ”بیٹی وہ رسول اللہ کی احادیث یاد کرتے ہیں۔“

حضرت ربیعہؒ رائی کے ساتھ ساتھ مالکؒ دیگر اساتذہ سے بھی علم حاصل کر رہے تھے۔ امام مالکؒ خود کہتے ہیں میرے والد نے ایک دفعہ مجھ سے اور میرے بھائی نصر سے ایک مسئلہ پوچھا، میرے بھائی نے صحیح جواب دیا، میں نے غلطی کی، والد نے کہا: ”علم حاصل کرنے میں تم جہوم کی وجہ سے پیچھے رہ گئے“ (یعنی بیک وقت کئی اساتذہ سے علم حاصل کر رہے ہو) مجھے غصہ آ گیا پھر میں حضرت ابن ہرمرز کے پاس جا کر سات سال تک علم حاصل کرتا رہا اور ان کے علاوہ دوسرے علماء کرام سے نہ ملا۔ شروع میں یہ حال تھا کہ مالکؒ کو لوگ ”نصر کے بھائی“ کے نام سے پہچانتے تھے بعد میں یہ نوبت آئی کہ نصر کا ذکر مالکؒ کے بھائی کے نام سے کیا جانے لگا۔

علم حدیث کے شیدائی، مالکؒ نے اب حضرت نافعؒ بن عمر کی مجلس کا رخ کیا لیکن حضرت ابن ہرمرز سے حصول علم ترک نہ کیا۔ امام مالکؒ خود فرماتے ہیں۔ ”میں حضرت نافعؒ کے پاس دوپہر کے وقت آتا تھا، سخت دھوپ سے کسی درخت کے نیچے پناہ نہیں ملتی تھی، میں ان کے نکلنے کا انتظار کرتا۔ وہ آتے اور مجلس میں داخل ہونے تک میں ان سے مسائل پوچھتا۔“ امام صاحبؒ نے حضرت نافعؒ سے بارہ سال تک علم حاصل کیا۔ واضح رہے کہ حضرت نافعؒ کا مکان مدینہ منورہ سے باہر بقیع میں واقع تھا۔

ایک دن حضرت امام بن الشہاب الزہریؒ سے ملاقات ہوئی۔ امام مالکؒ کے استاد حضرت ربیعہؒ رائی بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابن الشہاب الزہریؒ نے چالیس سے زائد احادیث بیان کیں۔ امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ دوسرے دن ہم امام الزہریؒ کے پاس گئے انہوں نے فرمایا: ”کتاب میں دیکھو تا کہ میں حدیثیں بیان کروں، کل میں نے جو کچھ بیان کیا تھا، کیا تم نے دیکھ لیا؟“

حضرت ربیعہؒ نے کہا ”یہاں ایک شخص موجود ہے جو تمام احادیث آپؐ کو سنا دے گا جو آپؐ نے کل بیان کی تھیں۔“ امام الزہریؒ نے پوچھا: ”وہ کون ہے؟“

”حضرت ربیعہؒ نے بتایا ”ابن ابی عامر“۔“

امام الزہریؒ نے فرمایا۔ ”سنو۔“

میں نے انہیں چالیس احادیث سنا دیں۔ امام الزہریؒ نے تعجب سے کہا ”میں سمجھتا تھا کہ یہ احادیث میرے سوا کسی دوسرے کو یاد نہیں ہیں۔“ اس کے بعد امام مالکؒ، ابن الشہاب الزہریؒ سے بھی علم حاصل کرنے لگے۔ امام الزہریؒ نے اپنے ہونہار شاگرد امام کا نام ”علم کا محافظ“ رکھ دیا تھا۔

سال ہا سال تک اپنے سینے کو علم دین سے منور کرنے کے بعد اب وہ وقت آ گیا تھا کہ امام مالکؒ خود مسجد نبویؐ میں مسند درس پر فائز ہوں اور مسائل کے سلسلے میں فتوے دیں، لیکن امام مالکؒ نے خود آگے بڑھ کر یہ بارگراں نہیں اٹھایا، آپ فرماتے ہیں: ”میں خود نہیں بیٹھا یہاں تک کہ اہل علم میں سے ستر علماء کرام نے شہادت دی کہ میں اس منصب کا اہل ہوں۔“

اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں امام مالکؒ نے پچاس سال سے زائد عرصہ تک درس دیا۔ درس کی مجلس نہایت پر وقار ہوتی تھی، آپؐ کے شاگرد کہتے ہیں: ”امام صاحبؒ ہمارے ساتھ بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا تھا گویا ہم ہی میں سے ہیں۔ کھل کر باتیں کرتے تھے لیکن جب درس دینے بیٹھتے تو ان کے کلام سے ہم پر ہیبت طاری ہو جاتی گویا وہ ہمیں پہچانتے ہی نہیں نہ ہم انہیں جانتے ہیں۔“

مجلس کے وسط میں شہ نشین تھی جس پر امام صاحبؒ صرف اس وقت تشریف رکھتے جب حدیث کا املا کروانا ہوتا، مجلس میں شرکت کرنے والوں کے لیے جگہ جگہ بچکے رکھے ہوتے تھے۔ حدیث کا درس ہوتا تو عود اور لوبان جلایا جاتا۔ صفائی اور نفاست کا یہ حال تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی نظر نہ آتا تھا۔

امام مالکؒ فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ طویل باتوں سے ہمیشہ گریز کرتے۔ فرضی مسائل پر فتویٰ نہ دیتے تھے اور اسے فتنہ قرار دیتے تھے۔ اپنا جواب ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ سے شروع کرتے اور اکثر اپنے فتوے کے آخر میں کہتے ”یہ صرف ہمارا خیال ہے ہمیں اس پر پکا یقین نہیں ہے۔“

اخلاص نیت کا یہ عالم تھا کہ ان مسائل پر فتویٰ نہیں دیتے تھے جو قاضیوں (ججوں) کا حق تھے۔ فتویٰ دینے میں بہت غور سے کام لیتے تھے۔ جن مسائل یا احادیث کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہ ہوتے ان پر کوئی فتویٰ نہ دیتے۔

فتویٰ دینے میں عمر بھر اس قدر احتیاط سے کام لینے کے باوجود خوف خدا سے معمور اس عظیم بزرگ کا حال تھا کہ جب بیمار پڑے اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ایک شاگرد نے رونے کا سبب دریافت کیا اس پر جواب ملتا ہے: ”میں نہ روؤں تو کون روئے؟ اے کاش مجھے میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلے ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔“

یہی الفاظ ادا کرتے ہوئے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

امام مالکؒ نے گو کہ کثیر تعداد میں احادیث بیان فرمائی ہیں لیکن آپؒ نے حدیثوں کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہر سنی ہوئی روایت کو بے تحقیق بیان کر دینا عقل مندی نہیں، آپؒ نے اپنی مشہور کتاب موطاء میں ابتداً اس ہزار احادیث میں سے چار ہزار حدیثیں منتخب کر کے شامل فرمائی تھیں۔ آپؒ کی وفات تک نظر ثانی کے نتیجے میں ایک ہزار سے کچھ زائد احادیث اس کتاب میں رہ گئیں۔

موطاء کی تالیف امام مالکؒ نے عباسی خلیفہ منصور (136ھ/754ء تا 158ھ/775ء) کے دور میں شروع کی اور منصور کے آخری زمانہ خلافت تک وہ مسودہ مکمل کر چکے تھے۔ اس زمانے میں ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ خلیفۃ المسلمین ایک ایسی جامع کتاب مقرر کریں جس کے مطابق سارے مقدمات کا فیصلہ ہو چنانچہ امام مالکؒ نے موطاء لکھی۔ اس کتاب میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال شامل ہیں۔ امام صاحبؒ حدیث کے ساتھ ساتھ ”درایت“ یعنی حدیث کے راویوں کی صحت کو پرکھنے کے امام بھی تسلیم کیے گئے ہیں، وہ فقہائے مدینہ میں پہلے فرد ہیں جنہوں نے غیر ثقہ راویوں اور ثقہ راویوں کو الگ الگ کیا۔

امام مالکؒ اور ان کے دور کے دیگر جید علمائے کرام کی سیرتوں کا مطالعہ کریں تو ایک بات خاص طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے ان

بزرگوں نے گوشت کے مختلف مسالک پیش کیے۔ کئی امور میں ایک دوسرے سے سخت اختلاف کیا لیکن کبھی ایک دوسرے کے بارے میں ذرہ برابر تعصب کو دل میں جگہ نہ دی۔

حضرت لیث بن سعد فرماتے ہیں میں مالک سے مدینے منورہ میں ملا، دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے ہیں سبب دریافت کیا تو جواب ملا: ”ابو حنیفہ کے ساتھ پسینہ آگیا، وہ تو بڑے فقیہ ہیں۔“

حضرت لیث کہتے ہیں۔ پھر میں امام ابو حنیفہ سے ملا، ان سے پوچھا۔ ”آپ کو امام مالک کی کیا بات پسند آئی۔“
جواب ملا۔ ”صحیح جواب، اس قدر جلد دینے والا میں نے اور کوئی نہیں دیکھا اور نہ اس قدر پر کھنے والا پایا۔“

اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام مالک کو دیکھا گیا کہ عشاء کی نماز کے بعد مسجد نبویؐ میں علمی گفتگو شروع ہوئی تو فجر کی نماز تک جاری رہی جب کسی مسئلہ میں ایک امام دوسرے کے قول پر مطمئن ہو جاتا تھا تو بلاتامل اس کو اختیار کر لیتا تھا۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ ”امام مالک اہل علم کے سرداروں میں سے ایک ہیں، وہ حدیث اور فقہ میں امام ہیں، کوئی ان کا مثل نہیں۔“
ہارون الرشید نے چاہا کہ امام مالک کی موطاء خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے لیکن خود امام مالک نے فرمایا۔ ”ایسا نہ کرو صحابہ کرامؓ خود جزوی باتوں میں مختلف ہیں اور وہ کئی ملکوں میں پھیل چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نیک راہ پر ہے۔“

امام صاحب نے اپنی چھیالیس سال کی عمر میں ولید بن عبد الملک سے لے کر ہارون الرشید تک، بنو امیہ اور بنو عباس کے متعدد حکمرانوں کو دیکھا۔ آپ ان سے ملتے بھی رہے، بعض اوقات ان کے تحفے بھی آپ نے قبول فرمائے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس مرد جری نے کبھی کسی حکمران کے سامنے حق بات کہنے سے گریز نہ کیا۔ کسی حکمران کی خوشامد نہ کی اور کسی حکمران سے بے جا رعایتیں حاصل نہ کیں۔

آپ سے ایک شاگرد نے کہا ”لوگ کہتے ہیں آپ امراء سے ملتے ہیں۔“ فرمایا: ”یہ تو میرے لیے لازم ہے اس لیے کہ میں انہیں بہت سی نامناسب باتوں سے منع کرتا ہوں۔“ ایک اور بار خلفاء کے دربار میں جانے پر اعتراض کیا گیا تو جواب دیا: ”اگر نہ جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے؟“

خلیفہ منصور کے دربار کا قاعدہ تھا کہ جو دربار میں داخل ہوتا، خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا لیکن امام مالک نے کبھی ایسا نہ کیا، آپ کی نگاہوں میں اتنا رعب تھا کہ لوگ نظریں نہ ملا پاتے تھے، حکام پر بھی ان کی زبردست ہیبت طاری تھی۔

خلیفہ مہدی نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ امام صاحب سے موطاء سنیں۔ موسیٰ اور ہارون نے امام صاحب کو بلوایا۔ امام صاحب نے بے نیازی سے کہا ”علم بیش قیمت چیز ہے اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں۔“

ہارون الرشید 170ھ/786ء میں خلیفہ بنے۔ چار سال بعد اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر حج کے ارادے سے آئے۔ آپ سے ملے تو موطا سننے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا ”کل کا دن اس کے لیے ہے۔“ ہارون اگلے دن انتظار کرتے رہے مگر آپ نہیں گئے۔ ہارون نے شکایت کی، امام صاحب نے فرمایا۔ ”علم کے پاس لوگ آتے ہیں، علم لوگوں کے پاس نہیں جاتا۔“

آخر ہارون خود اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوئے، وہاں طلبہ کا ہجوم تھا۔ ہارون نے کہا ”اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔“ امام صاحب نے کہا کہ ایک شخص کے فائدے کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جاسکتا۔

پھر ہارون مسند پر بیٹھ گئے۔ امام صاحب نے فرمایا ”تواضع پسندیدہ ہے“ ہارون مسند سے اتر آئے۔ پھر امام صاحب کے شاگرد نے قرأت کی، بعد میں امام صاحب نے خلیفہ ہارون کی توجہ مدینہ کے فقرائے کی جانب دلائی، ہارون نے ان فقراء کی دل کھول کر امداد کی۔

امام صاحب سب سے زیادہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ خلفاء اور حکام کے نزدیک جو لوگ رہتے ہیں وہ ان کی جھوٹی تعریف کرتے ہیں چنانچہ آپ ایسے شخص سے سخت ناراض ہوتے تھے جو بادشاہوں کے منہ پر ان کی تعریف کرتا ہو۔ ایک بار ایک حاکم امام صاحب کے پاس موجود تھے

حاضرین میں سے کسی نے حاکم کی تعریف شروع کر دی۔ امام صاحبؒ برہم ہو گئے فرمایا ”احتیاط کرو، ایسا نہ ہو کہ تعریف کرنے والوں کے دھوکے میں آ جاؤ۔“

امام صاحبؒ نے ایک روایت کے مطابق 75 اور ایک روایت کے مطابق 94 جلیل القدر اساتذہ کرام سے علم حاصل کیا لیکن حصول علم کے سلسلے میں امام صاحبؒ نے بڑے نکتہ کی بات ارشاد فرمائی کہ ”اس کے لیے صرف زہد و تقویٰ اور سادگی ہی نہیں علم و فہم اور پختگی بھی درکار ہے۔“

امام صاحبؒ نہایت نفاست پسند تھے۔ ہمیشہ بیش قیمت لباس آپؒ کے بدن پر رہتا تھا، قیمتی کپڑے عدن سے منگوا کر تے تھے، بہت اچھی خوشبو استعمال کرتے تھے۔ جس گلی سے نکل جاتے دیر تک خوشبو پھیلی رہتی، کھانے کا ذوق بھی بے حد عمدہ تھا آپؒ فرماتے تھے ”میں کسی آدمی کے لیے پسند نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی نعمتیں دی ہوں اور پھر ان کے آثار اس پر ظاہر نہ ہوں۔“

ان سطور سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام مالکؒ عمر بھر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے رہے۔ آپؒ نے علم دین کے حصول کے لیے بے شمار سختیاں بھی جھیلی ہیں اور آپؒ پر وہ دور بھی آیا ہے جب آپؒ کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ آپؒ کی بچی بھوک سے بے تاب ہو کر رویا کرتی تھی اور یہ خود دار شخص اپنی خادمہ سے کہتا تھا کہ چکی چلائے تاکہ پڑوسی بچی کے رونے کی آواز نہ سن سکیں۔ امام صاحبؒ تنگ دستی سے دوچار رہے لیکن آپؒ نے علم کا حصول ترک نہ کیا اور اس غرض سے اپنے گھر کی چھت کی لکڑیاں تک بیچ دیں۔ امام مالکؒ خود فرماتے ہیں۔ ”اس علم میں کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک علم حاصل کرنے والا فقر میں مبتلا نہ ہو اور اس پر بھی وہ بہر حال علم حاصل کرنے کو ترجیح دے۔“

امام مالکؒ کی حق گوئی، قراخ دلی اور غفو و درگزر کے واقعات تاریخ اسلام میں درخشاں ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

ربیع الاول 179ھ / 795ء میں آپؒ کا انتقال ہوا اس طرح 62 سال تک ایک امت کو علم و حکمت کے خزانوں سے مالا مال کرنے کے بعد مدینہ کا امام مدینہ کی خاک میں جا بسا۔ وفات کے وقت آپؒ کی عمر چھبیس سال تھی۔ آپؒ کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔

☆☆☆

اردو ادب کے مشہور افسانے ۲

کتاب اردو ادب کے مشہور افسانے (جلد دوم) بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔

(کالی بلا شوکت صدیقی)؛ (قیدی، ابراہیم جلیس)؛ (اخروٹ جھا چوہا بھیس، ممتاز مفتی)؛ (سیب کا درخت، بوتل کا جن اے۔ حمید)؛ (فاصلہ، واجدہ تبسم)؛ (ادھا، گلزار)؛ (مجید کا ماضی، پوجا پھڈے باز، سعادت حسن منٹو)؛ (مادر زاد، خواجہ احمد عباس) (بدام رنگی، بلونت سنگھ)؛ (بیہودہ خاوند، کنہیا لال کپور)؛ (عجیب قتل، ش۔ م۔ جمیل)؛ (اوپر گوری کا مکان، آغا بابر)؛ (لاٹری، منشی پریم چند)؛ (صاحبان مرزا علی حیدر ملک)؛ (دل ہی تو ہے، بھنور، گوندنی، غلام عباس)؛ (مولوی مہرباں علی، ابن انشاء) (لیمن جوس، چتر سین)؛ (غیر قانونی مشورہ، لوح مزار، موپاساں)؛ (سوتلی سا لگرہ، اشفاق احمد)؛ (ایک تھی فاختہ، محمد منشاء یاد)۔

یہ کتاب افسانے سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

امام بخاریؒ

انہوں نے اپنی پوری زندگی علم حدیث کے لیے وقف کر دی

درس حدیث کا آغاز ہو چکا تھا۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ وقفہ وقفہ سے بلند ہونے والی شیخ الحدیث کی پروقار آواز اس خاموشی کو توڑ دیتی اور کاغذات پر جھکے طالب علموں کے قلم تیزی سے چلنے لگتے۔ وہ شیخ الحدیث کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو قسطا قسطا کے سینہ پر محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ ان طالب علموں میں ایک دبلا پتلا طالب علم ایسا بھی تھا جس کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ بڑے غور سے شیخ الحدیث کا درس سن رہا تھا، لیکن دیگر طلبہ کی طرح احادیث لکھنے کا اہتمام نہیں کر رہا تھا۔ درس ختم ہوا تو تمام طلبہ شیخ الحدیث کو سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر درس شروع ہوا۔ شیخ الحدیث نے احادیث بیان کرنا شروع کیں۔ آج بھی تمام طلباء اس کوشش میں تھے کہ احادیث کا ایک ایک لفظ پوری صحت کے ساتھ ضبط تحریر میں لے آئیں، لیکن وہی طالب علم قلم و قسطا سے بے نیاز بیٹھا، توجہ سے درس سن رہا تھا۔ آج بھی درس اسی طرح مکمل ہوا اور طلبہ رخصت ہو گئے۔

پندرہ دن گزر گئے۔

ان پندرہ دنوں میں کوئی دن ایسا نہ گزرا کہ وہ طالب علم اپنے ساتھ قلم اور کاغذ لایا ہو یا اس نے کسی ساتھی سے قلم یا کاغذ کی فرمائش کی ہو۔ اس کے ساتھیوں کو بڑا تعجب تھا کہ یہ نوجوان یہاں کس لیے آتا ہے۔ انہوں نے اس نوجوان کو روک کر اس پر تنقید شروع کر دی کہ آپ یہاں آکر حدیثیں لکھتے نہیں ہیں، آپ کی تو اتنے دنوں کی محنت ضائع ہو گئی۔

جب تنقید کا سلسلہ دراز ہو گیا تو نوجوان طالب علم کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کہا۔ ”اچھا آپ وہ تمام احادیث لے آئیں۔“ تمام طالب علم اپنے اپنے مجموعے لے آئے۔ اس وقت تک شیخ الحدیث کئی ہزار احادیث قلمبند کروا چکے تھے۔ نوجوان طالب علم نے حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیں اور تمام احادیث اسی ترتیب سے بیان کر دیں جس ترتیب سے گزشتہ پندرہ دنوں میں شیخ الحدیث نے بیان کی تھیں۔

انتہائی غیر معمولی حافظہ کا مظاہرہ کرنے والے یہی نوجوان آگے چل کر امام بخاریؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ جنہیں صحیح احادیث کا سب سے مستند مجموعہ ”صحیح بخاری“ مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک کے بعد روئے زمین پر صحیح بخاری ہی سب سے صحیح کتاب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ صحیح بخاری کی صورت میں بالکل صحیح اور مستند کو الگ الگ بابوں کے ذیل میں مرتب کر کے امام بخاریؒ نے امت مسلمہ پر عظیم احسان فرمایا ہے۔ آپؒ نے اس کے علاوہ بھی بیس سے زائد کتب تحریر فرمائی ہیں لیکن تنہا یہی ایک کارنامہ آپؒ کو بے پناہ فضیلت، قدر و منزلت اور اہمیت بخشنے کے لیے کافی ہے۔

آپؒ کا نام محمدؐ اور والد کا نام اسماعیلؑ ہے۔ آپؒ کے پردادا مغیرہ بن بردزبہ، بخارا کے حاکم یمان الجعفی کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے۔ چنانچہ اس نسبت سے آپؒ کا خاندان الجعفی کہلانے لگا۔ بخارا میں پیدائش کی وجہ سے آپؒ بخاری مشہور ہیں۔ آپؒ کو امام المحدثین ثین اور امیر المومنین فی الحدیث جیسے معزز القاب سے بھی نوازا گیا ہے۔

حدیث کے یہ بلند مرتبت امام، 13 شوال 194ھ/20 جولائی 810ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی اسماعیل بن ابراہیم بڑے ثقہ اور ذی علم محدث تھے۔ انہیں امام مالک کے علم سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے حماد بن زید، امام مالک اور ابو معاویہ سے احادیث روایت کی تھیں اور خراسان کے نامور محدث اور عالم حضرت عبداللہ بن مبارک کی علمی مجالس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا رہا تھا۔ علم کے گہر ہائے آبدار کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ حضرت اسماعیل بن ابراہیم عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی زندگی ایک سچے اور پکے مسلمان کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ ان کی نیک نفسی اور تقویٰ کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے ایک محدث احمد بن حفص بیان فرماتے ہیں: ”اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے فرمایا: ”میں ترکہ میں مال کی بہت بڑی مقدار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ الحمد للہ کہ اس میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں۔“

حضرت اسماعیل بن ابراہیم اس شان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن اس وقت آپ کے صاحب زادے محمد بہت چھوٹے تھے۔ جن کی تربیت اور پرورش کی تمام تر ذمہ داریاں آپ کی والدہ محترمہ پر آ پڑی تھیں۔ وہی محمد جنہیں بڑے ہو کر اپنے پیارے والد محترم کا نام روشن کرنا تھا، ایک اُمت کو اپنے بے پناہ علم سے بہرہ ور کرنا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کا وہ عظیم مجموعہ مرتب کرنا تھا جو آج بھی صحیح بخاری کے نام سے گھر گھر موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قادر مطلق نے ننھے محمد کی والدہ محترمہ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی، یہ ذمہ داری ایک بڑی آزمائش کی صورت میں بدل گئی، جب ننھے محمد کی آنکھوں میں کوئی خرابی ہو گئی۔ طبیبوں نے علاج کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور محمد اس حسین دنیا کو دیکھنے سے محروم ہو گئے۔ ننھے محمد کی والدہ ماجدہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پھول سا بچہ اب اپنی ماں کو دیکھ نہ سکتا تھا، صرف ماں کی شفقت بھری آغوش کو محسوس کر سکتا تھا۔ محمد کی والدہ دل شکستہ ضرور تھیں، لیکن اپنے رب کی رحمت سے مایوس ہرگز نہیں تھیں۔ وہ اپنے ناپید بچے کو دیکھتیں تو بے اختیار اپنے پروردگار کو پکار اُٹھتیں جو ہر شے پر قادر ہے۔ اپنے خالق کے حضور سجدہ ریز ہو جاتیں اور اپنے معصوم بچے کی بینائی کی بحالی کے لیے رورور دعائیں مانگتیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بہت مہربان و رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کی پکار ہمیشہ سنتا ہے۔ کائنات کے خالق نے کس محمد کو ان کی بصارت لوٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک رات محمد کی والدہ محترمہ نے خواب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے مخاطب ہیں اور فرما رہے ہیں کہ ”تمہارے رونے اور دعا کرنے سے اللہ نے تمہارے بیٹے کی آنکھیں درست کر دی ہیں۔“

آنے والی صبح اپنے ساتھ خوشیاں لے کر آئی۔ ننھے محمد نے بیدار ہو کر آنکھیں کھولیں تو دنیا اپنے تمام تر حسن و جمال کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ اب ہر شے کو دیکھ سکتے تھے۔ شفیق و محترم ماں اور مسرور و شاد ماں بہن اور بھائی کا دیدار کر سکتے تھے۔ والدہ محترمہ اللہ کی اس عنایت پر رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں، بچے کی بصارت بحال ہونے کے بعد انہوں نے اسے حصول علم کے لیے بخارا کے نامور محدثین اور علماء کرام کے پاس بھیج دیا۔

محمد اس کمسنی ہی میں بلا کے ذہین تھے۔ اور آپ کی یادداشت غضب کی تھی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بخارا کے بلند پایہ محدثین محمد بن سلام، بیکندی، محمد بن یوسف بیکندی، ابراہیم بن الاشعث، عبداللہ بن محمد مسندی سے حاصل کی۔ صرف ایک سال کے عرصہ میں آپ احادیث کا بڑا حصہ ان کی اسناد کے ساتھ حفظ کر چکے تھے لیکن حدیثیں جاننے کے پیاس تھی کہ بڑھتی جاتی تھی اور آپ درس حدیث کی مجالس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ اسی دوران میں ایک واقعہ پیش آیا۔

ایک دن آپ اپنے استاد محترم علامہ داغلی کے حلقہ درس میں شریک تھے۔ علامہ داغلی نے ایک حدیث بیان فرمائی۔ اچانک ننھے محمد کھڑے ہو کر ادب سے عرض کیا کہ ”حدیث کی سند اس طرح نہیں ہے، جس طرح آپ نے بیان فرمائی ہے۔“ انہوں نے اصل کتاب نکال کر دیکھی تو ننھے محمد کی بات کو درست پایا۔ علامہ داغلی اس بچے کی غیر معمولی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور کتاب میں خود اس بچے کے قلم سے تصحیح کروائی۔

محمد بن اسماعیلؒ سولہ برس کے ہوئے تو آپؒ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور حضرت وکیع بن الجراحؒ کی تمام کتابوں کو حفظ کر چکے تھے۔ اس وقت آپؒ کو ستر ہزار احادیث یاد تھیں اور آپؒ یہ بھی فوراً بتا سکتے تھے کہ یہ ستر ہزار احادیث کن صحابیؒ یا تابعیؒ سے روایت کی گئی ہیں اور روایت کرنے والے کی جائے سکونت، جائے وفات اور دیگر حالات کیا ہیں؟ یہ وہ دور تھا جب مسند خلافت پر مامون الرشید فائز تھے۔ اسلامی مملکت وسیع ہو رہی تھی۔ نئے علاقے فتح ہو رہے تھے اور محدثین کرام دور دور کے علاقوں میں پھیل چکے تھے تاکہ نئے مسلمان ہونے والے افراد کو علم سکھاسکیں۔ محمد بن اسماعیلؒ بخارا کے اہل علم اور اساتذہ کرام سے حصول علم کر چکے تھے۔ اب انہوں نے دوسرے علاقوں میں جا کر علم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حدیث یا اس کی اعلیٰ سند کو حاصل کرنے کے لیے جو سفر کیا جاتا ہے اسے محدثین کی اصطلاح میں ”رحلت“ کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے اس طرح کے سفر بہت کیے ہیں۔

آپؒ کی زندگی کا پہلا سفر، سفر حج تھا جو آپؒ نے اپنی والدہ محترمہ اور بھائی کے ساتھ 210ھ/826ء میں کیا۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد آپؒ نے مزید تحصیل علم کی خاطر مکہ مکرمہ میں ٹھہر جانے کا فیصلہ کیا۔ آپؒ کی والدہ اور بھائی واپس بخارا چلے گئے۔ مدینہ منورہ سے آپؒ بصرہ تشریف لے گئے۔ اس وقت تک آپؒ کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور آپؒ کے غیر معمولی حافظہ کا بڑا چرچا تھا۔ آپؒ کے بصرہ پہنچتے ہی لوگ جوق در جوق آپؒ سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ اس وقت بصرہ میں بڑے بڑے محدثین اور علماء کرام موجود تھے جن میں ابوالولید الطیاسی، صفوان، بن عیسیٰ، ابو عاصم النبیل، محمد بن عرعہ، سلیمان بن حرب اور دیگر علماء شامل تھے۔ بصرہ کے شیوخ نے بخارا کے نوجوان عالم محمد بن اسماعیلؒ کی آمد پر ایک علمی مجلس کا اہتمام کیا۔ اس مجلس میں آپؒ نے احادیث بیان کیں۔

بصرہ سے آپؒ کا علمی سفر آپؒ کو، کوفہ اور بغداد لے گیا۔ بغداد اس دور میں خلافت عباسیہ کا دار الحکومت تھا اور وہاں علوم و فنون کو زبردست ترقی دی گئی تھی۔ کوفہ میں عمر بن حفص، سعید بن حفص، اسماعیل بن ابان، خالد بن مخلد اور دیگر علماء کرام سے استفادہ کیا۔ تحصیل علم کا شوق اب آپؒ کو کشاں کشاں بغداد لے آیا جہاں فقہ کے مشہور امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ، سرتح بن انعمانؒ، محمد بن عیسیٰ الصباغؒ اور محمد بن سائق درس دینے میں مصروف تھے۔ بغداد سے آپؒ نے شام کی راہ لی اور وہاں حیوۃ بن شریحؒ، حکم بن نافعؒ، آدم بن ابی ایاسؒ، ابو نصر اسحاق بن ابراہیم اور یوسف فریابی سے احادیث کا درس لیا۔ اس کے بعد مصر میں یحییٰ بن عبداللہؒ، احمد بن شعیبؒ، احمد بن صالحؒ، سعید بن ابی مریمؒ، اور سعید بن کثیر سے علم حاصل کیا۔ غرض یہ کہ حدیث سننے کے لیے آپؒ نے کل عالم اسلام کا سینکڑوں میل طویل سفر کیا۔ اس مبارک سفر کے نتیجے میں سولہ سال کا ایک نوجوان، حدیث کے ایک رفیع الشان اور عظیم المرتبت امام کی حیثیت سے ابھرا۔ جنہیں دنیا امام بخاریؒ کے نام سے جانتی ہے۔

ایک بار سمرقند میں چار سو محدثین جمع ہوئے۔ انہوں نے امام صاحب کا ایک ہفتہ تک امتحان لیا۔ کئی احادیث کی اسناد بدل بدل کر آپؒ کے سامنے بیان کیں لیکن امام صاحبؒ نے ہر حدیث صحیح متن اور درست سند کے ساتھ بیان کر دی اور کسی مرحلے پر آپؒ مغالطے کا شکار نہ ہوئے۔ امام صاحبؒ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ قضایا الصحابہؓ والتابعین اور تاریخ الکبیر کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، الادب المفرد، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر بہت اچھی کتاب ہے۔ دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں۔ التفسیر الکبیر، التاريخ الاوسط، الجامع الکبیر، اسامی الصحابہؓ، کتاب المسموط، الجامع الصغیر فی الحدیث، بر الوالدین، کتاب الکفی، کتاب الرقاق، التاريخ الصغیر، المسند الکبیر، کتاب الوجدان، کتاب الاثریہ، خلق افعال العباد، کتاب الفوائد، کتاب البیہ، جزا القرأت خلف الامام رفع الیدین، کتاب الضعفا الصغیر اور کتاب العل۔

ان تمام کتابوں کے ساتھ ساتھ امام صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ جامع صحیح بخاریؒ کی تالیف ہے۔ آپؒ نے مسلسل سولہ سال تک نہایت محنت سے احادیث تلاش کیں۔ ان کی اسناد اور متن کی باریک بینی کے ساتھ جانچ پڑتال کی اور چھ لاکھ احادیث میں خوب چھان پھٹک کر سات ہزار دو سو پچھتر احادیث منتخب کی ہیں۔

حدیثیں لکھ کر محفوظ کرنے کا سلسلہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا البتہ باقاعدہ تالیف حدیث کا اہتمام نہ

تھا۔ 99ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے خلیفہ بننے پر احادیث کی تدوین کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کا آغاز ہو گیا کچھ ہی عرصہ بعد بڑے بڑے جلیل القدر محدثین بھی اس مبارک فریضہ کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ ان میں حضرت ابن جریجؒ، امام مالکؒ، محمد بن اسحاقؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور عبداللہ بن مبارک جیسے عظیم محدثین اور فقہاء شامل تھے۔

تیسری صدی کے اوائل میں احادیث کو صحابہ کرامؓ کی ترتیب کے اعتبار سے جمع کیا گیا۔ اس طرز کے مجموعے کو ”مسند“ کہتے ہیں۔ اس دور میں امام احمد بن حنبلؒ، حافظ حسن بن احمدؒ، عبید اللہ بن موسیٰؒ، یعقوب بن شبیبہ جیسے پائے کے فقہاء اور محدثین سامنے آتے ہیں۔ امام ابوحنفیہؒ اور امام شافعیؒ کی جمع کردہ احادیث بھی بعد میں مرتب کی گئیں۔

تیسری صدی ہجری ہی میں تدوین حدیث کا کام بہت اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا اور صحیح احادیث کو یکجا کرنے میں اس دور کے محدثین نے بڑا کام کیا۔ محدثین کے اس کارواں کے قائد امام بخاریؒ تھے۔ امام بخاریؒ نے جب احادیث کا مطالعہ کیا تو آپؒ نے محسوس کیا کہ احادیث کے مجموعوں میں بہت سی ضعیف روایات بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اسی دوران آپؒ کے محترم استاد حضرت شیخ الحدیث اسحاق بن راہویہ نے خواہش ظاہر کی کہ کیا ہی اچھا ہو آپؒ ایسی کتاب مرتب کریں جس میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف صحیح احادیث ہوں۔ یہ بات امام بخاریؒ کے دل میں بیٹھ گئی۔ پھر آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ آپؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں۔ آپؒ کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس کی مدد سے آپؒ حضورؐ پر سے مکھیوں کو ہٹا رہے ہیں۔ امام صاحب نے علمائے کرام سے اس خواب کی تعبیر معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ آپؒ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب جھوٹی احادیث کو صحیح احادیث سے الگ کر دیں گے۔ اس خواب نے امام صاحبؒ کے دل میں بھڑکنے والی آتش شوق کو اور تیز کر دیا اور آپؒ تن من دھن سے احادیث نبویؐ کی تدوین و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

اس زمانے میں امام ابو الولید احمد بن الارزاقیؒ، اسماعیل بن سائیمؒ، ابو بکر عبدالستار بن زبیرؒ، علامہ حمیدؒ، مکہ مکرمہ کے نامور علماء کرام میں شمار ہوتے تھے۔ محمد بن اسماعیل نے ان کے علم سے خوشہ چینی کی اور 212ھ/827ء میں مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسیؒ، ابراہیم بن المنذرؒ، مطرف بن عبداللہ ابو ثابتؒ، محمد بن عبید اللہ اور ابراہیم بن حمزہ جیسے بلند مرتبت محدثین درس دے رہے تھے۔ محمد بن اسماعیل نے ان تمام محدثین کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے عطا کیے ہوئے علم کے موتی اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔

اپنی عمر کے اٹھارویں برس میں آپؒ نے ”قضاہی الصحاہ والتابعین“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ آپؒ کی سب سے پہلی تالیف تھی۔ اسی سال آپؒ نے ”التاریخ الکبیر“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر فرمائی۔ اس کتاب کا مسودہ آپؒ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک اور منبر کے درمیان بیٹھ کر لکھا۔

تاریخ الکبیر میں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ میں سے حدیث کے چالیس ہزار راویوں کے اسمائے گرامی، حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیے گئے ہیں۔ اگر کہیں ایک ہی نام کے چند حضرات کا ذکر اکٹھے آیا ہے تو ان کے والد کے ناموں میں حروف تہجی کی ترتیب قائم فرمادی گئی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ ”تاریخ کبیر میں کوئی ایسا نام نہیں جس کے متعلق مجھے کوئی واقعہ یاد نہ ہو لیکن طوالت کے خوف سے یہ واقعات میں نے درج نہیں کیے کہ یہ کتاب نہیں رہے گی بلکہ کتب خانہ بن جائے گی۔“

امام بخاریؒ فرماتے ہیں: ”میں نے استفادۂ حدیث کے لیے مصر و شام کا دو دفعہ سفر کیا۔ چار دفعہ بصرہ اور چھ بار حجاز گیا اور شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کے ساتھ کتنی مرتبہ کوفہ اور بغداد میں گیا۔“ بغداد میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ آپؒ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور جب بھی امام بخاریؒ بغداد جا کر وہاں سے لوٹنے کا ارادہ کرتے، امام احمد بن حنبلؒ کی خواہش ہوتی کہ امام بخاریؒ وہاں سے واپس نہ جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کو انتہائی حیرت انگیز اور فقید المثال حافظے سے نوازا تھا۔ آپؒ کو تین لاکھ احادیث یاد تھیں۔ مختلف محدثین اور علماء کرام نے آپؒ کے حافظے کا بار بار امتحان لیا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امام صاحب نے ایک حدیث کا مضمون دوسری حدیث سے ملا دیا ہو کسی

راوی یا حوالے میں کوئی غلطی کی ہو حتیٰ کہ انہیں جس ترتیب سے احادیث سنانے کو کہا جاتا تھا۔ وہ اسی ترتیب سے سنا سکتے تھے۔ امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار اسی کے قریب ہے۔ ایک بار بلخ تشریف لے گئے۔ وہاں لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے شیوخ (اساتذہ) ایک ایک روایت بیان فرمائیں، آپ نے ایک ہزار شیوخ سے ایک ہزار احادیث اسی وقت بیان کر دیں۔ امام صاحب جب بغداد تشریف لے گئے تو اہل بغداد نے ان کا امتحان لینا چاہا۔ انہوں نے دس محدثین کو منتخب کیا اور ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی۔ اس مجلس میں امام صاحب کو مدعو کیا گیا۔ باری باری ہر محدث نے دس دس حدیثیں سنائیں لیکن جان بوجھ کر ہر حدیث کی سند اور متن میں کچھ تبدیلی کر دی، اس طرح سو احادیث آپ کے سامنے بیان کی گئیں۔ ہر حدیث کے جواب میں امام صاحب یہی کہتے رہے کہ مجھے معلوم نہیں۔

جب تمام احادیث بیان ہو چکیں تو امام صاحب نے کہنا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے محدث کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: ”آپ نے سب سے پہلے یہ حدیث بیان کی جو یوں تھی۔“ پھر آپ نے کہا، ”آپ نے حدیث کے بیان میں یہ غلطی کی اور سند میں یہ بات درست نہ تھی۔ اصل حدیث یہ ہے۔“ اس طرح آپ نے ترتیب وار سو کی سو احادیث بیان فرمادیں۔ پہلے آپ محدث کی بیان کردہ حدیث اور اس کی سند بیان کرتے۔ اس کے بعد درست متن اور سند کے ساتھ وہی حدیث بیان کر دیتے۔ آپ نے ہر محدث کی بیان کردہ احادیث کو صرف ایک بار سنا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ امام صاحب کے حافظے میں نقش ہو گئی ہوں۔

آپ نہایت خلیق، بردبار اور درگزر کرنے والے تھے۔ برائی کا بدلہ ہمیشہ نیکی سے دیا کرتے تھے۔ کسی شخص کی اصلاح کرنا ہوتی تو سرعام کبھی ملامت نہ کرتے۔ ایک بار مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے اپنی داڑھی سے تنکا الگ کر کے مسجد میں ڈال دیا۔ امام صاحب نے وہ تنکا چپکے سے اٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لیا اور بعد میں اسے مسجد سے باہر پھینک دیا۔

امام صاحب سفر میں رہے یا قیام کی حالت میں آپ جامع صحیح کی تالیف و ترتیب میں مصروف رہے۔ آپ نے ہر باب کے تحت احادیث کا اندراج ایک بار تو حرم پاک میں انجام دیا اور دوسری مرتبہ مسجد نبویؐ میں منبر و محراب کے درمیان۔ سولہ سال کی مسلسل ریاضت اور محنت کے بعد امام صاحب نے بالآخر بالکل صحیح اور مستند احادیث کا مجموعہ ترتیب دے لیا۔ اس مجموعہ میں سات ہزار دو سو پچھتر احادیث ہیں جنہیں امام صاحب نے چھ لاکھ احادیث میں سے منتخب کر کے لکھا ہے۔ ہر حدیث کو اپنی کتاب میں درج کرنے سے قبل آپ نے اس کے متن، راویوں اور حوالوں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی لیکن ان 7275 احادیث میں سے ہر ایک کو اپنی کتاب میں شامل کرنے سے قبل آپ نے ہر بار غسل فرمایا، دو رکعت نفل نماز ادا کی پھر اس حدیث کی صحت کے بارے میں استخارہ کیا اور جب اللہ کی طرف سے ان کے دل کو اطمینان بخش دیا گیا تب انہوں نے اس حدیث کو اپنی کتاب میں درج فرما دیا۔ جب امام صاحب نے اپنی جامع صحیح، امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی اور یحییٰ بن معین جیسے مشہور شیوخ کے سامنے پیش کی تو سب نے اس کی بہت تعریف کی اور اس کتاب کی صحت کی گواہی دی۔ اس کتاب کو 90 ہزار افراد نے امام بخاریؒ سے براہ راست پڑھا ہے۔ صحیح بخاری محض احادیث کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کو فقہی نقطہ نظر سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں کئی حکیمانہ باتیں شامل ہیں۔ امام نوویؒ کے بقول، امام بخاریؒ کا مقصد احادیث سے مسائل کا استنباط (نتیجہ نکالنا) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب نے ایک ہی متن کی حدیث کو کئی بابوں میں درج کیا ہے تاکہ ایک ہی حدیث سے نکلنے والے کئی مطالب اور مسائل کی نشاندہی کی جاسکے۔

صحیح بخاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری صدی ہجری سے لے کر آج پندرہویں صدی ہجری تک صحیح بخاری پر علماء کرام کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اس کے مشکل الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں اور اس کے رجال پر تحقیق کی گئی ہے۔

امام بخاریؒ کے زمانے میں بصرہ، بغداد، نیشاپور، سمرقند اور بخارا علوم اسلامیہ کے مراکز تھے۔ آپ ان شہروں میں بار بار گئے ہر بار آپ کے عقید مند آپ کا والہانہ خیر مقدم کرتے تھے۔ آپ حلقہ درس قائم کرتے اور احادیث املا کرواتے۔ 256ھ/870ء میں آپ بخارا سے سمرقند

روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک بستی خرنگ میں قیام کیا جہاں آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ اس دوران سرقند والوں کو آپ کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔ انہوں نے آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے آدمی بھیج دیا۔ امام صاحب نے جانے کی تیاری کی۔ عمامہ باندھا، موزے پہنے، سواری طلب کی لیکن سواری کی طرف چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ فرمایا: ”ضعف بڑھتا جا رہا ہے مجھے چھوڑ دو“ آپ لیٹ گئے۔ آپ کی زبان مبارک پر اللہ کی حمد و ثنا اور دعائیں جاری ہو گئیں۔ کچھ دیر آپ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ یہ یکم شوال / یکم ستمبر کی رات تھی۔ یعنی اگلے روز عید الفطر تھی جو خوشیوں بھر دان ہوتا ہے لیکن آپ کے جسد خاکی کے اطراف چہرے سو گوار تھے۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ عید کے دن نماز ظہر کے بعد آپ کو خرنگ ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ نے تقریباً 62 سال کی عمر پائی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ”وفن کیے جانے کے بعد امام بخاری کی قبر سے بہت اچھی خوشبو پھوٹی۔ جس سے فضا مہک اٹھی۔ لوگ دور دور سے اس مٹی کو حاصل کرنے کے لیے آنے لگے حتیٰ کہ مٹی کی حفاظت کے لیے قبر کے گرد احاطہ بنا دیا گیا۔“



اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب اردو ادب کے مشہور افسانے بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل

ہیں۔ (آخری آدمی، پسماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دکھ مجھے دے دو، وہ بڑھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عید گاہ، کفن، شکوہ شکایت، منشی پریم چند)؛ (گڈریا، اشفاق احمد)؛ (توبہ شکن، بانو قدسیہ)، (گنڈاسا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کمر بند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونا لیزا، اے۔ حمید)؛ (اوور کوٹ، غلام عباس)؛ (مہاکشمی کا پل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جوگندر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قراۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

رسول اللہ کے خادم خاص، علم فقہ کے امام

برکتوں اور سعادتوں سے بھرپور رمضان کا مبارک مہینہ رخصت ہونے کو تھا۔ آخری عشرے کی ایک رات بیت چکی تھی۔ تاریکی سمنی جاری تھی اور صبح کا اجالا اس شہر کے گلی کو چوں، بازاروں اور دروہام کو منور کر رہا تھا۔ ایسے میں ایک بزرگ اپنے مکان کی چھت پر تشریف فرما تھے اور ملنے کے لیے آئے ہوئے ایک صاحب سے کہہ رہے تھے:

”اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا ہے۔!“

”وہ کیا ہے؟“ ان صاحب نے پوچھا۔

بزرگ نے جواب دیا: ”رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس میں شعاع نہیں ہوتی، چنانچہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

یہ بزرگ تھے رسول اللہ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں طویل عرصہ تک رسول اللہ کی خدمت کا شرف حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شب قدر کو ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے اور رسول پاکؐ نے فرمایا ہے کہ لوگو! تم پر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا وہ سارے کے سارے خیر سے محروم رہ گیا اور اس شب کی خیر و برکت سے وہی محروم رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔ رسول اللہؐ نے اس عظیم رات کو رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ لوگ نہایت خوش نصیب ہیں جو اس رات کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور یقیناً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بے حد خوش نصیب تھے کہ وہ شب قدر کو پالینے میں کامیاب ہو گئے۔

آپؓ کا نام عبداللہ، کنیت ابو عبد الرحمن، والد کا نام مسعود اور والدہ کا نام ام عبدؓ ہے۔ اس لیے آپؓ ابن ام عبدؓ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

عرب کا دستور تھا کہ لڑکوں کو روزانہ بھیڑ بکریاں چرانے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو بھی لڑکپن میں یہی ذمہ داری سونپی گئی۔ ایک دن آپؓ عقبہ بن معیط کی بکریاں چرا رہے تھے کہ سرور کائناتؐ اپنے رفیق حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ادھر سے گزرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا: ”صاحب زادے! تمہارے پاس کچھ دودھ ہے تو ہماری پیاس بجھاؤ۔“ نوجوان عبداللہؓ نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا: ”میں آپؓ کو دودھ نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ دوسرے کی امانت ہے۔“ یہ اس معاشرے میں بسنے والے نوجوان کا جواب تھا۔ جس میں چاروں اطراف گمراہی کے اندھیرے پھیلے ہوئے تھے، لیکن زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے نے اس نوجوان کو وہ پاکیزہ نفس عطا کر دیا تھا جو اسے برائی اور بھلائی میں تمیز کرنا سکھاتا تھا۔

رسول اللہؐ نے نوجوان کا جواب سن کر دریافت فرمایا: ”اچھا! کیا تمہارے پاس کوئی بن بیابا بکری بھی ہے۔“ جواب ملا۔ ”ہاں“ اور

نوجوان عبداللہؑ نے ایسی ایک بکری پیش کر دی۔ حضورؐ نے اس بکری کے تھن پر ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی۔ کائنات کے خالق سے اس کے محبوب بندے نے دعا کی تھی۔ تائید ایزدی سے بکری کے تھن دودھ سے لبریز ہو گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اسے دو ہاتھوں سے دودھ نکالا کہ تینوں افراد نے سیر ہو کر پیا۔ پھر رسول کریمؐ نے بکری کے تھن کو حکم دیا۔ ”خشک ہو جا“ تھن اپنی اصلی حالت پر واپس آ گئے۔

یہ معجزہ دیکھ کر نوجوان عبداللہؑ حیرت زدہ رہ گئے۔ رسول اقدسؐ کی مسحور کن شخصیت نے انہیں اسیر کر لیا۔ عرض کیا ”مجھے اس مؤثر کلام کی تعلیم دیجیے۔“ حضورؐ نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا ”تم تعلیم یافتہ بچے ہو۔“ یہی وہ مبارک دن تھا جب رسول عربیؐ نے نوجوان عبداللہؑ کو اپنے شاگردوں کی صف میں شامل فرمایا اور اپنے خادم خاص کا مرتبہ دیا۔ خود اس پاکیزہ صفت نوجوان کی تربیت کی، ستر سورتوں کی خود تعلیم دی۔ جس نے اللہ کے حبیبؐ سے علم کی دولت پائی ہو اس کا کیا پوچھنا، چنانچہ حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ ان عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جو علم و فضل کے اعتبار سے امام تسلیم کیے گئے ہیں۔

جب اس بیس سالہ نوجوان کی زبان پر کلمہ شہادت جاری ہوا تو اسلام کو بحیثیت دین قبول کرنے والوں کی تعداد اس روئے زمین پر بہت تھوڑی تھی اور دنیا اس بات سے بے خبر تھی کہ صرف چند سالوں بعد یہ نیا دین کتنی بڑی قوت بن جائے گا۔ حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ بجا طور پر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انہیں اسلام لانے والے چھٹے فرد کا اعزاز نصیب ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف یہی اعزاز حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ کے لیے سرمایہ افتخار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اور بھی کئی امتیازات سے نوازا ہے۔

حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ وہ خوش نصیب صحابیؓ ہیں جنہیں رسول پاکؐ کے تکیہ، جنگ کا سامان اور جو توں کی نگرانی کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضورؐ کے لیے مسواک کا اہتمام کرنا بھی آپؐ ہی کے فرائض میں داخل تھا۔ سواری کے موقع پر کجاوہ کتے اور عصا لے کر حضورؐ کے آگے آگے چلتے۔ آپؐ اور آپؐ کی والدہ محترمہ ام عبدؓ کو حضورؐ کا اس قدر قرب حاصل تھا کہ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ یمن سے مدینہ آئے اور انہوں نے حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ کو حضورؐ کے پاس بار بار جاتے دیکھا تو ایک عرصہ تک وہ حضرت عبداللہؑ کو حضورؐ کے خاندان کا ہی ایک فرد سمجھتے رہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ خود فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؑ کو ان موقعوں پر بھی حضورؐ کی خدمت میں حاضری کی اجازت تھی جب کہ دیگر صحابہؓ کرامؓ کو روک دیا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ میں علم دین حاصل کرنے کی تڑپ تھی۔ دن رات حضورؐ کی خدمت میں حاضری دیتے اور آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے علم و معرفت کے موتی سمیٹ لیتے۔

علم دین کے حصول کی تڑپ اور حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ کی فہم و فراست کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام پاکؐ کی تفسیر بیان کرنے میں آپؐ کا بہت بلند مقام ہے۔ آپؐ کی بیان کردہ تفاسیر مختلف کتابوں میں شامل ہیں۔ انہیں اگر مجتمع کیا جائے تو ایک مکمل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

احادیث کی مستند میں آپؐ سے 848 احادیث روایت کی گئی ہیں۔ آپؐ کا شمار ان بلند پایہ صحابہؓ کرامؓ میں ہوتا ہے جو فقہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ فقہ حنفی کی تمام تر بنیاد آپؐ ہی کے فتاویٰ پر رکھی گئی ہے۔ حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ ان چار صحابہؓ کرامؓ میں شامل ہیں جن کے متعلق رسول پاکؐ نے فرمایا کہ قرآن کریم چار آدمیوں سے حاصل کرو۔ حضورؐ نے سب سے پہلے ابن ام عبدؓ (عبداللہؑ بن مسعودؓ) کا نام لیا۔ دیگر صحابہؓ کرامؓ میں حضرت سالمؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ شامل ہیں۔ حضرت عبداللہؑ بن مسعودؓ خود فرماتے ہیں کہ ”قرآن پاکؐ میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں میں نہ جانتا ہوں کہ کب، کہاں اور کس سلسلے میں نازل ہوئی۔“

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات حضور اکرمؐ، حضرت ابو بکرؓ اور میں رات گئے تک نبی کریمؐ کے ایک کام کے سلسلے میں بات چیت کرتے رہے۔ فارغ ہو کر نکلے تو حضورؐ میرے اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان چل رہے تھے۔ جب ہم مسجد کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے۔ حضورؐ کھڑے ہو گئے اور کان لگا کر سننے لگے۔ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ رک گئے؟“ آپؐ نے ہاتھ کے

اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس آدمی نے قرأت کے بعد رکوع کیا، سجدے کئے اور دعا میں مشغول ہو گیا۔ حضورؐ نے اس سے فرمایا: ”تم مانگو! اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائیں گے“ یہ بات آپؐ نے دوبار فرمائی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ”جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ وہ قرآن کریم کو اسی طرح پڑھے جس طرح کہ نازل ہوا ہے تو وہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کی طرح قرآن پڑھے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود کو تلاوت کلام پاک کا بہت شوق تھا۔ تنہائی میں اکثر قرآن پاک پڑھا کرتے۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ ایک بار حضورؐ نے فرمایا: ”مجھے سورۃ النساء پڑھ کر سناؤ۔“ میں نے عرض کی ”یا رسول اللہ! قرآن تو آپؐ پر نازل ہوا ہے اور آپؐ کو میں سناؤں؟“ ارشاد ہوا: ”کیوں نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ کوئی قرآن پڑھے اور میں سنوں۔“ میں نے حکم کی تعمیل کی جب اس آیت پر پہنچا:

ترجمہ: ”بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان پر گواہ بنائیں گے۔“ (النساء۔ 41)

تو میں نے دیکھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود طویل عرصہ تک حضورؐ کے ساتھ رہے۔ آپؐ سے دین کا بیش بہا علم حاصل کیا۔ 848 احادیث روایت بھی کیں، لیکن حدیث بیان کرتے ہوئے آپؐ حد درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب کبھی ”قال رسول اللہ“ فرماتے کانپ اٹھتے۔ حضرت ابو عمر شیبانیؒ فرماتے ہیں: ”ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعود نے حدیث بیان فرمائی تو آپؐ کا بدن تھر تھرا اٹھا“ کہنے لگے ”حضورؐ نے اس طرح فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب یا اس کے مشابہ۔“

حدیث بیان کرتے ہوئے نہایت سنجیدہ ہو جاتے تھے اور ادب و احترام کے ساتھ حدیث بیان فرماتے تھے۔ آپؐ نے حضورؐ کی رفاقت میں جو طویل عرصہ گزارا اس دوران آپؐ نے جس توجہ اور محبت کے ساتھ حضورؐ کی عادات و اخلاق کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار ایک طویل حدیث بیان کی جس میں قیامت، جنت اور مسلمانوں اور اللہ تعالیٰ کے سوال و جواب کا ذکر تھا۔ حدیث ختم کر کے آپؐ مسکرا دیے پھر فرمایا: ”آپؐ لوگ پوچھتے نہیں کہ میں کیوں مسکرا رہا ہوں؟“ لوگوں نے پوچھا: ”آپؐ کیوں مسکرا رہے ہیں؟“ فرمایا: ”اس لیے کہ حدیث بیان کر کے حضورؐ بھی مسکرائے تھے!“ حضرت حذیفہؒ سے پوچھا گیا کہ ایسا کون شخص ہے جو عادات اور طریقوں کے لحاظ سے حضورؐ سے قریب تر ہو۔ جواب ملا: ”سب سے زیادہ حضرت عبداللہ بن مسعود، آنحضرتؐ کی ہدایت، حسن خلق اور طور طریقوں کے پابند تھے۔“ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا فقہ میں بہت بلند مقام ہے اور فقہ حنفی کی عمارت آپؐ ہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ حضرت عمرؓ نے 20ھ/641ء میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو قاضی اور افسر بیت المال مقرر کر کے کوفہ بھیجا اور ساتھ ہی خط تحریر کیا۔ ”میں نے حضرت ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو خود سے جدا کر کے ایثار کا مظاہرہ کیا ہے۔“

مسلمانوں کو تعلیم دینے اور کوفہ کے گورنر کی وزارت کے فرائض بھی آپؐ کے سپرد تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کوفہ پہنچ کر ایک حلقہ درس قائم کیا۔ لوگ آتے اور مختلف دینی مسائل دریافت کرتے یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ پورا خطہ عراق فقہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا پیروکار ہو گیا۔ آپؐ کی یہ درس گاہ کوئی معمولی درس گاہ نہ تھی۔ یہاں بڑے بڑے علماء اور ائمہ تیار ہوئے۔ آپؐ کے شاگردوں میں سے علقمہؒ اور اسودؒ نے فقہ میں کمال حاصل کیا۔ ان کے بعد حضرت ابراہیم نخعیؒ کوفہ کی فقہ کے حوالے سے مشہور ہوئے۔ یہاں تک کہ فقیہ عراق کہلائے جانے لگے۔ ان کے پاس حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ کا بڑا ذخیرہ تھا۔ یہ ذخیرہ ان سے حضرت حمادؒ تک منتقل ہوا اور حضرت حمادؒ سے علم کا یہ بیش قیمت خزانہ حضرت امام ابو حنیفہؒ تک پہنچا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے فہم و فراست اور قوت اجتہاد سے اس فقہ کو اس قدر وسعت دی کہ آج مسلمانوں کی اکثریت اس فقہ پر کاربند ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے دیگر شاگردوں میں مسروق، عبیدہ، حارث، قاضی شریح اور ابو وائلؒ نے بہت نام پایا۔ حضرت علقمہؒ تو آپؐ کے طور طریقوں کے اس قدر پابند تھے کہ لوگوں کا کہنا تھا کہ جس نے علقمہؒ کو دیکھ لیا اس نے عبداللہ بن مسعود کو دیکھ لیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی تقریر مختصر، جامع اور بے حد مؤثر ہوتی تھی۔ اس کی اثر آفرینی کا اندازہ اس بات سے لگایے کہ لوگ آپ کے مکان سے نکلنے کے منتظر رہتے تھے تاکہ آپ آئیں تو آپ سے علم حاصل کیا جائے۔ تقریر میں عموماً توحید، نماز، جماعت اور خوف خدا کی تلقین فرماتے۔ تقریر کے دوران واقعات اور تمثیلات کا حوالہ بھی دیتے لوگوں کے شوق کے باوجود آپ زیادہ وعظ و نصیحت سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ جب بھی حضرت عبداللہ بن مسعود کو دیکھتے تو چہرہ ہشاش بشاش ہو جاتا۔ فرماتے: ”ایک طرف ہے جو علم سے بھرا ہے۔“ ایک بار حضرت علیؓ سے کوفہ کے چند افراد نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے تقویٰ، حسن خلق اور علم کی تعریف کی۔ حضرت علیؓ نے پوچھا: ”کیا آپ یہ باتیں سچے دل سے کہہ رہے ہیں؟“ جواب ملا ”جی ہاں۔“ حضرت علیؓ نے فرمایا: ”آپ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی جو کچھ تعریف کی ہے میں ان کو اس سے بھی بہتر خیال کرتا ہوں۔“

امام محمدؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے چھ اصحاب مجتہد سمجھے جاتے تھے۔ وہ فقہ کے مسائل میں بحث و مذاکرہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت علیؓ، ابی بن کعبؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ایک ساتھ اور حضرت عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ایک ساتھ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مسائل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

غزوہ تبوک کے زمانے میں مسلمانوں کا لشکر راستے میں ایک جگہ ٹھہر گیا۔ حضورؐ کے لیے مسواک کا اہتمام کرنا بھی حضرت عبداللہ بن مسعود کے ذمہ تھا۔ چنانچہ وہ مسواک کاٹنے کے لیے پیلو کے درخت پر چڑھ گئے۔ آپؐ کی ٹانگیں نہایت دہلی پتلی تھیں۔ لوگوں نے دیکھا تو ہنس پڑے حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کیوں ہنس رہے ہیں؟“ لوگوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی پتلی ٹانگیں دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ حضورؐ نے فرمایا: ”یہ ٹانگیں جو تمہیں اس وقت انتہائی کمزور اور ہلکی دکھائی دے رہی ہیں قیامت کے روز میزان میں احد کے پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ہوں گی۔“ ایک بار کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کو نماز کے لیے پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے انتظار نہیں کیا اور نماز پڑھا دی۔ ولید ناراض ہوئے اور انہوں نے پیغام بھیج دیا۔ ”آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟ کیا یہ امیر المؤمنینؓ کا حکم ہے یا آپؐ کی اپنی ایجاد ہے۔؟“ جواب ملا۔ ”نہ تو امیر المؤمنینؓ کا حکم ہے نہ اپنی ایجاد، البتہ اللہ کو یہ ناپسند ہے کہ آپؐ اپنے مشاغل میں مصروف رہیں اور لوگ نماز کے لیے آپؐ کے منتظر رہیں۔“ حضرت تمیم بن حرامؓ فرماتے ہیں: ”مجھے اکثر اصحاب رسولؐ کی ہم نشینی کا فخر حاصل ہے۔ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے زیادہ کسی کو دنیا سے بے خبر اور آخرت کا طالب نہیں دیکھا۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود نہایت سادہ مزاج تھے۔ بالعموم سفید رنگ کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ ایک انگلی میں لوہے کی انگلی پہنتے تھے جو غالباً مہر لگانے کے کام آتی تھی۔ خضاب نہ لگاتے تھے اور عطر کا متواتر استعمال کرتے تھے۔

آپؐ نہایت رحم دل واقع ہوئے تھے لیکن جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام پر عمل کرنے کا معاملہ درپیش ہوتا۔ وہاں کسی رعایت سے کام نہ لیتے۔ ایک بار عدالت میں کسی شخص نے اپنے بھتیجے کو شراب نوشی کے الزام میں پیش کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے تحقیقات کروائی تو الزام درست ثابت ہوا۔ آپؐ نے مجرم کو سزا دینے کا حکم دیا۔ جب کوڑے پڑنے لگے تو وہی شخص جو اپنے بھتیجے کو عدالت میں پکڑ لایا تھا۔ اب آپؐ کی منت سماجت کرنے لگا کہ اسے چھوڑ دیجیے۔ اس سے اپنے بھتیجے کی حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس بات پر ناراض ہو کر فرمایا ”تم بے حد ظالم چچا ہو پہلے اسے حد شرعی کا مستحق ثابت کرو یا پھر اب چھوڑ دینے کی سفارش کر رہے ہو یہ اب ممکن نہیں۔“ انصاف کے انہی اصولوں پر آپؐ تمام عمر سختی سے عمل پیرا رہے۔

مکہ سے واپسی پر غزوہ حنین پیش آئی۔ حضرت عبداللہؓ خود فرماتے ہیں کہ مشرکین نے اس طرح حملہ کیا کہ مسلمان منتشر ہو گئے۔ دس ہزار میں سے صرف 80 اصحاب رسولؐ اللہ کے گرد جمع ہو گئے۔ ہم لوگ تقریباً 80 قدم تک پسپا ہوئے، لیکن پھر ہم نے قدم جما لیے۔ حضورؐ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتے، لیکن وہ پیچھے ہٹتا۔ اس حالت میں ایک بار آپؐ ذرا جھکے تو میں نے پکار کر کہا ”آپؐ سر بلند رہیں اللہ نے آپؐ کو رفعت

بخشی ہے۔“ رسول اللہ نے مجھے حکم دیا ”مجھے ایک مٹھی خاک اٹھا کر دو۔“ میں نے خاک اٹھا کر دی۔ آپؐ نے وہ خاک دشمنوں کی طرف پھینک دی۔ پھر فرمایا: ”مہاجرین و انصار کہاں ہیں؟“ میں نے اشارے سے بتایا تو حکم ہوا۔ ”انہیں آواز دے کر بلاؤ“ میں نے چیخ کر مہاجرین و انصار کو بلایا تو یکا یک سب پلٹ پڑے اور مشرکین پر ٹوٹ پڑے۔ ذرا دیر میں پانسہ پلٹ گیا اور مشرکین کو بھاگتے ہی بنی۔

آپؐ نے جہاں علم کے شعبہ میں اپنی فراست کا لوہا منوایا وہیں جنگ و جدل کے میدان میں بھی جرأت و بہادری کی ناقابل فراموش مثالیں قائم کیں۔ آپؐ کے ایمان کی قوت اور بے خونی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب صرف چند صحابہؓ کرام ایمان لائے تھے اور حضور اقدسؐ کے سوا کسی کو بلند آواز میں کلام پاک پڑھتے نہیں سنا گیا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فوراً آگے بڑھے اور قریش کو قرآن پاک سنانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ آپؐ کے ساتھیوں نے منع کیا کہ آپؐ کا خود کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ یہ کام تو ایسے شخص کو کرنا چاہیے جس کا خاندان بڑا ہوتا کہ مشرکین سے اس کی حفاظت کر سکے، لیکن حضرت عبداللہؓ کا جواب تھا ”مجھے چھوڑ دیجیے۔ اللہ میرا حافظ ہے۔“

دوسرے دن جب مشرکین خانہ کعبہ میں جمع ہوئے تو حضرت عبداللہؓ وہاں پہنچے اور آپؐ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر بلند آواز میں قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔ پہلے پہل تو لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ آپؐ کیا پڑھ رہے ہیں۔ وہ تعجب کے ساتھ سننے لگے پھر ایک طرف سے کسی نے کہا ”ارے محمدؐ پر جو کتاب اتری ہے وہی پڑھ رہے ہیں۔“ یہ آواز آنی تھی کہ کفار بھڑک گئے۔ چاروں طرف سے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑے۔ آپؐ کو اس قدر مارا پیٹا گیا کہ چہرے پر ورم آ گیا۔

حضرت عبداللہؓ واپس لوٹے تو آپؐ کے ساتھیوں نے کہا ”دیکھا اسی لیے ہم تمہیں جانے نہ دیتے تھے۔“ حضرت عبداللہؓ نے کمال بے خونی سے کہا: ”اللہ کی قسم! اللہ کے دشمن آج سے زیادہ میری نظر میں کبھی ذلیل نہ تھے۔ اگر آپؐ چاہیں تو میں کل پھر اسی طرح اس کے مجمع میں جا کر انہیں قرآن پاک سناؤں۔“ صحابہؓ کرم نے کہا ”بس جانے بھی دو۔ اتنا ہی کافی ہے۔ وہ جس چیز کا سننا پسند نہ کرتے تھے اس کو تم نے بلند آواز سے ان کے کانوں تک پہنچا دیا۔“

آپؐ تمام اہم جنگوں میں شریک رہے۔ بدر کا معرکہ ہو یا احد کا میدان، غزوہ خندق ہو یا حدیبیہ کا مرحلہ، غزوہ خیبر اور فتح مکہ تمام مواقع پر حضورؐ کے شانہ بہ شانہ داؤد شجاعت دی۔

کوفہ میں آپؐ بحیثیت قاضی اور افسر بیت المال دس سال تک مقیم رہے۔ اس دوران گورنر تبدیل ہوئے، لیکن آپؐ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوئی۔ کوفہ کی وسعت اور موصول ہونے والے محصولات کی کثرت کے اعتبار سے یہاں کا بیت المال بہت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ فوجی مرکز تھا۔ ہزاروں سپاہیوں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ لاکھوں کے وظائف جاری ہوتے تھے۔ خراسان، ترکستان اور آرمینیا پر فوج کشی کے مصارف ادا کیے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے نہایت محنت اور توجہ کے ساتھ اس گراں بار ذمہ داری کو نبھایا۔

32ھ میں آپؐ کی عمر 60 سال سے زائد ہو چکی تھی۔ ایک شخص آپؐ کے پاس آیا کہنے لگا ”اللہ مجھے آپؐ کی آخری زیارت سے محروم نہ رکھے۔ میں نے کل رات خواب میں دیکھا کہ حضورؐ ایک بلند منبر پر تشریف فرما ہیں اور آپؐ ان کے سامنے حاضر ہیں۔ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں ”ابن مسعودؓ میرے بعد تمہیں بہت تکلیفیں پہنچائی گئی ہیں۔ آؤ میرے پاس چلے آؤ۔“

حضرت عبداللہؓ نے دریافت کیا ”خدا کی قسم تم نے یہ خواب دیکھا ہے۔؟“ کہنے لگے ”جی ہاں“ فرمایا: ”تم میرے جنازے میں شریک ہو کر ہی مدینہ سے کہیں جاؤ گے۔“

چند دن بعد آپؐ علیل ہو گئے اور یہی علالت آپؐ کے سفر آخرت کا پیغام لے کر آئی۔ حضرت عثمانؓ نے آپؐ کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں صحابی رسولؐ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے پہلو میں آپؐ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

آپ کا شمار اسلام قبول کرنے والے پہلے سات خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے

وہ نوجوان بہت پریشان تھا!

پریشانی کوئی معمولی نہ تھی۔ نوجوان کی والدہ اس سے ناراض ہو گئی تھیں، انہوں نے کھانا پینا، بات چیت سب بند کر دی تھی، ماں کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان نے ایک نیا مذہب اسلام قبول کر لیا تھا۔

تین دن ہونے کو آئے تھے اور ماں نے نہ کوئی چیز کھائی تھی۔ نہ پانی پیا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بیٹا جب تک اسلام کو ترک نہ کرے گا۔ میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی نہ اس سے بات کروں گی۔

نوجوان کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی، ماں سے تو سبھی محبت کرتے ہیں۔ ماں ہے ہی ایسی پیاری ہستی، اپنی اولاد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی۔ نوجوان کو اس بات کا دکھ تھا کہ ماں اس کی بات سمجھ نہیں رہی ہیں لیکن وہ اسلام کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

آخر نوجوان اپنی ماں کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ ”ماں! آپ مجھے بے حد عزیز ہیں لیکن آپ کے قالب میں خواہ ہزار جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے ہر جان نکل جائے تب بھی میں اسلام نہیں چھوڑوں گا۔“

بیٹے کے منہ سے یہ بات سن کر ماں حیران رہ گئیں لیکن جب بیٹے نے اسلام کی باتیں دلشین انداز میں بیان کرنی شروع کیں تو ماں کا دل پگھل گیا، دین اسلام کی کشش انہیں بھی کھینچ لے گئی اور وہ بھی دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئیں۔

اسلام کے عشق سے سرشار یہ نوجوان تھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو نبی کریمؐ کے ان قابل رشک دس صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جنہیں رسول اقدسؐ نے دنیا ہی میں جنت کی خوشخبری سنائی تھی۔ ان صحابہ کرامؓ کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے۔

آپؓ کا نام سعد اور کنیت ابو اسحق ہے جو آپؓ کے بڑے صاحبزادے اسحق کے نام پر رکھی گئی ہے۔ آپؓ کو سعد بن ابی وقاصؓ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپؓ کے والد محترم مالک بن وہیب کی کنیت ابو وقاصؓ ہے۔ آپؓ کا تعلق قبیلہ بنو زہرہ سے ہے اور آپؓ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ملتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی والدہ ماجدہ بھی قبیلہ بنو زہرہ سے تھیں اور حضرت سعدؓ کے والد ابو وقاصؓ کی چچا زاد بہن تھیں اس لحاظ سے ابو وقاصؓ رشتہ میں حضور اکرمؐ کے ماموں ہوتے تھے اور حضرت سعدؓ ماموں زاد بھائی۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو نبوت کے منصب پر سرفراز کیا تو حضرت سعدؓ اپنی عمر عزیز کی سترہ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ رسول اللہؐ کے قریب ترین ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حضرت سعدؓ کی اچھی دوستی تھی۔ حضرت سعدؓ نے جب نئے مذہب اسلام کا ذکر سنا تو اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ دل نے حق کی پکار پر لبیک کہا اور آپؐ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ آپؐ کا شمار اسلام قبول کرنے والے پہلے سات خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں حضور اکرمؐ کو اپنے اسلام کو ظاہر نہ کرنے کا حکم تھا تو حضرت سعدؓ دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی قریبی

پہاڑیوں یا سنسان گھاٹیوں میں نکل جاتے اور وہاں چھپ چھپ کر نماز ادا کرتے۔ ایک دن چند مشرکین اس طرف آ نکلے۔ انہوں نے جو ایک نانوس طریقہ عبادت کو دیکھا تو لگے چھیڑ چھاڑ کرنے۔ حضرت سعدؓ نو جوان تھے، خون جوش میں آ گیا۔ قریب ہی اونٹ کی ہڈی پڑی ہوئی تھی، آپ نے وہ اٹھالی اور ایک مشرک پر حملہ کر دیا۔ ہڈی کی ضرب سے مشرک کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ حضرت سعدؓ وہ پہلے مسلمان ہیں جن کے ہاتھ سے اسلام کی حمایت میں کسی کا خون بہا۔

حضرت سعدؓ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ جب رسول اکرمؐ اور ان کے اہل خاندان کو کفار نے تین سال تک، شعب ابی طالب کی گھاٹی میں محصور کر دیا تو حضرت سعدؓ بھی حضورؐ کے ساتھ تھے۔ یہ تین سال بڑے کٹھن تھے، کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے پیے گزر جاتے تھے۔

ہجرت کا حکم ہوا تو حضرت سعدؓ بھی اپنے بھائی عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔ مدینہ طیبہ میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو چاروں طرف سے خطرات منڈلاتے رہتے تھے۔ حضورؐ ان خطرات کے پیش نظر مسلح دستے، دشمن کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔ ان مہمات کو سریہ کہتے ہیں۔ ایک سریہ میں جس کی قیادت حضرت عبیدہ بن حارثؓ کر رہے تھے، قریش کے ایک قافلے سے ٹکبھیڑ ہوئی۔ باقاعدہ لڑائی تو نہ ہوئی البتہ مخالف سمت سے کسی نے نعرہ مارا تو حضرت سعدؓ نے قریش کی سمت ایک تیر چلا ہی دیا۔ آپؐ خود فرماتے ہیں کہ ”میں پہلا عرب ہوں جس نے راہ اللہ میں تیر چلایا۔“

رمضان 2ھ میں غزوہ بدر کا معرکہ ہوا۔ اس معرکہ میں حصہ لینے والے 313 جانبازوں میں حضرت سعدؓ بھی شامل تھے۔ لڑائی شروع ہوئی، حضرت سعدؓ انتہائی جوانمردی سے تلوار چلاتے ہوئے کفار کے ایک سردار سعید بن العاصؓ تک جا پہنچے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آپؐ نے سعید بن العاصؓ کی مشہور تلوار ”ذوالکیتھ“ پر قبضہ کر لیا۔ جنگ ختم ہوئی تو آپؐ یہ تلوار لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”تلوار جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دو۔“ حضورؐ نے یہ حکم اس لیے دیا کہ اس وقت تک مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ غزوہ بدر میں حضرت سعدؓ کے چھوٹے بھائی عمیرؓ شہید ہو گئے تھے۔ حضرت سعدؓ کو ان سے پچھڑنے کا صدمہ تو تھا ہی پھر سعید بن العاصؓ کی تلوار نہ ملنے کا بھی افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن آپؐ نے سعید کی تلوار فوراً رکھ دی۔ کچھ ہی دیر بعد سورہ انفال نازل ہوئی جس میں مال غنیمت کے بارے میں احکام تھے۔ حضورؐ نے حضرت سعدؓ کو بلایا اور فرمایا: ”جاؤ اپنی تلوار لے لو۔“

صرف ایک سال بعد یعنی 3ھ میں اپنے زخم چاٹتے ہوئے قریش پھر مقابلے پر نکلے۔ میدان احد میں اسلام اور کفر کے لشکروں کا آنا سامنا ہوا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی غلطی سے پانسہ پلٹ گیا اور اسلامی فوج منتشر ہونے لگی۔ اس نازک موقع پر یہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے جو چند دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ حضورؐ کی حفاظت کے لیے ڈٹ گئے۔ آپؐ نہایت جرأت کے ساتھ تیر برسائے جارہے تھے۔ آپؐ کے عزم و استقلال اور شجاعت کو دیکھ کر سرور کائنات کی زبان مبارک سے نکلا ”اے سعدؓ تیر چلا میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔“ کیا مرتبہ ہے اس شخص کا جس کے لیے دونوں جہانوں کے سردار یہ کہیں کہ ”میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔“ حضرت علیؓ فرماتے ہیں ”میں نے سعدؓ کے سوا کسی اور کے حق میں ایسے الفاظ رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے نہیں سنے۔“

چاروں طرف سے کفار یورش کر رہے تھے، حضرت سعدؓ تیر چلا رہے تھے رسول مقبولؐ نے تیر اٹھا کر فرش پر ڈال دیے اور ایک ایک تیر اٹھا کر حضرت سعدؓ کو دینے لگے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے ”اے سعدؓ تیر چلا میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔“ ایک تیر ایسا تھا جس میں انی نہیں تھی، حضرت سعدؓ نے عرض کی۔ ”اے اللہ کے رسولؐ یہ تو خالی ہے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”اسے بھی چلاؤ۔“

اسی معرکہ احد کا ذکر ہے، ایک مشرک مسلمانوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا، حضورؐ نے حضرت سعدؓ کو حکم دیا کہ اس پر حملہ کر دو۔ ترکش

میں کوئی تیر نہیں بچا تھا، حضرت سعدؓ نے بغیر پھل کا تیر اٹھایا اور اس مہارت سے اس مشرک کی پیشانی پر مارا کہ وہ بدحواس ہو کر پیچھے گر پڑا۔

بدرواحد کے بعد غزوہٴ خندق کا مرحلہ آیا۔ یہاں بھی حضرت سعدؓ نے اپنی جانبازی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس غزوہ کا ایک واقعہ حضرت سعدؓ خود بیان فرماتے ہیں کہ ”ایک کافر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر خندق عبور کر گیا، اس نے زرہ پہن رکھی تھی اور سر پر خود تھا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں، جب وہ میرے تیر کی زد میں آ گیا تو میں نے ایک تیر نکال کر کمان سے جوڑا، وہ یہ دیکھ کر ٹھہر گیا وہ اپنی ڈھال کو ناک کے کبھی اوپر اور کبھی نیچے کرتا رہا جیسے ہی اس نے یہ حرکت بند کی، میں نے کمان پر چڑھا ہوا تیر تاک کر اس کی آنکھ پر مارا۔ وہ گھوڑے سے گر کر تڑپنے لگا، یہ دیکھ کر حضورؐ بے ساختہ ہنس پڑے۔“

احزاب، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف، تبوک، تمام غزوات میں حضرت سعدؓ حضور اکرمؐ کے شانہ بشانہ لڑے۔ 10ھ میں رسول پاکؐ حجۃ الوداع کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو حضرت سعدؓ ہمراہ تھے مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت سعدؓ شدید بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لیے تشریف لائے تو حضرت سعدؓ نے عرض کی اے اللہ کے رسولؐ میرا، ایک بیٹی کے سوا کوئی وارث نہیں مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں، جواب ملا ”نہیں۔“ عرض کی نصف ہی سہی حضورؐ نے ارشاد فرمایا ”نہیں“ عرض کی: ”تو ایک تہائی مال صدقہ کرنے کی اجازت دے دیجیے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”ایک تہائی بھی بہت ہے، اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑو گے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہوں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں تم جو کچھ بھی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے صرف کرو گے۔ اس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ ڈالتے ہو اس کا بھی ثواب پاؤ گے۔“

حضرت سعدؓ نے نہایت افسردہ ہو کر کہا ”اے اللہ کے رسولؐ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے مکہ مکرمہ کی خاک نصیب ہوگی حالانکہ اس سرزمین کو راہ حق میں ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکا ہوں۔“ آنحضرتؐ نے انہیں دلاسا دیا اور اپنا دست مبارک حضرت سعدؓ کے چہرے، پیشانی سے لے کر شکم تک پھیر کر کہا ”اے اللہ سعدؓ کو شفا دے اور اس کی ہجرت کو کامل فرما دے“ پھر آپؐ نے حضرت سعدؓ کو مزید تسلی دیتے ہوئے پیشگوئی کی۔ ”سعدؓ تم اس وقت تک نہیں مرو گے جب تک تم سے ایک قوم کو نقصان اور ایک کو فائدہ نہ پہنچ جائے۔“

رسولؐ اللہ کی دعا قبول ہوئی، حضرت سعدؓ صحت یاب ہونے لگے اور ٹھیک ہو کر مدینہ منورہ واپس چلے گئے۔ آپؐ کہتے تھے۔ ”حضورؐ کے دست مبارک کی ٹھنڈک میں ہمیشہ اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں“ بعد میں حضورؐ کی پیش گوئی بھی پوری ہوئی اور حضرت سعدؓ کی قیادت میں لشکر اسلام نے پے درپے فتوحات حاصل کیں۔

حضرت عمرؓ کے دور سے پہلے ہی مجوسی ایرانیوں سے مسلمانوں کی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک بڑی فوج تشکیل دی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا، اس فوج نے قادسیہ کے مقام پر وہ تاریخی جنگ لڑی جسے جنگ قادسیہ کہا جاتا ہے اور جس میں کامیابی کے نتیجے میں پورا عراق عرب مفتوح ہوا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران کہلائے جانے لگے۔

جنگ قادسیہ میں حضرت سعدؓ ایک شدید مرض کی وجہ سے خود تو شریک نہ ہو سکے البتہ آپ میدان جنگ کے قریب ہی ایک عمارت کی بالائی منزل سے سارا منظر دیکھتے رہے اور پرچوں پر ہدایات لکھ لکھ کر اپنے نائب حضرت خالد بن عرفطہؓ کے لیے پھینکتے رہے۔

حضرت سعدؓ نے بابل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اپنے ایک افسر زہرہ کی قیادت میں فوج آگے روانہ کر دی جس نے ایک تاریخی مقام کوٹی پر قبضہ کر لیا۔ اب حضرت سعدؓ کوٹی سے آگے بڑھے، بہرہ شیر پہنچے، اس شہر کو بہرہ شیر اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہاں کسریٰ کا شکاری شیر رہتا تھا۔ حضرت سعدؓ کا لشکر جوں ہی اس شہر میں پہنچا، شیر مقابلے کے لیے چھوڑا گیا۔ شیر نے جست لگائی حضرت سعدؓ کے بھائی ہاشم نے جو ہراول دستے

کے افسر تھے۔ اس صفائی سے تلوار ماری کہ شیر فضا میں ہی کٹ کر ڈھیر ہو گیا۔ حضرت سعدؓ اس بات سے اس قدر خوش ہوئے کہ آپؐ نے بے اختیار اپنے بھائی کی پیشانی چوم لی۔

بہرہ شیر کے دو ماہ محاصرے کے بعد ایرانی فوج خود باہر نکلی لیکن مسلمانوں کے آگے ٹھہرنہ سکی اور شکست سے دوچار ہوئی۔ اب بہرہ شیر اور دار السلطنت مدائن کے درمیان صرف دجلہ حائل تھا۔ ایرانیوں نے دریائے دجلہ پر بنے تمام پل توڑ دیے تھے تاکہ مسلمانوں کا لشکر دریا عبور نہ کر سکے۔ بارش کے باعث دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی اور ایرانی یہ سوچنے میں یقیناً حق بجانب تھے کہ مسلمان دریا کو کسی طرح عبور نہ کر سکیں گے لیکن اس کائنات کے خالق پر سچا یقین اور توکل رکھنے والے صحابیؓ رسول حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے لشکر کو لاکار اور اللہ کا نام لے لگھوڑ اور یا میں ڈال دیا، امیر لشکر کا پانی میں اترنا تھا کہ سارا لشکر دریا کی شوریدہ سرموجوں سے لڑتا ہوا پانی میں اتر پڑا۔ ایرانیوں نے جب یہ دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ ”دیواں آمدند“ (دیو آگئے دیو آگئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مدائن فتح ہو گیا۔

حضرت سعدؓ جب شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ایرانی بھاگ چکے تھے اس عالم میں حضرت سعدؓ کی پاکیزہ نفسی کا حال یہ ہے کہ کوئی تکبر کا کلمہ زبان سے نکالنے کی بجائے زبان پر قرآن پاک کی آیات جاری ہو جاتی ہیں۔ ترجمہ:

”اگلی قومیں کس قدر باغ، چشمے، کھیتیاں اور طرح طرح کی نعمتیں، عمدہ محلات چھوڑ کر چل بسیں، جن میں خوش باش زندگی بسر کرتی تھیں اور ہم نے ان چیزوں کا مالک دوسری قوموں کو بنا دیا۔“ (الدخان)

مدائن پر قبضہ کے بعد کسریٰ کے ایوان میں منبر نصب کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ آگے بڑھنے کی بجائے ریاستی نظم و نسق سنبھالنے پر توجہ دی جائے۔

حضرت سعدؓ نے امور مملکت کو نہایت عمدگی سے چلایا۔ پورے عراق عرب کی مردم شماری اور زمین کی پیمائش کروائی۔ مفتوحہ علاقوں کو ملک کے اصلی باشندوں کے ہاتھ ہی میں رہنے دیا۔ لگان اور جزیہ کے اصول بنائے۔ مدائن میں ایک جامع مسجد تعمیر کروائی۔

مدائن کی مرطوب آب و ہوا عرب کے گرم علاقے کے مسلمانوں کو اس نہ آئی تو حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت سعدؓ نے 17ھ میں نیا شہر کوفہ آباد کیا۔ کوفہ میں چالیس ہزار افراد کے لیے مکانات بنائے گئے جو ابتدا میں زسلوں کے تھے لیکن ایک بار ان میں آگ لگ گئی تو حضرت عمرؓ کی اجازت سے اینٹ اور گارے کے مکانات تعمیر کیے گئے۔ اس شہر میں ہر قبیلہ کی ایک آبادی تھی ہر آبادی میں ایک مسجد تھی، حضرت سعدؓ نے ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کروائی جس میں چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ آپؐ نے شہر میں چھوٹی چھوٹی نہریں کھدوائیں، پل، مسافر خانے بنوائے ذاتی سرمائے سے کئی مدارس قائم کیے۔ آپؐ نے اپنی توجہ اور محنت سے کوفہ کو اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی بنوا دیا۔

21ھ میں حضرت سعدؓ کے خلاف کچھ شورشیں ہونے لگیں تو حضرت عمرؓ نے آپ کو واپس مدینہ منورہ بلا لیا۔ 23ھ میں حضرت عمرؓ کو شہید کر دیا گیا۔ وفات سے قبل آپؐ نے خلافت کے لیے جن چھ اکابر صحابہ کرامؓ کے نام تجویز کیے ان میں ایک حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ حضرت عمرؓ نے خاص طور پر کہا کہ اگر سعدؓ خلافت کے لیے منتخب ہو جائیں تو وہ اس کے اہل ہیں اور اگر وہ منتخب نہ ہوں تو جو خلیفہ بنایا جائے وہ ان سے مدد لے۔

حضرت عثمانؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی حضرت سعدؓ کو دوبارہ کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ تین سال بعد بیت المال کے مہتمم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے حضرت سعدؓ کا کوئی اختلاف ہوا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت سعدؓ کو سبکدوش کر دیا۔ اس کے بعد حضرت سعدؓ مدینہ منورہ سے دس میل دور عقیق کے مقام پر رہنے لگے بقیہ تمام عمر آپؐ نے اختلافات اور تنازعات سے دور رہ کر گزاری، ایک بار آپؐ کو خلیفہ بننے کی

ترغیب دی گئی تو سخت ناراض ہوئے فرمایا:

”میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ اللہ پر ہیزگار، بے غرض اور مخفی بندے کو محبوب رکھتا ہے۔“

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی پاکیزہ سیرت و کردار تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے۔ آپؓ دین کا گہرا فہم رکھتے تھے۔ رسول اللہ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے آپؓ کو علم کی دولت وافر مقدار میں نصیب ہوئی۔ آپؓ کا شمار حضرت ابوبکرؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ جیسے جلیل القدر فقہیہ صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ آپؓ نے رسول اللہ کی 215 احادیث روایت کی ہیں جن میں سے پندرہ متفق علیہ ہیں، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ ”جب سعد بن ابی وقاصؓ حضورؐ سے کوئی حدیث روایت کریں تو پھر اس کے متعلق کسی دوسرے سے مت پوچھو۔“

آپؓ کی زندگی آپؓ کی قلب پاکیزہ کا عکس تھی۔ نہایت کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ رات ہوتی تو رسول اللہ کا یہ صحابیؓ اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑا ہو جاتا۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو خشیت الہی سے جسم لرزنے لگتا اور چہرے کی رنگت تبدیل ہو جاتی۔ رات کے آخری حصہ میں آپؓ اپنے رب کو یاد کر کے اس قدر روتے کہ آپؓ کی داڑھی اور جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

آخر عمر میں بے حد ضعیف ہو گئے تھے۔ 55ھ میں آپؓ نے اپنے خالق کے بلاوے پر لبیک کہا۔ میت مدینہ لائی گئی۔ مدینہ کے گورنر مروان نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسلام کے اس عظیم جرنیل کو جنت البقیع میں سپرد خاک کر دیا گیا۔



ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

حضرت بلالؓ

آپؓ کو دنیا کا پہلا مؤذن ہونے کا شرف حاصل ہے

صبح صادق کے دھند لکے میں، روشن اور گرم دوپہر میں، گہما گہمی سے بھرپور سہ پہر میں، سرمئی سرمئی شام میں اور پھر رات کی تاریکی میں، روزانہ، دنیا کے گوشے گوشے میں ایک آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ آواز، چودہ صدیوں سے اسی تسلسل کے ساتھ بلند ہو رہی ہے۔ ہر دور میں اس آواز نے یکساں کلمات ادا کیے ہیں۔ ان کلمات میں ذرہ برابر بھی تو تغیر نہیں آیا.....!

یہ کلمات اس دین کے ماننے والوں کا سرمایہٴ افتخار ہیں جسے لے کر ایک نبی امیؐ، فاران کی سرزمین پر اترا۔ ان کلمات میں جادو ہے، جو دلوں کو اسیر کر لیتا ہے، ان کلمات میں وہ رعب و جلال ہے جو بڑے بڑے جابروں کا پتہ پانی کر دیتا ہے۔
اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے

روئے زمین پر سب سے پہلے ان کلمات کو بلند کرنے کی سعادت جس شخص کے حصہ میں آئی وہ نہ تو بے حد دولت مند تھا، نہ ہی بہت با اثر اور نہ اس کے حسن و جمال نے لوگوں کو متوجہ کیا تھا بلکہ وہ ایک حبشی النسل غلام تھا۔ جس کی رنگت سیاہ تھی، آنکھیں سرخ اور ہونٹ موٹے تھے، لیکن اس کا دل نہایت حسین تھا۔

حسین دل والے یہ غلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے عزت و شرف کی بلندیوں پر فائز کیا، حضرت بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ آپؓ کو نہ صرف دنیا کے پہلے مؤذن ہونے کا اعزاز حاصل ہے بلکہ آپؐ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص بھی تھے۔ آپؐ کی خوش نصیبی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول پاکؐ نے آپؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا:
”بلالؓ کس قدر اچھا آدمی ہے، وہ تمام مؤذنین کا سردار ہے۔“

حضرت بلالؓ کے والد رباح اور والدہ حمامہ قبیلہ بنو جحج کے غلام تھے۔ یہ سرزمین عرب کا وہ تاریک دور تھا جب انسان اخلاقی پستیوں کی گہرائیوں میں جا گرا تھا اور اس پر گمراہی مسلط ہو چکی تھی۔ اس دور میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ غلاموں کا طبقہ تھا جسے بنیادی انسانی حقوق ملنا تو دور کی بات، چین سے جینے کا حق بھی حاصل نہ تھا۔

رب کائنات نے جب اپنے پسندیدہ بندے کو نور نبوت سے آراستہ کیا تو حضرت بلالؓ کی عمر تقریباً 28 سال تھی۔ آپؓ اپنے آقا امیہ بن خلف کی بکریاں چرانے کے لیے پہاڑوں میں لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپؓ کا گزر رخا حرا کی طرف ہوا جہاں رسول کریمؐ اپنے عزیز ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آنحضرتؐ نے ایک حبشی نوجوان کو بکریاں لے جاتے دیکھا تو اسے بلایا اور فرمایا: ”میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری اسلام کے متعلق کیا رائے ہے؟“

حضرت بلالؓ رسول اقدسؐ کی پر شکوہ شخصیت سے حد درجہ متاثر ہو چکے تھے، پھر حضورؐ کا دل نشین انداز گفتگو۔ بلالؓ کے منہ سے نکلا ”میں آپؐ کے دین کو اچھا پاتا ہوں۔“

حضرت بلالؓ واپس لوٹ گئے، لیکن دل حضورؐ کی طرف لگا رہا۔ دوسرے روز پھر بکریاں لے کر وہیں پہنچ گئے۔ نبی کریمؐ کی سادہ و پراثر

باتیں سنیں تو دل بے قرار ہو گیا، جو سچائی آپؐ کے قلب میں قدرت نے پہلے ہی ودیعت کر دی تھی، وہ دین اسلام کی صورت میں آپؐ کے سامنے آ گئی تھی۔ آپؐ نے اسلام کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ آپؐ ان پہلے سات خوش نصیب افراد میں سے ہیں جن کے لیے اسلام نے اپنے دروازے کھول دیے۔

یہ اسلام کا دور اولین تھا۔ حضور اکرم اللہ کے حکم سے فی الحال تبلیغ دین، رازداری کے ساتھ فرما رہے تھے، لیکن اسلام کا جو منفرد اور پاکیزہ رنگ ہے، وہ زیادہ عرصہ تک کفار مکہ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہوں نے جلد ہی چوکنا ہو کر دیکھنا شروع کیا کہ ان کے بعض ساتھیوں میں، خواتین میں، غلاموں میں ایک تبدیلی سی آ گئی ہے۔

امیہ بن خلف کو بھی بہت جلد خبر مل گئی کہ اس کا غلام بلالؓ بن رباح، محمدؐ کے ساتھیوں میں شامل ہو گیا ہے۔ غلام اور اس کی یہ مجال کہ آقا کے دین سے روگردانی کرے۔ امیہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے بلالؓ کو طلب کیا اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیے۔ اب اذیتوں اور تکالیف کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

مکہ مکرمہ کے علاقے حرہ کی زمین اپنی گرمی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ دھوپ میں تانبے کی طرح گرم ہو جاتی ہے۔ امیہ نے حضرت بلالؓ کو حرہ کی اسی زمین پر لٹا دیا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا، لیکن حضرت بلالؓ کی زبان سے احدا حد کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ امیہ نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں بنا تو اس نے مردہ جانور کی کھال لی اور حضرت بلالؓ کو اس میں لپیٹ کر سی دیا اور پھر تپتی دھوپ میں ڈال دیا۔ گرمی کی شدت سے کھال سوکھ گئی اور اس نے حضرت بلالؓ کے جسم کو جکڑ لیا۔ لیکن آپؐ بدستور خدائے واحد کا کلمہ بلند کرتے رہے۔ آپؐ گود کہتے انگاروں پر لٹا دیا گیا۔

امیہ کہتا: ”بلالؓ اب بھی محمدؐ کے خدا سے باز آ جا“ لیکن جواب وہی تھا: ”احد..... احد۔“

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں: ”میں نے حضرت بلالؓ کو اس حالت میں دیکھا کہ امیہ نے ان کو ایسی تپتی ہوئی زمین پر لٹا رکھا تھا کہ جس پر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ گل جاتا، لیکن حضرت بلالؓ اس حالت میں بھی اللہ کے سوا دوسرے کسی معبود کا انکار کرتے تھے۔“

امیہ کے طیش کا عالم اب کیا پوچھنا؟ اس نے حضرت بلالؓ کے گلے میں رسی باندھ دی اور مکہ کے شریڑوں کے حوالے کر دیا۔ لڑکے آپؐ کو مکہ کی گھاٹیوں میں گھسیٹتے پھرتے، پھر جلتی ریت پر لا کر اوندھے منہ ڈال دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ اسلام کے اس سچے عاشقؐ کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو شدید زخمی نہ ہو چکا ہو۔

تشدد کا یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ حضرت ابو بکرؓ قبیلہ بنو جمح کے محلے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ آتے جاتے حضرت بلالؓ پر ظلم ہوتا دیکھتے۔ ایک دن ان سے رہا نہ گیا۔ وہ امیہ کے پاس گئے اور اس سے کہا ”امیہ! اس بے گناہ اور بے کس غلام پر اتنا ظلم تو نہ کرو، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کرتا ہے اگر تم اس احسان کرو تو یہ احسان آخرت کے دن تمہارے کام آئے گا۔“ امیہ نے حقارت سے کہا: ”میں تمہارے خیالی یوم آخرت کا قائل نہیں۔ میرے جوجی میں آیا، کروں گا۔“ حضرت ابو بکرؓ تحمل کے ساتھ اسے سمجھاتے رہے کہ ”دیکھو تم طاقتور ہو، اس مجبور غلام پر ظلم و ستم کرنا تمہارے شایان شان نہیں، اس طرح عربوں کی قومی روایات کو بے نہ لگاؤ۔“

امیہ نے کہا: ”اگر تم اس غلام کے اتنے ہی ہمدرد ہو تو اسے خرید کیوں نہیں لیتے؟“

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا ”بولو کیا لو گے؟“

امیہ بولا ”تم اپنا فسطاس رومی مجھے دے دو اور اسے لے جاؤ۔“

فسطاس بڑے کام کا غلام تھا اور امیہ کا خیال تھا کہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت بلالؓ جیسے کمزور غلام کے بدلے اتنا صحت مند اور کارآمد غلام دینے پر رضا مند نہیں ہوں گے، لیکن حضرت ابو بکرؓ فوراً بولے: ”مجھے منظور ہے۔“ امیہ حیران رہ گیا، تاہم اس نے ایک شرط اور لگا دی۔ بولا: ”فسطاس کے

ساتھ چالیس اوقیہ چاندی بھی لوں گا۔“ (ایک اوقیہ: 40 درہم) حضرت ابو بکرؓ اس پر بھی راضی ہو گئے۔ جب وہ حضرت بلالؓ کو لے کر چلنے لگے تو امیہ ہنس کر کہنے لگا: ”ابو قافہ! تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس غلام کو درہم کے چھٹے حصے کے عوض بھی نہ خریدتا۔“ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: ”امیہ! تم اس غلام کی قدر و قیمت سے واقف نہیں مجھ سے پوچھو تو یمن کی بادشاہی بھی اس کی قیمت کے مقابلے میں بیچ ہے۔“ یہ کہا اور حضرت بلالؓ کو آزاد کر دیا۔

رسول پاکؐ کو خبر ملی تو آپؐ نے نہایت مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا: ”مجھے بھی اس میں شریک کر لو“ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی: ”یا رسول اللہ میں بلالؓ کو آزاد کر چکا ہوں۔“

اب حضرت بلالؓ آزاد تھے۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت رسول اقدسؐ کی خدمت میں گزارتے۔ آپؐ سے قرآن پاکؐ کی تعلیم حاصل کرتے، حکمت و دانائی کی باتیں سیکھتے اور دین اسلام کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرتے۔

ہجرت کا حکم ہوا تو بلالؓ بھی مکہ سے مدینہ پہنچے۔ رسول کریمؐ نے مہاجرین اور انصار کا بھائی چارہ کروا دیا تھا حضرت بلالؓ کو حضرت ابو رویحہؓ کا بھائی بنایا گیا۔ حضرت بلالؓ کو حضرت ابو رویحہؓ سے اس قدر محبت ہو گئی کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں حضرت بلالؓ جہاد پر جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا: ”بلالؓ! آپؓ کا وظیفہ کون وصول کرے گا؟“ جواب ملا: ”ابو رویحہؓ! کیونکہ رسول اللہؐ نے ہم میں جو بردارانہ تعلق قائم کر دیا ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔“

مدینہ منورہ میں اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈال دی گئی تو ایک سال بعد یہ سوال اٹھا کہ نماز باجماعت کے لیے لوگوں کو کس طرح اکٹھا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا ہر نماز کے وقت ایک پرچم بلند کر دیا جائے کچھ نے کہا ناقوس بجایا جائے کچھ لوگ کہنے لگے آگ روشن کی جائے تاکہ اسے دیکھ کر لوگ نماز کے لیے آجائیں کچھ کا مشورہ یہ تھا کہ ایک شخص جا کر لوگوں کے گھروں پر اطلاع دے آیا کرے۔ رسول کریمؐ نے ان طریقوں کو پسند نہیں فرمایا۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ حضورؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ”مجھے خواب میں ایک شخص نے اذان کے کلمات سکھائے ہیں۔“ انہوں نے وہ کلمات دہرائے۔ حضورؐ نے وحی الہی کے مطابق ان کلمات کو پسند فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس قسم کا خواب دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی اپنا خواب بیان کر دیا۔ حضور اکرمؐ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تم اذان دو۔ آپؐ نے انہیں اذان کے کلمات سکھائے اور ہدایت کی کہ دونوں کانوں میں انگلیاں دے کر اذان دو تاکہ تمہاری آواز بلند ہو اور دور تک پہنچے۔ مدینہ کی فضاؤں میں نغمہ توحید گونج اٹھا اور حضرت بلالؓ کو اسلام کے پہلے مؤذن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت بلالؓ کی آواز میں وہ لہجہ تھا کہ جو آپؐ کی اذان سنتا مسحور ہو کر رہ جاتا۔ جب نمازی آجاتے تو آپؐ نہایت ادب سے حضورؐ کے دروازے پر جا کر کہتے: ”اے اللہ کے رسول! نماز تیار ہے۔“

مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کی تعمیر ہوئی تو اس کے ایک سرے پر ایک چبوترہ بنا کر اس پر چھت ڈال دی گئی۔ اس چبوترے پر نبی کریمؐ کے وہ صحابہ کرامؓ رہنے لگے جو تمام وقت رسول پاکؐ کی خدمت میں رہنا چاہتے تھے اور علم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان اصحاب کو ”اصحاب صفہ“ کہا جانے لگا کیونکہ صفہ عربی میں چبوترے کو کہتے ہیں۔ حضرت بلالؓ بھی انہی اصحاب صفہ میں سے تھے۔

بدر کا معرکہ ہوا پھر احد کے میدان میں مسلمان اور کفار صف آراء ہوئے، پھر غزوہ خندق کا مرحلہ آیا۔ اس کے بعد فتح مکہ اور غزوہ تبوک کی منزلیں گزریں۔ ہر مقام پر حضرت بلالؓ نے خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ صدیق سے عرض کی کہ مجھے جہاد میں شامل ہونے کی اجازت دیجیے، لیکن حضرت ابو بکرؓ نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت ہے۔ پھر حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو حضرت بلالؓ نے ایک بار پھر جہاد کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عمرؓ نے بھی روکا، لیکن آپؓ کے اصرار پر اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت بلالؓ شام کی جنگوں میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت المقدس کی فتح میں شریک تھے۔ 16ھ/637ء میں جب حضرت عمرؓ شام گئے تو جابہ میں حضرت بلالؓ نے ان کا خیر مقدم کیا۔

حضرت عمرؓ نے ان سے کہا ”اے ہمارے سردار بلالؓ، اسلام کے قبلہ اول پر توحید کا پرچم لہرایا ہے۔ اس با عظمت موقع پر آپؐ اذان دیں تو ہم آپؐ کے شکر گزار ہوں گے۔“

حضرت بلالؓ نے اذان دی برسوں بعد وہی آواز بلند ہوئی جو مدینہ کے گلی کو چوں میں سنائی دیتی تھی تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت معاذؓ بن جبلؓ کا بھی یہی حال تھا۔

حضرت بلالؓ نے خلیفہؓ ثانی حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ انہیں اور حضرت ابورویحہؓ کو شام میں مستقل رہائش کی اجازت دے دی جائے۔ اس موقع پر وہ حضرت ابورویحہؓ کو نہ بھولے تھے جنہیں ہجرت کے بعد حضورؐ نے حضرت بلالؓ کا بھائی بنا دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ درخواست قبول کر لی۔

ایک دن حضرت بلالؓ نے حضور اکرمؐ کو خواب میں دیکھا کہ آپؐ فرما رہے ہیں: ”بلالؓ! یہ خشک زندگی کب تک؟ کیا تمہارے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ہماری زیارت کرو۔“ یہ خواب دیکھنا تھا کہ حضرت بلالؓ تڑپ اٹھے فوراً مدینہ روانہ ہو گئے۔ روضہ رسولؐ پر پہنچے تو آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ رسولؐ پاک کے نواسوںؓ حسنؓ اور حسینؓ کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ دونوں نے اذان کی فرمائش کی۔ آپؐ یہ فرمائش نال نہ سکے۔ مسجد نبویؐ سے جب روح پرور اذانِ بلالیؓ بلند ہوئی تو عورتیں تک بے قرار ہو کر گھروں سے نکل آئیں۔

کچھ عرصہ بعد حضرت بلالؓ اپنے پیارے نبیؐ کے شہر سے رخصت ہوئے اور واپس شام چلے گئے۔ 20ھ/641ء میں آپؐ نے اپنا سفر حیات مکمل کر لیا۔ آپؐ کو دمشق میں باب الصغیر کے قریب دفن کیا گیا۔ آپؐ کی وفات کی خبر حضرت عمرؓ تک پہنچی تو وہ روتے روتے نڈھال ہو گئے۔ بار بار کہتے تھے کہ ”آہ ہمارا سردار بلالؓ بھی ہمیں داغ جدائی دے گیا۔“

حضرت بلالؓ کو صحیح معنوں میں حضور اقدسؐ کے معتمد (سیکرٹری) کا درجہ حاصل تھا۔ سفر ہو یا قیام، دکھ سکھ، امن، جنگ غرض ہر حالت میں آپؐ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ ساتھ رہے۔ رسول کریمؐ بھی آپؐ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ آپؐ، حضورؐ کے گھر کے کاموں سے لے کر امور مملکت تک کو سنبھالتے تھے۔ رسولؐ اللہ کے گھر کا سودا سلف لے آتے، قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کے انتظامات کرتے۔ حضورؐ کے مہمانوں کے آرام کا خیال رکھتے۔ رسول پاکؐ کو نمازوں کے اوقات اور جماعت کی تیاری کی اطلاع کرتے تھے۔

حضورؐ کے وضو کے پانی کے انتظام کی نگرانی بھی حضرت بلالؓ ہی کے سپرد تھی۔ ایک بار آپؐ حضورؐ کے لیے وضو کا پانی لائے۔ حضورؐ کے وضو کر لینے کے بعد بچے ہوئے پانی سے حضرت بلالؓ نے وضو کر لیا۔

میدان میں نماز ہوتی تو حضورؐ کے آگے ”سترہ“ کے طور پر نیزہ رکھنے کا فریضہ بھی حضرت بلالؓ انجام دیتے تھے۔ ”سترہ“ کا مطلب یہ ہے کہ نماز باجماعت کے دوران امام کے آگے کوئی لکڑی یا نیزہ گاڑ دیا جاتا ہے جس کے بعد دیگر افراد کو اگر جماعت کے سامنے سے گزرنا پڑے تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ خاص خاص مواقع پر حضرت بلالؓ ہی نیزہ لے کر حضورؐ کے آگے چلا کرتے تھے۔

آپؐ، حضورؐ کے خزانچی بھی تھے۔ آپؐ کے پاس ہر وقت رقم موجود رہتی تھی اور آپؐ حضورؐ کی ہدایت کے مطابق مختلف لوگوں کو رقم ادا کیا کرتے تھے۔ آپؐ، حضورؐ کے حکم سے مختلف اعلانات بھی کیا کرتے تھے۔ غزوہٴ احراءؓ، الاسدؓ اور غزوہٴ بنو قریظہ کے موقعوں پر آپؐ ہی نے حضورؐ کی ہدایت پر مسلم مجاہدین کو حضورؐ کے اس حکم سے آگاہ کیا تھا کہ وہ آخری وقت تک لڑیں۔

غزوات کے بعد حضورؐ کے کہنے پر حضرت بلالؓ ہی مالِ غنیمت تقسیم کیا کرتے تھے۔ آپؐ پہلے منادی کرتے تو لوگ اپنا اپنا مال پہنچا دیتے۔ حضورؐ اس مالِ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کروا کے بانٹ دیتے۔ ایک بار نماز عید ختم ہوئی تو حضورؐ نے حضرت بلالؓ کے سہارے کھڑے ہو کر خطبہ دیا پھر آپؐ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں نصیحتیں کیں۔ جب آپؐ نے عورتوں کو صدقہ کا حکم دیا تو یہ حضرت بلالؓ ہی

تھے جنہوں نے چادر پھیلا دی اور عورتیں اپنے گلے اور کان سے زیورات اتار کر چادر میں ڈالنے لگیں۔

فتح مکہ ہوئی تو حضرت بلالؓ حضورؐ کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ آپؐ ہی کو حضورؐ نے حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذانِ حق بلند کریں۔

جمعۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ 8 ذی الحجہ 10ھ/29 مارچ 630ء کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت بلالؓ، آپؐ پر کپڑے سے سایہ کیے ہوئے تھے جب مدینہ واپس آنے لگے تو حضورؐ کی اونٹنی کی مہار حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں تھی۔

حضرت بلالؓ ایمان کو تمام اعمال صالحہ کی بنیاد سمجھتے تھے۔ کسی نے پوچھا: ”سب سے بہتر عمل کون سا ہے؟“ فرمایا: ”اللہ اور اس کے رسولؐ پر صدق دل سے ایمان لاؤ، پھر جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ ادا کرو، پھر حج بیت اللہ کا فرض ادا کرو۔“

یہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر صدق دل سے لایا گیا ایمان ہی تھا جو آلام و مصائب اور اذیتوں کے سمندر سے نکلا تو اس کی آب و تاب پہلے سے سوا تھی اور ایسے ہی ایمان کی روشنی سے اپنے قلب کو منور کرنے والے بندے کا درجہ اللہ رب العزت کے نزدیک بے حد بلند ہے۔



گلدستہ اولیاء

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو اسلم لودھی کی عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت شاہ قبول اولیاءؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت سلطان باھوؒ، حضرت حافظ محمد عبدالکریمؒ (موہری شریف)، حضرت خواجہ صوفی نواب الدین (موہری شریف)، حضرت الحاج محمد معصومؒ (موہری شریف)، حضرت شاہ کمال بخاریؒ، حضرت مخدوم حسام الدین ملتانیؒ، حضرت حافظ محمد اسحاق قادری نقشبندیؒ، حضرت سید سلطان احمد خنی سرورؒ، عاشق رسول حضرت صوفی بندے حسن خان، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس قادری کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلدستہ اولیاء کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ

انہوں نے ہمیشہ عیش و آرام سے دور رہنا پسند فرمایا

جندب نے چھوٹی سی سیاہ مشک پانی سے بھر کر پشت پر رکھ لی، زمبیل میں کچھ پھل ڈالے اور بھائی کو الوداع کہا۔

وہ تن تنہا، حجاز کے صحراؤں میں سفر کر کے مکہ مکرمہ جا رہے تھے۔ سفر تمام ہوا۔ منزل سامنے تھی، لیکن جندب یہاں بالکل اجنبی تھے، کوئی جان پہچان والا ہوتا تو اس کے گھر قیام کرتے، لیکن یہاں کس سے بات کرتے۔ چنانچہ حرم پاک ہی میں ایک جانب پڑ رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ یہاں جس مقصد کے تحت آئے تھے وہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے آنے والا جو مسافر ان سے ملا تھا اس نے بتایا تو تھا کہ قبیلہ قریش کے ممتاز خاندان کا ایک شخص یہاں موجود ہے، جو کہتا ہے کہ اللہ نے اپنا کلام اس پر نازل فرمایا ہے۔

جندب اپنے ساتھ جو پھل لائے تھے وہ ختم ہو چکے تھے اور زم زم کے پانی پر گزارہ ہو رہا تھا۔ ایک رات حرم پاک میں ایک جانب لیٹے ہوئے تھے اور دو عورتیں ”یا اساف“، ”یا نائلہ“ کہہ کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اساف اور نائلہ کے متعلق مشہور تھا کہ یمن کے رہنے والے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوئے اور حرم پاک میں بدکاری کے مرتکب ہوئے جس کے نتیجے میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور دونوں پتھر کے ہو گئے۔ عربوں نے غضب یہ کیا کہ ان پتھر کے بتوں کی پوجا شروع کر دی اور انہیں کعبہ اور چاہ زم زم پر نصب کر دیا گیا۔

عورتیں اساف اور نائلہ سے دعائیں مانگ رہی تھیں اور جندب لیٹے سن رہے تھے۔ آخر ان سے رہانہ گیا اور انہوں نے طنز سے کہا: ”ایک کا دوسرے سے نکاح کر دو۔“

عورتیں یہ آواز سن کر چونک گئیں۔ اساف اور نائلہ کے متعلق ایسی بات؟ دن کا وقت ہوتا تو کسی کو مدد کے لیے پکارتیں، لیکن اس وقت کس کو بلاتیں۔ بڑبڑاتی ہوئی جلدی سے حرم پاک سے نکل گئیں۔ سامنے ایک پہاڑی تھی اس پر چڑھنے لگیں، سامنے سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق ابو بکرؓ کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: ”کیا ہوا؟“ عورتوں نے کہا: ”کیا بتائیں، صابی کعبہ میں پڑا ہوا ہے۔“ دریافت کیا: ”وہ کیا کہتا ہے۔“ جواب ملا ”بسیری بات بک رہا ہے۔“

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک آئے۔ نو جوان جندب سے ملے، لیکن اس موضوع پر تفصیلی بات نہیں کی۔ حضرت ابو بکرؓ نو جوان کو اپنے گھر لے گئے۔ طائف کی کشمشیں پیش کیں۔ صبح ہوئی جندب حرم پاک آ گئے۔ رات ہوئی تو حضرت علیؓ تشریف لائے۔ آپؓ اس نو جوان کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ رہانہ گیا پوچھ بیٹھے ”آپؐ یہاں کس ضرورت کے تحت آئے ہیں۔؟“

جندب کہنے لگے ”میں نے سنا تھا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔“ حضرت علیؓ نے خوش ہو کر فرمایا:

”یہ بالکل سچ ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں، صبح آپؐ میرے ساتھ چلیں راستے میں اگر کوئی ایسا واقعہ ہو جس میں خطرہ محسوس ہو تو میں بہانے

سے رک جاؤں گا، پھر میں جدھر جاؤں چلے آئیے گا۔“

صبح ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نو جوان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپؐ نے نو جوان کے سامنے کلام

پاک کی تلاوت فرمائی، ادھر تلاوت ختم ہوئی ادھر نو جوان جندب نے کلمہ شہادت پڑھ لیا اور روئے زمین پر پانچویں مسلمان کا اضافہ ہو گیا۔

یہ نو جوان تھے حضرت ابوذرؓ غفاری جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی روشن علامت ہیں۔ آپؓ کا تعلق قبیلہ غفار سے ہے اس نسبت سے غفاری کہلاتے ہیں۔ جندب آپؓ کا نام اور ابوذر کنیت ہے۔ آپؓ کا قبیلہ غفار اس راستے پر آباد تھا جس کے ذریعہ تجارتی قافلے مکہ مکرمہ سے پہاڑی دروں اور ریگستانوں سے ہوتے ہوئے شام و فلسطین کی سمت جایا کرتے تھے۔ قبیلہ غفار تجارتی قافلوں کو لوٹنے کے لیے مشہور تھا۔ ابتدا میں جندب نے بھی قافلوں کی لوٹ مار میں حصہ لیا، لیکن آپؓ کی فطرت سلیم نے اس کام کو پسند نہ کیا، نہ ہی آپؓ بتوں کے آگے سر جھکانے اور ان سے مرادیں مانگنے پر مطمئن ہوئے۔ آپؓ کا دل کہتا تھا کہ اس بیکراں کائنات، اس روشن اور گرم سورج، ان چمکیلے ستاروں، ان تپتے صحراؤں اور ان بلند و بالا پہاڑوں کا کوئی ایک خالق ہے۔

اسی اثناء میں آپؓ کو خبر ملی کہ مکہ مکرمہ میں کوئی صاحب ایسے ہیں جو خود کو اللہ کا نبی کہتے ہیں۔ آپؓ نے پہلے اپنے بھائی انیس کو معلومات حاصل کرنے کے لیے مکہ روانہ کیا۔ ادھر انیس روانہ ہوئے ادھر ابوذرؓ انتظار کی گھڑیاں گننے لگے۔ بعد میں آپؓ اس وقت کی کیفیت بتاتے ہیں کہ ”انیس نے بہت دیر لگائی تھی۔“

انیس واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ مکہ مکرمہ میں جو صاحب خود کو اللہ کا نبی کہتے ہیں وہ اچھی عادتوں کی تعلیم دیتے ہیں لوگ انہیں شاعر اور کاہن کہتے ہیں، لیکن میں نے شعر کے وزن پر اس شخص کے کلام کو خوب پرکھا۔ شعر تو وہ یقیناً نہیں ہیں رہا کاہن تو میں سینکڑوں کاہنوں سے ملا ہوں۔ اس شخص کے کلام کو کاہنوں کی گفتگو سے کوئی واسطہ نہیں۔“ حضرت ابوذرؓ بھائی کی زبانی یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور خود مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کر لیا۔

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا: ”میں کھجوروں والی سرزمین کی طرف متوجہ کیا گیا ہوں۔ میں اسے مدینہ کے سوا کسی شہر کو خیال نہیں کرتا تو کیا تم اپنی قوم کو میری جانب سے تبلیغ کر سکتے ہو؟ ممکن ہے اللہ انہیں تم سے نفع پہنچائے اور تمہیں اجر دے۔“

حضرت ابوذرؓ کہہ اٹھے! ”جب تک میں مسجد حرام میں بلند آواز سے اپنے اسلام لانے کا اعلان نہ کر دوں میں نہیں جاسکتا۔“ ایمان کی کیا قوت ہے جو ایک نو جوان کو تنہا، ہزاروں افراد کے سامنے سینہ سپر کر دیتی ہے فوراً حرم پاک گئے اور بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھ دیا۔ قریش بھلا اس بات کو گوارہ کر سکتے تھے کہ حرم پاک میں ”نئے“ دین کی بات کی جائے۔ فوراً بہت سے لوگ آپؓ پر پل پڑے۔ لاتوں، گھونسوں، لکڑیوں سے مارنا پینٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ وہاں سے گزرے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن آپؓ نے مداخلت کی اور قریش والوں سے کہا ”ارے کیا کرتے ہو یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے، جدھر سے تمہارے تجارتی قافلے گزرتے ہیں۔ تمہاری تجارت بند ہو کر رہ جائے گی۔“

تجارت بند ہونے کے خوف سے لوگ رک گئے۔ دوسرے دن حضرت ابوذرؓ پھر حرم پاک پہنچے اور کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا ایک بار پھر آپؓ کو اللہ کے واحد معبود ہونے کی شہادت دینے کی پاداش میں زد و کوب کیا جانے لگا۔ حضرت عباسؓ پھر تشریف لائے اور بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے قریش کو ڈانٹا کہ ”کیا تمہارا ارادہ ہے کہ قریش کے قافلے لوٹ لیے جائیں۔“

حضرت ابوذرؓ حرم پاک میں اپنے مسلمان ہو جانے کا بے باکانہ اظہار کر چکے تو آنحضرتؐ کی ہدایت کے مطابق اپنے گھر پہنچے۔ بھائی انیس سے ملے انہیں اپنے مسلمان ہو جانے کی خبر دی۔ بھائی آپؓ کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ بھی ایمان لے آئے پھر آپؓ کی والدہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

اب حضرت ابوذرؓ نے اپنے قبیلے والوں کی طرف توجہ کی، قبیلے والے جمع تھے۔ سردار خفاف بن ایماء کے پاس جا کر بیٹھے اور کہنے لگے ”مکہ میں ایک نبیؐ کا ظہور ہوا ہے وہ اس صاف آسمان، وسیع زمین اور چمکدار ستاروں کے خالق کی طرف دعوت دیتا ہے۔“

شور مچ گیا، ”ابوذرؓ گمراہ ہو گیا۔ ابوذرؓ گمراہ ہو گیا۔“ سردار نے کہا ”ٹھہرو ذرا اسے بات تو پوری کرنے دو۔“

حضرت ابوذرؓ نے بڑے مؤثر انداز میں اپنی بات بیان کی..... فرمایا: ”ایک دن میں نہم کے بت کے پاس آیا۔ بڑی انکساری کے ساتھ اس پر دودھ کی نذر چڑھائی، واپس ہونے لگا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک کتا دودھ پی رہا ہے اور معبود خاموش کھڑا ہے وہ اسے مقدس دودھ سے نہ ہٹا سکا۔ پھر کہتے ہیں کہ صرف معبود کی نذر ہڑپ کر لی بلکہ پاؤں اٹھا کر اس پر پیشاب بھی کر دیا۔ یہ ہے نہم کی طاقت، قوت، عزت، جلال اور اس کی سلطنت۔“

یہ بات سن کر سب نے گردنیں جھکا لیں۔ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حضرت ابوذرؓ کی تبلیغ سے، سردار خفاف مسلمان ہو گئے، کئی اور افراد نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا اور جو باقی بچے انہوں نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں آئیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ حضرت ابوذرؓ تبلیغ دین میں مصروف رہے، ادھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت اور پھر جنگ کا حکم ملا۔ غزوہ بدر واحد کے معرکے درپیش آئے۔ حتیٰ کہ غزوہ خندق بھی ہوئی جس میں اللہ کی قدرت سے کفار کو سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اب قبیلہ غفار کے بقیہ لوگوں نے بھی ایمان لانے کی خواہش ظاہر کی۔ پڑوس کے قبیلے، اسلم والے بھی تیار ہو گئے۔

5ھ کے ابتدائی مہینوں میں حضرت ابوذرؓ مدینہ تشریف لائے۔ آنحضرتؐ سے ملے۔ آپؐ نے دعا فرمائی۔ ”اللہ غفار، کی مغفرت کرے اور اسلم کو سلامت رکھے۔“

غزوہ خندق کے بعد حضرت ابوذرؓ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت ابوذرؓ علم حاصل کرنے کے بڑے شائق تھے۔ آپؐ خود فرماتے ہیں میں حضورؐ سے پوچھا کرتا تھا اور پوچھنے میں شدید تھا۔

حضرت عمرؓ، آپؐ کو علم میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے برابر سمجھتے تھے۔ آپؐ کی بیان کردہ احادیث کی تعداد 281 ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آپؐ کے علم سے استفادہ کیا ہے۔ آپؐ نے جو کچھ علم حاصل کیا۔ آپؐ اس کی چلتی پھرتی تفسیر تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کو بے پناہ عقیدت تھی اور آنحضرتؐ بھی آپؐ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ جب رسول کریمؐ اپنے وصال سے قبل سخت بیمار ہوئے تو آپؐ نے حضرت ابوذرؓ کو بلوایا۔ حضرت ابوذرؓ جھکے تو حضورؐ نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سینہ مبارک سے چمٹا لیا۔

رسول کریمؐ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ جب بھی آپؐ کا ذکر فرماتے تو حبیبی، خلیلی (میرے محبوب، میرے دوست) کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ جس بات کی حضورؐ نے تعلیم دی۔ مرتے دم تک اس پر عمل پیرا رہے۔ ایک بار حضرت ابوذرؓ نے تنگ دستی سے پریشان ہو کر حضورؐ سے خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی صوبے کا عامل (گورنر) بنادیتے۔ آپؐ نے فرمایا ابوذرؓ میں تمہیں کمزور پاتا ہوں، میں تمہارے لیے اسی بات کو پسند کرتا ہوں جو مجھے اپنے لیے پسند ہے۔ تم ہرگز دو آدمیوں کے امیر نہ بننا۔“

آپؐ کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد حضرت ابوذرؓ نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ سے فرمایا: ”کیا تم ایسی بات پر بیعت کرو گے جس کے بعد تمہارے لیے صرف جنت ہو۔“ کہنے لگے ”جی ہاں“ اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ حضورؐ نے فرمایا: ”تم کسی سے کچھ نہیں مانگو گے۔“ حضرت ابوذرؓ نے کہا: ”بہت بہتر“ حضورؐ نے فرمایا: ”حتیٰ کہ وہ کوڑا بھی نہیں جو تمہارے گھوڑے سے گر پڑے، بلکہ تم اترو اور خود اٹھاؤ“ اس کے بعد آپؐ کا حال یہ تھا کہ آپؐ نے کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا۔

930ھ/9ء میں سلطنت روم نے ملک شام میں بہت بڑی فوج جمع کر دی تھی۔ یہ بڑا فیصلہ کن لمحہ تھا۔ حضورؐ نے اعلان جہاد کر دیا تھا، سخت گرمی کا موسم، کھجور کی فصلیں پک کر تیار تھیں۔ روم جیسی بڑی طاقت سے ٹکر لینے کا معاملہ، سچے اور مخلص مسلمان تو جہاد میں حصہ لینے کے لیے بے تاب تھے اور منافق طرح طرح کے عذر کر کے رخصت طلب کر رہے تھے۔ بالآخر مسلمانوں کا لشکر غزوہ تبوک میں حصہ لینے کے لیے روانہ ہوا۔ ابو ذرؓ کا اونٹ ذراست رفتار تھا وہ لشکر سے پیچھے رہ گیا۔ شور مچ گیا: ”ابو ذرؓ رہ گئے۔ ابو ذرؓ“ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”تو اللہ اسے خود تم لوگوں سے ملا دے گا۔“

ادھر ابو ذرؓ نے بڑی کوشش کی کہ اونٹ تیز چلے، لیکن لشکر اسلام کو پکڑ نہ سکے۔ بیتاب ہو کر اونٹ سے اتر پڑے، کچھ سامان جو اٹھا سکے اٹھایا اور دوڑنا شروع کر دیا۔

قافلے والوں نے دور سے دیکھا کوئی شخص دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ ہر طرف صدائیں لگنے لگیں۔ ”کوئی آ رہا ہے، کوئی آ رہا ہے۔“ حضورؐ نے فرمایا: ”ابو ذرؓ ہی ہو، ابو ذرؓ ہی ہو۔“

تھوڑی دیر بعد قافلے میں شور مچ رہا تھا۔ ”ابو ذرؓ ہی ہیں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ ابو ذرؓ پر رحمت فرمائے وہ تنہا چلے گا تنہا مرے گا اور تنہا ہی روز قیامت اٹھایا جائے گا۔“ حضرت عثمانؓ کے عہد میں پے در پے فتوحات ہوئیں لوگ آرام و آسائش کی طرف مائل ہوئے، لیکن حضرت ابو ذرؓ بدستور سادہ زندگی بسر کرتے رہے اور عیش و آرام کے اسباب پر تنقید کرتے رہے۔ یہ تنقید اس قدر بڑھی کہ حضرت عثمانؓ نے آپؓ کو مدینہ بلا کر فرمایا کہ آپؓ میرے پاس رہیے۔ لیکن آپؓ مدینہ کے قریب ایک گاؤں ”ربذہ“ جا کر رہنے لگے۔

ایک دن حضرت ابو ہریرہؓ جو ان دنوں بحرین کے ناظم تھے آئے تو محبت سے حضرت ابو ذرؓ کے گلے لگ گئے، لیکن آپؓ انہیں دھکے دے کر چھڑانے لگے۔ پھر حضرت ابو ذرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا: ”آپؓ کسی صوبہ کے عامل مقرر ہوئے؟“ حضرت ابو ہریرہؓ نے اقرار کیا۔ پوچھا ”کوئی مکان بنوایا؟ کوئی زمین حاصل کی؟ اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ کے مالک ہوئے؟“ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ”نہیں“ خوش ہو کر گلے لگا لیا، فرمایا: ”ہاں؟ تم میرے بھائی ہو۔“

حق گوئی حضرت ابو ذرؓ کا شعار تھی۔ خود حضورؐ نے فرمایا: ”آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابو ذرؓ سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔“ (ترمذی) اور حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا اگر ابو ذرؓ کی رگ گلو پر تلوار رکھ دی جائے اور کسی سچی بات کی تبلیغ اس سے رہ گئی ہو تب بھی وہ اسے نافذ کر کے رہے گا۔“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے موقع پر فرمایا تھا: ”ابو ذرؓ تنہا چلتا ہے، تنہا مرے گا اور تنہا ہی روز قیامت اٹھایا جائے گا۔“

اللہ کے رسولؐ کی اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آپؐ پہنچا تھا۔ 32ھ/653ء میں حج کا زمانہ تھا۔ گاؤں ”ربذہ“ میں جہاں حضرت ابو ذرؓ اپنی زندگی کے آخری ایام میں رہ رہے تھے، اول تو آبادی تھی بہت تھوڑی، پھر سب لوگ حج کے لیے چلے گئے، حضرت ابو ذرؓ شدید بیمار ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے۔ اہلیہ سخت پریشان تھیں۔ حضرت ابو ذرؓ نے اطمینان سے کہا: ”حضورؐ نے مجھ سمیت کچھ افراد سے فرمایا تھا: ”تم میں سے ایک صحرا میں مرے گا اور اس کی موت کے وقت وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچ جائے گی۔“ ان افراد میں سے میرے سوا سب کے سب آبادی میں انتقال کر چکے ہیں۔ تم جا کر دیکھو کوئی آتا ہوگا۔“ اہلیہ نے پریشان ہو کر کہا: ”اب تو حجاج جا چکے ہیں“ آپؓ نے اصرار کیا۔ ”نہیں تم جا کر دیکھو تو سہی“ اب حال یہ تھا کہ اہلیہ محترمہ دوڑ دوڑ کر ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتی تھیں پھر بھاگتی ہوئی شوہر کے پاس عیادت کے لیے آتی تھیں حتیٰ کہ دور سے کچھ

سوار آتے دکھائی دیے۔

سوار قریب پہنچے تو حضرت ابوذرؓ کی اہلیہ نے ان سے کہا ”ایک مسلمان مر رہا ہے اس کے دفن کا سامان کرو۔“ کسی نے پوچھا ”وہ کون ہے“ آپ نے بتایا ”ابوذرؓ صحابی رسولؐ“ شور مچ گیا۔ لوگ اونٹوں سے کود پڑے اور حضرت ابوذرؓ کے خیمے کی طرف دوڑے۔

حضرت ابوذرؓ نے آوازیں سنیں تو بیٹی سے کہا ”گھر میں مہمان آرہے ہیں ایک بکری ذبح کر لو اور آگ پر چڑھا دو، جب میری تدفین ہو جائے تو ان سے کہنا کہ ابوذرؓ نے آپ لوگوں کو خدا کی قسم دی ہے جب تک کھانا نہ کھالیں سوار یوں پر سوار نہ ہوں۔“

مسلمانوں کی جماعت خیمے میں پہنچی تو فرمایا: ”اے کاش میرے پاس اتنے کپڑے ہوتے کہ میں اس سے اپنا کفن بنا لیتا۔ میری وصیت یہ ہے کہ مجھے جو بھی کفن دے وہ حکومت کا اہلکار نہ ہو۔“

اتفاق یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اس جماعت میں جو آپؐ تک پہنچی تھی جتنے بھی افراد تھے وہ سب کسی نہ کسی سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ صرف ایک انصاری نوجوان ایسا تھا جو سرکاری اہلکار نہ تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود چادریں پیش کر دیں۔ ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ تھی ہجرت کے 32 ویں سال/10، جولائی 653ء کو صحابی رسولؐ حضرت ابوذرؓ غفار نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی دوران حضرت عبداللہ بن مسعود اونٹ پر وہاں سے گزرے آپؐ کوفہ سے عمرہ کا احرام باندھے آرہے تھے۔ لوگوں نے روک کر کہا: ”ابوذرؓ صحابی رسولؐ کی تدفین میں مدد کیجیے“ یہ سننا تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے چیخ ماری اور کہنے لگے: ”حضورؐ نے سچ فرمایا تھا۔ ابوذرؓ تنہا چلتا ہے تنہا مرے گا اور تنہا ہی اٹھایا جائے گا۔“

اس طرح قادر مطلق نے اس صحرا میں اپنے پیارے بندے کی تدفین میں حصہ لینے کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت بھیجی۔ نماز جنازہ، حضرت عبداللہ بن مسعود نے پڑھائی اور تقویٰ کے اس پیکر کو اسی صحرا میں سپرد خاک کر دیا گیا۔



حضرت ابو ہریرہؓ

علم کا وہ ظرف جس کے بغیر حدیث کا ذکر نامکمل ہے

بازار میں بڑی رونق تھی۔

دکانوں پر گاہکوں کی ریل پیل تھی۔ دکاندار گاہکوں کو مال کی خصوصیات سے آگاہ کرنے اور انہیں مال خریدنے پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اچانک ایک بزرگ نمودار ہوئے جن کا رنگ گندمی تھا، شانے کشادہ اور دانت آبدار تھے۔ انہوں نے سادہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ بزرگ بازار میں خرید و فروخت کے ارادے سے نہیں آئے تھے وہ بازار میں پہنچ کر ٹھہر گئے اور زور سے پکارے:

”تم لوگوں کو کس چیز نے مجبور کر رکھا؟“

لوگ بزرگ کی جانب متوجہ ہو گئے اور پوچھنے لگے: ”کس چیز سے؟“

بزرگ کے لبوں کو جنبش ہوئی، کہنے لگے ”وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اور تم لوگ یہاں بیٹھے ہو۔؟“

”کہاں؟“ لوگوں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”مسجد میں!“ بزرگ کا جواب تھا۔

یہ سننا تھا کہ بازار دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہو گیا، لوگ کاروبار چھوڑ چھاڑ کر مسجد کی طرف دوڑے کہ رسول اللہ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اس سے محروم نہ رہ جائیں، لیکن یہ کیا؟ مسجد میں نہ کوئی تقسیم کرنے والا نظر آیا نہ وصول کرنے والوں کی بھیڑ دکھائی دی، وہاں تو بس چند افراد نماز پڑھ رہے تھے، کچھ لوگ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے اور چند افراد حلال و حرام کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔

مسجد میں کچھ نہ پا کر تمام لوگ، کچھ حیران، کچھ ناخوش، واپس بازار میں چلے آئے، بزرگ سے شکایت کی کہ مسجد میں تو کچھ نہیں ہے، آپؐ نے تو کہا تھا کہ میراث رسولؐ تقسیم ہو رہی ہے، وہاں تو بس کچھ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں۔ کچھ کلام کی تلاوت کر رہے ہیں اور بعض افراد حلال و حرام پر گفتگو کر رہے ہیں۔

بزرگ نے جواب دیا: ”تم لوگوں پر افسوس ہے۔ یہی تو تمہارے نبی کریمؐ کی میراث ہے؟“ یہ بزرگ تھے، عظیم المرتبت صحابی رسولؐ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ علم حدیث میں جن کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ آپؐ تمام صحابہؓ کرام میں سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں۔ آپؐ نہ صرف خود علم حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے، بلکہ آپؐ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دوسرے بھی علم دین حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو علم کی دولت کے ساتھ ساتھ حکمت کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ حکمت سے اپنی بات کہنے کا آپؐ کو جو سلیقہ تھا اس کا اظہار اس مضمون کی ابتدا میں بیان کیے گئے واقعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا تعلق قبیلہ دوس سے ہے جو یمن میں آباد تھا۔ اسلام لانے سے قبل آپؐ کا نام عبد شمس تھا، لیکن لوگ آپؐ کو ابو ہریرہؓ کہتے تھے۔ یہ نام یوں پڑا کہ کم عمری میں آپؐ نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ رات کو ایک درخت میں جگہ بنا کر اسے سلا دیتے۔ صبح کو جب بکریاں چرانے کے لیے جاتے تو بلی ساتھ ہولیتی۔ دن بھر بکریاں چرانے کے علاوہ، کمن عبد شمس، بلی کے ساتھ کھیلا کرتے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر

انہیں ابو ہریرہؓ کہنا شروع کر دیا، کیونکہ عربی زبان میں بلی کے لیے ”ہرہ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

عبد شمس ابھی چھوٹے ہی تھے کہ آپؐ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مالی حالات زیادہ اچھے نہ تھے۔ شروع سے ہی فقر و فاقہ کی زندگی گزاری، ذرا بڑے ہوئے تو ایک عورت برہ بنت غزو ان کے پاس روٹی کپڑے پر ملازم ہو گئے۔ کام یہ تھا کہ جب مالک سوار پر ہو تو یہ ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے سواری کو لے چلیں۔ اتفاق دیکھیے کہ بعد میں یہی عورت آپؐ کے نکاح میں آ گئیں۔

قبیلہ دوس سے تعلق رکھنے والے ایک اور صاحب طفیل بن عمر مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں جانے سے پہلے ہی لوگوں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں ایک شخص ”نیا دین“ پیش کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں بڑا سحر ہے۔ وہ ایک کلام پیش کرتا ہے جس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ طفیل مکہ مکرمہ پہنچے تو تجسس ہوا کہ آخر سنیں تو سہی نیا دین ہے کیسا؟ اور وہ کلام کیسا ہے؟ جسے اللہ کا کلام کہا جا رہا ہے، آپؐ نے کلام پاک کی آیات سنیں تو سحر زدہ ہو کر رہ گئے اور ایمان لے آئے۔ واپس قبیلے میں پہنچے تو وہاں اسلام کی دعوت کو عام کرنے میں مصروف ہو گئے۔ حضرت طفیلؓ بن عمر کی کوششوں سے ہی قبیلہ دوس میں اسلام پھیلا۔

628ھ/7 میں غزوہ خیبر ہوئی۔ اسی زمانے میں حضرت طفیلؓ یمن کے 80 افراد کو لے کر رسول پاکؐ کی خدمت میں پہنچے۔ حضورؐ خیبر میں تھے۔ اس لیے یہ قافلہ خیبر جا پہنچا۔ حضرت ابو ہریرہؓ ساتھ تھے۔ اس وقت آپؐ کی عمر تین سال سے کچھ اوپر تھی۔ دوران سفر آپؐ کا ایک غلام کہیں پھٹ گیا۔ خیبر پہنچ کر حضرت ابو ہریرہؓ اسلام لے آئے، اسی وقت پھٹا ہوا غلام دکھائی دیا۔ حضورؐ نے فرمایا، ”ابو ہریرہؓ تمہارا غلام آ گیا۔“ اسلام کی مسرت سے سرشار ابو ہریرہؓ کا جواب تھا ”اب وہ اللہ کی راہ میں آزاد ہے۔“

حضرت ابو ہریرہؓ اسلام لے آئے تو اللہ کے رسولؐ نے آپؐ کے خاندانی نام عبد شمس کو بدل کر آپؐ کا نام عمیر رکھ دیا، لیکن آپؐ ابو ہریرہؓ ہی کے نام سے پکارے جاتے رہے اور آج بھی اپنی اسی کنیت سے مشہور ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اسلام لانے کے بعد رسولؐ اللہ کے در کے ہو رہے آپؐ کے دل میں علم دین حاصل کرنے کی جو خواہش تھی وہ بڑھ کر حرص کی صورت اختیار کر چکی تھی چنانچہ مسجد نبویؐ کے ایک گوشے میں رہائش اختیار کر لی جہاں چند اور صحابہؓ بھی رہ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگیوں کا مرکز و محور اللہ کے دین کے علم کا حصول تھا ان کے لیے مسجد میں ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا جس پر چھت ڈال دی گئی تھی۔ چونکہ عربی میں چبوترے کے لیے ”صفہ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس چبوترے پر رہنے والے اصحابؓ کو ”اصحاب صفہ“ کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ خود تو ایمان کی روشنی سے اپنے قلب کو منور کر چکے تھے۔ اب آپؐ کی خواہش تھی کہ والدہ محترمہ بھی اسلام کی نعمت سے فیضیاب ہوں، آپؐ مختلف مواقع پر اپنی والدہ کو اسلام لانے کی دعوت دیتے رہے، لیکن والدہ کی جانب سے انکار ہوتا رہا۔ ایک دن آپؐ نے والدہ کو پھر دعوت اسلام دی والدہ نے رسول پاکؐ کی شان میں کچھ ایسے کلمات ادا کیے جن کو سن کر حضرت ابو ہریرہؓ کو شدید رنج پہنچا، آنکھوں سے آنسو نکل آئے، روتے ہوئے رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ سے واقعہ بیان کیا اور حضورؐ سے درخواست کی کہ والدہ کے لیے دعا فرمائیں تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔ اللہ کے رسولؐ نے دعا فرمائی۔ کائنات کے خالق سے اس کے محبوب ترین بندے نے دعا کی تھی، کیوں نہ قبول ہوتی۔ حضرت ابو ہریرہؓ واپس گھر پہنچے تو والدہ محترمہ غسل کر کے تیار ہو رہی تھی، بیٹا گھر میں داخل ہوا تو والدہ کی زبان پر کلمہ شہادت جاری تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ پھر روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے، رسول پاکؐ کو والدہ کے اسلام لے آنے کی اطلاع دی اور درخواست کی کہ آپؐ دعا فرمائیں، اللہ میری اور میری ماں کی محبت تمام مسلمانوں کے دل میں ڈال دے۔

آنحضرتؐ نے دعا فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ”اس کے بعد کوئی ایسا مسلمان نہ تھا جس نے مجھے دیکھا ہو اور مجھ سے محبت نہ کی ہو۔“

رسول پاکؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو اصحاب صفہ کے منتظم کی حیثیت دے رکھی تھی جب بھی آنحضرتؐ کھانے یا کسی دوسرے کام

کے سلسلے میں اصحاب صفہ کو جمع کرنے کا ارادہ فرماتے تو حضرت ابو ہریرہؓ سے کہتے کہ اصحاب صفہ کو بلا لائیں۔ حضورؐ اصحاب صفہ کے ساتھ بے حد شفقت سے پیش آتے تھے۔ جب بھی آپؐ کے پاس صدقہ کی کوئی چیز آتی، آپؐ اسے تمام کی تمام اہل صفہ کو بھجوا دیتے اور جب تحفہ کے طور پر کوئی شے آتی تو خود بھی لیتے اور اصحاب صفہ کو بھی عنایت فرماتے۔

رسول پاکؐ کا وصال ہوا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنے۔ مختلف صحابہ کرام پر امور مملکت کے سلسلے میں مختلف ذمہ داریاں ڈالی گئیں، لیکن ابو ہریرہؓ ان امور سے لاتعلق ہو کر رسول اللہؐ کی احادیث کو عام کرنے میں مصروف رہے۔

حضرت عمرؓ نے مسند خلافت سنبھالی تو آپؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر مقرر کر دیا۔ ایک مدت کے بعد وہاں سے لوٹے تو کچھ رقم ان کے پاس تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: ”یہ رقم کہاں سے آئی؟“ حضرت ابو ہریرہؓ نے مناسب جواب دیا۔ تحقیق پر آپؓ کی بات درست نکلی۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ بحرین کا گورنر بنانا چاہا تو آپؓ نے انکار کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بھی آپؓ نے سیاسی امور میں کوئی مداخلت نہ کی۔ آپؓ نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ گمنامی کے گوشے میں گزارا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں مدینہ کے گورنر مروان کے قائم مقام رہے۔

57ھ/677ء میں بیمار پڑے۔ لوگ عیادت کے لیے آئے تو دیکھا کہ آپؓ رورہے ہیں۔ لوگوں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: ”میں اس دنیا کی دلفریبیوں پر نہیں روتا، بلکہ سفر کی طوالت اور زوارہ کی قلت پر آنسو بہاتا ہوں۔ اس وقت میں دوزخ اور جنت کے نشیب و فراز کے درمیان ہوں، معلوم نہیں ان میں سے کس راستے پر جانا ہوگا۔“

ساری زندگی دین کی خدمت کرنے والے صحابی رسولؐ کے خوف خدا کا یہ عالم ہے کہ وہ آخرت کے خیال سے لرزاں ہے کہ نہ جانے دوزخ یا جنت میں سے کون سی جگہ مقدر بنتی ہے۔

آپؓ کو حضورؐ سے اتنی محبت تھی کہ انتقال سے قبل وصیت کی: ”مجھے رسول اللہؐ کی طرح، عمامہ اور قمیض پہنانا۔ میری قبر پر عرب کے دستور کے مطابق خیمہ نہ نصب کرنا، جنازے کے پیچھے آگ لے کر نہ چلنا۔ جنازہ لے جانے میں جلدی کرنا۔ اگر میں صالح ہوں گا تو جلد اپنے رب سے ملوں گا اور اگر بد قسمت ہوں گا تو ایک بوجھ تمہاری گردن سے دور ہوگا۔“

یہ وصیت کرنے کے بعد آپؓ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعیدؓ خدری جیسے جلیل القدر صحابہ کرام، آپؓ کی نماز جنازہ اور تدفین میں شریک تھے۔ حضرت عثمانؓ کے صاحب زادوں نے کندھادے کر جنت البقیع (مدینہ منورہ) پہنچایا اور آپؓ کو اس مبارک سرزمین میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپؓ نے 78 سال کی عمر پائی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بغیر حدیث کا ذکر نامکمل ہے۔ آپؓ وہ خوش قسمت صحابی ہیں جن کے بارے میں خود رسول اقدسؐ نے فرمایا: ”ابو ہریرہؓ علم کا ظرف ہیں۔“ (بخاری)

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا حضرت ابو ہریرہؓ میں علم کے حصول کی خواہش، اتنی شدید تھی کہ وہ خواہش سے بڑھ کر حرص کا روپ دھار چکی تھی۔ عام طور پر لوگ حضورؐ سے زیادہ سوالات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے تھے، لیکن حضرت ابو ہریرہؓ پوچھنے میں کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے تھے۔ ایک بار آپؓ نے حضورؐ سے پوچھا: ”قیامت کے دن کون خوش قسمت آپؓ کی شفاعت کا زیادہ مستحق ہوگا؟“

رسولؐ نے فرمایا: ”حدیث کے بارے میں تمہاری حرص دیکھتے ہوئے میرا پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے اور کوئی نہ کرے گا۔“ (مسند احمد بن حنبل)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے صاحب زادے اور مشہور صحابی رسولؐ ہیں، آپؓ فرماتے ہیں: ”ابو ہریرہؓ ہم سب سے زیادہ حدیث جانتے تھے، اور امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ ”حضرت ابو ہریرہؓ اپنے ہم عصر حفاظ میں سے بڑے حافظ تھے۔“

ایک بار حضرت شقیہؓ صحیحی مدینہ منورہ آئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ایک بزرگ کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور بزرگ احادیث بیان فرما رہے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: ”یہ کون ہیں؟“ لوگوں نے بتایا: ”یہ حضرت ابو ہریرہؓ ہیں“ آپؐ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ جب لوگ حدیثیں سن کر رخصت ہو گئے تو حضرت صحیحیؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا: ”کوئی ایسی احادیث سنایے۔ جسے آپؐ نے حضورؐ سے خود سنا ہو سمجھا ہو اور جانا ہو۔“ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ”ایسی ہی حدیث بیان کروں گا۔“ یہ کہا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ہوش میں آئے تو فرمایا: ”میں آپؐ سے ایسی حدیث بیان کروں گا جو حضورؐ نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی اور میرے اور آپؐ کے سوا یہاں کوئی نہ تھا۔“ یہ کہا اور چیخ مار کر تیسری بار بے ہوش ہو گئے۔

حضرت صحیحیؓ نے آپؐ کو تھام لیا، دیر تک تھامے رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو ہوش آیا تو فرمایا: ”رسول اللہؐ نے فرمایا تھا“ ”قیامت کے دن سب سے پہلے تین آدمی طلب کیے جائیں گے، ایک عالم قرآن پاک، راہ خدا میں شہید ہونے والا اور دولت مند۔ اللہ تعالیٰ، عالم دین سے پوچھیں گے کیا میں نے تجھ کو قرآن کی تعلیم نہیں دی؟“ وہ کہے گا ”ہاں میرے خدا“ اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے، ”تو نے اس پر کیا عمل کیا؟“ وہ جواب دے گا ”رات دن اس کی تلاوت کرتا تھا۔“ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ”تو جھوٹا ہے تو اس لیے تلاوت کرتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کا خطاب دیں چنانچہ خطاب دیا جا چکا۔“ پھر دولت مند سے سوال کیا جائے گا: ”کیا میں نے تجھ کو مال و دولت نہیں دیا کہ تو بے نیاز ہو گیا؟“ وہ کہے گا ”ہاں اے خدا“ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے ”تو نے اس دولت کا کیا کیا؟“ میں صلہ رحمی کرتا تھا۔ صدقہ دیتا تھا“ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ”جھوٹ بولتا ہے“ تیرا مقصد تو یہ تھا کہ تو فیاض اور سخاوت کا کہلائے۔ سو لوگوں نے کہہ دیا، ”پھر وہ شخص پیش ہوگا جسے اپنی جان راہ خدا میں دینے کا دعویٰ تھا“ اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے تو کیوں مار ڈالا گیا؟“ وہ کہے گا ”اے اللہ آپؐ نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا“ میں آپؐ کی راہ میں لڑا اور مارا گیا۔“ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، ”تو جھوٹ کہتا ہے تو چاہتا تھا کہ تو دنیا میں جری اور بہادر کہلائے تو یہ کہہ چکا۔“

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: یہ حدیث بیان فرما کر رسول اللہؐ نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا: ”ابو ہریرہؓ، سب سے پہلے انہی تینوں پر جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔“

اس حدیث رسولؐ کو بیان کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ کا تین مرتبہ بے ہوش ہو جانا آپؐ کے خوف خدا کی بے پناہ شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپؐ اس حقیقت سے بخوبی باخبر تھے کہ انسان اگر ساری عمر نیک اعمال کرتا رہے لیکن اس کی نیت درست نہ ہو تو اس کے سارے اعمال اکارت جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی بیان کردہ روایات کی تعداد 5374 ہے۔ ان میں سے 325 احادیث متفق علیہ ہیں، گو کہ آپؐ نے رسول اللہؐ کی خدمت میں بہت طویل عرصہ نہیں گزارا۔ اس کی وجہ آپؐ خود بیان کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

”لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ حدیثوں کو بیان کرتا ہے حالانکہ مہاجرین اور انصار ان حدیثوں کو نہیں بیان کرتے، لیکن اعتراض کرنے والے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہمارے مہاجر بھائی اپنے کاروبار میں لگے رہتے ہیں، انصار اپنی زراعت کی دیکھ بھال کرتے ہیں، میں سارا وقت حضورؐ کی خدمت میں گزارتا تھا، جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہ رہتے تھے میں ان اوقات میں بھی موجود رہتا تھا دوسرے یہ کہ جن باتوں کو وہ بھلا دیتے تھے میں ان کو یاد رکھتا تھا۔“

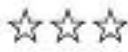
حضرت ابو ہریرہؓ متعدد غزوات میں شریک ہوئے، لیکن غزوات میں مسلمانوں کی فتح کے بعد جو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا آپؐ اس سے لاتعلق رہتے تھے حتیٰ کہ ایک بار رسول کریمؐ نے پوچھ لیا کہ ”ابو ہریرہؓ تم اس مال غنیمت کا سوال کیوں نہیں کرتے جس کا تمہارے دوسرے ساتھی سوال کرتے ہیں؟“ علم دین کے شیدائی نے عرض کی ”میری درخواست تو یہ ہے کہ آپؐ مجھے وہ علم سکھائیں جو اللہ نے آپؐ کو سکھایا ہے“ یہ سن کر رسول پاکؐ نے فرمایا: ”چادر پھیلاؤ۔“ حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی چادر پھیلا دی۔ پھر حضورؐ احادیث بیان فرمانے لگے جب آپؐ نے اپنی

بات ختم کی تو فرمایا ”اس چادر کو اکٹھا کر کے اپنے جسم سے لگاؤ“ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایسا ہی کیا۔ آپؓ فرماتے ہیں ”اس کے بعد میرے حافظے کا یہ حال تھا کہ جو کچھ حضورؐ ارشاد فرماتے اس میں سے ایک حرف بھی نہیں بھولتا۔“

ایک بار مدینہ کے گورنر مروان نے آپؓ کا امتحان لیا۔ انہوں نے اپنے کاتب کو تخت کے نیچے بٹھادیا اور آپؓ سے احادیث پوچھنا شروع کیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ احادیث بیان فرماتے جاتے تھے اور تخت کے نیچے چھپا ہوا کاتب لکھتا جاتا تھا۔ ایک سال بعد مروان نے پھر اسی طرح سے ابو ہریرہؓ کو بلوایا اور کاتب کو تخت کے نیچے بٹھادیا۔ احادیث پوچھنا شروع کیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے وہی احادیث بیان کر دیں حتیٰ کہ ان کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے علم سے بڑے بڑے صحابہؓ کرام نے استفادہ کیا ہے ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو ایوبؓ انصاری، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت ابو موسیٰؓ اشعری، حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ شامل ہیں۔ آپؓ کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہے جن میں متعدد تابعین شامل ہیں۔ آپؓ کا شمار مدینہ کے فقہاء کرام میں ہوتا ہے۔ رسول پاکؐ کے بعد مدینہ منورہ میں جس جماعت کو فتویٰ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی اس کے ایک رکن آپؓ بھی تھے۔ عربی آپؓ کی مادری زبان تھی تاہم آپؓ فارسی زبان بھی جانتے تھے۔ دیگر مذاہب پر بھی آپؓ کی نظر تھی اور تورات کے مسائل سے خاصی واقفیت تھی۔

آپؓ کو عبادت سے خصوصی لگاؤ تھا۔ آپؓ کا خاندان تین افراد پر مشتمل تھا۔ آپؓ، آپؓ کی اہلیہ اور خادم۔ آپؓ کا معمول تھا کہ رات کو جاگ کر عبادت کیا کرتے تھے اور اپنی اہلیہ اور خادم کو بھی عبادت کے لیے جگا دیا کرتے تھے۔ ہر ماہ کے شروع میں تین روزے رکھا کرتے تھے۔ آپؓ فرماتے تھے کہ ”ایسا میں اس لیے کرتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے تو کم از کم وہ ماہ تو روزوں کے ثواب میں لکھا جائے۔“



حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ

آپؓ نے اللہ کی راہ میں تین بار ہجرت فرمائی

چاروں طرف سنائے کا راج تھا!

ہر طرف تاریکی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی خواب گاہوں میں میٹھی نیند سو رہے تھے شہر کی گلیاں سنسان تھیں اور ان سنسان اور تاریک گلیوں میں دو انسانی سائے حرکت کر رہے تھے۔ دونوں سائے دراز قد تھے۔ ایک ان میں چھریرے بدن کا معلوم ہوتا تھا جبکہ دوسرا قدرے جسیم تھا۔

کچھ دور جانے پر ایک مکان سے روشنی پھوٹی دکھائی دی..... دونوں سائے روشنی کی سمت چل دیے۔ روشنی جوں جوں واضح ہوتی گئی فضا میں ایک طرح کا شور بڑھتا گیا۔ جسے ان سایوں نے بھی محسوس کیا۔ شور ایسا تھا جیسے کچھ لوگ ہڑبونگ مچا رہے ہوں۔ کچھ ایسا شور جیسے عیش و طرب کی محفلوں سے اُٹھتا ہے۔

ایک سائے نے دوسرے سے پوچھا: ”تمہیں معلوم ہے یہ کس کا مکان ہے۔؟“ جواب ملا ”نہیں!“

پہلے سائے نے بتایا: ”یہ ربیعہ بن امیہ بن خلف کا مکان ہے اس وقت یہ لوگ مست ہیں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟“

دوسرے سائے نے کہا: ”ہم بہت غیر مناسب جگہ چلے آئے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”لا تجسوا“ لوگوں کے عیوب تلاش نہ کرو۔“

یہ سن کر پہلے سائے نے خاموشی اختیار کر لی پھر دونوں سائے مڑے اور جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے گئے۔

تاریک راتوں میں گلی گلی گھوم کر لوگوں کا حال معلوم کرنے والے یہ سائے تھے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ۔ یہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہی تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے راتوں کو گشت پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کیا تھا اور یہ حضرت عبدالرحمنؓ ہی تھے جنہوں نے اس وقت کی وسیع و عریض اسلامی مملکت کے حکمران حضرت عمرؓ کو قرآن پاک کی آیت سنا کر روک دیا تھا۔

آپؓ کا نام عبدالرحمن اور کنیت ابو محمد ہے والد کا نام عوف اور والدہ کا نام شفاء تھا۔ ایمان لانے سے قبل آپؓ کا نام عبد عمرو تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو خود رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کا نام تبدیل کر کے عبدالرحمن رکھ دیا۔ آپؓ نے اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں تو مکہ مکرمہ میں واقعہ فیل رونما ہوئے دس سال بیت چکے تھے۔ اور ابرہہ کے ہاتھیوں کی اباہیلوں کے ہاتھوں تباہی کی داستان لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھی۔

آفتاب رسالتؐ طلوع ہوا تو اس کی روشنی حضرت عبدالرحمنؓ کے دل میں بھی گھر کر گئی۔ رسول پاکؐ کے رفیق محترم حضرت ابو بکر صدیقؓ نے توحید کی دعوت دی تو آپؓ نے اس پر فوراً لبیک کہا۔ ایمان لانے والوں میں آپؓ کا تیرہواں نمبر ہے۔ اس وقت رسول اللہؐ کی مخالفت زیادہ نہیں بڑھی تھی اور آپؓ حضرت ارقم بن ابی رقمؓ کے مکان میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

مکہ کے کفار اور قریش کی نگاہوں سے نیا دین (اسلام) چھپانہ رہ سکا۔ جلد ہی ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو گیا۔ کمزور ستائے جانے لگے تو حضورؐ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کر جانے کی ہدایت کی۔ حضرت عبدالرحمنؓ ان صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جنہوں نے حبشہ کے لیے دوبار ہجرت کی۔ بالآخر آپؐ دیگر مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔

مدینہ منورہ میں انصار نے مہاجرین کو بے عزت و احترام سے اپنے ہاں جگہ دی۔ حضور اکرمؐ نے سعد بن الربیع انصاری سے حضرت عبدالرحمنؓ کا بھائی چارہ کروادیا۔ حضرت سعدؓ نے اس موقع پر ایثار و قربانی کی جو مثال قائم کی اس کی آب و تاب سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی اس طرح باقی ہے۔ حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمنؓ سے کہا: ”میں اپنا نصف مال آپ کو دیتا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ انہیں دیکھ لیں۔ آپ کو جو پسند آجائے مجھے اس کا نام بتائیں۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ عدت گزر جانے کے بعد آپؐ اس سے نکاح کر لیجیے گا۔“

حضرت عبدالرحمنؓ نے جواب دیا: ”اللہ آپؐ کے مال اور اہل و عیال میں برکت عطا فرمائے۔ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجیے۔“ لوگوں نے انہیں بنی قنیقاع کے بازار میں پہنچا دیا۔ آپؐ نے تھوڑے سے مال سے تجارت شروع کر دی۔ واپس آئے تو کچھ گھی اور پنیر بطور نفع ساتھ تھا۔ اس کے بعد تو چند برسوں میں حال یہ تھا کہ آپؐ کا کاروبار دور دور تک پھیل چکا تھا۔ کچھ تو والد کی تربیت کا اثر تھا کہ آپؐ کا کاروباری رموز سے واقف تھے اور دراصل یہ اللہ کا آپؐ پر خاص کرم تھا کہ آپؐ جس کاروبار میں بھی ہاتھ ڈالتے وہ پھلنے پھولنے لگتا۔ خود آپؐ کا کہنا ہے کہ ”میں پتھر بھی اٹھاتا تو اس کے نیچے سے سونا نکل آتا۔“ آپؐ کا مال سینکڑوں اونٹوں پر لد کر باہر جاتا تھا اور اسی طرح واپس آتا تھا۔ ایک بار آپؐ کا قافلہ مدینے لوٹا تو اس میں سات سو اونٹوں پر صرف گےہوں، آٹا یا دیگر اشیائے خورد و نوش لدی ہوئی تھیں۔ بعد میں آپؐ نے زراعت بھی شروع کر دی تھی۔

لیکن اتنی بڑی دولت کے مالک ہونے کے وجہ سے کیا آپؐ میں تکبر آ گیا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ آپؐ تو اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر آپؐ نے نصف مال حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دیگر دو مواقع پر راہ خدا میں چالیس چالیس ہزار دینار دیے۔ ایک بار جہاد کے لیے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ دیے۔ ایک بار ایک زمین چالیس ہزار دینار میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کی اور یہ ساری رقم راہ خدا میں دے دی۔ ایک دن میں تیس تیس غلام آزاد کر دیتے تھے۔ انتقال کے وقت پچاس ہزار دینار اور ایک ہزار گھوڑے اللہ کی راہ میں وقف کیے۔ جن صحابہ کرامؓ نے غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی اور اس وقت تک حیات تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے چار سو دینار کی وصیت کی۔ اس وقت ایسے ایک سو صحابہ کرامؓ حیات تھے۔ ان تمام میں یہ رقم تقسیم کی گئی۔ خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ بھی شامل تھے۔ امہات المؤمنینؓ کے لیے ایک باغ کی وصیت کی جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔

اللہ کی راہ میں اس قدر مال و دولت نثار کرنے والا صحابی رسولؐ پھر بھی فکر مند رہتا تھا کہ اس سے کہیں آخرت میں اس کے مال کے بارے میں باز پرس نہ کر لی جائے۔ یہی فکر انہیں ایک بار ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس لے گئی۔ آپؐ نے حضرت ام سلمہؓ سے عرض کی: ”مجھے خوف ہے کہ مال کی کثرت مجھے ہلاک کر دے گی۔“

ام المؤمنینؓ نے جواب دیا: ”راہ خدا میں صرف کرو، میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ میرے اصحابؓ میں سے بعض ایسے ہیں کہ مجھ سے بچھڑنے کے بعد انہیں میرا دیدار نصیب ہوگا۔“

حضرت عبدالرحمنؓ کو اللہ نے اس قدر دولت دی کہ آپؐ چاہتے تو عالیشان محل کھڑا کر لیتے اور دنیا بھر کی آسائشیں اپنی جھولی میں ڈال لیتے

لیکن آپؐ کے تقویٰ کی بلندی کا عالم یہ ہے کہ ایک بار روزہ رکھا۔ شام کے وقت کھانا سامنے آیا تو آپؐ رو پڑے اور فرمایا:

”مصعب بن عمیرؓ مجھ سے بہتر تھے۔ وہ شہید ہوئے تو ان کے کفن میں صرف ایک چادر تھی جس سے سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں چھپاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ اسی طرح حمزہؓ شہید ہوئے وہ مجھ سے بہتر تھے۔ اب دنیا ہمارے لیے کشادہ ہو گئی ہے اور ہمیں اس قدر دنیاوی نعمتیں دے دی گئی ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ شاید ہماری نیکیوں کا صلہ دنیا میں ہی مل گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس قدر روئے کہ کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ (بخاری)

آپؐ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یعنی ان دس صحابہ کرامؓ میں جنہیں رسول پاکؐ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور شجاعت و دلیری کے جوہر دکھائے غزوہٴ احد میں بدن پر 21 زخم لگے یہ تمام زخم بدن کے سامنے حصے پر تھے۔ پشت پر کوئی زخم نہ تھا۔ اسی غزوہ میں پاؤں میں اتنا کاری زخم لگا کہ صحت یاب ہونے کے بعد بھی ہمیشہ پاؤں پر زور دے کر چلتے تھے۔

شعبان 6ھ/627ء میں حضورؐ نے دومتہ الجندل کے قریب آباد قبیلہ کلب کو اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا۔ یہ قبیلہ خاصا طاقت ور تھا اور اگر یہ اسلام لے آتا تو مسلمان کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوتی۔ اللہ کے رسولؐ کی خواہش یہ تھی کہ کسی ایسے شخص کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بھیجا جائے جو بات موثر اور دلکش انداز میں پہنچا سکے اور اگر لڑائی کی ضرورت پیش آجائے تو اس کی بھی اہلیت رکھتا ہو۔ آپؐ نے حضرت عبدالرحمنؓ کو بلوایا۔ اپنے دست مبارک سے سیاہ عمامہ باندھا۔ چار انگشت شملہ پشت کی جانب چھوڑتے ہوئے فرمایا۔

”عبدالرحمن اسی طرح عمامہ باندھا کرو کیوں کہ یہ عمدہ اور پسندیدہ طریقہ ہے۔“

پھر آپؐ نے سات سو مجاہدین ساتھ کیے اور ہاتھ میں علم دے کر فرمایا: ”بسم اللہ! راہِ خدا میں روانہ ہو جاؤ۔ جو لوگ اللہ کی نافرمانی اور گناہ میں مبتلا ہیں ان سے جا کر جہاد کرو۔ کسی کو دھوکا نہ دینا، فریب نہ کرنا، بچوں کو نہ مارنا۔“

حضرت عبدالرحمنؓ دومتہ الجندل پہنچے۔ اسلام کی دعوت اس قدر عمدگی سے دی کہ قبیلہ کلب کے سردار اصغ بن عمرو جو عیسائی تھے اپنے قبیلے کے بہت سے لوگوں سمیت حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے حضرت رافع بن کیتؓ کے ہاتھ ایک خط میں حضورؐ کو اس خوشخبری سے آگاہ کیا۔ حضورؐ نے جواباً پیغام بھجوایا کہ تم قبیلہ کے سردار اصغ کی بیٹی سے شادی کرلو۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمنؓ نے ایسا ہی کیا۔ اسی خاتون سے حضرت ابوسلمہ بن حضرت عبدالرحمنؓ پیدا ہوئے۔ جو مشہور راوی حدیث ہیں۔ سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے اصغ کی بیٹی سے شادی کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ اس طرح قبیلہ بنو کلب سے مسلمانوں کے تعلقات استوار ہوں گے۔ اس سے پہلے قریش اور بنو کلب میں شادی بیاہ کے تعلقات نہ تھے۔

غزوہٴ احد میں لڑائی زوروں پر تھی۔ حضرت حارث بن صمہؓ انصاری حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا۔ ”تم نے عبدالرحمنؓ کو دیکھا ہے؟“ انہوں نے عرض کی ”وہ پہاڑی کی طرف کفار کے زرعہ میں تھے میں نے ادھر جانا چاہا لیکن آپؐ پر نظر پڑ گئی اس لیے میں ادھر آ گیا۔“..... رحمتِ دو عالمؐ نے ارشاد فرمایا۔ ”عبدالرحمنؓ کو فرشتے بچارہے ہیں۔“ حضرت حارثؓ، حضرت عبدالرحمنؓ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے سات کافروں کی لاشیں پڑی ہیں۔ حضرت حارثؓ نے پوچھا ”ان سب کو آپؐ نے قتل کیا ہے؟“ جواب ملا ”دو کو تو میں نے قتل کیا ہے باقی مشرکین کو قتل کرنے والے مجھے نظر نہیں آئے۔“ یہ سننا تھا کہ حضرت حارثؓ پکار اٹھے ”رسول اللہؐ نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔“

رسول پاکؐ کے بعد خلافت کا مسئلہ اٹھا۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے بھی اس مسئلے کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپؐ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ

صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے تیسرے فرد تھے حضرت ابو بکرؓ نے اپنے عہد خلافت میں آپؐ کو ہر قسم کے مشوروں میں شریک رکھا۔

حضرت عمرؓ پر خلافت کی ذمہ داری ڈالی گئی تو انہوں نے امور مملکت کو چلانے کے لیے وسیع انتظامات کیے، مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے مستقل مجلس شوریٰ قائم کی۔ حضرت عبدالرحمنؓ بھی اس مجلس کے رکن بنائے گئے۔ آپؐ کی رائے بہت سے مواقع پر حتمی تسلیم کی گئی۔ مثلاً عراق پر جب فوج کشی کے لیے جب مسلمانوں کی فوج بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو سوال اٹھا کہ اس فوج کا سپہ سالار کسے بنایا جائے۔ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ وہ خود فوج کی قیادت کریں لیکن یہ حضرت عبدالرحمنؓ تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ کو روکا اور متبادل کے طور پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ یہ تجویز مان لی گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں مسلمانوں نے مشہور جنگ قادسیہ میں فتح حاصل کی۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فقہ پر جتنا کام ہوا اس میں حضرت عبدالرحمنؓ کی آراء بھی شامل تھیں۔ آپؐ ان جلیل القدر اور صاحب علم صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جو رسول پاکؐ کے زمانے میں فتویٰ دیتے تھے۔ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعین نے آپؐ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان راویوں میں حضرت عمرؓ بھی شامل ہیں، کئی اہم مواقع پر آپؐ نے خلفائے راشدینؓ کو اپنے علم سے فائدہ پہنچایا۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں حضور کریمؐ کی وراثت کا مسئلہ پیدا ہوا تو حضرت عبدالرحمنؓ نے اس حدیث کی تصدیق کی کہ حضورؐ کے ترکہ میں وراثت نہیں ہے۔

18ھ/639ء میں شام میں طاعون پھیل گیا۔ حضرت عمرؓ دورہ کرتے ہوئے ”سرغ“ کے مقام پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ وہاں سے جانا چاہتے تھے لیکن حضرت ابوعبیدہؓ کو اختلاف تھا۔ حضرت عباسؓ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف آئے وہ بعض ضرورتوں سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرمایا ”اس مسئلے کے متعلق مجھے علم ہے۔ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ جب تم اس (طاعون) کو کسی زمین میں سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب تم کسی علاقے میں ہو اور وہاں وبا پھوٹ پڑے تو اس سے بھاگ کر نہ جاؤ۔“

یہ حدیث پاک سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”اللہ کا شکر ہے، پلٹ چلو۔“

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ حضرت عبدالرحمنؓ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار عشاء کی نماز کے بعد حضرت عبدالرحمنؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے عرض کی ”مجھے بلوایا ہوتا۔ خود کیوں تکلیف کی“ جواب ملا۔ ”مجھے اطلاع ملی ہے کہ مدینے کے باہر ایک قافلہ اتر رہا ہے۔ قافلے والے تھک کر سو گئے ہیں میرے ساتھ چلو۔“ حضرت عبدالرحمنؓ فوراً تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ انہیں لے کر مدینہ کے باہر تشریف گئے اور نماز ادا کرنا شروع کر دی اور اس طرح قافلے کی حفاظت بھی کرتے رہے اور نماز کا ثواب بھی سمیٹ لیا۔

معرکہ نہاوند میں مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانے پر مال غنیمت ملا۔ مال غنیمت کی سینکڑوں گھڑیاں مدینہ منورہ لائی گئیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں مسجد نبویؐ میں رکھنے کا حکم دیا اور چند صحابہ کرامؓ کو نگرانی کے لیے مامور کر دیا، ان صحابہ کرامؓ میں حضرت عبدالرحمنؓ بھی شامل تھے۔

26 ذوالحجہ 23ھ/4 نومبر 644ء کو حضرت عمرؓ نماز فجر کی امامت کے لیے کھڑے ہوئے اسی وقت ایک پارسی غلام ابولولونے آپؐ پر حملہ کر دیا آپؐ شدید زخمی ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن میمونؓ فرماتے ہیں کہ زخمی ہوتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمنؓ کا ہاتھ پکڑا اور امامت کے لیے انہیں کھڑا کر دیا جو لوگ قریب تھے انہیں تو علم تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جو لوگ دور تھے وہ حضرت عمرؓ کی آواز نہ آنے پر چلا رہے تھے۔ ”سبحان اللہ سبحان اللہ“

حضرت عمرؓ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان سے اصرار کیا گیا کہ وہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ ”حضرت عمرؓ نے فرمایا، حضرت عثمانؓ،

حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوفؓ میں سے جس کی نسبت کثرت آراء ہوا سے خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ رسول اللہؐ ان سب سے آخر وقت تک خوش رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ عبدالرحمنؓ نہایت صائب الرائے، ہوش مند اور سلیم الطبع ہیں۔ ان کی رائے کو غور سے سننا اور اگر انتخاب میں اختلاف پیدا ہو جائے تو جس کی طرف عبدالرحمنؓ ہوں ان کا ساتھ دینا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں آپؐ امور مملکت سے دور رہے 32ھ/652ء میں آپؐ اپنے رب سے جا ملے۔ اس وقت آپؐ کی عمر 72 سال تھی، بعض مؤرخین نے آپؐ کی عمر 75 سال بتائی حضرت علیؓ نے جنازے پر کھڑے ہو کر کہا: ”عبدالرحمنؓ جاؤ تم نے اچھا زمانہ پایا اور فتنوں سے بچ کر چل دیے۔“

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متعدد مواقع پر آپؐ کو ساتھ لے جاتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لیے حضورؐ تشریف لے گئے تو حضرت عبدالرحمنؓ ساتھ تھے۔

مسند اور ترمذی میں خود حضرت عبدالرحمنؓ سے روایت ہے کہ ”اصحابؓ میں سے چار پانچ افراد حضورؐ سے جدا نہ ہوتے تھے۔ تاکہ آپؐ کو کسی بھی وقت کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے پورا کر سکیں۔ ایک دن میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اپنے مکان سے نکلے میں پیچھے پیچھے چلا۔ آپؐ بلندی پر واقع ایک باغ میں داخل ہو گئے وہاں آپؐ نے سجدہ کیا۔ سجدہ اتنا طویل تھا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ آپؐ کا وصال ہو گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں رو پڑا۔ آپؐ نے سجدے سے سر اٹھا کر پوچھا: ”عبدالرحمنؓ! تجھے کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے اپنے رونے کی وجہ بتائی، حضور اکرمؐ نے فرمایا:

”جبریلؑ نے مجھ سے کہا کہ کیا میں آپؐ کو یہ بشارت نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو آپؐ پر درود بھیجے گا میں اس پر درود بھیجوں گا اور جو آپؐ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلام بھیجوں گا۔“ یعنی حضورؐ اس پیغام کے جواب میں سجدہ شکر بجالا رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ رحمت اللعالمینؑ پر لاکھوں درود اور لاکھوں سلام نازل فرمائے۔ جن کے تربیت کردہ صحابہ کرامؓ کی روشن سیرتیں ستاروں کی مانند، گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کو راستہ دکھا رہی ہیں۔



حضرت سلمان فارسیؓ

انہوں نے زندگی محض ایک مسافر کی طرح بسر کی

مکان کی تعمیر و ترقی کے لیے مزدور آچکے تھے، لیکن بوذخشاں کچھ پریشان تھے۔ وہ اصفہان کے پرانے شہر کے نواحی قصبہ جہی کے بڑے جاگیردار تھے اور انہیں روزانہ اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اگر وہ روزانہ کی طرح جاگیر پر چلے جاتے تو مکان میں تعمیراتی کام کی نگرانی کون کرتا۔ آخر بہت کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے بیٹے مابہ کو بلایا۔ مابہ آئے تو بوذخشاں نے کہا: ”بیٹے آج میں یہاں گھر میں مصروف ہوں لہذا تم ذرا جاگیر کی طرف چلے جاؤ وہاں دیکھ بھال کرنا لیکن دیکھو وہاں زیادہ دیر نہ لگانا ورنہ مجھے پریشانی ہوگی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ تم مجھے جاگیر سے بھی زیادہ عزیز ہو۔“

مابہ نے کہا ”بہت اچھا۔“ اور وہ جاگیر کی سمت روانہ ہو گئے۔ دن ڈھلا، سورج کا چہرہ زرد ہوا، سائے دراز ہونے لگے اور بالآخر سورج اپنا سرخ چہرہ لیے مغرب کی طرف روپوش ہو گیا، لیکن مابہ جاگیر سے نہیں لوٹے۔ بوذخشاں سخت پریشان تھے۔ مابہ کہاں گئے۔ انہوں نے اپنے عزیز بیٹے کو تلاش کرنے کے لیے مختلف سمتوں میں آدمی روانہ کر دیے، لیکن تمام ہی افراد مابہ کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔

بوذخشاں بیٹے کی گمشدگی کے صدمے میں نڈھال تھے ان کے ہاں آتش دان میں بیٹے کی روشن کی ہوئی آگ بدستور روشن تھی۔ بوذخشاں مذہب کے اعتبار سے مجوسی تھے۔ یعنی آگ کی پرستش کرنے والے۔ مجوسیوں میں یہ عقیدہ ہے کہ اگر ان کے ہاں روشن کی جانے والی آگ بجھ جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کا خدا ان سے ناراض ہو گیا ہے۔ آتش کدہ میں آگ بھی روشن تھی۔ مقدس آگ کی اس قدر دیکھ بھال کرنے والے مابہ سے خدا کیسے ناراض ہو سکتا ہے۔ آخر وہ کہاں گئے؟

رات بھینکنے لگی لیکن مابہ کا کوئی پتہ نہ چلا..... اور پتا چلتا بھی کیسے؟ مابہ تو ایک کلیسا میں بیٹھے مسیحی پادریوں سے ان کے دین کی باتیں سن رہے تھے اور انہیں عبادت کرتے دیکھ رہے تھے۔ اہل کلیسا تو مجوسیوں کے دشمن تھے اس لیے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ مابہ کسی کلیسا میں بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

خاصی رات گزر گئی تو مابہ گھر لوٹے..... دل گرفتہ باپ نے بیٹے کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ جب جذبات کا طوفان تھا تو بوذخشاں نے گلوگیر لہجے میں مابہ سے پوچھا۔ ”بیٹے تم کہاں تھے۔“ مابہ نے جھجکتے ہوئے اصل بات بتادی کہ ”میں تو جاگیر پر جانے کے لیے نکلا تھا راستہ میں کلیسا میں کچھ لوگوں کو عبادت کرتے دیکھا۔ ان کی عبادت مجھے بہت اچھی لگی اس لیے میں وہیں رک گیا۔ میں نے کلیسا والوں سے ان کے دین کی بہت سی باتیں سنیں۔ ان کے مذہب کے ماننے والے شام میں ہیں۔ میں اس مذہب کے بارے میں اور جاننا چاہتا ہوں۔“ مابہ کی زبان سے یہ سننا تھا کہ بوذخشاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ سخت لہجے میں بولے۔ ”بیٹے اس مذہب میں قطعاً کوئی بھلائی نہیں ہے۔ تمہارا اپنا اور باپ دادا کا مذہب اس مذہب سے کہیں بہتر ہے۔“ لیکن مابہ اب مجوسیت سے بیزار ہو چکے تھے۔ ان کے دل میں تلاش حق کا جذبہ موجزن تھا۔ آگ کی پوجا کرنا انہیں

بے معنی دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس ذات کی تلاش میں تھے جس نے اس کائنات کو، زمین آسمان، چاند اور ستاروں کو تخلیق کیا ہے، جس کے حکم پر دن اور رات باری باری آتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں اور موسم بدلتے ہیں۔

مابہ کو نصرانیت (عیسائیت) میں حق کی خوشبو محسوس ہوئی تھی وہ کہہ اٹھے ”نہیں خدا کی قسم وہ مذہب ہمارے مذہب سے یقیناً بہتر ہے۔“ بوذخشاں یہ سن کر سخت ناراض ہوئے۔ اگرچہ انہیں اپنے بیٹے سے محبت تھی لیکن اپنا پیارا بیٹا دشمنوں کے دین کو پسند کرنے لگے۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ انہوں نے سوچا ابھی جوان خون ہے جذباتی ہو گیا ہے سختی سے سمجھا دوں گا تو سمجھ جائے گا۔ انہوں نے مابہ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں اور انہیں گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ کمرے میں انہیں خوراک وغیرہ فراہم کر دی جاتی۔ گھر کے دیگر افراد مابہ کے ساتھ سخت سلوک ہوتے دیکھتے لیکن بوذخشاں کے خوف سے کچھ نہ کہتے۔

مابہ قید میں تھے لیکن ان کے دل میں ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی اس کائنات کے مالک کو پہچاننے کی دھن۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح ایک شخص کے ذریعہ کلیسا والوں کو کہلا بھیجا کہ جب شام سے کوئی قافلہ آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ کچھ دنوں بعد ایک قافلہ شام سے آکر قصبے میں ٹھہرا، مابہ کو اطلاع دی گئی انہوں نے اہل کلیسا کو پیغام بھیج دیا کہ جب قافلہ شام واپس جانے لگے تو مجھے خبر دینا۔ قافلہ چند روز ٹھہر کر واپس جانے لگا تو مابہ کو اطلاع دی گئی۔ مابہ نے کسی طرح اپنے پیر بیڑیوں سے آزاد کیے اپنے گھر پر الوداعی نظر ڈالی اور چھپتے چھپاتے، قافلے والوں سے جا ملے اب ان کی منزل شام تھی۔

کئی دن کے سفر کے بعد قافلہ شام پہنچا وہاں پہنچ کر مابہ نے کلیسا کے بڑے پادری (اسقف) سے ملاقات کی اور ان کے پاس رہ کر کلیسا کی خدمت کرنے اور علم حاصل کرنے کی گزارش کی۔ اسقف نے یہ گزارش قبول کر لی۔ مابہ اسقف کے ساتھ رہنے لگے کچھ عرصہ بعد اسقف کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ایک اور صاحب اسقف بنائے گئے۔ لیکن کچھ مدت بعد ان کا بھی آخری وقت آن پہنچا۔ مابہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اب میں کس کے پاس جاؤں۔“ اسقف نے کہا کہ ”بیٹا دین کی سچی تعلیم پر تو اب شاید کوئی بھی کار بند نہیں رہا تم موصل جاؤ وہاں ایک بزرگ ہیں ان سے ملو اور میرا سلام کہو۔“

وادی القریٰ، مدینہ منورہ سے شام جانے والے راستے پر آباد، ایک بستی تھی۔ اونٹ پر اس بستی سے مدینہ منورہ پہنچنے میں چھ دن لگتے تھے۔ مابہ کا شوق انہیں وادی القریٰ تک تو لے ہی آیا تھا۔ اب قدرت نے انہیں اس سرزمین تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا جہاں آفتاب حق کی کرنیں جلوہ گر ہونے والی تھیں، لیکن ابھی مابہ کو مزید امتحانوں سے گزرنا تھا۔ مابہ وادی القریٰ میں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن ان کے آقا کا چچا زاد بھائی عثمان بن اشہل القرظی وہاں آ نکلا۔ اس نے مابہ کو محنت سے کام کرتے دیکھا تو انہیں پسند کر لیا۔ اس نے بھاؤ تاؤ کیا اور مابہ کو خرید کر یثرب (مدینہ منورہ) لے آیا۔ عثمان بن اشہل کا تعلق یہودیوں کے قبیلہ بنی قریظہ سے تھا۔ اس کا نخلستان قبا کی بستی کے قریب واقع تھا۔ بستی قبا، یثرب سے دو تین میل کے فاصلے پر تھی۔ قبا دراصل ایک کنویں کا نام تھا۔ یہاں بنی عمرو بن عوف کے مکانات تھے۔

مابہ اب عثمان بن اشہل کے نخلستان میں کام کرنے لگے ایک دن مابہ کھجور کے ایک بیڑ پر چڑھے کام میں مصروف تھے کہ ان کے آقا کا ایک چچا زاد بھائی تیز تیز قدم بڑھاتا آیا اور آتے ہی بنی قیلہ (انصار) کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمام انصار ایک ایسے شخص کے پاس جمع ہو رہے ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص اللہ کا نبی ہے۔

مابہ نے یہ بات سنی تو ان کا دل ڈوبنے لگا۔ بدن کا پنے لگا انہیں خدشہ ہوا کہ وہ کھجور کے بیڑ پر سے گر نہ پڑیں۔ وہ جلدی سے درخت سے

اتر آئے اور آقا کے چچا زاد سے پوچھنے لگے۔ ”آپ ابھی کیا کہہ رہے تھے۔؟“ ان کے آقا کو یہ بے تکلفی ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے مابہ کے منہ پر زور سے طمانچہ مار کر کہا۔ ”تمہیں ان باتوں سے کیا غرض۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

مابہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن بے چینی کے ساتھ رات کا انتظار کرنے لگے۔ رات ہوئی تو کھجوریں لے کر قبا کی طرف چل دیے۔ ان کا رخ اس مکان کی طرف تھا جہاں مکہ سے آئے ہوئے لوگ مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر مابہ نے دیکھا کہ ایک بے حد روشن چہرے والا نہایت حسین شخص بیٹھا ہے اور اس کے اطراف جو لوگ ہیں وہ اس پر گویا نثار ہو رہے ہیں۔ یہ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو اپنے صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ مابہ نے کھجوریں پیش کیں اور بولے: ”مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نیک آدمی ہیں۔ یہ صدقہ ہے۔ اسے کھا لیجیے۔“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجوریں اپنے ساتھیوں کو دے دیں لیکن خود ان میں سے نہ کھایا۔ مابہ نے دل میں کہا ایک نشانی تو مل گئی پھر وہ واپس چلے آئے۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ سے آئے ہوئے لوگ یثرب (مدینہ) چلے گئے مابہ نے پھر کھجوریں جمع کیں اور مدینہ پہنچ گئے وہاں وہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں پہنچے اور یہ کہہ کر کھجوریں پیش کیں کہ یہ آپ حضرات کے لیے تحفہ ہے۔ اس بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی کھجوریں کھائیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی کھلائیں۔ مابہ نے دل میں کہا۔ ”دونشایاں پوری ہو گئیں۔“ اب مابہ کو مہر نبوت دیکھنے کی جستجو تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک انصاری کا انتقال ہو گیا ان کی تدفین بقیع الفرقہ میں ہوئی۔ جنازے سے فارغ ہو کر رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارد گرد گھوم پھر کر مہر نبوت دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ آپ کے جسم پر دو موٹی چادریں تھیں۔ مابہ کے انداز سے آپ سمجھ گئے اور انہوں نے اپنی پشت مبارک سے چادر ایک طرف کو ہٹا دی۔ مابہ کے سامنے مہر نبوت تھی۔ کبوتر کے انڈے کی مانند، پشت پر دونوں شانوں کے درمیان۔ تلاش حق کا پر صعوبت سفر ختم ہو گیا تھا اور مابہ نے منزل پالی تھی۔ مابہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ مہر نبوت کو جھک کر عقیدت کے ساتھ چومنے لگے۔ آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ آخر اللہ کے نبی نے انہیں متوجہ کیا اور سامنے آنے کے لیے کہا مابہ نے حق کی تلاش کے لیے مشقتوں اور تکالیف سے پر اپنی پوری داستان کہہ سنائی، حضور پاک سے کلمہ طیبہ سیکھ کر پڑھا۔ دائرۃ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رسول اقدس نے آپ کا نام سلمان رکھا۔

ہجرت کے پانچویں سال بدر واحد کے شکست خوردہ قریش بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے۔ دس ہزار کا لشکر تھا جبکہ مقابلہ میں مسلمان کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس موقع پر حضرت سلمان نے ایک اہم اور مفید مشورہ پیش کیا کہ مدینہ منورہ کے اطراف خندق کھودی جائے انہوں نے کہا کہ ”حضور جب ہم فارس میں محاصرے کی حالات میں ہوتے تھے تو خندق کھود لیا کرتے تھے۔“ مدینہ منورہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ اگر شمال کی طرف سے حفاظت کا مناسب انتظام ہو جاتا تو دوسری اطراف سے دشمن کے اچانک حملے کا خدشہ نہ رہتا۔ چنانچہ خندق کھودنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

حضور نے خندق کھودنے کے لیے انصار و مہاجرین کو دس دس کی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت سلمان کے ساتھ عجیب معاملہ تھا۔ آپ مہاجر بھی تھے کیونکہ آپ نے دین کی خاطر اپنا گھر بار اور وطن چھوڑا تھا پھر آپ انصار میں سے بھی تھے۔ کیونکہ آپ حضور کی آمد سے قبل ہی سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی دلاویز شخصیت کے کیا انصار اور کیا مہاجرین سب ہی مداح تھے۔ چنانچہ جب خندق کھودنے کا کام شروع ہوا تو انصار کہنے لگے کہ حضرت سلمان ہمارے گروہ میں شامل ہوں اور مہاجرین نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت سلمان ہمارے ساتھ کام کریں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ تشریف لے آئے انہوں نے یہ دلچسپ بحث سنی تو فرمایا ”سلمانؓ تو ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔“ حضرت سلمانؓ کے لیے یہ یقیناً بہت عظیم سعادت تھی کہ اللہ کے رسولؐ نے انہیں اپنے اہل بیت میں شامل فرمالیا تھا۔

حضرت سلمانؓ اس کے بعد رسول اللہ کے ساتھ تمام مہمات میں شریک ہوئے۔ صلح حدیبیہ سے قبل بیعت الرضوان میں بھی آپؐ شامل تھے۔ غزوہ خیبر میں بھی آپؐ نے حصہ لیا۔ پھر حضور وادی القریٰ پہنچے۔ یہودیوں نے معمولی مقابلہ کیا پھر ہتھیار ڈال دیے۔ اللہ کی شان دیکھیے یہی وادی القریٰ تھی جہاں حضرت سلمانؓ نے پہلی دفعہ غلام کی حیثیت سے قدم رکھا تھا آج وہ ایک فاتح قوم کے فرد کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔

آپؐ نے اپنی عمر کا خاصا حصہ راہوں کے درمیان گزارا، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد آپؐ نے رہبانیت یعنی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر عبادت کرنے سے گریز کیا۔ آپؐ اپنے اصحابؓ اور دیگر لوگوں سے مل کر رہے تمام ذمہ داریاں ادا کیں محنت مزدوری بھی کی اور ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ اللہ کی یاد سے اپنے قلب کو معمور کیے رکھا۔ آپؐ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ فرائض اور واجبات کو پورے خشوع و خضوع سے ادا کرنا چاہیے۔ اور جس قدر نوافل آسانی ادا ہو سکتے ہوں ادا کرنے چاہئیں۔

طارق بن شہابؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے حضرت سلمانؓ کے ساتھ گزاری میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپؐ نوافل کیسے پڑھتے ہیں۔ حضرت سلمانؓ رات کے آخری حصے میں کھڑے ہوئے اور نوافل ادا کرنے لگے لیکن آپؐ کے متعلق میرا گمان یہ تھا کہ آپؐ بہت زیادہ عبادت کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا میں نے اپنے اس مشاہدہ کا تذکرہ حضرت سلمانؓ سے کر دیا۔ انہوں نے فرمایا: ”اپنی پانچ فرض نمازوں کا اچھی طرح خیال رکھا کرو۔ انہیں پورے آداب سے ادا کرو کیونکہ وہ چھوٹی چھوٹی خطاؤں کا کفارہ ہیں بشرط یہ کہ تم سے بڑے بڑے گناہ سرزد نہ ہوں۔“

مسند احمدؒ میں ابو عثمان الہندیؒ فرماتے ہیں: ”ایک روز میں حضرت سلمانؓ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ حضرت سلمانؓ اچانک اس درخت کی ٹہنی پکڑ کر اسے ہلانے لگے ایسا کرنے سے درخت کے بہت سے پتے جھڑ گئے۔ پھر آپؐ نے مجھ سے پوچھا۔ ”اے ابو عثمان تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے عرض کی۔ ”آپؐ ہی بتا دیجیے۔“ حضرت سلمانؓ نے فرمایا۔ ”میں بھی ایک دفعہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے درخت کی ٹہنی پکڑ کر زور سے ہلایا تو درخت کے بہت سے پتے جھڑ گئے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا۔ ”اے سلمانؓ پوچھتے کیوں نہیں میں نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے عرض کی۔ ”آپؐ ہی بتا دیجیے۔“ حضور اقدسؐ نے فرمایا ”جب کوئی مسلمان اچھی طرح وضو کرتا ہے اور پانچوں نمازیں خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح یہ پتے جھڑ گئے ہیں۔“

17ھ/638ء تک مدائن عراق کا صوبائی صدر مقام رہا پھر حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ مدائن کی آب و ہوا عرب سے گئے ہوئے مسلمان سپاہیوں کی صحت کے لیے موافق نہیں ہے، انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو نئے صدر مقام کے لیے جگہ پسند کرنے کی غرض سے بھیج دیں۔ ایسا مقام منتخب کیا جائے جہاں کی آب و ہوا اچھی ہو جانوروں کے لیے چارہ آسانی سے مل جائے وہ مقام ایسی جگہ ہو جہاں میرے اور اس مقام کے درمیان کوئی دریا یا پل حائل نہ ہو۔ حضرت سعدؓ نے دونوں صحابہ کرامؓ کو حضرت عمرؓ کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ دونوں اصحابؓ رسولؐ الگ الگ روانہ ہوئے اتفاق دیکھیے کہ دونوں مخالف سمتوں سے آ کر ایک ہی جگہ رکے۔ دونوں نے ایک ہی مقام کو پسند کیا تھا۔ اسی مقام پر کوفہ آباد کیا گیا۔

حضرت عمرؓ، حضرت سلمانؓ فارسی کے تقویٰ اور انتظامی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے انہوں نے اصرار کر کے حضرت سلمانؓ کو مدائن کا

گورنر بنادیا۔ حضرت سلمانؓ نے چند سال یہ ذمہ داری ادا کی لیکن اس پورے عرصہ میں بھی آپؐ اسی سادگی سے زندگی بسر کرتے رہے جو اس سے پہلے آپؐ کا شعار تھی۔ جو تنخواہ ملتی اللہ کی راہ میں دے دیتے اور خود اپنے ہاتھ سے کھجور کی چٹائیاں بن کر فروخت کرتے جو رقم حاصل ہوتی اس سے اپنی اور اہل و عیال کی گزر بسر ہوتی۔ حضرت عمرؓ کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ حضرت سلمانؓ فرماتے تھے اگر امیر المؤمنینؓ مجھے نہ روکتے تو میں گورنری کے باوجود یہ کام کرتا رہتا۔ حضرت سلمانؓ مدائن کی گورنری کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت بھی فرماتے تھے۔ لوگ دور دورس ان سے مسائل پوچھنے کے لیے آتے تھے۔

حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت سلمانؓ مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے۔ اہل بیتؑ کی خدمت میں لگے رہے۔ خلیفہؓ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں عراق و شام کی فتوحات کا آغاز ہوا۔ حضرت سلمانؓ کا خیال تھا وہ عراق میں جا کر آباد ہو جائیں تاکہ وہ ان علاقوں میں نو مسلموں کی تربیت کر سکیں، حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ بنے تو حضرت سلمانؓ عراق میں آباد ہو گئے اور آپؐ کے دینی بھائی حضرت ابوالدرداءؓ نے سکونت کے لیے شام کو پسند کیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دمشق کا قاضی مقرر کر دیا۔

اس زمانے میں عراق کا بیشتر حصہ فارس کے شہنشاہ کسریٰ کے ماتحت تھا۔ حضرت سلمانؓ نے عراق کی جنگوں میں شرکت کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ خود فارسی تھے۔ ان علاقوں سے واقفیت رکھتے تھے اور فارسی زبان بول سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ کو ان جنگوں میں، داعی اور رائد مقرر کیا داعی کے فرائض یہ تھے کہ وہ حملے سے قبل کفار کو اسلام کی دعوت دے اور تین معروف شرائط پیش کرے یعنی اسلام قبول کر لو یا جزیہ ادا کر دو اور اپنے مذہب پر قائم رہو یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ رائد کا عہدہ فوج کے افراد کو خوراک اور جانوروں کو چارہ کی فراہمی کے منتظم اعلیٰ کا عہدہ تھا۔ ”رائد“ بالعموم ہر اول دستے کا سردار بھی ہوتا تھا۔ ان عہدوں کے لیے حضرت سلمانؓ کا انتخاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ قرآن و سنت کا گہرا علم رکھتے تھے۔ اچھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے اور علاقے سے خوب واقف تھے۔

عراق کی مہمات میں غالباً جنگ بویب، وہ پہلا معرکہ ہے جس میں حضرت سلمانؓ شریک ہوئے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فوج کے سالار حضرت ثنیؓ ”تھے۔ حضرت سلمانؓ رائد تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو اللہ نے فتح سے نوازا 14ھ/635ء میں جنگ قادسیہ ہوئی جس میں تیس ہزار مسلمانوں کے مقابلے پر ایک لاکھ بیس ہزار کفار تھے۔ اس جنگ میں بھی حضرت سلمانؓ داعی اور رائد تھے۔ 16ھ/637ء میں بہر شیر اور مدائن فتح ہوئے جو دریائے دجلہ پر ایک پل کے ذریعہ باہم ملے ہوئے تھے جب بہر شیر پر مسلمانوں نے قبضہ کیا تو انہوں نے اس پل کو توڑ دیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ لشکر اسلام کے سپہ سالار تھے۔ انہوں نے دریا عبور کرنے کے لیے کشتیاں تلاش کروائیں لیکن کشتیاں نمل سکیں۔ اسی اثناء میں دجلہ میں شدید طغیانی آگئی۔ حضرت سعدؓ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمانوں کے گھوڑے دریا میں داخل ہو گئے ہیں اور انہوں نے دریا عبور کر لیا ہے۔

حضرت سعدؓ نے گھوڑوں کی مدد سے دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ امام طبری کے مطابق گرمی کا شدید موسم تھا دریا میں طوفانی موجیں اٹھ رہی تھیں لیکن امیر لشکر کے حکم پر مسلمانوں کی پوری فوج دریا میں اتر گئی۔ یہی وہ تاریخی جنگ ہے جس کا علامہ اقبالؒ نے اپنے مشہور شعر میں ذکر کیا ہے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

دریا عبور کرتے ہوئے حضرت سلمانؓ، حضرت سعدؓ کے ساتھ تھے اہل فارس نے جب مسلمانوں کو اس طرح دریا سے نکلنے دیکھا تو وہ

”دیواں آمدند، دیواں آمدند“ (دیو آگئے، دیو آگئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت سلمانؓ نے فتوحات ایران کے سلسلے میں کئی لشکروں کی قیادت کی۔ آپؓ کو تیس ہزار مسلمانوں کی قیادت کا موقع بھی ملا۔

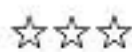
حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانے میں حضرت سلمانؓ نے شادی کی ضرورت محسوس کی۔ آپؓ کی شادی ایک خاتون بقیہؓ سے ہوئی۔ شادی کی تقریب بے حد سادگی سے منعقد ہوئی۔ اللہ نے آپؓ کو تین بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔

آپؓ اپنی زندگی کے آخری ایام تک مصروف جہاد رہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں بلخمر کی طرف ایک مہم روانہ کی گئی اس میں بھی آپؓ نے شرکت فرمائی۔ بلخمر بحیرہ خزر (کپسمین) کے ساحل پر واقع مشہور شہر تھا جو حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہو چکا تھا لیکن عہد عثمانیؓ میں وہاں بغاوت ہوئی تو اس کی سرکوبی کے لیے مہم بھیجی گئی۔

36ھ/656ء میں حضرت سلمانؓ بیمار پڑ گئے۔ آپؓ مدائن میں ایک مکان کی بالائی منزل پر صاحب فراش تھے۔ آپؓ اس وقت بھی اپنے محبوب رسول صلی اللہ وآلہ وسلم خدا کو بار بار یاد کرتے تھے۔ آپؓ نے ساری زندگی حضورؐ کے ارشادات پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کی اور اس وقت بھی آپؓ اس بات پر پریشانی کا بار بار اظہار فرماتے تھے کہ ہمارے حبیبؐ نے ہم سے جدا ہوتے ہوئے یہ وعدہ لیا تھا کہ مومن کا زادراہ ہونا چاہیے جتنا ایک سوار مسافر کا ہوتا ہے۔ یہی کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عیادت کے لیے آئے تو انہوں نے حضرت سلمانؓ کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ”میں موت کے خوف سے نہیں روتا بلکہ بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ تم میں سے ہر ایک کا دنیاوی ساز و سامان، مسافر کے توشہ سفر جتنا ہونا چاہیے جبکہ میرے ارد گرد یہ کالے ناگ پڑے ہوئے ہیں۔“

حضرت سلمانؓ جس سامان کو کالے ناگ قرار دے رہے تھے وہ محض مٹی کا ایک لوٹا، کپڑے دھونے کا لگن اور ایسی ہی چند معمولی چیزیں تھیں۔

مرض بڑھ گیا تو اہلیہ سے کہا ”وہ چیز لے آؤ جو تمہیں حفاظت سے رکھنے کو دی تھی۔“ اہلیہ مشک والی ایک سر بمہر تھیلی لے آئیں۔ آپؓ نے پیالے میں پانی منگوایا۔ مشک کو پانی میں اپنے ہاتھ سے ملایا۔ پھر ارد گرد چھڑکنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد فرمایا: ”تم لوگ چلے جاؤ اور انتظار کرو۔“ اہلیہ حضرت بقیہؓ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئیں تو دیکھتی ہیں کہ ان کے رفیق زندگی حضرت سلمانؓ اپنے خالق سے جا ملے ہیں۔ آپؓ کو مدائن میں طاق کسریٰ کے شمال مغرب میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ علاقہ آپؓ کی نسبت سے ”سلمان پاک“ کہلاتا ہے۔ کربلائے معلیٰ سے گزرنے والا ہر زائر یہاں حاضری دیتا ہے۔ آپؓ کا مزار پرانی وضع کا تھا۔ عثمانی سلطان مراد باغ نے اسے جدید انداز میں تعمیر کروایا۔ آپؓ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے تاہم امام ذہبیؒ کی ہی روایت مستند سمجھی جاتی ہے کہ حضرت سلمانؓ نے 76 یا 77 سال کی عمر پائی۔



حضرت فاطمہ الزہراؑ

جگر گوشہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سیدۃ النساء اہل الجنۃ جو تسلیم و رضا کا کامل نمونہ ہیں

وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے!

ان کا تعلق قبیلہ بنو سلیم سے تھا! اس وقت وہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ مجلس میں حاضر تھے اور اسلام لانے کی خواہش ظاہر کر رہے تھے۔ روئے زمین پر ایک اور مسلمان کا اضافہ ہو رہا تھا۔

نبی کریم نے بنو سلیم کے ضعیف شخص کو کلمہ پڑھوایا، دین اسلام کے ضروری احکام اور مسائل کی تعلیم دی پھر ان سے پوچھا: ”کیا آپ کے پاس کچھ مال بھی ہے۔“

جواب ملا ”اے اللہ کے رسولؐ۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بنو سلیم کے تین ہزار افراد میں سب سے غریب اور محتاج میں ہی ہوں۔“

رحمت دو عالم کی نگاہیں اپنے جاں نثار صحابہ کرام کی طرف اٹھ گئیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”آپ میں سے کون اس مسکین کی مدد کرے گا۔؟“ قبیلہ خزرج کے سردار اٹھے اور عرض کرنے لگے ”میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں پیش کرتا ہوں۔“ یہ حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔ سید البشرؐ کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ ”آپ میں سے کون ہے جو ان کا سر ڈھانک دے؟“

ایک صحابی اٹھے اور انہوں نے اپنا عمامہ اتار کر اسلام قبول کرنے والے ضعیف اعرابی کے سر پر رکھ دیا۔ یہ حضرت علیؓ تھے۔

پھر آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا۔ ”کون ہے جو ان کی خوراک کا بندوبست کرے۔“

حضرت سلمان فارسیؓ نے ان صاحب کو ساتھ لیا اور مختلف گھروں پر دستک دی لیکن ہر صحابی کے گھر سے معذرت کی گئی کہ کھانے کا کوئی انتظام کرنے سے قاصر ہیں۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا اور مسلمانوں کی مالی حالت مستحکم نہ تھی۔

پھر حضرت سلمان فارسیؓ ایک دروازے کی طرف بڑھے۔ دستک دی اور پورا احوال کہہ سنایا۔

مکان کے اندر سے آواز آئی۔ ”اے سلمانؓ..... اللہ کی قسم آج گھر میں سب کو تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو

خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی۔ جیسے یہ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جائیے اور اس سے کہیے کہ اس چادر کے عوض کچھ جنس دے دیجیے۔“

حضرت سلمانؓ چادر لے کر، نو مسلم اعرابی کے ساتھ شمعون یہودی کے پاس پہنچے اور اسے تمام روداد سنائی کہ یہ چادر کس نے بھیجی ہے اور کیا

پیغام دیا ہے۔ حضرت سلمانؓ نے بات ختم کی تو شمعون پر سکتہ طاری تھا۔ وہ شدید حیرت زدہ تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا نیا مذہب ہے جس

کے ماننے والے خود بھوکے رہ کر مساکین کا پیٹ بھرتے ہیں۔ اس کے دل میں توحید کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ وہ پکار اٹھا: ”اے سلمانؓ، خدا کی قسم یہ

وہی لوگ ہیں جن کی خبر تو ریت میں دی گئی ہے۔ تم گواہ رہنا کہ میں ایمان لایا۔“

پھر انہوں نے کچھ غلہ حضرت سلمانؓ کے سپرد کیا اور چادر لے کر اسی دروازے پر پہنچے جہاں سے چادر وصول کی تھی۔ دونوں چیزیں گھر

میں بھجوائیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر میں موجود خاتون نے اناج پیس کر روٹیاں تیار کر دیں۔ حضرت سلمانؓ کہتے ہیں: ”اس میں سے کچھ بچوں کے لیے رکھ لیجیے۔“ جواب ملتا ہے۔ ”جو چیز میں راہِ خدا میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لیے جائز نہیں۔“

یہ خاتون تھیں سیدہ فاطمہ الزہراءؓ بنت محمدؐ جن کے عظیم ایثار نے ناصرف ایک نو مسلم اعرابی کو فاقہ کشی سے بچالیا بلکہ ایک غیر مسلم کو اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا کر دی۔ آپؐ جگر گوشہ رسولؐ ہیں امت مسلمہ کی خواتین کے لیے تسلیم و رضا کا عظیم نمونہ ہیں اور دنیا اور جنت کی خواتین کی سردار ہیں۔

آپؐ وہ خوش قسمت خاتون ہیں جن کو اللہ کے حبیب نبی کریمؐ سب سے بڑھ کر محبوب رکھا کرتے تھے اور آپؐ کی ذاتِ اقدس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؐ ہی کے ذریعہ سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل کو آگے بڑھایا۔ سیدہ فاطمہؓ عظمت و رفعت کی ان بلند یوں پر فائز ہیں جو اللہ اپنے بے حد پیارے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ آپؐ کے اعلیٰ اوصاف کی بناء پر آپؐ کو مختلف القاب دیئے گئے ہیں جن میں چند یہ ہیں۔ زہراء (تازہ پھول کی طرح پاکیزہ) بتول (اللہ کی سچی اور بے لوث بندی) سیدۃ النساء اہل الجنۃ (جنت کی عورتوں کی سردار) بضعة الرسولؐ (جگر گوشہ رسولؐ)

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی پیدائش اس زمانے میں عمل میں آئی جب قریش خانہ کعبہ کی دیواروں کو ڈھا کر از سر نو تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ یہ آنحضرتؐ کو نبوت عطا کیے جانے سے پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت رسولؐ پاک کی عمر 35 برس تھی۔ سیدہ فاطمہؓ اپنی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہیں۔

حضرت فاطمہ الزہراءؓ کو یہ مقام بلند حاصل ہے کہ آپؐ کو دو جہانوں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت پوری میر آئی اور نبی کریمؐ کی منس و عنوا حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی مامتا بھری آغوش نصیب ہوئی۔ ان دو عظیم ترین ہستیوں کے ہاتھوں پلنے والی حضرت بتولؓ کو تعلیم و تربیت کی معراج حاصل ہوئی جو پہلے ہی خوبیوں کا مرقع تھیں اور حیا متانت اور پاکیزگی کا پیکر تھیں۔ سیرت کی قدیم کتب میں حضرت فاطمہؓ کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں ان سے سیدۃ النساء کے بچپن کی ایک پاکیزہ اور نفیس تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

بچے بالعموم شریر اور کھیل کود کے شیدائی ہوتے ہیں لیکن نبی کریمؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ بچپن ہی سے بے حد متین، سنجیدہ اور سادگی پسند تھیں۔ انہیں کھیلوں سے دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی بہت اعلیٰ قسم کے کپڑے اور زیورات استعمال کرنے کا شوق تھا۔ ایک بار آپؐ کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ کے کسی عزیز کی شادی تھی۔ انہوں نے اس موقع پر اپنی تمام بچیوں کے لیے اچھے کپڑے اور زیورات بنوائے لیکن حضرت فاطمہؓ نے یہ کپڑے اور زیورات استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور سادہ لباس زیب تن کر کے تقریب میں شرکت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا سے بے نیازی کا وصف سیدہ النساء کی فطرت کا جزو تھا اور اس کا اظہار آپؐ کے بچپن ہی سے ہونے لگا تھا۔

منہی فاطمہؓ اپنے والد گرامی آنحضرتؐ اور والدہ محترمہ حضرت خدیجہؓ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ آپؐ اپنے والد محترم کے افعال، عادات، گفتگو اور اطوار کو غور سے دیکھتی تھیں اور خود بھی وہی انداز اپنانے کی کوشش کرتی تھیں۔ آپؐ شکل و صورت میں بھی نبی کریمؐ سے بہت مشابہ تھیں اور آپؐ کا انداز نشست و برخاست بھی آنحضرتؐ سے ملتا جلتا تھا۔ جب بھی رسول اقدسؐ باہر سے گھر میں تشریف لاتے تو آپؐ بلند آواز میں اسلام علیکم کہتے پھر چند لمحات کے توقف کے بعد گھر میں داخل ہو جاتے۔ نبی کریمؐ کی چہیتی منہی فاطمہؓ اپنے پیارے والدؐ کی آواز سن کر دوڑی آتیں اور آنحضرتؐ کی انگلی اپنے ننھے ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں ساتھ لاتیں۔ نبی کریمؐ کو اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ سے بہت محبت تھی۔ آپؐ

ایسے موقعوں پر اکثر اپنی بیٹی کو گود میں لے لیتے اور آپ کی جبین پر بوسہ دیتے۔ حضرت فاطمہ الزہراءؑ کو اللہ نے بے پناہ ذہانت اور مثالی حافظہ عطا کیا تھا۔ آپ اپنے والد گرامیؑ اور والدہ محترمہؑ سے اکثر دین کے بارے میں سوالات فرماتیں۔

ذی الحجہ 13 نبویؐ میں نبی کریمؐ نے صحابہ کرام کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ کچھ عرصہ بعد آپؐ بھی حضرت ابو بکرؓ کی رفاقت میں ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں حضورؐ نے جب مسجد نبویؐ کی تعمیر شروع کروائی تو آپؐ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو حکم دیا کہ وہ مکہ معظمہ جا کر آپؐ کے اہل و عیال کو مدینہ منورہ لے آئیں۔ حضرت زیدؓ مکہ مکرمہ پہنچے اور ام المومنین حضرت سودہؓ، حضورؐ کی دو صاحبزادیوں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ، اپنی زوجہ محترمہ حضرت ام ایمنؓ اور صاحبزادے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مدینہ منورہ لے آئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا اور نبی کریمؐ اپنے جاں نثار صحابہؓ کو ساتھ لے کر اسلامی تحریک کی قیادت فرما رہے تھے۔ دین اسلام کی کرنیں بڑی تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ انہی دنوں رسولؐ کی چہیتی بیٹی سیدہ فاطمہؓ کے لیے نکاح کے کئی پیام آئے لیکن حضورؐ نے سکوت فرمایا۔ بعض روایتوں کے مطابق آپؐ کو حکم الہی کا انتظار تھا۔ پھر صحابہؓ کرام نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپؓ سیدہ فاطمہؓ کے لیے پیام بھیجیں۔ انہوں نے کچھ تامل کے بعد حضورؐ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آنحضرتؐ نے یہ درخواست قبول فرمائی۔ آپؐ کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپؐ جب بھی کسی صاحبزادی کا عقد کرنا چاہتے تو ان کے پاس تشریف لے جاتے اور بلند آواز میں فرماتے: ”فلاں شخص نے تمہارے لیے نکاح کا پیغام دیا ہے۔ اگر اس کے جواب میں آپؐ کی صاحبزادی سکوت اختیار کرتیں تو حضورؐ سمجھ جاتے کہ بچی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے لیے پیغام بھیجا تو رسولؐ کریمؐ نے اپنی پیاری صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ سیدہ بتولؓ کی خاموشی ہی ان کی رضا مندی کا اظہار تھی۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت انسؓ بن مالک کو حکم دیا کہ وہ صحابہ کرامؓ کو مسجد نبویؐ میں بلا لائیں، جب بہت سے اصحابؓ رسولؐ مسجد نبویؐ میں جمع ہو گئے تو حضورؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا۔

”مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہؓ بنت محمدؐ کا نکاح علیؓ ابن ابی طالبؓ سے کروں۔ میں آپؐ کے سامنے اس حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔“ پھر آپؐ نے خطبہ نکاح پڑھا۔ خطبہ کے بعد آپؐ حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؐ کے روئے مبارک پر مسکراہٹ تھی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے دریافت فرمایا: ”میں نے چار سو مشقال چاندی کے مہر پر فاطمہؓ کو تیرے نکاح میں دیا۔ کیا تجھے منظور ہے؟“ (بعض روایتوں میں مہر کی رقم پانچ سو درہم اور بعض میں 480 درہم بیان کی گئی ہے۔) حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ ”بسر و چشم۔“

اللہ کے رسولؐ نے اس مبارک موقع پر دعا فرمائی۔ صحابہ کرامؓ نے بھی دعا مانگی اور حاضرین کو شہد کا شربت اور کھجوریں تقسیم کی گئیں۔ رخصتی کے دوسرے دن حضورؐ نے خواہش ظاہر کی کہ ولیمہ بھی کیا جائے۔ حضرت سعدؓ نے ایک بھیڑ کا تحفہ پیش کیا۔ دیگر صحابہ کرامؓ نے بھی مدد کی۔ دعوت ولیمہ میں کھجور، پنیر، جو کی روٹی اور گوشت پیش کیا گیا۔ حضرت اسماءؓ نے اس ولیمہ کو اس زمانے کا بہترین ولیمہ قرار دیا ہے۔

دونوں جہانوں کے سردارؐ نے اپنی پیاری بیٹی کو جو جہیز دیا اس کی تفصیل مختلف روایتوں میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ ایک بستر مصری کپڑے کا، ایک نقشین تخت، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ ایک مشکیزہ، مٹی کے دو برتن، ایک چکی، ایک پیالہ، دو چادریں، ایک جائے نماز۔ جب سیدہ بتولؓ رخصت ہو کر حضرت علیؓ کے گھر تشریف لائے۔ آپؐ نے آنے کی اطلاع دی پھر اندر داخل ہوئے۔ ایک برتن میں پانی منگوایا اور اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈال دیے پھر آپؐ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے حضرت علیؓ کے سینہ اور

بازوؤں پر پانی چھڑکا اس کے بعد آپؐ نے سیدہ فاطمہؓ کو بلایا اور ان پر بھی پانی چھڑک کر فرمایا۔ ”فاطمہؓ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان میں بہترین شخص سے کی ہے۔“ پھر آپؐ نے زوجین کے لیے دعا فرمائی اور واپس تشریف لے گئے۔

3ھ میں اللہ تعالیٰ نے اس مبارک جوڑے کو ایک فرزند سے نوازا۔ آنحضرتؐ کو علم ہوا تو آپؐ بہت مسرور ہوئے آکر نومولود کے کان میں اذان دی اپنا لعاب دہن چٹایا پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا، دو مہینہ ذبح کیے اور نومولود کے سر کے بال اتروا کر ان کے وزن کے برابر چاندی صدقہ فرمائی حضورؐ نے بچے کا نام ”حسن“ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ 4ھ میں رب العالمین نے سیدہ فاطمہؓ کو دوسرا بیٹا عطا فرمایا، حضورؐ تشریف لائے۔ بچے کے کانوں میں اذان دی پھر آپؐ نے سیدہ فاطمہؓ کو بچے کا عقیقہ کرنے اور بچے کے بالوں کے ہموزن چاندی خیرات کرنے کی ہدایت کی۔ اس بچے کا نام حضور اقدسؐ نے ”حسین“ رکھا۔

سرور عالمؐ اپنے ان دونوں نواسوں سے حد درجہ محبت فرماتے تھے۔ حضرت حسنؓ کو تقریباً آٹھ سال اور حضرت حسینؓ کو تقریباً سات سال آنحضرتؐ کی خدمت میں رہنے اور آپؐ سے تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ کی دیگر اولادوں میں حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ شامل ہیں۔ سیرت نگاروں نے آپؐ کے ایک صاحبزادے حضرت محسنؓ کا بھی ذکر کیا ہے جو کمسنی میں فوت ہو گئے تھے۔

سیدہ فاطمہؓ بے حد کریم النفس اور رحم دل تھیں۔ آپؐ کی ذات، ایثار و قربانی کا دوسرا نام تھی۔ ایک بار حضرت علیؓ نے ساری رات ایک باغ کو سینچا۔ اجرت میں آپؐ کو تھوڑے سے جو حاصل ہوئے۔ آپؐ جو لے کر گھر آئے۔ حضرت فاطمہؓ نے ایک حصہ لے کر آٹا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ ابھی کھانا تیار ہوا تھا کہ کسی مسکین نے دستک دی اور سوال کیا۔ سیدہؓ نے سارا کھانا دے دیا پھر بچے ہوئے اناج کا ایک حصہ لے کر پیسا اور کھانا پکایا ابھی یہ کھانا تیار ہوا ہی تھا کہ ایک یتیم نے دروازے پر آ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ سیدہؓ نے یہ سارا کھانا اس کے حوالے کر دیا۔ پھر آپؐ نے جتنا بھی اناج بچا تھا اسے پس کر کھانا پکایا لیکن اسے کھانے کی بھی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک مشرک نے آ کر کھانا مانگا۔ آپؐ نے سارا کھانا اسے دے دیا آپؐ اور آپؐ کے اہل خانہ نے اس دن فاقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ اس گھرانے کے پاکیزہ نفوس کے بارے میں سورۃ الدھر کی یہ آیت نازل ہوئی۔ ترجمہ: ”اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔“

حضور اکرمؐ نے حضرت علیؓ اور سیدہ بتولؓ کے درمیان کاموں کی تقسیم فرمادی تھی۔ گھر کے اندر جتنے کام تھے مثلاً چکی پیسنا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ وہ سب حضرت فاطمہؓ کے سپرد تھے۔ باہر کے کام مثلاً بازار سے سودا لانا، اونٹ کو پانی پلانا، پانی بھر کر لانا وغیرہ۔ یہ سب حضرت علیؓ کے ذمہ تھے۔ حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ بے حد محنتی تھیں۔ آپؓ طبیعت ناساز ہونے کے باوجود بھی گھر کے تمام کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔ ایک بار سیدہؓ کو بخار آ گیا۔ رات بھر آپؓ شدید بے چین رہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی رات بھر جاگتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر آنکھ لگ گئی۔ فجر کی اذان سن کر بیدار ہوا تو دیکھا فاطمہؓ وضو کر رہی ہیں۔ میں نے مسجد میں جا کر نماز ادا کی واپس آیا تو دیکھا کہ فاطمہؓ معمول کے مطابق چکی پیس رہی ہیں۔ میں نے کہا: ”فاطمہؓ تمہیں اپنے حال پر رحم نہیں آتا؟ رات بھر تمہیں بخار رہا۔ صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا اب چکی پیس رہی ہو۔ خدا نہ کرے زیادہ بیمار ہو جاؤ۔“

حضرت فاطمہؓ کا جواب تھا۔ ”میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو کچھ پروا نہیں۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھی اللہ کی اطاعت کے لیے اور چکی پیسی آپؐ کی اطاعت اور بچوں کی خدمت کے لیے۔“

حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ گھر کے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے بھی ایک لمحہ کے لیے اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتی تھیں۔ حال یہ تھا کہ

آپؐ چکی پستی تھیں یا کوئی اور کام کر رہی ہوتی تھیں اور آپؐ کی زبان پر قرآن کی آیات جاری ہوتی تھیں۔ حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ میں فاطمہؑ کو دیکھتا تھا کہ کھانا پکاتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کرتی جاتی تھیں۔ آپؐ بہت عبادت گزار تھیں لیکن حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ عبادت کی کثرت کی وجہ سے آپؐ گھر کے کاموں میں فرق نہ آنے دیتی تھیں۔ رسول اللہؐ کا مکان متصل ہونے کی وجہ سے آپؐ کی زبان مبارک سے آیات قرآنی اور دیگر نصیحتیں سننے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ جب بھی حضورؐ آخرت کا ذکر فرماتے حضرت فاطمہؑ شدت احساس سے رو پڑتیں عبادت کے وقت بھی آپؐ کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور اکثر مصلیٰ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔

جب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا اور مجاہدین کو فتوحات حاصل ہونے لگیں تو مدینہ منورہ میں مال غنیمت آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضورؐ اللہ کی ہدایت کے مطابق مال غنیمت کا صرف پانچواں حصہ اپنے پاس رکھ کر بقیہ چار حصے عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے پھر اپنا حصہ بھی راہِ خدا میں دے دیتے۔ آپؐ نے اپنا حصہ اپنی ازواجِ مطہراتؑ اور اپنی لاڈلی بیٹی سیدہ فاطمہؑ تک کو دینا گوارہ نہ فرمایا۔ ایک بار حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ سے کہا کہ چکی پیٹے پیٹے تمہارے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں اور چولہا پھونکتے پھونکتے تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ آج حضورؐ کے پاس مال غنیمت میں بہت سی کنیریں آئی ہیں، جاؤ اپنے ابا جان سے ایک کنیر مانگ لاؤ۔“

سیدہ فاطمہؑ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن شرم کی وجہ سے کوئی بات نہ عرض کر سکیں اور واپس آ گئیں۔ دوسرے دن آپؐ حضرت علیؑ کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں پہنچیں اور اپنی تکالیف بیان کر کے ایک کنیر کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا: ”میں تمہیں کوئی کنیر خدمت کے لیے نہیں دے سکتا۔ ابھی اصحاب صفہ کے لیے انتظامات کرنے ہیں۔ میں ان لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر فاقہ کیا ہے۔“

یہ سن کر حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ الزہراءؑ خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ رات میں آنحضرتؐ سیدہ فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: ”تم جس چیز کی خواہش مند تھیں اس سے بہتر ایک چیز میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ، دس بار الحمد للہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھا کرو اور سونے سے پہلے 33 مرتبہ سبحان اللہ، 33 مرتبہ الحمد للہ اور 34 مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ عمل تمہارے لیے لونڈی اور غلام سے بہتر ہوگا۔“

حضرت فاطمہؑ نہ صرف اپنے شوہر اور بچوں کی بلکہ عزیزوں، رشتہ داروں اپنے جاننے والوں اور اہل محلہ کی بھی خدمت کے لیے بھی تیار رہتی تھیں۔ حضرت فاطمہؑ کی خوشدامن حضرات فاطمہؑ بنت اسد کا کہنا ہے کہ جس قدر میری خدمت فاطمہؑ نے کی ہے شاید ہی کسی بہو نے اپنی ساس کی خدمت کی ہو۔“ آنحضرتؐ کو حضرت فاطمہؑ سے بے حد محبت تھی۔ جب کبھی آپؐ سفر پر جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؑ سے ملنے کے لیے جاتے اور جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے سیدہ فاطمہؑ سے آکر ملتے۔ حضورؐ تقریباً ہر روز حضرت فاطمہؑ کے گھر تشریف لے جاتے۔ ان کی کوئی مشکل ہوتی تو اسے حل کرنے کی کوشش فرماتے آپؐ کے گھر میں کوئی چیز پکتی تو آپؐ اس میں سے ایک حصہ حضرت فاطمہؑ کے ہاں ضرور بھجوا دیتے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے: ”فاطمہؑ میرے جسم کا ایک حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھ کو اذیت دی (بخاری) ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا: ”فاطمہؑ اہل جنت کی خواتین کی سردار ہیں۔“ رسول اللہؐ حضرت فاطمہؑ کے بچوں حسنؑ اور حسینؑ کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ حسنؑ اور حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔

حضرت اسامہؓ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے کسی ضرورت سے رسول اللہؐ کے دروازے پر دستک دی، آپؐ غسی چیز کو چادر میں لپیٹے ہوئے باہر تشریف لائے میں جب اپنی ضرورت بیان کر چکا تو میں نے دریافت کیا:

”یہ آپ کیا لپیٹے ہوئے ہیں۔؟“

آپ نے چادر ہٹائی تو اس میں سے حسن اور حسینؑ برآمد ہوئے جو آپ کی گود میں چڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: ”یہ دونوں میرے بیٹے، میری بیٹی کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے اور ہر شخص سے جو ان سے محبت رکھتا ہے، محبت فرما۔“ (ترمذی)

حضرت فاطمہ الزہراءؑ نے اٹھائیس یا انتیس برس کی عمر پائی چنانچہ آپؑ کو زیادہ احادیث روایت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آپؑ سے اٹھارہ یا انیس احادیث مروی ہیں امام دارقطنیؒ نے حضرت فاطمہؑ سے روایت کردہ احادیث پر مشتمل ایک کتاب تیار فرمائی تھی جس کا نام مسند فاطمہؑ رکھا تھا۔ حضرت سیدہ بتولؑ علم حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ آپؑ شعر بھی کہتی تھیں۔ آپؑ کی بعض نصیحتوں کا بعد میں فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ حضرت سیدہ فاطمہؑ ہر معاملے میں حضورؐ کی ہدایت کو پیش نظر رکھتی تھیں اور آپؑ کے اشارہ ابرو کو خوب سمجھتی تھیں۔ ایک بار حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کو باہر سے کچھ رقم بھیجی۔ اس زمانے میں حضورؐ گہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپؑ واپس آئے تو حضرت فاطمہؑ نے اس خوشی میں ایک نقشین پردہ خرید کر دروازے پر لٹکا دیا اور چاندی کے دو کنگن بنوا کر ہاتھ میں پہن لیے حضورؐ تشریف لائے تو آپؑ نے خلاف معمول گھر میں قدم نہ رکھا اور واپس چلے گئے۔ حضرت فاطمہؑ اس پر بہت رنجیدہ ہوئیں اور رو پڑیں۔ آپؑ نے حضورؐ کی بے رخی پر غور کیا تو یہی بات سمجھ میں آئی کہ میں نے دروازے پر نقشین پردہ لگا دیا ہے اور ہاتھوں میں کنگن پہن لیے ہیں۔ شاید اس وجہ سے حضورؐ ناراض ہو گئے ہیں۔ آپؑ نے پردہ اتار دیا اور کنگن ہاتھوں سے نکال دیے پھر یہ دونوں چیزیں حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے ہاتھوں حضورؐ کی خدمت میں بھجوا دیں۔ بچے پہنچے تو آنحضرتؐ بڑے خوش ہوئے۔ آپؑ نے بیٹی فاطمہؑ کے لیے دعا فرمائی۔ آپؑ نے یہ بھی فرمایا: ”یہ میرے اہل بیت ہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف (زرق برق آرائش) سے آلودہ ہوں۔ (ابوداؤد، نسائی)

10ھ میں حضورؐ نے حجۃ الوداع فرمایا۔ اس مبارک سفر میں سیدہ فاطمہؑ لڑکھرائی بھی حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ 11ھ میں جدائی کی گھڑیاں آن پہنچیں۔ آنحضرتؐ شدید علیل ہو گئے۔ آخری ایام میں آپؐ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہاں مقیم تھے۔ آپؐ کی تیمارداری کے لیے حضرت فاطمہؑ آئیں تو حضورؐ نے بڑی محبت و شفقت سے پاس بٹھایا پھر ان کے کان میں آہستگی سے کوئی بات کہی جسے سن کر سیدہؓ رو پڑیں۔ پھر حضورؐ نے کوئی بات ان کے کان میں فرمائی جسے سن کر سیدہؓ ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا: ”اے فاطمہؑ تمہارے ابا جان نے تم سے کیا کہا؟“ سیدہؓ نے فرمایا: ”جو بات حضورؐ نے چھپا کر کہی ہے، میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔“

رمضان المبارک 11ھ کو رسول اللہؐ کی پیاری بیٹی حضرت سیدہ فاطمہؑ سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں (اس تاریخ میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق حضرت فاطمہؑ نے نبی کریمؐ کے وصال کے دو ماہ چار ماہ، آٹھ ماہ یا اٹھارہ ماہ بعد وفات پائی، لیکن زیادہ مؤرخین کا اتفاق چھ ماہ والی روایت اور 3 رمضان المبارک 11ھ کی تاریخ پر ہے) سیدہ فاطمہؑ جہاں ایک سعادت مند اور نیک بیٹی تھیں وہاں بہت خدمت گزار اور صابر الفطرت بیوی بھی تھیں۔ آپؑ نے حضرت علیؑ کا ہمیشہ احترام فرمایا، ان کی اطاعت کی اور خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہ گھرانہ زوجین کے پاکیزہ، خلوص آگیز اور محبت آمیز تعلقات کی جی تصویر تھا۔

☆☆☆

حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا

نہایت محترم صحابیہ رسولؐ، جنہیں ماں کی طرح حضورؐ کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی

تیر برس رہے تھے۔!

جذبہ شہادت سے سرشار مٹھی بھر مسلمان بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ ان کے پاس نہ تو لڑائی کا پورا ساز و سامان تھا نہ سواری کے لیے گھوڑے، مقابلے میں کفار کا لشکر تھا، جس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔

چند مسلمان خواتین بھی میدان جنگ میں بڑی بے خوفی کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ مجاہدین کی طرح لڑنے کی بجائے، زخموں کی مرہم پٹی کر رہی تھیں، پیاسوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ مجاہدین کے جو تیر گر جاتے تھے، انہیں اٹھا کر دے رہی تھیں۔ یہ کفر و اسلام کا معرکہ تھا۔

اچانک ایک کافر نے ایک اچھی حرکت کی، ”اس نے مردوں پر حملہ کرنے کی بجائے ایک مسلمان خاتون کا نشانہ لے کر تیر چلا دیا۔ تیر، خاتون کو لگا تو وہ زمین پر گر گئیں، تیر چلانے والا کافر بے حیائی سے ہنسنے لگا۔

یہ جنگ کوئی معمولی جنگ نہ تھی۔ اللہ کے سب سے محبوب بندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اس جنگ کی قیادت فرما رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کافر حبان بن العرفہ کا تیر لگنے سے مسلمان صحابیہ گر گئی ہیں۔ یہ صحابیہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بے حد محترم تھیں۔ آپ انہیں ماں کا درجہ دیتے تھے۔ ان کے یوں زخمی ہو کر گر جانے اور پھر حبان کے خوش ہو کر قہقہے لگانے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید تکلیف پہنچی۔ آپ نے بغیر پھل کا ایک تیر اٹھایا اور اپنے رشتہ کے ماموں، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو دیتے ہوئے فرمایا: ”حبان کو ماریے“۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے تیر کمان میں رکھ کر حبان کا نشانہ لیا اور تیر چلا دیا۔ تیر جا کر حبان کی گردن کے قریب سینے میں جا لگا۔ حبان الٹ کر زمین پر چاروں شانے ڈھیر ہو گیا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر تبسم نمودار ہو گیا۔ آپ باقاعدہ ہنسنے، یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک نظر آنے لگے۔ پھر آپ نے فرمایا: ”سعدؓ نے اُمّ ایمن کا بدلہ لے لیا۔ اللہ سعدؓ کی ہر دعا کو قبول فرمائے۔“

یہ خاتون تھیں: حضرت ام ایمنؓ، جن کے غزوہ احد میں تیر لگنے سے زخمی ہو جانے پر رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے قرار ہو گئے اور آپؐ کی عطا کردہ تیر نے حضرت ام ایمنؓ کو پہنچنے والی تکلیف کا بدلہ لے لیا۔

آپؐ وہ بابرکت خاتون ہیں، جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن میں آپؐ کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کا بے حد احترام فرماتے تھے اور آپؐ کو ماں کہہ کر بلاتے تھے۔

ام ایمنؓ، شکل صورت میں ایک سادہ سی حبشی خاتون تھیں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب کی لونڈی تھیں۔ والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان ہی مبارک خاتون نے انجام دی۔

ام ایمن اسی زمانے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پر مامور تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کا بہت احترام فرماتے تھے۔

اگرچہ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا، مگر اُم ایمن جیسی شفیق خادمہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم ایمن کو ہمیشہ اپنے گھر کی فرد کا درجہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اُم ایمن، میری والدہ کے بعد میری دوسری ماں ہیں۔ امام ذہبیؒ کے مطابق، اُم ایمن بھی خاتون تھیں، کنیز تھیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد سے ورثے میں ملی تھیں۔ بعد میں آپ نے اُم ایمن کو آزاد کر دیا تھا۔ یہ واقعہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی کے بعد کا ہے۔ دلائل النبوة میں ابوالعظیم لکھتے ہیں کہ اُم ایمنؓ، دراصل حضرت خدیجہ بنت خویلد کی ہمشیرہ کی خادمہ تھیں، جن کو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہبکے طور پر پیش کر دیا تھا اور آپ نے ان کو آزاد کر دیا تھا۔

الاصحابہ کے الفاظ کے مطابق: اُم ایمنؓ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی خادمہ تھیں، جو بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں کی طرح خدمت کرنے لگیں، یہاں تک کہ آپ بڑے ہو گئے۔ بعض کتب کے مطابق، اُم ایمنؓ کو بھی حضرت زید بن حارثہ کی طرح گھر کی خدمت کے لیے خرید کر مکہ لایا گیا تھا۔ اُم ایمنؓ کا اصل نام برکہ بنت ثعلبہ بن عمرو بن حصن بن مالک بن سلمہ بن عمر بن النعمان تھا۔ لوگ عام طور پر انہیں اُم انطباء کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

حضرت اُم ایمنؓ نے بھی حضرت زید بن حارثہ کی طرح بلا تردد، اسلام قبول کر لیا۔ اس لحاظ سے آپ کا شمار حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ (بن حارثہ) اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرح السابقون الاولون (سب سے پہلے ایمان لانے والوں) میں ہوتا ہے۔ آپ نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پال پوس کر جوان کیا تھا۔ وہ، آپ کی تمام پاکیزہ عادات کو بہت اچھی طرح جانتی تھیں اور دولت ایمان سے مالا مال ہو کر اور بھی خوش تھیں کہ آپؐ نبی آخر الزماں، نبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی دائی رہ چکی ہیں اور آپؐ، ان کو اپنی امی کہہ کر پکارتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم ایمنؓ کو جب آزاد کر دیا تو چند روز بعد ان کی شادی عبید بن الحارث الخزرجی سے کر دی۔ اُم ایمنؓ کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا، جس کا نام انہوں نے ایمن رکھا۔ حضرت ایمنؓ، صحابی رسولؐ تھے، یہ غزوہٴ حنین میں شریک تھے اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق اس جنگ میں حضرت ایمنؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ بعض دوسرے تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ حضرت ایمنؓ غزوہٴ خیبر میں شہید ہوئے تھے۔

مبصرین کے قول کے مطابق سورۃ الکہف کی آخری آیت حضرت ایمنؓ ہی کے حق میں نازل ہوئی تھی، اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے: ”اور جو اپنے رب کے سامنے پیش ہونے کے تصور سے خائف رہتے ہیں، انہیں اچھے کام کرنے چاہئیں اور اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے۔“

تاریخ کی کتابوں میں عبید بن الحارث کے بجائے عبید بن زید یا عبید بن عمر کے نام ملتے ہیں۔ البتہ عبید بن زید بن عمرو بن بلال بن ابی الحرباء بن قیس بن مالک بن سالم بن غنم بن عوف بن خزرج، اُم ایمنؓ کے پہلے شوہر تھے۔ یہ عبید بن زید مکہ مکرمہ میں آکر یہیں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ بعثت نبوی ﷺ سے پہلے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم ایمنؓ کا نکاح ان سے کر دیا تھا۔ وہ اُم ایمنؓ کو لے کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ ایمنؓ وہیں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر عبید کا انتقال ہو گیا تو اُم ایمنؓ واپس مکہ مکرمہ تشریف لے آئیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہنے لگیں۔

عبید بن الحارث یا بقول دوسرے تاریخ دانوں کے، عبید بن زید یا عبید بن عمرو کا قبل از اسلام کے دور ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم ایمنؓ کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیا تھا۔ حضرت زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہؓ بن زید، اُم ایمنؓ ہی کے لطن سے پیدا ہوئے تھے، حضرت زید بن حارثہ 8 ہجری میں جنگ موتہ میں درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ واضح رہے کہ یہ زید بن حارثہ وہی ہیں،

جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے، اور جنہیں آپؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ قرآن مجید میں ان ہی بلند مرتبہ صحابی کا تذکرہ ان کا نام لے کر فرمایا گیا ہے۔ جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بیٹا بنالیا تھا اور وہ ”زید بن محمدؐ“ کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔

کتاب المعارف میں ابن قتیبہ لکھتے ہیں: جنگِ حسنین میں عالم شکست خوردگی میں بھی، جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے، ان کے نام یہ ہیں، علیؑ ابن ابی طالب، عباسؓ بن عبدالمطلب، جو دشمن کے پتھروں کو اپنے سینے پر روکے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نچر کی لگام پکڑے ہوتے تھے، ابوسفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب، ابوسفیانؓ کے بیٹے، فضلؓ بن عباس بن عبدالمطلب، ایمنؓ بن عبید (جو ام ایمنؓ کے بیٹے تھے) حضرت ابوبکر صدیقؓ، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ایمنؓ بن عبید کو اس جنگ میں شہادت کا مرتبہ حاصل ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ایمنؓ کو خادمہ یا لونڈی کا درجہ کبھی نہیں دیا، چونکہ آپؐ ام ایمنؓ کی گود میں پلے تھے، اس لیے آپؐ ان کو اپنی ماں کا درجہ دیتے تھے۔ محترمہ جب بھی آپؐ سے ملنے تشریف لاتیں، آپؐ ادب سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے، ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے اور فرماتے: ”یہ میری والدہ آمنہؓ کے بعد، میری دوسری امی ہیں! اور میرے گھر کی آخری نشانی ہیں۔“ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو اہل جنت سے نکاح کرنا چاہے، اسے ام ایمنؓ سے نکاح کر لینا چاہیے۔ (کیونکہ وہ خاتونِ جنت ہیں یعنی جنتی ہیں۔)

صحابہ گرام رضی اللہ عنہم اجمعین، سیدہ ام ایمنؓ کے بلند مقام و عالی مرتبہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور وہ ان کے شوہر حضرت زیدؓ بن حارثہ کا بھی دل و جان سے احترام کرتے تھے، اس لیے کہ یہ دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد پسند تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہوا تو سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”اگر زیدؓ بن حارثہ زندہ ہوتے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، زیدؓ کو اپنا خلیفہ بنانا پسند کرتے۔“

ایک اور روایت کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی کسی لشکر میں زیدؓ کو بھیجا، انہیں (زیدؓ بن حارثہ کو) اسی لشکر کا امیر ضرور بنایا۔ اگر زیدؓ آج زندہ ہوتے تو آپؐ ان ہی کو خلیفہ بنانے کی خواہش ظاہر فرماتے!۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ام ایمنؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور ان کے بیٹے، حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سے خاص لگاؤ تھا۔ آپؐ، سیدنا حسنؓ اور اسامہؓ کو ایک ساتھ پیار کرتے، ان کو گود میں بٹھاتے اور یوں دعا فرماتے: ”اے اللہ! میں ان دونوں سے پیار کرتا ہوں، تو بھی ان کو پسند فرما لے!“

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو بہت چاہتے تھے۔ ان کے والد زیدؓ بن حارثہ کی شہادت کے بعد آپؐ نے اسامہؓ ہی کو امیر لشکر بنایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اپنی بابرکت زندگی کے آخری لمحات گزار رہے تھے کہ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ حاضر خدمت ہوئے۔ آپؐ نے اشارے سے ان کو لشکر لے کر روانہ ہو جانے کا از سر نو حکم دیا اور دعا بھی دی۔ اسامہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، گویا آپؐ میرے حق میں دعا فرما رہے تھے!۔

حضرت اسامہؓ لشکر لے کر روانہ ہو گئے اور کامیاب و فاتح لوٹ آئے۔ اسامہؓ بن زیدؓ، ایک عرصہ تک وادی القریٰ میں قیام پذیر رہے، پھر حضرت معاویہؓ کے زمانے میں دمشق کے ایک شہر مزہ میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے۔ زندگی کے آخری دنوں میں اسامہؓ واپس مدینہ منورہ آ کر جرف نامی مقام پر قیام فرما ہو گئے، اسی جگہ آپؐ کا 54ھ میں انتقال ہو گیا۔

حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سے، بڑے بڑے صحابیوں نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، ابو عثمانؓ نہدی، اور ابو وائلؓ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ سے مدینہ ہجرت فرما چکے تھے، وہاں تشریف لے جانے کے بعد آپؐ نے حضرت ام ایمنؓ کے شوہر حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت رافع رضی اللہ عنہم، دونوں صاحبان کو مکہ بھیج دیا، انہیں ایک ایک اونٹ اور پانچ سو

درہم بھی عطا فرمائے۔ تاکہ وہ دونوں حضرات مکہ جا کر حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ، ام ایمنؓ اور ان کے بیٹے اسامہؓ بن زیدؓ کو بحفاظت مدینہ لے آئیں۔ اس طرح حضرت ام ایمنؓ نے ہجرت کی سعادت بھی حاصل کر لی اور ثواب بھی پایا۔

حضرت ام ایمنؓ ایک بار سفر میں تھیں۔ آپؓ کا روزہ تھا۔ صحرا میں سفر کرتے ہوئے آپؓ تھک کر نڈھال ہو گئیں۔ مشکل یہ پیش آئی کہ آپؓ کے پاس پانی نہ تھا۔ جب آپؓ روحاء کے قریب پہنچیں تو سورج غروب ہونے لگا۔ آپؓ سخت پریشان ہوئیں کہ صحرا میں پانی کہاں سے حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے آپؓ کی مشکل پوشیدہ نہ تھی۔ اس نے صحرا میں آپؓ کے لیے آسمان سے پانی کا انتظام فرمادیا۔ حضرت ام ایمنؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد گرمیوں کی دو پہروں میں سفر کرتے ہوئے بھی مجھے کبھی پیاس نے نہیں ستایا۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت زمیصاءؓ (ام سلیمؓ) جیسی باشعور خواتین نے حضرت ام ایمنؓ ہی کی کوششوں سے اسلام قبول کیا۔ ام سلیمؓ کے پہلے شوہر کا نام مالک بن نضر تھا۔ حضرت انسؓ بن مالک ان ہی کے بیٹے تھے۔ حضرت انسؓ بن مالک جب بیس سال کے ہوئے تو ان کی والدہ ان کو لے کر بارگاہ رسالتؐ مآب میں حاضر ہو گئیں اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میرے اس بیٹے کو اپنا خادم بنا لیجیے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو قبول فرمایا اور انہیں جنت کی بشارت بھی دی۔ اس کے بعد محترمہؓ نے اسی شرط پر ابو طلحہؓ سے شادی کی کہ پہلے وہ مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت زمیصاءؓ (ام سلیمؓ) کی بدولت، حضرت ابو طلحہ انصاریؓ بھی مسلمان ہو گئے۔

ام سلیمؓ کی یہ خوبی بھی بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے اس وقت تک دوسرا نکاح نہیں کیا، جب تک ان کے فرزند انسؓ بن مالک اچھے خاصے بڑے نہیں ہو گئے۔

حضرت نسیمہؓ بنت کعب (ام عمارہ) کی طرح حضرت ام ایمنؓ بھی غزوہ احد میں شریک تھیں۔ ام سلیمؓ، ام عمارہؓ اور ام عبد اللہ (حضرت عائشہ صدیقہؓ) کے ساتھ مل کر انہوں نے جنگ سے بھاگ جانے والے افراد کو واپس بلایا۔ محترمہؓ بار بار ایک جملہ دہراتی تھیں: ”کیا اس حالت میں بھی تم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔“

جنگ احد کے علاوہ ام ایمنؓ نے غزوہ حسنین اور غزوہ خیبر میں بھی شرکت فرمائی۔ غزوہ خیبر کی مہم میں رسول اکرمؐ کے ساتھ بیس خواتین تھیں اور حضرت ام ایمنؓ بھی ان خواتین میں شامل تھیں۔

ام سنان الاسلمیہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد ہر غازی خاتون کو ایک چٹائی، ایک یمنی چادر اور دو درہم عنایت فرمائے اور اس طرح ام ایمنؓ نے بھی اپنے حصے کا مال غنیمت حاصل کر لیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدہ ام ایمنؓ کا بہت احترام فرماتے تھے، وقتاً فوقتاً آپؐ کی مزاج پرسی کے لیے آپؓ کے گھر تشریف لے جاتے اور آپؓ کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، جب اپنے رب سے جا ملے، تو اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بھی ان کے در دولت پر تشریف لے جاتے اور ان کی ضروریات کا اسی طرح خیال رکھتے، جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیال فرمایا کرتے تھے۔ سیدہ ام ایمنؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں کی طرح پالا تھا اور آپؐ کی نگرانی اور نگہداشت پر شروع سے مامور تھیں، اسی لیے وہ اپنی مامتا کا اظہار فرمایا کرتی تھیں، جس کو رسول اکرمؐ بھی سراہتے تھے اور آپؐ کو ”امی، امی“ کہہ کر پکارتے تھے۔

حضرت ام ایمنؓ نے ایک دفعہ مادرانہ شفقت کے باعث آنے کو چھان کر اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نرم سی چپاتیاں تیار کر دیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ”امی! یہ کیا ہے؟“ حضرت ام ایمنؓ نے فرمایا: ”یہ ہمارے علاقے کا کھانا ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے، اس لیے میں نے آپؐ کے لیے تیار کیا ہے۔“

آپؐ نے فرمایا: ”آپ اس کو دوبارہ باریک کر کے واپس آئے میں گوندھ لیں۔“ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اُم ایمنؓ ایک مشفق ماں کی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کر کے بہت خوش ہوتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانے سے انکار کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی حضرت اُم ایمنؓ سے مذاق کے رنگ میں بھی بات کرتے تھے۔ محمد بن قیس کے مطابق ایک دفعہ حضرت اُم ایمنؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! مجھے سواری کے لیے کچھ چاہیے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”میں آپؐ کو سواری کے لیے اونٹ کا بچہ دوں گا۔“

حضرت اُم ایمنؓ نے عرض کیا: ”وہ میرا بوجھ نہ اٹھا سکے گا اور نہ وہ مجھے چاہیے۔“ آپؐ نے دوبارہ (ازراہ مذاق) فرمایا: ”میں تو آپؐ کو اونٹ کے بچے ہی پر سوار کرواؤں گا، پھر آپؐ نے وضاحت فرمائی کہ ہر اونٹ، اونٹ کا بچہ ہی تو ہوتا ہے۔!“

حماد بن سلمہ سے روایت ہے کہ ثابت بن انس بیان کرتے ہیں کہ حضرت اُم ایمنؓ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر بہت روئیں۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپؐ بھی اس طرح گریہ و بکا کر رہی ہیں؟ حضرت اُم ایمنؓ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ایک دن آپؐ کو انتقال فرمانا ہے، میں رو اس لیے رہی ہوں کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔“

ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ آئیے بھائی ہم اُم ایمنؓ کے ہاں چلیں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں)۔ جب دونوں بزرگ، حضرت اُم ایمنؓ کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت اُم ایمنؓ اچانک رونے لگیں۔ دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ دریافت فرمایا: ”آپؐ گھس لیے رو رہی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے پاس (بہشت میں) ہر طرح کی راحت و برکت حاصل ہے۔“ حضرت اُم ایمنؓ نے فرمایا: ”بات یہ نہیں، میں رو اس لیے رہی ہوں کہ سلسلہ وحی ختم ہو گیا ہے۔“ حضرت اُم ایمنؓ کی یہ بات سن کر دونوں بزرگ آبدیدہ ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق لوگوں کو حضرت اُم ایمنؓ کی اس معصومانہ ادھر پر تعجب ہوا کہ محترمہؓ نے کیا اچھی بات کہی ہے، اس لیے کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہونا، کنایہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے درمیان نہ ہونے کا۔!

جب حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت ہوئی اور حضرت اُم ایمنؓ کو یہ خبر ملی تو آپؐ بے اختیار روئے لگیں، اس قدر روئیں کہ آپؐ کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔

حضرت اُم ایمنؓ نے بہت لمبی عمر پائی۔ آپؐ کا انتقال حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں ہوا۔ بعض مؤرخین نے غلطی سے لکھ دیا ہے کہ اُم ایمنؓ کا انتقال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے پانچ ماہ بعد ہو گیا تھا۔ دراصل وہ خاتون دوسری ہیں اور ان کا نام بھی برکہ تھا اور ان کی کنیت بھی اُم ایمنؓ ہی تھی۔

علامہ ابن حزمؒ کے فرمانے کے مطابق: حضرت اُم ایمنؓ کا شمار ان صحابیاتؓ میں ہوتا ہے، جن سے صرف پانچ احادیث مروی ہیں۔ حضرت اُم ایمنؓ کو قرآن و فقہ و حدیث پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ آپؐ فتوے بھی دیا کرتی تھیں۔

حضرت اُم ایمنؓ کے لیے فخر کی ایک بات یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ کے فرزند اسامہؓ کو اسی محبت، شفقت اور پیار سے نوازا، جو آپؐ نے اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو عطا فرمایا تھا اور دوسرے یہ کہ آپؐ کے شوہر حضرت زیدؓ بن حارثہؓ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھے۔

حضرت نسیمؓ بنت کعب

(نہایت دلیر اور بلند مرتبہ صحابیہ جنہیں غزوہ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی)

وہ چادر بہت خوبصورت تھی۔!

امیر المومنین کے پاس آنے والی چادریں تو کئی تھیں اور سب ہی بہت عمدہ تھیں، لیکن وہ چادر بہت بڑی اور نہایت نفیس تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے تجویز پیش کی۔

”اس چادر کی قیمت بہت زیادہ ہوگی، کیا ہی اچھا ہو جو یہ چادر عبد اللہ بن عمرؓ کی دہن صفیہ بنت ابی عبیدہؓ کو دے دی جائے۔“

امیر المومنین چاہتے تو یہ چادر باسانی اپنی بہو کو دینے کا فیصلہ فرماتے لیکن انہوں نے فرمایا:

”میں یہ چادر ان خاتون کو بھیج رہا ہوں، جو میری بہن صفیہ بنت ابی عبیدہؓ سے زیادہ اس کی حقدار ہے، یعنی ام عمارہؓ، نسیم بنت کعبؓ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احد کے معرکے کے دوران میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”میں نے گھمسان کے وقت جب بھی اپنے دائیں بائیں دیکھا، نسیم بنت کعبؓ کو میرا دفاع کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ میری جان بچانے کے لیے لڑ رہی تھیں“ اس کے بعد امیر المومنین کہنے لگے ”اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام عمارہ کے بیٹے عبد اللہ بن زید کو پکار رہے تھے۔ اے ام عمارہ کے فرزند“ عبد اللہ بن زید نے عرض کیا، ارشاد، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا، ”تیر چلاؤ، پتھر مارو“ حضرت عبد اللہ بن زیدؓ نے دشمن کے ایک گھڑسوار پر پتھروں کی بارش کر دی، ایک پتھر اس کے گھوڑے کی آنکھ پر جا کر لگا، وہ بے چین ہو کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ اس کا سوار بھی۔ عبد اللہ اس پر پتھر برساتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ پتھروں میں دب کر رہ گیا۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس منظر کو دیکھ کر تبسم فرماتے تھے۔ ایسے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ام عمارہ کے کندھے پر زخم آ گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”عبد اللہ، جاؤ اپنی ماں کو دیکھو، ان کے زخم کی مرہم پٹی کرو۔ تم سب گھر والوں پر اللہ اپنی برکتیں نازل فرمائے۔ تمہاری ماں نسیم کا مقام فلاں فلاں عورت کے مقام سے بہتر ہے۔ تمہارے سوتیلے والد (ربیب) کا مقام فلاں فلاں شخص کے مقام سے بہتر ہے اور خود تمہارا مقام بھی فلاں فلاں کے مقام سے اچھا ہے۔“

نسیم نے جب رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دعا فرماتے سنا تو بے اختیار عرض کرنے لگیں:

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یہ دعا بھی فرمائیے کہ اللہ جنت میں ہمیں آپ کا رفیق بنادے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی فرمائی۔ اے اللہ ان کو جنت میں میرا رفیق بنادے۔“

یہ سننا تھا کہ نسیمؓ نے کہا: ”اب دنیا مجھے کوئی بھی تکلیف دے، میں اس کی پروا نہیں کروں گی۔“

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے یہ ایمان افروز واقعہ سنانے کے بعد وہ قیمتی چادر حضرت نسیمؓ بنت کعب کو بھیجوا دی۔

یہ حضرت نسیمؓ بنت کعب ہیں، نہایت دلیر، جانباز اور تقویٰ کی بلندیوں پر فائز صحابیہ، جنہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اس دور میں ایمان لائیں، جب اسلام کا نام لینا، شدید آزمائشوں کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ مدینہ منورہ سے آنے والے اس اولین وفد میں حضرت نسیمؓ بھی شامل تھیں، جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا عہد کیا، اپنی جانیں دینے کا وعدہ کیا۔ یہ عہد ”بیعت عقبہ“ کہلاتا ہے۔ حضرت نسیمؓ نے

متعدد جنگوں میں حصہ لیا، جن میں غزوہ احد، غزوہ خندق، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ خیبر جیسی اہم جنگیں شامل ہیں۔ آپؐ نے جنگ یمامہ میں مرشدین کے خلاف جہاد بھی کیا۔

حضرت نسیبہؓ بنت کعب قبیلہ بنو نجار کی شاخ بنو مازن سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے آپؐ کے نام کے ساتھ 'المازینہ' بھی لگایا جاتا ہے۔ آپؐ کی والدہ محترمہ کا نام رباب تھا، نسیبہؓ والد اور والدہ دونوں کی طرف سے بنو خزرج سے تعلق رکھتی تھیں اور انصار کے بہترین گھرانے کی زینت تھیں۔

حضرت نسیبہؓ کا پہلا نکاح زید بن عاصم بن کعب سے ہوا، ان سے ان کی دو اولادیں ہوئیں۔ عبداللہ بن زیدؓ اور حبیب بن زیدؓ۔ زید بن عاصم نے بھی بیعت عقبہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ بدری صحابی ہیں۔ غزوہ احد میں بھی شریک ہوئے۔

زید بن عاصم کی وفات کے نسیبہؓ کا نکاح حضرت غزیہ بن عمرو سے ہوا۔ ان سے نسیبہؓ کی دو اولادیں ہوئیں: تمیم اور خولہ۔ غزیہؓ بیعت عقبہ اور غزوہ احد میں شریک ہوئے۔ حضرت نسیبہؓ کے بھائی عبداللہ بن کعب، نے بدر اور احد کے معرکوں میں شرکت کی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر غزوہ میں شریک رہے۔ غزوہ بدر کے تمام مال غنیمت کا حساب کتاب عبداللہ بن کعب ہی کے ذمے تھا۔ ان کا انتقال 30 ہجری میں ہوا۔ حضرت نسیبہؓ کے ایک اور بھائی حضرت عبدالرحمن بن کعب غزوہ احد اور اس کے بعد کے تمام معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کے آخری دنوں میں انتقال فرمایا۔ حضرت نسیبہؓ کے ایک اور بھائی خالد بن کعب بھی صحابی تھے۔ بر معونہ کے معرکے میں جام شہادت نوش فرمایا۔ نسیبہؓ نے اپنی چاروں اولادوں کی تربیت عین اسلامی خطوط پر کی۔

عبداللہ بن زید بن عاصم کی کنیت ابو محمد تھی، لیکن یہ 'ابن ام عمارہ' کی کنیت سے مشہور تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا اہتمام ان ہی کے ذمے تھا۔ بیعت عقبہ میں بھی شریک ہوئے۔ بدر میں شریک نہیں ہو سکے، البتہ آپؐ نے غزوہ احد اور جنگ یمامہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت وحشی بن حرب کے ساتھ مل کر انہوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے شخص مسلہ کذاب کو جہنم رسید کیا تھا۔ ابن ام عمارہ حرہ کے معرکے میں 33ھ میں شہادت پا گئے۔

حضرت نسیبہؓ کے صاحبزادے، حبیب بن زید بھی، بیعت عقبہ کے موقع پر موجود تھے۔ رسول اللہؐ نے آپؐ کے صدق ایمان کی تعریف فرمائی ہے۔

پہلی بیعت عقبہ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار کا ظلم و ستم عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ایسے میں مدینہ منورہ سے حج کے لیے آئے ہوئے چھ افراد کی، ملاقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ یہ ملاقات منیٰ کے قریب عقبہ کے مقام پر پر ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افراد کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ ان چھ افراد کے دلوں پر اسلام کی دعوت نے اثر کیا۔ وہ سب مسلمان ہو گئے۔ واپس جا کر انہوں نے مدینہ کے لوگوں تک اسلام کی بات پہنچائی۔ اگلے برس 73 افراد عقبہ کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ ان میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔ ان دو خواتین میں سے ایک حضرت نسیبہؓ بنت کعب تھیں۔

یہ ملاقات بہت رازداری کے ساتھ ہوئی کیونکہ کفار مکہ کی شدید مخالفت کا اندیشہ تھا۔ حضرت کعب بن مالک اس رات کا حال کچھ یوں بیان فرماتے ہیں: "ہم ایک تہائی رات ہوئے رہے، پھر ہم عقبہ میں طے شدہ مقام کی طرف چھپتے چھپاتے چل پڑے۔ ہم 73 افراد تھے۔ ہمارے ساتھ صرف دو خواتین تھیں۔ ایک اسماء بنت عمرو اور دوسری نسیبہؓ بنت کعب۔ ہم مقررہ جگہ پہنچے تو کچھ دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ تشریف لے آئے۔ حضرت عباس اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس منصوبے میں شریک رکھا تھا۔

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس موقع پر ایک تقریر کی، پھر ہم سب نے کہا: ہم نے آپؐ کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ فرمائیے کہ آپؐ اور آپؐ کا رب کیا چاہتا ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز ارشاد فرمایا۔ قرآن مجید کی تلاوت فرمائی، توحید کا پیغام دیا، اسلام کی طرف دعوت دی اور پھر فرمایا: میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم لوگ میری اسی طرح حفاظت کرو گے، جیسے تم اپنی عورتوں کے محافظ ہو۔ اس کے بعد ایک طویل گفتگو ہوئی، جو ان صحابہ گرام اور صحابیات مکرم کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل اور بھرپور ایمان اور یقین اور آپؐ پر ہر شے فدا کر دینے کے جذبہ بے پایاں کی مظہر تھی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بیعت لی۔ اس بیعت کو بیعت النساء بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی ”عورتوں کی بیعت“ سورہ المائدہ کی آیت 12 پر اس بیعت کی شرائط پر وضاحت سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

جب سب حضرات بیعت کر چکے تو ام عمارہ، حضرت نسیمہؓ اور ام منیع نے بھی اسلام قبول کر لیا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی بیعت لی۔ خود نسیمہؓ روایت کرتی ہیں کہ بیعت کے لیے عرب کی رسم کے مطابق لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں مبارک ہاتھوں پر اپنے اپنے ہاتھ مارتے جاتے تھے، خود حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو تھامے ہوئے تھے۔ آخر میں میں، (ام عمارہؓ) اور ام منیع، دو خواتین باقی رہ گئیں۔ میرے شوہر عزیہ بن عمرو نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ دو خواتین بھی اس بیعت میں ہمارے ساتھ شریک ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی بیعت لے لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں ان سے بھی ان ہی شرائط پر بیعت لے چکا ہوں، جن پر میں نے تم سے بیعت لی ہے۔ ہاں، میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔“

حضرت انس بن مالک غزوہ احد میں شریک تھے۔ آپؐ اس جنگ کا حال کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

”غزوہ احد میں جب لوگ شکست خوردہ سے ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے ہٹ گئے تو حضرت ابوطلمحہ انصاریؓ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہوئے۔ وہ ایک اچھے تیر انداز تھے۔ میں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ کو دیکھا۔ دونوں نے اپنی پنڈلیوں کو مضبوطی سے باندھ رکھا تھا اور اپنے کندھوں پر پانی کی مشکیں اٹھائے زخیبوں کو پانی پلاتی جا رہی تھیں۔“

یہ اتنا سخت معرکہ تھا کہ حضرت انسؓ کے الفاظ میں، نیند کے باعث دو مرتبہ تلوار، حضرت ابوطلمحہ کے ہاتھ سے گر گئی۔“

حضرت نسیمہؓ اس نازک مرحلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی تھیں۔ آپؐ ضرورت پڑنے پر پیاسوں کو پانی پلا رہی تھیں، زخیبوں کی مرہم پٹی بھی کر رہی تھیں۔ کوئی تیر گر جاتا تو اٹھا کر بہتر انداز کو دے دیتیں، کسی کی تلوار گر جاتی تو فوراً اٹھا کر اسے تھما دیتیں۔ کوئی نیزہ گر جاتا تو اسے بھی دشمن کے ہاتھ میں نہ آنے دیتی تھیں۔

اسی جنگ میں حضرت نسیمہؓ زخمی بھی ہو گئیں۔ اس کا واقعہ خود حضرت نسیمہؓ نے اپنی بھانجی، حضرت ام سعد بنت سعد بن ربیع کو اس طرح سنایا:

”میں صبح ہی نکل کھڑی ہوئی اور یہ بھی دیکھی گئی کہ لوگ کس حال میں ہیں، کیا کر رہے ہیں، انہیں کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ اس وقت میرے پاس پانی سے بھرا ہوا ایک مشکیزہ تھا۔ اس وقت جنگ کی صورتحال مسلمانوں کے حق میں تھی۔“

جب مسلمانوں کو پسپائی کا سامنا ہوا، تو میں کتر کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھ گئی اور آپؐ کی جان بچانے کی غرض سے بے خطر اور براہ راست قتال میں شریک ہو گئی۔ میں اپنی تلوار سے ہر اس شخص کو کاٹتی پٹتی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھتا اور کبھی اپنی کمان سے تیر چلاتی، یہاں تک کہ مجھے بھی زخم آ گیا۔“

ام سعدؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنی خالہ حضرت نسیمہؓ کے کندھے پر زخم بھی دیکھا، جو خاصا گہرا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا: ”یہ زخم کس نے

لگایا؟“ جواب ملا: ”ابن قمیہ نے۔ اس نے جب دیکھا کہ لوگ بھاگ رہے ہیں تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ ہر ایک سے کہتا، مجھے بتاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ میں نے اور دیگر صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ایسے میں ابن قمیہ نے مجھ پر وار کیا تو کندھے پر یہ گہرا زخم آ گیا۔ میں نے بھی ابن قمیہ پر کئی وار کیے۔ اس کو خاصی چوٹیں لگائیں لیکن اس نے دو دو زابیں پہن رکھی تھیں۔“

حضرت نسیبہؓ اسی غزوہ کا حال ایک اور مقام پر اس طرح بیان فرمایا:

”میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اطراف دس کے لگ بھگ افراد رہ گئے ہیں۔ میں، میرے دونوں بیٹے اور میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کر رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بغیر ڈھال کے دیکھا تو ایک اور صاحب سے جن کے پاس ڈھال تھی، فرمایا تم اپنی ڈھال اسے دے دو، جو ابھی جنگ کا راہ رکھتی ہے۔ میں نے وہ ڈھال لے لی۔ ایک گھڑ سوار نے میری طرف بڑھ کر تلوار سے وار کیا، میں نے آگے اپنی ڈھال رکھ دی۔ اس کی تلوار میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ پھر میں نے اس کے گھوڑے کے ٹخنے کے قریب چوٹ لگائی۔ وہ اپنی پیٹھ کے بل گرا۔ یہ منظر دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بیٹے کو پکارا۔ اے ابن عمارہ اپنی ماں کو دیکھو۔ میرے بیٹے نے یہ پکار سن لی۔ وہ آیا اور ہم دونوں ماں بیٹے نے مل کر اس گھڑ سوار مشرک کو موت کے حوالے کر دیا۔“ حضرت نسیبہؓ کے صاحب زادے، حضرت عبداللہ بن زید فرماتے ہیں کہ غزوہ احد کے روز ایک شخص تیز اونٹ کی طرح چلتا ہوا میرے قریب سے گزرا اور اس نے میرے بائیں بازو کو زخمی کر دیا۔ زخم سے خون رُک نہیں رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا ”اپنے زخم کی پٹی رکھو۔“

میری والدہ کے پاس بہت سی پٹیاں تھیں، جو انہوں نے پہلے سے تیار کر رکھی تھیں، انہوں نے میرے زخم کو باندھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ والدہ نے پٹی باندھنے کے بعد مجھ سے کہا: ”اٹھو میرے بیٹے، جنگ میں شریک ہو کر مشرکین پر وار کرو۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

”اے ام عمارہ، تم جیسی ہمت اور طاقت کون رکھتا ہے؟“

حضرت نسیبہؓ فرماتی ہیں: ”جس شخص نے میرے بیٹے پر وار کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نشاندہی فرمائی کہ یہ ہے تمہارے بیٹے پر حملہ کرنے والا، میں نے اس کی پنڈلی پر زور سے چوٹ لگائی اور وہ زمین پر آ رہا۔ میں اور میرے بیٹے نے اس مشرک کو ہلاک کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے نسیبہؓ، تم نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا، پھر فرمایا، شکر ہے اس اللہ کا اور تمام خوبیاں ہیں اس کے لیے، جس نے تم کو فتح یاب کیا، دشمن کو سزا دے کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔“

کسی نے حضرت نسیبہؓ سے پوچھا: ”کیا جنگ میں قریش (کفار مکہ) کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ شریک تھیں۔ حضرت نسیبہؓ نے فرمایا: ”نہیں، اللہ کی قسم، میں نے ان میں سے کسی بھی عورت کو نہ تیر چلاتے دیکھا، نہ نیزہ پھینکتے، نہ پتھر مارتے اور نہ تلوار چلاتے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈھولک وغیرہ بجاتی تھیں اور جنگ بدر میں کام آنے والے مشرکوں کے نام لے لے کے اپنے مردوں کو ابھارتی تھیں۔ ان کے پاس سرے داناں اور سرے کی سلاخیاں تھیں، جب کوئی مشرک واپس بھاگتا تو یہ عورتیں اس کو سرے کی سلاخیاں اور سرسہ داناں مارتیں اور کہتیں: ”تم تو صرف عورت نکلے۔“ لیکن احد کے روز میں نے دیکھا کہ مشرکوں کے مرد اور عورتیں دونوں بدحواس ہو کر بھاگے۔ یہ الگ بات کہ جب جنگ کا پانسہ پلٹا تو مسلمانوں کو ان کی طرف سے نقصان پہنچا۔

حضرت نسیبہؓ نے غزوہ احد میں 12 دشمنوں کو زخمی کیا۔ خود حضرت نسیبہؓ کو اس جنگ میں تیرہ زخم آئے، ان میں سے کندھے کے زخم کا علاج انہوں نے سال بھر تک کروایا۔ یہاں تک کہ غزوہ حراء الاسد کا مرحلہ آپہنچا، آپؐ اس حالت میں بھی اس نئے معرکے میں شریک ہونے نکلے

کھڑی ہوئیں مگر کندھے کے زخم سے پھر خون رسنے لگا، اس کی تکلیف اور نقاہت سے بے ہوش ہو گئیں اور میدانِ جہاد میں نہ پہنچ سکیں۔! لیکن آپؐ جس اخلاص اور ایمان کے ساتھ نکل آئی تھیں، اس کا اجر یقیناً انہوں نے رب العالمین کے ہاں پالیا ہوگا۔!

حضرت نسیمؓ نے غزوہٴ خندق میں بھی حصہ لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے علاوہ کئی صحابیاتؓ مدینہ منورہ کے اندرونی علاقوں کی حفاظت کر رہی تھیں، اس موقع پر حضرت نسیمؓ کی ذمہ داری یہ تھی کہ ہر آنے جانے والے پرکڑی نظر رکھیں، یہودیوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کا سامان وقت پر پہنچانے میں مدد دیں۔

حضرت نسیمؓ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی شریک تھیں اور بیعت عقبہ ثانیہ کی طرح بیعت رضوان میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔ آپؐ کو غزوہٴ احد اور حنین میں غزوہٴ خیبر میں بھی حصہ لینے کا موقع ملا۔ حنین کے معرکے میں آپؐ کی ذمہ داریاں یہ تھیں: دشمنوں کی سازشوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر رکھنا، زخمی مسلمانوں کو طبی امداد دینا اور اسلامی لشکر کو کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنا۔ آپؐ نے ان ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی نبھایا۔ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد ان مبارک خاتونؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں فتح مکہ کا انتہائی پر مسرت منظر بھی دیکھا اور خوش ہوئیں کہ آپؐ نے پہلے دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عہد کیا تھا، آپؐ آج تک اس پر قائم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے عہد پر ثابت قدم رہنے کا یہ انعام مرحمت فرمایا کہ آج وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کے ساتھ فاتحانہ شان سے مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے آخری دنوں میں ایک شخص نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا۔ اس کا نام تھا سلیمہ۔ اسکے جھوٹے ہونے کی وجہ سے اسے مسلمانوں نے کذاب یعنی ”مسلمہ جھوٹا“ کہا جاتا ہے۔ اس شخص نے ایک بڑا لشکر بھی تیار کر لیا۔ اس کے خلاف کارروائی کی ضرورت تھی لیکن ضروری تھا کہ پہلے اسے سمجھایا جائے اور مؤثر انداز میں دلیل دے کر قائل کیا جائے سلیمہ تک بات پہنچانے کے لیے جس شخصیت کا انتخاب ہوا وہ تھے حبیب بن زید، جو حضرت نسیمؓ کے بیٹے تھے۔ حبیب بن زید مسلمانوں کے پاس گئے، اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی، مگر وہ اپنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا رہا۔ آخر اس نے حضرت حبیبؓ بن زید کو شہید کر دیا جو مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر گئے تھے۔ اس سنگ دل نے حضرت حبیب بن زید کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اس دوران میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو مسلمانوں نے کذاب اور اس کی فوج سے لڑنے کے لیے ایک اسلامی لشکر بھیجا گیا۔ اس لشکر کی قیادت حضرت خالد بن ولیدؓ فرما رہے تھے۔ لشکر میں حضرت نسیمؓ بھی اپنے دوسرے بیٹے، عبداللہ بن زید کے ساتھ شریک تھیں۔

یامہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ گھمسان کا رونا پڑا۔ حضرت وحشیؓ، مسلمانوں کو قتل کرنے کی کوشش میں تھے، اچانک حضرت نسیمؓ کے بیٹے عبداللہ بن زیدؓ نے سلیمہ پر حملہ کر دیا۔ وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ حضرت وحشیؓ نے برچی کا وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا۔

اس جنگ میں حضرت نسیمؓ کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اس کے بارے میں حضرت ام سعدؓ نے حضرت نسیمؓ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ”ہم لوگ لڑے ہوئے حدیقتہ الموت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ (یہ مسلمانوں کا ایک قلعہ نما باغ تھا) میں اندر چلی گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں مسلمانوں کو قتل کروں گی اچانک میرے راستے میں مسلمانوں کا ایک حمایتی آکھڑا ہوا۔ اس نے مجھ پر وار کیا، جس سے میرا ہاتھ کٹ گیا۔ اللہ کی قسم! اس پر بھی مجھے آگے بڑھنے سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ میں جب مسلمانوں تک پہنچی تو میرا بیٹا عبداللہ، مسلمانوں کے کپڑوں سے اپنی تلوار صاف کر رہا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے سے پوچھا: ”کیا تم نے اس کو قتل کیا ہے؟“ بیٹے نے کہا: ”ہاں“ یہ سنتے ہی میں نے سجدہٴ شکر ادا کیا۔“

ایک موقع پر حضرت نسیمؓ نے اس بارے میں سوال کیا کہ قرآن پاک میں بالعموم مردوں ہی سے خطاب کیا جاتا ہے، عورتوں کیلئے کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سورہٴ احزاب کی آیت 35 نازل فرمائی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نیکی کے

اجرو ثواب اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے (ایک ہی جیسا) اجر اور مغفرت عظیم تیار ہے۔! یہی سوال ام المؤمنین سیدہ ام سلمیٰؓ نے بھی کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمایا تھا، پھر اس آیت کریمہ کی صورت میں مکمل اور بالکل واضح فیصلہ صادر فرمادیا گیا۔

حضرت نسیبہؓ کو ایک صفت یہ بھی تھی کہ انہیں زبان و بیان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔

حضرت نسیبہؓ سے کئی احادیث بھی روایت کی گئی ہیں۔ نسیبہؓ کے پوتے عباد بن تمیم بن زید، حادث بن عبد اللہ بن کعب اور مکمہ مولیٰ ابن عباس نے حضرت نسیبہؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت نسیبہؓ نے 13ھ میں اس دار فانی کو الوداع کیا۔

حضرت نسیبہؓ انصار کے قبیلہ بنو نجار کی عالی نصیب بیٹی تھیں اور بنو نجار وہ خوش قسمت قبیلہ ہے، جو انصار کے تمام قبیلوں سے بہتر اور پھر بنو نجار میں حضرت نسیبہؓ کا گھرانہ، سب سے بڑھ کر ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ سب مخلوقات میں سب سے بہتر یعنی سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نسیبہؓ کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ ان کو جنت میں میرا رفیق بنادے۔ یہ مرتبہ بلند ہو جس کو مل گیا۔



ابن نفیس

آپ کو علم تشریح الاعضاء کا بانی، ابن سینا ثانی اور جالینوس عرب کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے

رات کا پرسکون، خوابناک اور دل میں اتر جانے والا سماں تھا!

دوستوں کی محفل آراستہ تھی اور ہر موضوع پر گفتگو جاری تھی۔ دونوں دوست اپنے چہرے میرے انداز و اطوار اور گفتگو کے سلیقے سے اہل علم و دانش معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو بھی علمی موضوعات ہی پر ہو رہی تھی۔

گفتگو میں ایک مرحلہ ایسا آیا جب گفتگو کا رنگ بحث کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک صاحب جو اپنی طبیعت کے اعتبار سے بہت جلد گھبرا جانے والے معلوم ہوتے تھے۔ تیز اور بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ دوسرے صاحب کی آواز بدستور پرسکون اور ہموار تھی پہلے صاحب کی آواز بلند اور لہجہ تیز ہوتا چلا گیا دوسرے صاحب نہایت تحمل سے ان کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر سکن تک نہ آئی تھی۔ چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا تاثر بھی نہ تھا لہجہ کی ہمواری اور نرمی و روانی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

رفتہ رفتہ پہلے صاحب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور گردن کی رگیں پھولنے لگیں، جوان کے جذبات کی شدت کو ظاہر کر رہی تھیں۔ دوسرے صاحب بدستور اسی پرسکون لب و لہجہ میں گفتگو کرتے رہے۔ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے رہے۔ یہ کیفیت کچھ دیر تک نہیں ساری رات رہی یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو گیا۔ نماز فجر باجماعت ادا کی گئی جب دونوں دوست رخصت ہونے لگے تو پہلے صاحب نے دوسرے صاحب سے کہا:

”اے شیخ علاء الدین! میرے پاس تو بس مسائل ہیں، نکات اور قواعد مگر آپ تو ماشاء اللہ بے شمار علوم کے خزانے اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔!

اپنے مخاطب کی تند و تیز باتوں اور ناگوار لہجہ اور اسلوب گفتگو کے جواب میں انتہائی غیر معمولی صبر و تحمل، تہذیب و اخلاق اور شائستگی کا ثبوت دینے والے یہ صاحب علم و دانش تھے ابن نفیس جن کو اپنی غیر معمولی علمی فضیلت و بلندی کی وجہ سے علم تشریح الاعضاء کا بانی، ابن سینا ثانی اور جالینوس عرب کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے یہ بلند مرتبہ اپنی خداداد فراست اور شب و روز کی علمی محنت اور تفکر سے حاصل کیا تھا۔ آپ نہ صرف سائنسی علوم میں بے مثال دسترس رکھتے تھے بلکہ فقہ، حدیث، قانون، نحو اور منطق کے بھی ماہر تھے۔

ابن نفیس دنیائے طب میں علامہ قرشی کے نام سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ قرشی کے عنوان سے حکیم پیر محمد کاوش اپنی تالیف ”ناموس الاطباء (1960ء) میں صفحہ 96 پر یوں لکھتے ہیں:

علامہ قرشی کا نام علاء الدین ابوالحسن علی بن حازم المکی القرشی تھا۔ علامہ قرشی مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور دمشق میں سکونت اختیار کی۔ فنون حکیمہ میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ اپنے وقت کے جالینوس ثانی کہلانے لگے۔ ان کو قابل قدر تصنیف ”موجز القانون“ ہے جس کی شرحیں بعد میں اطباء نے لکھیں۔ علامہ قرشی نے خود ”قانون شیخ“ پر جو شرح کی ہے وہ عجیب و غریب شرح ہے۔ یہ شرح طبع نہیں ہوئی لیکن اس کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ سہولت کی خاطر آئندہ سطور میں ہم اس عظیم شخصیت کو صرف ابن نفیس کے نام سے یاد کریں گے۔

ابن نفیس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں خاصے اختلافات ہیں، لیکن اگر آپ کی تاریخ وفات 687ھ/1288ء کو مد نظر رکھا

جائے جبکہ آپ کی عمر تقریباً 80 سال ہو چکی تھی تو اس حساب سے ابن نفیس سال پیدائش 607ھ/1210ء قرار پاتا ہے۔

ابن نفیس کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ ان کی نشو و نما اور ابتدائی تعلیم و تربیت شام میں ہوئی جو اس زمانے میں سلطان العادل سیف الدین کے زیر نگیں تھا۔ بعد میں آپ مصر گئے۔

جس طرح ابن نفیس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہا جاسکتا اس طرح تاریخ یہ بھی بتانے سے قاصر ہے کہ انہوں نے مصر کی سرزمین پر کب قدم رکھا تھا۔ اگر وہ اپنے ساتھی ابن ابی اصیبعہ کے ساتھ ہی آئے تھے تو ممکن ہے کہ یہ واقعہ تقریباً 633ھ/1236ء کا ہو۔ اسی اعتبار سے یہ بھی زیادہ امکان ہے کہ ابن نفیس کو سلطان الکامل محمد نے دور اقتدار (614ھ/1218ء تا 635ھ/1238ء) قاہرہ بلوایا ہوگا۔

ابن نفیس کو علامہ قرشی کیوں کہا جاتا ہے اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ ایک گاؤں قرش میں پیدا ہوئے ابن ابی اصیبعہ کی کتاب عیون النبا کا ایک نسخہ جو مکتبہ ظاہریہ میں ہے اس میں لکھا ہے کہ یہ دمشق کے قریب ایک گاؤں ہے۔ جن لوگوں نے قاف پر پیش اور راپر زبر پڑھا ہے وہ ان کو قبیلہ قریش سے بتاتے ہیں یا غریبہ کے گاؤں قرشیہ یا بیت غمر کی پڑوسی بہت سی قریشی، جو مصر ہی میں ہے اس کے حوالے سے بھی ان کو قرشی کہتے ہیں۔ ایک قرشیہ نامی قبیلہ آباد ہے۔

پول گلیونجی نے لکھا ہے: اگرچہ بعض تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ ابن نفیس کی شخصیت ایک عرصہ تک گمنام رہی۔ تاریخ کے صفحات پر سات صدیوں تک ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ لپکھر نے جو ”تاریخ الطب العربی“ مرتب کی ہے اس میں انہوں نے ابن نفیس کا ذکر مستقل دو صفحات پر کیا ہے اور کیا ہے کہ ابن نفیس غیر معروف گمنام نہیں رہے بلکہ ان کے طبی انکشافات ہم سے پوشیدہ رہے۔ ابن نفیس نے ایک کتاب شرح تشریح القانون لکھی تھی جس میں ان کے حیرت انگیز نظریات کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن اس کتاب کا بھی پتا ڈاکٹر محی الدین اخطاوی (1945ء، 1986ء) کو اس وقت لگا جب وہ مکتب برلن میں عربی قلمی نسخوں کے مطالعے میں مصروف تھے۔ مکتبہ برلن کے نمبر 62243 پر ان کو شرح تشریح القانون کے عنوان سے ایک کتاب کا ذکر ملا۔ ڈاکٹر محی الدین نے اس کتاب کو پڑھا اور اس سے اپنا ایک مقالہ تیار کیا جس کا عنوان تھا: قرشی کے نظریات کے مطابق خون، پھیپھڑوں میں کس طرح چلتا ہے۔ اس مقالہ پر ان کو فریڈرک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی ملی۔ ڈاکٹر محی الدین نے جب اس کتاب کے بارے میں انکشاف کیا تو ان کے اساتذہ کو یقین نہیں آیا۔ انہوں نے اس کا مقالہ جرمنی مسترق ڈاکٹر مایر ہوف کو پڑھنے کے لیے دیا۔ مایر ہوف اس وقت قاہرہ میں تھے۔ ڈاکٹر مایر ہوف نے ڈاکٹر محی الدین کی ان تمام معلومات کی تصدیق کی، جو انہوں نے اپنے مقالے میں ابن نفیس اور ان کی کتاب کے بارے میں لکھی تھیں۔ ڈاکٹر مایر ہوف نے یہ بات مؤرخ جارج مارٹن کو بھی بتائی۔ جارج مارٹن نے اس مقالے کو اپنی عظیم کتاب ”تعارف تاریخ علوم“ کے آخری حصے میں شامل کر دیا۔ اس کے بعد مایر ہوف نے ابن نفیس کی کتابوں کی تلاش کا کام شروع کر دیا اور ابن نفیس کی زندگی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیں اور یوں ڈاکٹر محی الدین، مایر ہوف اور جارج مارٹن کی مشترکہ کوششوں سے، پوری سات صدیوں کے بعد ابن نفیس، تاریخ طب کے افق پر چمکتے ستارے کی طرح ابھر کر سامنے آ گئے۔

تب سے ابن نفیس کی کتب اور ان کی شخصی زندگی کے بارے میں مؤرخوں نے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس سلسلے میں ابو حیان الاندلسی کی ان معلومات نے بہت کام دیا، جو انہوں نے ابن نفیس کے بارے میں لکھی ہیں۔

ابو حیان کے بارے میں ہم رابطہ کے شمارہ میں تفصیلی تحریر پیش کر چکے ہیں۔ ابو حیان، ابن نفیس کی وفات کے بعد غرناطہ سے قاہرہ جانے والے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا انتقال قاہرہ میں 745ھ/1345ء میں ہوا تھا۔

بعض مورخین نے اعتراض کیا ہے کہ ابن امیہ نے اپنی کتاب ”تاریخ الطب والدجمل“ میں ابن نفیس کا نام تک نہیں لیا، جبکہ دونوں ہم

عمر، ہم سبق اور ہم جماعت تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ طبیب و خوار سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور قاہرہ کے شفا خانے بیمارستان الناصری میں دونوں نے بالترتیب ابن امیہ نے شعبہ آشوب چشم کے رئیس اور ابن نفیس نے مدیر معاون کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اس طرح ابن امیہ کی دوسری کتاب ”عیون النبا“ میں بھی ابن نفیس سمیت چھ شخصیات کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس دوسری کتاب کا ایک نسخہ اور بھی ہے، جس میں ان چھ غیر مذکورہ شخصیات کا ذکر مل جاتا ہے۔ اس نسخے میں ابن نفیس کا ذکر یوں ملتا ہے۔

علاء الدین ابوالحزم القرشی، المعطیب، شام کے قریب، قرش نامی گاؤں میں پیدا ہونے کے سبب ”قرشی“ کہلائے۔

”ق“ اور ”ز“ پر زبر کے ساتھ موصوف اپنے زمانے کے شیخ فاضل، علم کا سحر ذخار اور عالمی میدان میں قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں کسی ایک ہی فن پر مہارت حاصل نہیں تھی، اور نہ ہی یہ صحیح ہے کہ ”القانون“ کے مشکل مقامات کی تشریح ہی تک ان کی پرواز تھی، بلکہ حق بات یہ ہے کہ ان کی اور بھی بہت ساری تصانیف ہیں جو اپنی ندرت اور اشارات کی لطافت کی بناء پر خاصی مشہور ہیں۔ ایسی کتابوں میں ”موجز القانون“ اور ”الشامل“ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں ابن نفیس نے مختلف علوم اور حکم کے باب میں حکماء اور فلاسفوں اور عالموں کے نظریات و عقائد کا ذکر کیا ہے۔ ان کے وزنی دلائل و براہین کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، جو پورے کا پورا، ان کتابوں میں موجود ہے۔ ”شرح الفقول“ جو بقرطی کی فصول کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ مفردات میں کتاب الوالید، کتاب موالید اور جامع الدقائق فی الطب، کتاب الشافی اور اوجاع الاطفال نامی رسالہ، یہ سب علمی تحریریں ابن نفیس ہی کا سرمایہ اور ہمارا تاریخی و ثقافتی ورثہ ہیں۔

ان کتابوں کے منظر عام پر آ جانے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس ضمن میں ابن نفیس اور ابن ابی امیہ کے حوالے سے جو منفی پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ اس میں بدینتی کے سوا کوئی چیز شامل نہیں تھی۔ ”عیون النبا“ میں اگر ابن نفیس کا ذکر شامل نہیں ہے تو اس کی صرف یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ ابن ابی امیہ کا انتقال تقریباً 642ھ/1245ء میں ہوا تھا۔ اس وقت ابن نفیس کی عمر 35 سال سے کسی بھی طرح زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ مزید یہ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تک ابن نفیس نے طب اور دیگر علوم میں وہ مقام پیدا نہ کیا ہو جو، ان کو تاریخ میں مشہور و ممتاز مسلم طبیبوں میں شمار کروا سکتا۔

مصری مؤرخ ڈاکٹر محی الدین کی اس عبارت نے بات اور بھی صاف کر دی۔ وہ لکھتے ہیں: ”ان (نامعلوم) اطباء میں علی بن ابوالحزم بھی ہیں۔ یہ حکیم فاضل اور طبیب حاذق ہیں۔ ان کو ”علاء الدین ابن النفیس القرشی، الدمشقی“ کے نام سے جانا گیا ہے۔ یکتائے روزگار اور بے مثل شخصیت کے مالک تھے۔ ہر علمی شعبہ سے لگاؤ رکھنے والے بلکہ اس میں نئے اضافے کرنے والے بہت سی اعلیٰ خوبیوں کے مالک، پیش رفتگاں کے علوم کے خزانہ دار۔ ایسا بلند و بالا پہاڑ، جس کی چوٹی سر کرنا، ناممکن ہے۔ ایسی لمبی رسی، جس کو ڈوبنے والا پکڑ لے، تو غرق جہالت ہونے سے بچ جائے۔ کوئی ایسا طبیب یا عالم نہیں، جس نے ان کی علمی چشمے کے صاف شفاف پانی سے چلو بھرتک نہ پیا ہو اور اپنی گردن کے لیے خوبصورت علمی موتیوں کا ہار بنا کر نہ پہنا ہو اور ان کے خرمن علم و معرفت کا خوشہ پہن نہ رہا ہو۔“

علاء الدین ابن نفیس علم طب کے امام تھے۔ اس فن میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ بہت ضعیف ہو جانے کے باوجود، وہ اس علمی شعبے سے وابستہ رہے۔ نہایت عمدہ تصانیف اور دلکش کتابوں کے مالک ہیں۔ طب میں ان کی کتاب ”الشامل“ کی صرف فہرست ہی تین سو اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ اب قاہرہ کے بیمارستانی منصوری کی لائبریری میں موجود ہے۔ ان کی ایک کتاب کحل (سرمد) پر ہے اور ایک ”شرح القانون“ ہے۔

ابن النفیس نے دمشق میں قیام کے دوران ہی عمران الاسرائیلی کی شاگردی اختیار کر لی۔ عمران کو الملک الناصر نے اپنے ہاں شاہی طبیب مقرر کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن عمران نے منع کر دیا۔ عمران باقاعدہ طور پر ”بیمارستان الکبیر“ دمشق میں مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مہذب الدین الخوار بھی وہاں کام کرتے تھے۔ ابن ابی امیہ اور خود ابن نفیس، دونوں نے ان دونوں اساتذہ فن کی موجودگی میں شعبہ طب میں مہارت حاصل کی۔ ابن ابی امیہ، عمران کے حسن کارکردگی سے بہت متاثر تھے۔ جس انداز سے عمران مریضوں کے احوال کی تفتیش اور تشخیص کرتے

تھے۔ وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ عمران 637ھ/1239ء میں فوت ہو گئے۔

ان تمام تر واقعات کی روشنی میں ڈاکٹر حجاب عکادی کہتے ہیں: ”اس بات کا قوی امکان ہے کہ ابن نفیس نے دمشق کو جب خیر باد کہہ کر ایوبیوں کے دار الحکومت قاہرہ کا قصد کیا تو وہ زمانہ بغداد میں منگولوں کے داخلے سے 20 سال پہلے کا تھا۔ منگول بغداد میں 656ھ/1258ء میں داخل ہوئے۔ گویا ابن نفیس نے قاہرہ کا سفر 636ھ ہی میں کیا۔

ابن نفیس جب مصر آئے گویا تو کسی اجنبی جگہ نہیں پہنچے، جہاں طب کا نام و نشان نہ تھا بلکہ بغداد سے بھی بڑھ کر اس کی علمی و تاریخی حیثیت، ایک عرصے تک رہی ہے۔ اموی خاندان کے وہ فلاسفر اور اطباء، جن کو یونانی طب و فلسفہ سے گہری دلچسپی رہی ہے، مصر ہی میں تھے چنانچہ جابر بن حیان کے استاد خالد بن یزید بن معاویہ، طب کے توشیدائی تھے، جنہوں نے یونانی طب و فلسفہ کو عربی میں منتقل کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اسطفان الاسکندری کو کیمیائی کتب کے عربی ترجمے کا کام، خاص طور پر سونپ دیا تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہ ”حکیم آل مروان“ کے نام سے مشہور تھے۔ آل مروان کا اور اس کے بعد کا زمانہ، سائنسی، طبی اور فلسفیانہ انکشافات کا زمانہ رہا ہے۔ مصری اطباء نے بھی طب کے فن کو کافی آگے بڑھایا ہے، اسی طرح ابن نفیس نے خون کی گردش پر تحقیق کی۔

ہلاکو خان کے حملوں کے دوران جب اطباء، علماء اور مسلم فلاسفر وغیرہ، بغداد چھوڑ کر دمشق ہجرت کر گئے تھے اور ساتھ میں بہت ساری علمی کتابیں اور دینی و تاریخی سرمایہ بھی لے گئے۔ نور الدین محمود بن زنگی نے جو کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں بے شمار قلمی نسخے اور علمی نوادرا جمع کر دیے گئے تھے۔ ان ہجرت کرنے والے اطباء میں امین الدولہ ابو الحسن ہیبت اللہ بن صاعد النصرانی البغدادی المعروف ابن تمیذ کے اکثر شاگرد تھے۔ بغداد سے رخصت ہوتے وقت یہ لوگ اپنے ساتھ ابن سینا کی کتاب ”القانون“ جیسی بے شمار طبی کتب لے گئے۔

الملك العادل ابوبکر الايوبی (متوفی: 615ھ/1216ء) کے مرض کے علاج کے لیے طبیب و دوا کو بلایا گیا، جب ابوبکر ایوبی شفا پا گئے تو انہوں نے الدخوار کو پورے شام و مصر کے اطباء کا رئیس بنادیا۔ اس کے علاوہ الدخوار کے لیے ایک اعزاز ہے کہ ان کے شاگردوں میں ابن ابی امیہ، ابن نفیس، شمس الدین الہکی، زین العابدین الحافظی، اور موفق الدین علیہ السلام وغیرہ جیسے بے شمار اطباء کے نام آتے ہیں۔ الدخوار کا طب سے اس قدر شغف تھا کہ انہوں نے وصیت کر دی تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کی تمام ذاتی اور زیر مطالعہ کتابوں کو طبی مدرسہ (میڈیکل کالج) میں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ”المکتبۃ الدخواریہ“ کے نام سے ان کی تمام کتب ایک جگہ جمع کر دی گئیں۔ یہ اپنے زمانے کے بہترین کتب خانوں (لائبریریز) میں شمار ہوتا تھا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابن نفیس نے ”بیمارستان المنصور“ میں، یا ”بیمارستان الجدید“ میں کام نہیں کیا کیونکہ اس کی بنیاد ہی 684ھ/1285ء میں ڈالی گئی تھی جبکہ ابن نفیس کا انتقال 687ھ ہی میں ہو گیا تھا یعنی اس شفا خانے کی عمارت مکمل ہونے سے بھی پہلے۔

قاہرہ میں ابن نفیس نے فقہ کے مدرس کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

ابن نفیس نے اپنے زمانے میں ہر شعبہ علمی میں ترقی و عروج بھی دیکھا اور پھر صلیبی جنگوں کے سلسلے کو بھی پایا۔ فرنگیوں کے داخل ہونے کا سانحہ بھی ان کی نظر سیکورا، پھر مسلمانوں کی فتح اور لوٹس نہم کی گرفتاری کے مناظر بھی دیکھے۔

جب مصر میں وبا پھیلی تو ابن نفیس اس کا قلع قمع کرنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ کبھی کچھ بھول گئے۔ علم طب کے فروغ اور عوام الناس کی خدمت نے انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ اپنا گھر بساتے۔ چنانچہ وہ عمر بھر کنوارے رہے اور ہمیشہ پیشہ وارانہ مہارت اور صلاحیت کو عوام میں عام کرنے کی فکر میں رہتے تھے اور اس سلسلے میں اس قدر پریشاں اور متفکر رہنے لگے کہ اکثر بھولنے کے عارضے کا شکار ہو جائے لیکن جب قلم ہاتھ میں لے کر لکھنے بیٹھتے تو پھر گویا علم کی ایک دنیا آباد کر لیتے لکھتے وقت ابن نفیس کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی، گویا انہیں لکھنے سے پہلے غور نہیں کرنا پڑ رہا ہو۔!

ابن نفیس کے بارے میں مشہور ہے کہ لکھنے پڑھنے کے لیے، پہلے سے ان کے لیے قلم تیار کر کے رکھ دیے جاتے تھے، پھر آپ دیوار کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاتے تاکہ توجہ کسی اور طرف نہ ہونے پائے اور پھر اپنے خیالات، تجربات اور نتائج کو لکھتے چلے جاتے قلم کی روانی ایسی تھی گویا سیلاب کا ریلوا ہو، جب ایک قلم گھس کر خراب ہو جاتا یا ٹوٹ جاتا تو دوسرا تیار پڑا ملتا تاکہ تحریر کی روانی متاثر نہ ہو اور قلم بنانے پر وقت ضائع نہ ہو۔ ابن نفیس کثیر التصلیف، عالم ہیں ان کی اکثر کتب بہت ضخیم ہیں اور آسانی سے ان کی دوسری جلد تیار ہو سکتی ہے شاید اسی وجہ سے ان کی زیادہ تر تصانیف کتب خانوں کی زینت بنی رہی ہیں مشہور اور نمایاں کتابوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ المہذب فی الکھل: ابن نفیس کی اس کتاب نے ان کی زندگی ہی میں بہت شہرت حاصل کی لیکن اب اس کتاب کی صرف چند تحریریں صدقہ بن ابراہیم الشاندل کے اقتباسات کی صورت ہی میں دستیاب ہیں۔ یہ سارے اقتباسات آنکھ کے آگے والے حصے میں پیپ پڑ جانے کے علاج کے بارے میں ہیں اور کچھ آشوب چشم کے بارے میں تحریریں ہیں۔

2۔ الشامل فی الطب: العری نے مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ اس کی فہرست میں تین سو صفحات پر مشتمل، اس کتاب کا ذکر بھی ہے۔ ان میں سے صرف 80 صفحات کی بیاض ہے اور اب یہ کتاب قاہرہ کے شفا خانے، بیمارستان منصوری میں وقف و ہے۔ قیاس ہے کہ یہ کتاب ابو بکر الرازی کی ”الحاوی“ جیسی ضخیم کتاب ہے۔ اس کے اجزاء بوڈلین کی لائبریری آکسفورڈ میں 536 اور 539 نمبر پر موجود ہیں۔

3۔ المختار من الاغذیہ: اس کا ذکر صرف الوارڈیٹ نے مکتبہ برلن (جرمنی) کی کتابی فہرست کے صفحہ 496-497 پر کیا ہے تیز امراض (امراض ماڈہ) میں کون کون سی غذائیں استعمال کرنا چاہئیں۔ اس کتاب کا خصوصی موضوع ہے شاید ابن نفیس نے اس کتاب کی تیاری میں ”الغذاء فی الامراض الحادہ“ نامی کتاب سے استفادہ کیا ہو یہ کتاب بقراط کی ہے۔

4۔ شرح تقدیمات المعروف: اس میں بقراط کی کہانی کہنے کے انداز کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ ابن نفیس کے اپنے خیالات اور آراء بھی ہیں۔

5۔ شرح فصول بقراط: بروکلن نے لکھا ہے کہ یہ کتاب گوئے مالا، برلن، پیرس، آکسفورڈ، اسکور پال کی لائبریریوں میں موجود ہے۔

6۔ شرح تشریح جالینوس: یہ کتاب مکتبہ آیا صوفیہ میں 3661 نمبر پر محفوظ ہے، اس میں سے پہلے ساتھ ابواب موجود نہیں ہیں۔

7۔ تعلیق علی کتاب الاویسہ لاء بقراط: مکتبہ آیا صوفیہ میں 3642-1 نمبر پر محفوظ ہے۔ بقراط نے وبائی امراض پر جو کتاب لکھی تھی، اس پر ابن نفیس نے اپنے خیالات کا اضافہ کیا ہے۔

8۔ شرح مسائل حنین بن اسحاق: علامہ بدرالدین محمود بن احمد العینی نے اپنی کتاب ”عقد الجمان“ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا ایک اصلی نسخہ لیڈن (ہالینڈ) کی لائبریری میں 1296 نمبر پر موجود ہے، کالر بروکلن نے اس کے ابن نفیس کی تالیف ہونے پر شک ظاہر کیا ہے۔

9۔ شرح القانون: ابن نفیس نے اس کی بیس جلدوں پر مشتمل شرح میں بڑی دانائی کی باتیں کی ہیں۔ منطقی قیاس آرائیاں بھی ہیں اور مشکل طبی مسائل کا ذکر اور حل بھی ہے۔

10۔ شرح مفردات القانون: اس کا ایک ہی بے مثل نسخہ آیا صوفیہ کی لائبریری میں ہے، اس کی فہرست کا نمبر 318 اور نمبر 3659 ہے۔

11۔ موجز القانون: اس کتاب میں اعضاء کی تشریح اور ان کے اعمال (فلشنز) کے ماسواء ”القانون“ کہا گیا ہے، طبی صنعت کے طلباء کے لیے اس کتاب سے استفادہ نسبتاً سہل ہوا گیا، اس لیے مشرقی دنیا کے سب گوشتے اطس کتاب کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔ مشرقی دنیا کی طب پر اس کا براہ راست گہرا اثر ہے، اس کا اصل نسخہ پیرس آکسفورڈ، میونخ، فلورنس اور اسکور پال میں بھی ہے، اس کتاب کے چار اجزاء ہیں۔

شمالی ہند [موجودہ: پاکستان] یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔

محمود بن احمد بن حسن بن اسماعیل یعنی مظفر الدین ابوشاء یعنی المعروف ابن المنجاذ 812ھ-902ھ/1409-1496ء نے المنجز

شرح الموجز لابن نفیس کے نام سے اس کو ازسرنو اپنی تحقیقات اور علمی نوادر کے اضافے کے ساتھ مرتب کیا۔ بریان الدین نے، جوالع بیگ کے طبیب خاص تھے، سمرقند میں ”شرح موجز القانون لابن نفیس القرشی“ کے عنوان سے کتاب کو ترتیب دیا۔

موجز القانون کا ترکی زبان میں ترجمہ کرنے والے صاحب کا نام ہے: مصلح الدین مصطفیٰ بن شعبان السمروری الحمفی الروجی (897ھ-969ھ/1492-1562ء) اس کا ایک ترجمہ عبرانی زبان میں بھی سفر حاموجز کے عنوان سے ہوا، اس کا انگریزی ترجمہ کلکتہ میں 1828ء میں شائع ہوا تھا اور نام تھا: ”المعنی فی شرح الموجز“ پھر اس کی دوسری مرتبہ طباعت لکھنؤ میں 1906ء میں ہوئی۔

12- تفاسیر العلل واسباب الامراض: اس کا تذکرہ بروکلن نے کیا ہے۔

13- شرح الہدایہ فی الطب: ہوا یہ ابن نفیس کی یہ وہ کتاب ہے جو منطق پر ہے۔

14- شرح تشریح القانون: یہی وہ کتاب ہے، جس کی شہرت، دوسری سب کتابوں کی شہرت پر بازی لے گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پچھپھروں کے دوران خون کے بارے میں جید اکتشافات ہیں، اس میں یہ بھی لکھا ہے قلب کے غصلات کو، اس کے اندر موجود خون کی تھیلیوں ہی سے غذا ملتی ہے، اس کے جوف (اندرونی کھوکھلا حصہ) میں موجود خون سے نہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ ابن نفیس اپنی ذات غیر معمولی پر اعتماد تھا کہ وہ کتنے بلند پایہ طبیب ہیں، پھر انہوں نے عرب کی تاریخ میں روشناس ہونے والے دو بڑے طبیبوں پر بے دھڑک تنقید کی ہے یعنی جالینوس اور شیخ علی ابن سینا پر۔

ابن نفیس نے طب کے علاوہ فلسفہ، منطق، فقہ، اصول فقہ، لغت عربی، اور علم البیان پر بھی کتابیں تالیف کی ہیں جیسا کہ فدری قلعجی نے العلوم عند العرب (ص: 215) پر اس حقیقت کا ذکر کیا ہے، تنقید کے لیے اس کے تمام ادبی اسالیب اور آداب کا جاننا ضروری ہوتا ہے، اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ ابن نفیس کو عربی ادب سے لگاؤ نہ رہا ہو، مسلسل غور و فکر، تدبر اور علمی و عقلی تجربات کی روشنی میں فلسفہ، طب اور حکمت و منطق کے موضوع پر لکھنے والے ابن نفیس عبقری زمانہ کے طور پر جانے گئے

، العمری کیے مسائل الابصار کے حوالے سے ابن نفیس کی تعریف میں اس تحریر میں پہلے بھی جو لکھا جا چکا ہے وہ ابن نفیس کی فکری صلاحیتوں کا بہترین اعتراف ہے۔

معاصرین کو اعتراض تھا کہ ابن نفیس نے امام زخمشری کی صرف انموذج ہی ابن بخاس سے پڑھی ہیلیکن ابن نحاس کہتے ہیں سرزمین عاہرہ کے اندر نحو کے علم میں ابن نفیس کے کلام کے بغیر میں مطمئن اور خوش نہیں رہ سکتا۔ میں صرف اور صرف ابن نفیس کے غوی کلام میراضی ہو سکتا ہوں۔

ابن نفیس نے ابن سینا کی کتاب ”جی بن یقظان پر بھی خاصی تنقید کی ہے اور اس کے مقابلے پر جو کتاب لکھی ہے، اس کا نام انہوں نے فاضل بن ناطق رکھا ہے اور عقلی طور پر نبوت، شریعت، بعث اجسام اور کائنات کے ختم ہو جانے کے بارے میں وہی آراء بیان کی ہیں، جو تمام علماء اسلام کی متفقہ ہیں، اس کتاب کے انداز سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ ابن نفیس بلا کے ذہین، زیرک اور نابغہ روزگار تھے۔

طب کے علاوہ ابن نفیس نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی تالیف کی تھیں۔

1 شرح کتاب التنبیہ فی فروغ الشافیہ: ابواسحاق ابراہیم بن علی بنی یوسف الفیروز آبادی الشیرازی (393ھ-476ھ/1003-1083ء) کی کتاب کی شرح ہے، جسے ابن نفیس نے مکمل کیا، اس کتاب کا کوئی نسخہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔

2- شرح الہدایہ (شرح ہدایت) فلسفہ میں ابن سینا کی کتاب ”ہدایہ“ کی تشریح ہے، اس کتاب کا موضوع منطق ہے، جسے ابن نفیس نے بڑی

خوبی سے بنایا ہے۔

- 3- شرح اشارات: ابن سینا کی کتاب اشارات کی شرح ہے، اس کا موضوع بھی منطق ہی ہے اور بہت سارے منطقوں نے اس کتاب پر شرحیں بھی لکھی ہیں لیکن ابن نفیس والی شرح دستیاب نہیں ہو سکی۔
- 4- طریق الفصاحت: یہ نحو کی کتاب ہے۔
- 5- الرسالة الکاملیہ فی السیرۃ التوبہ: یہ فقہ اور دینی علوم پر کتاب ہے۔
- 6- مختصر فی علم اصول الحدیث: ابن نفیس کی یہ کتاب اصول حدیث کا احاطہ کرتی ہے جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی ترتیب میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

بروکلن نے لکھا ہے کہ یہ آخری دو کتابیں دارالکتب قاہرہ لائبریری میں موجود ہیں۔

ابن العماد الحنبلی نے جہاں اپنی کتاب شذرات الذہب میں 681ھ میں وفات پانے والی شخصیات میں ابن نفیس کا نام بھی شامل کیا ہے وہیں انہوں نے ابن نفیس کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابن نفیس دیار مصر کے شیخ الطب ہیں، ابن العماد نے مزید لکھا ہے کہ طب کی معرفت ان کیدات پر ختم ہو گئی تھی، بلا کے ذہین، روشن دماغ، زیرک اور کرشماتی اوصاف کے مالک، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، منطق، لغت عرب اور معانی میں ان سے مشورے لینا ضروری سمجھتے تھے۔

سبکی فرماتے ہیں: ”التنمیہ“ نامی کتاب کی شرح لکھی، اصول فقہ و منطق پر کتابیں تصنیف کیں، طب میں روئے زمین پر کوئی ابن نفیس کے جویا نہیں، اطباء کا کہنا ہے کہ علاج کے سلسلے میں وہ ابن سینا سے زیادہ ماہر تھے۔

اسنوی لکھتے ہیں: اپنے فن میں بلا مقابلہ، مشرق و مغرب کے امام وقت تھے، اپنے زمانے کی حیرت انگیز خوبیوں والی شخصیت تھے، فقہ اور اصول فقہ کے موضوع پر لکھنے والے، صاحب تصنیف، ابن نفیس جو جلد اور بیان میں اور عربی زبان میں اچھے مصنف تھے، ان کے اساتذہ کئی شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

قاہرہ کے مدرسہ مشرور یہ میں ابن نفیس کو تدریس کے فرائض سونپے گئے، وہاں پہلے ہی مرحلے میں انہوں نے سہو کے باب میں بہترین شرح بیان کی، ابن نفیس، شافعی تھے، چنانچہ تاج الدین السبکی نے ان کا ذکر ”طبقات الشافعیہ کبریٰ“ میں بڑے بڑے شافعی فقہاء و علماء کی فہرست میں ان کے نام کو بھی شامل کیا ہے۔

مذہب شافعی پر کتابیں مرتب کرنے والے علماء نے بھی ابن نفیس کے بارے میں کچھ معلومات تحریر کی ہیں چنانچہ تاج الدین السبکی نے ”طبقات الشافعیہ“ میں، طاق کبریٰ زادہ نے مفتاح السعاده میں جلال الدین سیوطی نے ”حسن المحاضرہ“ میں ابن العماد حنبلی نے شذرات الذہب میں حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں، ام ذہبی نے تاریخ ذہنی میں، یامنی نے مرآة الجنان، میں اور علامہ عینی نے اپنی کتاب عقد الجمان فی تاریخ اہل الزمان میں ابن نفیس کے بارے میں بنیادی معلومات تحریر کی ہیں۔

ابن نفیس نہایت پارسا، متقی، سادہ مزاج، شریف النفس، اور حقیقت میں نفیس الطبع تھے، اتنے بڑے عالم ہو کر چاہتے تو دولت کے انبار جمع کر لیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا البتہ طبیعت میں نفاست ضرور تھی، اسی لیے کتب میں درج ہے کہ ابن نفیس نے قاہرہ میں اپنی رہائش گاہ بنوائی تو سنگ مرمر کا فرش لگوا یا یہاں تک کہ ڈیوڑھی میں بھی، کس یا در کے گھر کا فرش اس طرح دیکھا نہیں گیا۔

علمائے طب اور فہمائے اور ادباء، ابن نفیس کے گھر پر بھی ان سے ملتے تھے، علمی مذاکرات ہوتے، طبی مباحثے ہوتے دیگر اطباء و علماء کے ساتھ ساتھ رئیس الاطباء المہذب ابن ابی خلیفہ بھی آتے، مگر ابن نفیس ہر ایک کو اس کے مرتبے کے مطابق بیٹھنے کی جگہ فراہم کرتے اور مہمان نوازی

کے جملہ آداب کو ملحوظ رکھتے۔!

ابن نفیس جب علمی کام شروع کرتے تو گویا، علم کے دریا بہا دیتے، بقرط کی تالیفات کی شرحیں تیار کرتے۔ اس کے بتائے ہوئے علاج اور طریقہ علاج پر پورا اعتماد کرتے اور اس کی کتابیں اپنے شاگردوں کو سبق سبق کر پڑھاتے۔ اسی طرح ابن سینا کی ”القانون“ پر شرحیں اور ذیلی کتب لکھیں اور جالینوس کے بارے میں ان کی ذاتی رائے ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ اپنی آراء کو وضاحت سے بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور لمبی لمبی بحثیں کرتے ہیں، جن میں اتنا فائدہ نظر نہیں آتا۔

ابن نفیس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرح، جس بنات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہوں، بلا جھجک کہہ دیتے مجھے کچھ معلوم نہیں چنانچہ مسالک الابصار ہی میں لکھا ہے کہ ابوالثناء الطوسی الکایت کہتے ہیں جکہ میں نے ابن نفیس کو اپنے ہاتھ کے اندر پیدا ہو جانے والے ورم کے بارے میں بتایا تو جواب میں انہوں نے صاف گوئی سے کہہ دیا کہ مجھے اس کے لیے کوئی دوا معلوم نہیں، جو تجویز کروں اور پھر خاموش ہو گئے۔

ابن نفیس اتوار کے روز مرض الموت میں گرفتار ہوئے اور جمعہ کے روز، سحر کے وقت 21 ذی قعدہ 687ھ (17 دسمبر 1288ء) کو قاہرہ میں انتقال کر گئے۔ طیب دوست نے شراب کو بطور دوا لینے کا مشورہ دیا کہ شاید اس سے شفا ممکن ہو، ابن نفیس نے اس طبی مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور شراب لینے پر راضی نہیں ہوئے، انہوں نے یہ فرمایا کہ: ”میں ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا کہ میرے پیٹ میں ذرا سی بھی شراب نام کی کوئی چیز موجود ہو۔“

ابن نفیس نے اپنی ساری جائیداد اور تمام کتب، شفا خانہ بیمارستان المنصوری کے تمام وقف کردی تھیں۔



”معالم السنن“ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام خطابی نے چونکہ کثرت سے سفر کیے اور مختلف مقامات پر بھی رہے اس لیے آپ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ان بزرگوں میں درج ذیل نام زیادہ مشہور ہیں:

1۔ امام ابن الاعرابی، امام ذہبی نے ان کے غیر معمولی علمی مرتبے اور تقویٰ کی زبردست تعریف کی ہے۔ یہ امام خطابی کے غالباً سب سے پہلے استاد بھی تھے۔ امام خطابی ان سے بہت متاثر ہیں اور ابوالفضل التیسر اکی کے مطابق: امام خطابی نے جتنی احادیث آپ سے روایت کی ہیں اتنی کسی اور سے نہیں کیں۔ ابوبکر بن داسہ، ابوبکر الاسامعی، ابوالعباس اصم، ابوعمر والستماک، مکرم البغدادی البراز، ابوبکر بنجاد، حمزہ العقی، جعفر البغدادی، عبداللہ بن شاذان الکراچی، ابوعمر والجبری، سعید بن سلام۔

ان 13 علمائے کرام کے علاوہ ابوالطیب التمار حسین بن علی بن محمد خلف الخیام ابوصالح بخاری، ماوراء النہر کے علاقے کے ممتاز عالم دین و محدث بھی امام خطابی کے اساتذہ میں شامل ہیں۔

فقہ میں امام خطابی کو مندرجہ ذیل علماء کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا: امام قفال، ابن ابی ہریرہ۔

لغت و ادب میں ان کے اساتذہ ہیں: غلام ثعلب (وفات: 345ھ) ابومنصور محمد بن احمد بن الازہر بن طلحہ الشافعی (وفات: 370ھ) موخر الذکر سے انہوں نے ”غریب الحدیث“ کے بہت سارے حوالے دیئے ہیں۔ اسماعیل الصفار نحوی ادیب (پیدائش: 247ھ وفات: بغداد: 341ھ) نحو کے امام سند عالی کے راوی، شاعری اور ادب میں پیش پیش تھے۔

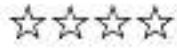
امام خطابی کی علمی حیثیت اور مرتبے کا اندازہ لگانے کے لیے اوپر بیان کردہ علماء، فقہاء، محدثین اور نحویوں کا ذکر کافی ہے۔ اس طرح آپ

کے شاگردوں کا ذکر بھی آپ کے منصب علمی کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے، جن میں ہر ایک اپنی جگہ اپنے فن میں یکتا اور اپنے وقت کے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔

امام حاکم، ابو حامد اسقرائی، ابو عبید اللہ ردی، ابو ذر اللہ ردی اور عبد الغافر بن محمد الفارسی آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔

امام خطابی نے براہ راست اپنی کتب، تصانیف و تالیفات میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ آپ کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ آپ کا ذکر فقہائے شافعیہ کے ضمن میں پایا گیا ہے اس لیے آپ شافعی ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ تاج الدین سبکی نے ابن قاضی شہبہ دمشقی، اسنوی، عبادی نے اپنی اپنی کتابوں میں طبقات الشافعیہ میں آپ کا ذکر بھی کیا ہے۔

امام نووی نے امام خطابی کو ”فقیر شافعی“ لکھا ہے۔ اس طرح شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی آپ کو شافعی فقہاء میں شمار کیا ہے۔ امام ذہبی کے مطابق: امام خطابی نے مذہب شافعی کی تعلیم ابو بکر قتال شاشی اور ابو علی ابن ابی ہریرہ اور ان جیسے دیگر شافعی علماء سے حاصل کی تھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ آپ نے بعض ایسے اقوال کو بھی ترجیح دی تھی جو بعض اوقات امام شافعی کے مسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ گویا امام خطابی، خود ہی مجتہد بھی تھے اور اپنے اختیاری جوہر کی بنا پر وہ خود کو کسی شافعی قول کے خلاف کسی دوسرے قول کی تائید کرتے وقت حق بجانب سمجھتے تھے۔



امام ابن حزمؒ

مفسر، حافظ حدیث، فقیہ مؤرخ، ادیب، علم کلام کے ماہر اور اعلیٰ منتظم

نیکوں اور سعادتوں سے بھرنا ماہ رمضان المبارک رخصت ہونے کو تھا۔ قرطبہ کے شہری اس ماہ مقدس کے آخری روزے کی سحری کرنے کے بعد نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اگلے دن عید الفطر کا پر مسرت دن تھا۔ آفتاب طلوع ہونے والا تھا اور افق پر پھیلی ہوئی روشنی اس کی آمد کا پتا دیتی تھی۔ ایسے میں قرطبہ کے ایک گھرانے میں بھی ایک آفتاب طلوع ہوا۔ اس آفتاب کی ضیا بارکروں نے کچھ ہی عرصے بعد سرزمین اندلس میں اجالا کر دیا۔ علم و عرفان کے اس آفتاب کو دنیا امام ابن حزم کے نام سے جانتی ہے۔ آپ ایک اعلیٰ مفسر، حافظ حدیث، فقیہ مؤرخ، ادیب، علم کلام کے ماہر اور اچھے منتظم تھے۔ آپ کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ آپ کے آفتاب عظمت کی روپہلی کرنوں کی طرح آج بھی جگمگا رہا ہے۔ امام ابن حزم کا پورا نام ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم ہے۔

آپ 30 رمضان المبارک 384ھ (7 نومبر 994ء) کو قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا، وہ اندلس کے سیاسی اضطراب کا زمانہ تھا۔ المصعین 407ھ/1016ء کے بعد سرزمین اندلس امویوں اور علویوں کے درمیان میدان جنگ بنی رہی، لیکن درحقیقت، ابن حزم کا زمانہ، اندلس کا عظیم علم و عرفان تھا اموی امراء اندلس میں پناہ لے رہے تھے اور ان کی مجالس میں علماء اور فضلاء کو بہت عزت دی جاتی تھی۔

امام ابن حزمؒ کی پرورش بہت ناز و نعم سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ذہانت سے نوازا تھا۔ ذہن روشن اور تیز تھا۔ اپنی ان ہی خداداد خوبیوں کی وجہ سے امام ابن حزمؒ نے نہایت توجہ اور محنت سے علم حاصل کیا، ان کی زندگی کے ابتدائی سال خواتین ہی کے درمیان گزرے۔ چنانچہ امام ابن حزمؒ خود فرماتے ہیں: ”میں نے خواتین کا اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے، مجھے ان کی طبیعت کی خاص خاص باتیں اچھی طرح معلوم ہیں۔ میرے علاوہ کوئی دوسرا ان باتوں کو نہیں جانتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے عورتوں ہی کی گود میں پرورش پائی ہے۔ ان ہی کے ہاتھوں پلا بڑھا ہوں۔ جوان ہو جانے تک میں نے کبھی مردوں کی مجلس میں شرکت نہیں کی یہاں تک کہ میری اچھی خاصی مسیں بھیگ آئیں۔ خواتین ہی نے مجھے قرآن پاک کی تعلیم دی اور انہی نے مجھے عربی کے بے شمار اشعار روایت کر کے سنائے۔ حتیٰ کہ مجھے لکھنا بھی خواتین ہی نے سکھایا اور خوشخطی بھی میں نے ان ہی سے سیکھی ہے۔“

امام ابن حزمؒ کو لڑکپن کی عمر تک خواتین تک محدود رکھنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ امام ابن حزمؒ کے والد گرام کو اپنے فرزند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ انہوں نے خود، ان کے گرد مردوں اور خواتین کا ایک حصار قائم کر رکھا تھا۔ اس لیے ابتدا ہی سے جوانی تک آپؒ محبت اور یگانگت کے ماحول میں پلے بڑھے۔ اسی وجہ سے یورپی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی امام ابن حزمؒ کے اندر جوانوں کی عام اغراض کیفیت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک امام ابن حزمؒ نے قرآن، حدیث، فقہ، شعر اور لغت عرب کے سوا کچھ اور سنا ہی نہیں تھا۔

امام ابن حزمؒ کی تعلیم مسجد الجامع اور مسجد القمری کے علاوہ رصافہ کی مسجد کے علمی حلقوں میں مکمل ہوئی۔

امام ابن حزمؒ اپنے زمانے کے دیگر طلباء کی طرح علمی کی تلاش میں قریب قریب اور شہر شہر گھومنا شروع کر دیا۔ اسپین (اندلس) کے کونے کونے

میں ہر عالم سے مل کر ابن حزمؒ نے علم کے موتی اپنے دامن میں بھر لیے۔ قرطبہ کے مشرق سے مغرب تک اور قرطبہ سے مرہ تک علم کی تلاش میں انہوں نے یا پیادہ سفر کیے۔

امام ابن حزمؒ کو اپنی زندگی میں تین مرتبہ عہدہ وزارت ملا۔ ایک بار تو ان کو اپنے دوست عبدالرحمن المتظہر کا رمضان المبارک 412ھ (دسمبر 1021ء) میں وزیر بننا پڑا۔ آپ اس منصب پر تقریباً ڈیڑھ ماہ فائز رہے۔ المتظہر کے قتل ہو جانے کے بعد ابن حزمؒ کو قیدی بنالیا گیا۔ بعد میں ابن حزمؒ کو رہا کر دیا گیا۔ دوسری مرتبہ ابن حزمؒ کو ہشام کے زمانے میں 418ھ تا 422ھ (1027ء تا 1031ء) وزارت کا عہدہ ملا۔ تیسری بار ابن حزمؒ نے بلنسیہ میں مرتضیٰ کے لیے بطور وزیر کام کیا۔

امام ابن حزمؒ کو اپنی زندگی میں مشکلات کا سامنا بھی رہا۔ ہر حق گو کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔

امام ابن حزمؒ کو آزمایا گیا۔ ابو محمد ابن حزمؒ کو پورے خاندان سمیت اپنے نئے گھروں کو چھوڑ کر قرطبہ کے مشرقی جانب سے قرطبہ کے مغربی حصے میں موجود پرانے گھروں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ امیر المومنین محمد المہدی کے زمانے کی بات ہے اور یہ زمانہ تھا 399ھ (1008ء) کا۔ ابن حزمؒ کے اپنے قول کے مطابق یہ جلاوطنی محمد المہدی کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے تیسرے ہی روز عمل میں آگئی تھی۔ چنانچہ جب تک مہدی زندہ رہے، انہوں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ جمادی الآخر 399ھ میں جب ان کا انتقال ہو گیا تو وہ (امام ابن حزمؒ) بھی منتقل ہو کر واپس اپنے نئے گھروں میں آ گئے۔ مہدی کا انتقال جمادی الآخری 399ھ (فروری 1009ء) میں ہوا تھا۔

دوسری بار ابن حزمؒ کو اس وقت جلاوطن کیا گیا، جب ہشام الغنم بالله کو 422ھ (1031ء) میں خلافت سے ہٹا دیا گیا۔ 404ھ میں جب بربری فوج غالب آئی تو ابن حزمؒ کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بار ابن حزمؒ یکم محرم 404ھ کو قرطبہ سے نکالے گئے۔ اب وہ المرینہ میں مقیم ہو گئے۔ پھر ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ امویوں کی حمایت کر رہے ہیں، اس لیے المرینہ کے والی خیران العامری نے ابن حزمؒ اور ان کے دوست محمد بن اسحاق کو چند ماہ قید میں رکھ کر جلاوطن کر دیا۔ اب یہ دونوں دوست حض القصر پہنچے، جہاں کے والی ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے لیکن جب عبدالرحمن الرابع کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا تو ابن حزمؒ بلنسیہ چلے گئے، پھر انہیں عبدالرحمن الرابع کی فوج میں شامل ہو کر غرناطہ کے محاذ پر لڑنے کا موقع بھی ملا۔ یورپی تہذیب و تمدن اور وہاں کے غیر اخلاقی ماحول کے علاوہ وہاں مختلف تہذیبوں، مذاہب، خیالات و نظریات اور رویوں کے علمبردار انسانوں کے معاشرے میں مرہ کر امام ابن حزمؒ نے، جس زیر کی اور دانائی کے ساتھ نہ صرف خود کو سنبھالے رکھا، بلکہ وہ دین اسلام کو بھی فروغ دیتے رہے اور علم دین کی خدمت برابر کرتے رہے۔ علماء آپ کے عزم و ثبات اور دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

امیر ابو نصر بن ماکونی لکھتے ہیں کہ: ”امام ابن حزمؒ فقیہ فاضل، اور حافظ حدیث تھے۔ حدیث کے موضوع پر تصنیف کرنے والے عالم تھے۔ انہوں نے اندلس کے کثیر علماء سے روایتیں بیان کی ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور انہوں نے کئی رسائل بھی تحریر کیے ہیں۔ امام حمیدی نے کم و بیش ان ہی اوصاف کا تذکرہ کیا ہے اور وزارت چھوڑنے کے بعد دنیا سے بالکل بے رغبتی کا بیان بھی دیا ہے جبکہ امام حافظ ذہبی کا تو کہنا ہے کہ ”امام حزمؒ تنہا، علم کا سمندر ہیں، جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ آپ مختلف الفوم علوم اور معارف کو جاننے والے ہیں۔ ابن حزمؒ اپنے زمانے کے فقیہ، حافظ، متکلم، ادیب وزیر، مسلک ظاہری کے پابند اور مبلغ اور صاحب تصنیف عالم ہیں، کسی چیز کو محفوظ کرنے کے دو ہی طریقے ہیں: ”شاگردوں کو سکھا دیا جائے یا کتابوں میں تحریر کر دیا جائے چنانچہ امام ابن حزمؒ کے لائق اور فرائد رمانہ دار شاگردوں نے اپنے استاد مکرم کا علمی ورثہ تحریری صورت میں محفوظ کر لیا۔ جو انہوں نے اپنے شاگردوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس میں بہت ساری نادر معلومات اور علمی نوادر کو بھی اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا گیا۔

امام ابن حزمؒ کی تصانیف کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کے فرزند رافع ابو الفضل کے بیان کے مطابق ان کے والد ابن حزمؒ کے ہاتھ

کی تحریروں کی تعداد 400 جلدوں پر مشتمل ہے۔ جن کے صفحات کی تعداد 80 ہزار ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے 76 کتب کنوائی ہیں جبکہ ڈاکٹر احمد بن ناصر الحد نے 136 کتب کا ذکر کیا ہے۔ علامہ ابو عبد الرحمن بن عقیلی الظاہریؒ فرماتے ہیں کہ صرف وہ کتب جو ہم تک نہیں پہنچیں، ان کی تعداد 83 ہے۔

امام ابن حزمؒ نے شروع میں رسم و رواج کے مطابق ایک متعین فقہی مکتب فکر سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت پورے اسپین پر مالکی فقہ کا اثر و نفوذ تھا چنانچہ دوسرے طلباء کی طرح امام ابن حزمؒ نے بھی اپنی تعلیم کا آغاز فقہ مالکی سے کیا۔ حکومتِ وقت کا مسلک بھی یہی تھا۔ اس کے بعد ابن حزمؒ نے شافعی مسلک کی طرف توجہ دی۔ علامہ عبد الواحد المراسشیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابن حزمؒ شافعی مسلک کے تھے۔ وہ ایک زمانے تک شافعی ہی رہے۔ پھر امام ابن حزمؒ نے ظاہری مسلک اختیار کر لیا۔ آپ قرآن و سنت کے ظاہری معنوں کے قائل تھے۔

امام ابن حزمؒ کی قوت حافظہ بہت مضبوط تھی، بلا کے حاضر دماغ تھے۔ ان کی فکری گہرائی اور بحر حقائق میں ان کی غواضی کا اندازہ ان کی کتابوں کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ آپ انتہائی صابر، بہادر، نڈر، ثابت قدم، مخلص اور بے باک حق گو تھے۔ وہ اپنی عزت نفس کے بارے میں بہت حساس تھے، لیکن خود پسندی اور تکبر سے یکسر پاک تھے۔!

امام ابن حزمؒ مجموعہ صفات تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ تراشا ہوا ہیرا کہہ لیجیے، جو ہر پہلو سے برابر چمک دمک دیتا ہے۔ آپ ایک مفسر، اچھے محدث، دانا فقیہ اور منطقی بھی تھے اور اعلیٰ درجے کے شاعر بھی۔! جس موضوع پر گفتگو کرتے، فکر و نظر کی جولانیاں، دیکھنے کے قابل ہوتیں۔ متکلم (علم کلام) کے ماہر، اصول فروع کے امامِ نکتہ سنخ، بہترین شاعر، نغز گو، امانت دار اور سچے مورخ بہترین تربیت یافتہ، شفیق مربی۔۔۔۔۔ گویا بہترین صفات انسانی کا مجموعہ تھے۔ اس لیے ہر قاری آپ کی کتب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہر طالب علم آپ کی شاگردی پر فخر کرتا تھا۔ اگر آج بھی کوئی راہ حق پر چلنا چاہے تو امام ابن حزمؒ ایک بہترین قائد و رہنما ہیں۔ ان کے معاصر اور ان سے معاصرانہ چشمک رکھنے والے علماء بھی ان کے بارے میں انصاف کی بات کرتے ہیں اور ان کے خلاف خواہ مخواہ کوئی غیر مناسب بات نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی اچھائیوں ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

استاد ابراہیم الکتائیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابن حزمؒ کا تفسیری اسلوب بالکل اچھوتا اور جداگانہ تھا۔ قرآن مجید کی آیت (سورہ یونس: 94) کے بارے میں امام ابن حزمؒ نے ایک مستقل رسالہ تحریر کیا ہے۔ اسی طرح سورہ یوسف علیہ السلام کی آیت 110 کے بارے میں تفسیر و تشریح پر باقاعدہ ایک طویل مقالہ موجود ہے۔ امام ابن حزمؒ نے بلاغتِ قرآن کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ ”القرءات“ کے نام سے بھی ان کا ایک رسالہ موجود ہے، جو قابل مطالعہ ہے۔

امام ابن حزمؒ اپنے وقت کے اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ حدیث کے حافظ اور محافظ تھے، حدیث کے موضوع پر آپ کی تصانیف بھی ہیں۔ ابن القطانؒ فرماتے ہیں: ”فقہ اور حدیث میں امام ابن حزمؒ کو نمایاں دسترس حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتابوں کا ہر قاری، و عالم آپ کو مفسر، کبیر اور اعلیٰ درجے کے ناقد ہیں۔ امام ابن حزمؒ کے بارے میں احادیثِ قدسیہ کے حوالے سے ایک بنیادی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ آپ حدیث روایت کرنے میں اسمِ بامسمیٰ تھے۔ یعنی حد درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایسی مثالیں محدثین کے حوالے سے کم ہی ملیں گی۔

امام ابن حزمؒ علم حدیث کے بارے میں ایک خاص انتہائی محتاط نقطہ نظر رکھتے تھے۔ ان کے نظریات اور طریقہ تحقیق پر گہری نظر رکھنے والے اہل علم کے مطابق امام ابن حزمؒ کا درجہ علم حدیث میں ”مجتہد“ کا ہے یعنی آپ کو ”مجتہد فی الحدیث“ کہا گیا ہے۔ امام ابن حزمؒ کے مرتبہ و مقام کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ امام ابن ہمتیہؒ جیسے دانش مند، ان کی آراء سے متاثر ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ جس گہری نظر اور جس زاویہ نگاہ سے امام ابن حزمؒ نے کیا ہے، اس طرح کسی اور نے نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تحقیق اور

چھان بین کے دوران ایسی ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے، جنہیں علماء اور نوادیت ابن حزمؒ کا نام دیتے ہیں۔ امام ابن حزمؒ نے تاریخ پر جو رسائل و کتب تحریر کی ہیں ان کی تعداد دس عدد ہے، ان میں سب سے اہم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آپؐ کا بے حد بے بہا کام ہے اور درحقیقت سب سے اہم اور باعث اجر و ثواب بھی یہی ہے۔ ان کا تاریخ پر تحقیق کا کام اس قدر وسیع اور اتنے زاویوں پر پھیلا ہوا ہے کہ چند سطروں میں ان کا ذکر ممکن نہیں۔ انہوں نے تاریخی مواد کو بالکل نئے عنوانات کے تحت اکٹھا کیا ہے اور اس کو ملکوں، سین (برسوں) شہروں اور طبقوں کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ تاریخ نویسی میں امام ابن حزمؒ کا اپنا ایک الگ اسلوب ہے۔ ان کا نیز دیکھ صحیح ترین تاریخ ملت اسلامیہ کی تاریخ ہے۔ آپؐ کے مطابق بن اسرائیل کی تاریخ کا صرف وہ حصہ صحیح ہے جو، ان کے سرزمین شام میں داخلے کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور یہاں سے نکل جانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کی تاریخی تاریخ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آپؐ نے مختلف علاقوں اور زمانوں کی تاریخ پر الگ الگ بھرپور تبصرے فرمائے ہیں۔

امام ابن حزمؒ کے بارے میں ابن خاقان فرماتے ہیں کہ امام ابن حزمؒ نے شعر بھی لکھے ہیں اور شعر گوئی میں کوئی ان کے زمانے میں، ان جیسا نہیں تھا۔ امام ابن حزمؒ نے شعروں میں مختلف خیالات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اظہار خیال و جذبات میں انہوں نے جو تجربات کیے ہیں وہ نہایت کامیاب تجربے ہیں۔

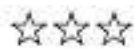
امام ابن حزمؒ کی شاعری میں صوفیانہ تصورات اور اشارات بھی پائے جاتے ہیں اور حکمت و زہد کے موضوعات بھی اور مختلف انسانی کیفیات کا ردِ عمل بھی ملتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری نہایت صاف اور سادہ لیکن حکمت و دانش سے بھرپور ہے۔ آپؐ کی شاعری کا کچھ حصہ ہم تک ایک دیوان کی شکل میں پہنچا ہے۔

امام ابن حزمؒ بحیثیت ایک مربی کے فرماتے ہیں: ”میں نے یہ دیکھنا چاہا کہ انسانوں میں کیا قدر مشترک ہے؟ تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ہے ”ازالہ غم“۔ پھر آپؐ فرماتے ہیں کہ ازالہ غم کے لیے مؤثر ترین علاج یہ ہے کہ آخرت کے لیے نیک اعمال کے ساتھ تیاری کی جائے اور یہ تیاری اللہ پاک کی ذاتِ بلند کی طرف بھرپور توجہ کے ساتھ ہو۔

امام ابن حزمؒ نے دوسرا دیان و مذاہب کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور آپؐ ان کی خامیوں سے بخوبی واقف تھے، اس لیے ان سے محفوظ رہے۔ آپؐ کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپؐ نے نہایت احتیاط سے تحقیق کر کے اپنی ایک کتاب میں اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کب اور کہاں کہاں توریت اور انجیل میں تبدیلیاں کی ہیں اور اب تورات و انجیل کے جو نسخے ان کے ہاتھ میں ہیں، ان میں اس حد تک تضاد اور تناقص پایا جاتا ہے کہ کسی تاویل کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ابن خلکانؒ فرماتے ہیں کہ ابن حزمؒ سے پہلے کسی مؤرخ نے یہود و نصاریٰ کے بارے میں اس طرح کی معلومات قلم بند نہیں کی ہیں۔

الفضل مبین، اہل الارادۃ و الملل و اہل حزمؒ کی مشہور ترین کتاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم فقیہ فرماتے ہیں کہ یورپی مؤرخین نے علم الادیان کے بانی کا لقب دے کر امام ابن حزمؒ کی عظمت کا صحیح اعتراف کیا ہے اور یہ فخر صرف اور صرف ایک مسلمان کو حاصل ہے، جس نے سب سے پہلے یورپ کی تاریخ پر قلم اٹھایا۔ وہ مسلمان ہیں یہی: ”ابو محمد علی بن حزمؒ“۔

ابن حزمؒ کا انتقال اپنے گاؤں منٹ شہم میں، 28 شعبان 456ھ (15 اگست 1064ء) کو ہوا۔



حافظ علی بن المدینی

عالم، محدث اور حضرت امام بخاریؒ کے استاد مکرم

”مجھے معلوم ہو گیا ہے!“

ماں نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا تین سال بعد گھر واپس آیا تھا۔ اس تین برس کے عرصے میں اس نے یمن جا کر دینی علوم کی تربیت حاصل کی۔ وہ اکیلا ہی سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس پورے عرصے میں اپنی ماں، باپ، عزیزوں اور دوستوں سے اس کا رابطہ ٹوٹا رہا۔ اب جب کہ وہ علم دین کے موتیوں سے اپنا دامن بھر کر واپس آیا تھا تو اس کی والدہ اس سے کہہ رہی تھیں:

”مجھے معلوم ہو گیا ہے، تمہارا سچا دوست کون ہے اور دشمن کون۔“ بیٹے نے حیران ہو کر پوچھا:

”پیاری ماں، آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میرا دوست کون ہے اور دشمن کو؟“ ماں نے جواب دیا:

”دیکھو بیٹا، تمہارے جانے کے بعد تمہارے کچھ دوست آ کر تمہارے بارے میں پوچھتے تھے اور مجھے تسلی دیتے تھے کہ مجھے بیٹے کی جدائی کا غم برداشت کرنا چاہیے کیونکہ وہ دین کا علم حاصل کرنے گیا ہے۔ جب وہ عالم بن کر واپس آئے گا تو آپ کو بہت خوشی ہوگی۔ میں سمجھ گئی کہ یہ تمہارے سچے دوست ہیں، تمہارے کچھ دوست ایسے بھی تھے جو جب کبھی تمہارے بارے میں مجھ سے پوچھتے، وہ یہ کہہ کر میرا غم بڑھا دیتے کہ آپ اسے پیغام بھجوائیں کہ وہ واپس آ جائے۔ اس پر سختی کیجیے کہ وہ اس طرح آپ کو چھوڑ کر نہ جایا کرے، میں نے جان لیا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں۔“

یہ عظیم خاتون تھیں، مشہور زمانہ محدث، امام بخاریؒ کے استاد مکرم اور علم حدیث کے بہت بڑے ماہر حافظ علی بن المدینی کی والدہ محترمہ، جنہوں نے، اپنے بیٹے کی ابتدا ہی سے اعلیٰ تربیت کی۔ اسے حصول علم کے لیے سیکڑوں میل دور بھیجا۔ بیٹے سے جدائی برداشت کر لی لیکن اسے دینی علوم کی بہترین تربیت دلوائی، جس کے نتیجے میں حافظ علی بن المدینی، علم حدیث کے بلند مرتبہ ماہر بن کر ابھرے۔ ان ہی کی شخصیت کا ہم زیر نظر مضمون میں جائزہ لے رہے ہیں۔

علی بن المدینی کا اصل نام ہے: علی بن عبد اللہ بن جعفر بن یحییٰ بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن چونکہ آپ کا اصل رشتہ مدینہ منورہ سے تھا، اس لیے آپ ”ابن المدینی“ کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ چنانچہ جب بھی ”ابن المدینی“ کا نام لیا جاتا ہے تو ذہن میں از خود، علی ابن المدینی کا نام ماہر آتا ہے۔

آپ کی کنیت ابوالحسن تھی۔ امام احمد ابن حنبلؒ، آپ کا اتنا احترام کرتے تھے، انہیں نام سے پکارنے کی بجائے ”ابوالحسن“ کی کنیت سے خطاب کرتے تھے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ میں نے خود کسی کو علی ابن المدینی کا نام پکارنے نہیں سنا، سبھی ان کو ”ابوالحسن“ ہی کہتے تھے۔

علی بن المدینی 161ھ / 777ء میں پیدا ہوئے۔ ابن حبان نے ”ثقات“ میں لکھا ہے کہ آپ ربیع الاول کے مہینے میں 162ھ / 778ء میں پیدا ہوئے تھے۔

علی بن المدینی جس زمانے میں پیدا ہوئے، اس وقت بلاد اسلامیہ کے ایک ہی متفقہ حکمران تھے، جو خلیفہ کہلاتے تھے۔ اسلامی حکومت مشرق میں ہندوستان اور چین تک اور مغرب میں مراکش تک پھیل چکی تھی۔ علی بن المدینی کے زمانے میں، یکے بعد دیگرے سات عباسی خلفاء مسند

خلافت پر متمکن ہوئے، جن کے نام بالترتیب یہ ہیں: مہدی (158ھ/774ء تا 169ھ/785ء)، ہادی (169ھ/785ء تا 170ھ/786ء)، ہارون الرشید (170ھ/786ء تا 193ھ/808ء)، امین (193ھ/808ء تا 198ھ/813ء)، مامون (198ھ/813ء تا 218ھ/833ء) المعتمد (218ھ/833ء تا 227ھ/841ء) الواثق (227ھ/841ء تا 232ھ/848ء)۔

علی بن المدینی جب پیدا ہوئے، اس وقت مہدی، خلیفہ تھے، جن کا عہد، امن اور رفاه عامہ کا عہد سمجھا جاتا ہے۔ انہی کے زمانے میں اسلام کے خلاف اٹھنے والی الحاد پسندوں کی تحریکوں کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ مہدی کے بعد ان کے بیٹے موسیٰ الہادی خلیفہ بنے تو انہوں نے بھی یہ مشن جاری رکھا۔ ہارون الرشید کا زمانہ بھی علمی، ادبی، مادی اور ثقافتی ترقی کا زمانہ تھا۔ ان کے عہد میں بھی مختلف مخالفانہ تحریکیں اٹھتی رہیں تاہم ان کو دبایا جاتا رہا۔

صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین کے دور کے اختتام کے بعد ایک ایسے دور کا آغاز ہوا، جس میں مسلمانوں کی اجتماعی، اخلاقی، سیاسی، فکری، دینی، عمرانی اور معاشی زندگی پر روم اور فارس کا رنگ نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ زبان اور آداب میں بھی رومی اور ایرانی اثرات غالب آتے رہے۔ خلیفہ کا دار الخلافہ، بغداد کو بنایا گیا اور بغداد کی ترقی اور تمدن کا یہ عالم تھا کہ اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔

بعض فرقوں اور گروہوں نے مثلاً خارجیوں، رافضیوں، قدریہ، اور معتزلہ وغیرہ نے دینی اختلافات کا سہارا لے کر سیاسی اختلافات کو پھیلانے کی کوششیں کیں لیکن دوسری طرف صالح علماء، دین و دنیا کے تمام شعبوں میں اسلام کی خدمات انجام دیتے رہے۔ دوسرے علوم فلسفہ اور منطق نے اسی دور میں ترقی پائی۔ خلاف اسلام تحریکوں اور نظریات کے خلاف جہاد میں بھی ان بلند مرتبہ بزرگوں کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔ چنانچہ علم حدیث اور اصول تفسیر کی روشنی میں قرآن و حدیث کے علم کو عام کرنے والے علمائے کرام میں شعبہ بن الحجاج، ثوری، اعمش، یحییٰ بن سعید القطان، سفیان بن عیینہ، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم، اسحاق بن راہویہ، امام ابوداؤد، ابن کثیر، محمد بن اسحاق اور ان کے علاوہ ابوحنیفہ دینوری، ابن قتیبہ اور اصمعی وغیرہ نے علمی خدمات انجام دیں۔ علی بن المدینی کا نام بھی ایسے ہی علمائے حق کی فہرست میں آتا ہے۔

علی بن المدینی کی تعلیم و تربیت انتہائی علمی و دینی ماحول میں ہوئی۔ خود ان کے والد محترم عبداللہ بن جعفر بن نجیح السعدی، مشہور محدث تھے اور بصرہ میں سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کے نامور علمائے حدیث سے احادیث روایت کی ہیں، جن میں ابراہیم بن اسماعیل بن مجمع، ثور بن زید دہلی، جعفر بن محمد الصادق، زید بن اسلم، عبداللہ بن دینار، مالک بن انس، موسیٰ بن عقبہ، مسلم بن ابومریم، نافع بن ابوعامر الاسجی، وغیرہ شامل ہیں۔ خود حافظ علی ابن المدینی سے مزید جن حضرات نے احادیث روایت کی ہیں، ان میں سب سے پہلا نام خود ان کے فرزند علی بن المدینی کا آتا ہے۔ ان کے علاوہ ابوداؤد الطیاسی قتیبہ بن سعید اور مزید آٹھ حضرات کے نام بیان کیے جاتے ہیں۔ حافظ علی ابن المدینی کے والد عبداللہ بن جعفر کا انتقال 178ھ/794ء میں ہوا۔ علی بن المدینی کی والدہ محترمہ نہایت عقل مند، زیرک اور بے حد مستحکم ایمان والی، صالحہ خاتون تھیں۔ اپنے فرزند علی بن المدینی کی تعلیم و تربیت کے لیے انہوں نے بہت قربانیاں دیں۔ علی بن المدینی کے تین بیٹوں نے بھی احادیث کی روایت کی ہے۔ ان کے پوتے بھی احادیث کی روایت کرتے تھے۔

علی بن المدینی نے اپنی تعلیم کا آغاز، اپنے والد عبداللہ بن جعفر سے کیا۔ ان کے علاوہ انہوں نے جعفر بن سلیمان سے بھی علم حاصل کیا۔ دونوں بزرگوں کا انتقال ایسے وقت میں ہوا، جب علی بن المدینی کی عمر سترہ برس تھی۔ علی بن المدینی، حماد بن زید، (المتوفی: 179ھ/795ء) سے بھی روایت کرتے تھے۔

علی بن المدینی کی قوت حافظہ بہت اچھی تھی۔ موصوف کی رائے ہر معاملے میں ایک علمی نکتہ بن جاتی تھی۔ ذیل میں ہم علی بن المدینی کی وہی خوبیاں بیان کریں گے، جن کی قدر و قیمت کا اندازہ علمحدیث کے ماہرین اور مفسرین ہی کر سکتے ہیں مثلاً علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ میں نے

اپنی ایک لاکھ احادیث کو ترک کر دیا ہے۔ ان میں سے تیس ہزار تو صرف عباد بن صہیبؓ کی تھیں۔

علی بن المدینی حدیث کے حوالے سے کس قدر اہم مقام رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان چند باتوں سے کیا جاسکتا ہے کہ آپؓ جو بات سنتے، لکھ لیتے، حتیٰ کہ پہچان کے لیے ضعیف روایات بھی۔ (غسان کوئی)

آپؓ ہر بات کو عقل کے پیمانے پر، پرکھتے تھے اور پھر سوال کر کر، کے ہر بات کی تہ تک پہنچتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؓ قطعی نہیں جھجکتے تھے کہ جس سے سوال کر رہے ہیں، وہ عمر اور رتبے میں آپؓ سے بڑا ہے یا چھوٹا۔ درحقیقت تحقیق کا طریقہ ہی یہی ہے۔ اس کے علاوہ آپؓ مشہور احادیث کو تو لکھتے ہی تھے، لیکن آپؓ کے نزدیک عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ غیر مشہور احادیث کو بھی لکھ لیا جائے۔ اس سے بہتر راستے کھلتے ہیں۔ آپؓ کے نزدیک جو بات اہم ہوتی، اس پر آپؓ کوئی علامت بنا دیتے۔ چنانچہ آپؓ کا خود کہنا ہے کہ حدیث کو محفوظ کرنا، ایسا مشکل کام ہے کہ اس پر قابو پاتے پاتے، آدمی خود ہار مان جاتا ہے لہذا ”میرا خیال ہے“ اور ”میرا گمان ہے“ جیسے الفاظ کا سہارا لے کر اس مشکل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

آپؓ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب آپؓ مطالعہ کرنے بیٹھتے تو صبح سے آدھی رات کا وقت ہو جاتا، پھر بھی آپؓ کا دل نہیں بھرتا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپؓ نے خود فرمایا: ”کبھی ایسا ہوا ہے کہ مجھے رات کے وقت کوئی حدیث یاد آ جاتی ہے تو میں خادمہ کو حکم دیتا ہوں کہ چراغ جلادو، تاکہ میں اس حدیث کو دوبارہ پڑھ کر اس پر مزید غور و فکر کر سکوں۔“ امام علی بن المدینی اپنے علم دوست ساتھیوں اور مشائخ سے علمی مذاکرات میں حصہ لیا کرتے تھے، تاکہ حدیث کے علم میں زیادہ سے زیادہ پہنچتے ہو جائیں۔ چنانچہ آپؓ اکثر اپنے ہم عصر علماء کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیتے تھے۔ اس طرح بہت ساری چیزیں، آپؓ کو یاد ہو جاتی تھیں اور ان مذاکرات میں حصہ لینے والے ہر فرد کو ان سے فائدہ پہنچتا تھا۔ یحییٰ بن سعید القطانؒ فرماتے ہیں کہ علمی مذاکرات میں ہم نے ہمیشہ ہی علی بن المدینی سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔

علی بن المدینیؒ حدیث روایت کرتے وقت راوی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس کے بارے میں جب تک ان کو اچھی طرح معلوم نہ ہو جاتا، اس سے روایت نہیں لیتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ علی بن المدینیؒ کی علمی بلندی و عظمت کا سب علماء کرام اعتراف کرتے تھے۔ علی بن المدینیؒ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک طالب علم کی طرح بصرہ سے کوفہ، بغداد، یمن، حجاز، (مکہ و مدینہ) واسطہ، رے اور سامراء تک علم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے لیکن جس محفل میں یہ طالب علم کی حیثیت سے بیٹھتے، وہاں ان کا مقام، استاد کا سا ہو جاتا اور آپؓ ہر محفل پر چھا جاتے۔ آپؓ کے ساتھ ہر علمی سفر میں آپؓ کے دوست یحییٰ بن معینؒ بھی ہوتے۔ علی بن المدینیؒ اور یحییٰ بن معینؒ اپنے وقت کے بہترین دوست، عالم، اور محدث تھے۔ یہاں تک کہ لوگ اپنی روایات کو قابل یقین بنانے کے لیے بہت ساری احادیث ان ہی دونوں علماء کرام کے حوالے سے بیان کرتے۔ ایک موقع پر علی بن المدینیؒ اور یحییٰ بن معینؒ نے ایک علمی محفل میں جھوٹے راوی اور قصاص کی ایسی چوری پکڑی کہ اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ان دونوں بزرگوں کے منہ پر کہہ دیا کہ تم میں نہ کوئی علی بن المدینیؒ ہے نہ یحییٰ بن معینؒ۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہوا ہے۔ تب سے ان دونوں علم دوست ساتھیوں نے احادیث کے گہرے تفصیلی جائزے اور تحقیق (جرح و تعدیل) کا خاص اہتمام شروع کر دیا۔

جعفر بن درستویہ کہتے ہیں کہ صرف ایک موقع پر علی بن المدینیؒ سے حدیث روایت کرنے میں غلطی ہوئی، اس کے بعد آپؓ سات سال تک احادیث زبانی روایت کرتے رہے اور کبھی کسی ایک بھی حدیث کی روایت میں غلطی نہیں کی، یہ آپؓ کو غیر معمولی خداداد صفت عطا فرمائی گئی تھی۔ یہی وجہ تھیں کہ ہر مجلس علم میں آخری رائے علی بن المدینیؒ ہی کی تسلیم کی جاتی تھی۔ انہیں گویا علم حدیث میں سند کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ محمد بن اسحاق السراجؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو یحییٰ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علی بن المدینیؒ جب بغداد آئے، حلقہ اہل علم و فضل کی صدارت کے اہل ٹھہرے۔ احمد، یحییٰ، المعطی اور دیگر علماء باہم مناظرہ کرتے تو آخری فیصلہ علی بن المدینیؒ ہی کا مانا جاتا۔

علی بن المدینی کو جلیل القدر علماء، مشائخ اور محدثین کی صحبت حاصل رہی ہے۔ یہ بجائے خود ان کے علمی مقام کے تعین کے لیے کافی ہے، یہ فہرست خود طویل ہے۔ علی بن المدینی کی علمی بلندی کا اندازہ، اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے اور امام احمد بن حنبل، ان کے دونوں صاحبزادے اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدثین، علی بن المدینی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں: ”علی بن المدینی اپنے ہم عصروں میں سے سب سے زیادہ عالم تھے، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ وہ اپنے زمانے کے ہر عمر کے کسی بھی عالم سے بڑھ کر تھے۔“

علی بن المدینی نے علم حدیث میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بہت سفر کیے اور آخر کار ان کو ان علوم میں مہارت حاصل ہو گئی: 1۔ علم العلل (حدیثوں کی درجہ بندی کے اصول اور اسباب کا علم) 2۔ علم التاريخ 3۔ علم الانساب 4۔ علم الفقہ 5۔ علوم القرآن والتزیل۔ چنانچہ علماء کی ایک بڑی جماعت نے ان علوم کے حوالے سے ان کے بلند درجات کا اعتراف کیا ہے۔

علی بن المدینی کے مزاج پر ان علماء کا زیادہ اثر غالب رہا: سفیان بن عیینہ (جو حدیث میں ”امیر المؤمنین“ کے لقب سے مشہور تھے) یحییٰ بن سعید القطان، آپ صحیح گھر سے علم حدیث سیکھنے نکلتے تو عشاء بعد گھر لوٹتے تھے اور عبدالرحمن بن مہدی، انہوں نے دس سال ہی کی عمر سے علم کا حصول شروع کر دیا تھا۔

ابو عبید القاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ علم ان چار علماء پر ختم ہے: ابو بکر بن شیبہ، جو سب سے زیادہ، بے تکان روایات بیان کر لیتے تھے۔ احمد بن حنبل جو سب سے زیادہ فقیہ حدیث تھے۔ علی بن المدینی جو، ان سب میں سے علم حدیث کو زیادہ جاننے والے تھے اور یحییٰ بن معین، وہ حدیث کو سب سے زیادہ لکھنے والے تھے۔

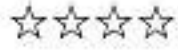
علی بن المدینی نے خود جو تصانیف کیں اور مرتب کیں، وہ زیادہ تر ناپید ہو گئی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود ایک مسند کے ضائع ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اب فن تاریخ اور علم تاریخ میں علی بن المدینی کی درج ذیل تصانیف باقی رہ گئی ہیں: 1۔ کتاب التاريخ (دس جلدیں) 2۔ کتاب الطبقات (دس جلدیں) 3۔ اخبار آل ابی العباس 4۔ کتاب الضعفاء (دس اجزاء) 5۔ کتاب قبائل العرب (دس اجزاء) 6۔ الاخوان والاخوات 7۔ شاذ السماء (تین اجزاء) علی بن المدینی کی ایک اہم کتاب ”معرفۃ المشاہد من الاسماء والکنی والاعقاب“ تھی جو، اب موجود نہیں ہے۔ علی بن المدینی کو قرآن کریم کی قرأت میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی اور مختلف قرأتوں کا بہت اچھا علم رکھتے تھے اور اپنے وقت کے مانے ہوئے قاریوں کی قرأت کی غلطیاں بیان کر دیا کرتے تھے کہ وہ ان کی اصلاح کر لیں، اس سے ان کی قرآن مجید سے گہری محبت اور قرآن کریم کے غیر معمولی علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم حدیث کے حوالے سے امام نووی فرماتے ہیں کہ ”علی بن المدینی حدیث کے امام تھے۔ اس فن میں آپ نے تقریباً دو سو (200) کتب تصنیف کی ہیں۔“

علی بن المدینی کو راویوں کے ناموں اور ان کی کنیتوں کا اچھا خاصا علم تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دوسرے علماء کی رہنمائی کے لیے باقاعدہ طور پر ایک الگ کتاب بھی لکھی، اس میں انہوں نے بتایا کہ فلاں راوی کا اصل نام یا کنیت یا لقب کیا ہے۔ اس طرح بہت سارے ہم نام، ہم کنیت اور ہم لقب افراد کو ایک دوسرے سے الگ الگ پہچاننے میں بہت مدد حاصل ہوئی۔ اسی طرح آپ نے راویوں کے حوالوں سے ان کی صفات بیان کر کے ان کی وضاحت کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے راویوں کے سن پیدائش کو بھی اہتمام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور بہت سارے واقعات کی چھان بین کر کے ان کے متعلق حقائق واضح کیے ہیں اور حدیث کے علم کے حوالے سے یہ بلاشبہ ایک بڑی خدمت ہے۔

علی بن المدینی کی روایات، حدیث کی تقریباً سبھی کتب ہی وجود ہیں۔ جن میں مسند احمد بن حنبل، طبقات محمد بن سعد، صحیح البخاری، مستند عمر الخطاب، سنن ابی داؤد، السنن، جامع ترمذی، فضائل القرآن (جعفر بن محمد الفریابی) سنن نسائی، مسند عمر بن عبدالعزیز (بافندی) الثقات (ابن

حبان) سنن بیہقی، مستدرک الحاکم، سنن دارقطنی، عمل الیوم واللیطہ (ابن السنی)

علی بن المدینی 28 ذی الحجہ 234ھ / 23 جولائی 849ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اپنے پیچھے علم کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ چھوڑ گئے، جو یقیناً ان کے لیے آخرت کا خزانہ بنے گا۔



امام ابن تیمیہؒ

تفسیر، حدیث اور فقہ کے ماہر، عظیم عالم مجتہد اور مصلح

وہ بچہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا تھا.....!

وہ شخص روزانہ اس بچے کو دیکھا کرتا تھا جو اس کے گھر کے سامنے سے گزرا کرتا تھا۔ اس نے اس بچے کی دانائی اور علمی بصیرت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اس نے سوچا کہ اس کے علم سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ اسے تبلیغ کے لیے مفید نکات مل جائیں گے اور دوسرا یہ کہ ممکن ہے یہ بچہ اس کے سوالوں سے ذہنی تغیر کا شکار ہو کر اس کے مذہب کی تقلید کرنے لگے۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد وہ اپنے گھر سے نکل کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا..... وہ بچہ اپنے مقررہ وقت پر کتب خانے جانے کے لیے آ رہا تھا۔ اس نے اس بچے کو بلایا اور چند ایک مذہبی سوال کیے بچے نے نہایت پرسکون انداز میں اس کے سوالوں کے جواب دیے اور پھر اپنے راستے پر ہولیا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا..... اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن یہی ہونے لگا وہ شخص اس بچے کو روکتا اور اس سے چند ایک علمی سوالات کرتا۔ بچہ اسے جواب دیتا اور چلا جاتا۔ کچھ عرصے کے بعد اس شخص کی ذہنی کیفیت تبدیل ہونا شروع ہوئی اب وہ اس بچے سے مذہب اسلام کے متعلق سوال کرتا جس کے نتیجے میں اس کے اندر تغیر رونما ہونا شروع ہوا اور وہ شخص جو اس بچے کو ورغلا نا چاہتا تھا خود دین برحق کی جانب راغب ہو گیا اور اسلام لے آیا۔

یہ ایک کرامت تھی اس بچے کی کہ جس کے ایمان کی مضبوطی اور دینی عقلیت سے متاثر ہو کر ایک یہودی مبلغ ایک اچھا مسلمان بن گیا۔

علم کا شوق رکھنے والا یہ بچہ چند برسوں بعد تفسیر، حدیث اور فقہ کا بہت بڑا امام بنا جسے دنیا

امام ابن تیمیہ کے نام سے جانتی ہے۔ آپ کی

ذات گرامی میں ایک عالم، مجتہد، مجاہد اور مصلح کی تمام صفات یکجا ہو گئی تھیں۔ آپ نے اپنے وسیع علم، بے پناہ، ذہانت، بے مثال حافظہ، بے بہا بصیرت اور شاندار انتظامی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں اور معاشرتی خرابیوں کے خلاف مؤثر تحریری اور عملی جہاد کیا۔

آپ کا نام احمد، لقب تقی الدین اور کنیت ابو العباس ہے، لیکن دنیا آپ کو امام ابن تیمیہ کے نام سے جانتی ہے۔ دراصل خاندان ابن تیمیہ سے تعلق رکھنے والا ہر فرد ”ابن تیمیہ“ کہلاتا تھا لیکن ابن تیمیہ کے نام سے شہرت صرف احمد تقی الدین امام ابن تیمیہ نے پائی۔

لفظ ”تیمیہ“ کے سلسلے میں متعدد روایات مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کے جد امجد محمد بن اخضر ایک سفر کے دوران یمن کی بستی ”تیاء“ سے گزرے وہاں انہیں ایک معصوم بچی نظر آئی۔ جب وہ واپس گھر پہنچے تو انہیں اپنی بچی کی ولادت کی اطلاع دی گئی۔ بچی کو دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ اس بچی اور تیاء میں نظر آنے والی بچی کی شکل میں بے حد مماثلت ہے۔ چنانچہ ان کے منہ سے بے ساختہ ”تیمیہ“ کا لفظ نکلا یعنی تیاء والی لڑکی۔ اس کے بعد خاندان کا ہر شخص ابن تیمیہ کہلانے لگا۔ ایک اور روایت کے مطابق امام ابن تیمیہ کے جد امجد کی والدہ یا دوسرے قول کے

مطابق داوی کا نام تیمیہ تھا جو بہت ہی قابل، عالم اور فاضل تھیں۔

امام ابن تیمیہ کا خاندان علمی لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ آپ کے دادا ابوالبرکات مجد الدین ابن تیمیہ بہت جید عالم اور فقیہ تھے۔ آپ کے والد شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ بلند پایہ عالم، محدث، فقیہ اور مفتی تھے۔ وہ جامع حران کے خطیب اور مدرسہ نوریہ کے مدرس تھے۔ امام صاحب کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت عبد الرحمن بھی بڑی پرہیزگار بلند حوصلہ اور متحمل مزاج خاتون تھیں۔

امام ابن تیمیہ نے جس زمانے میں آنکھ کھولی، وہ دور مسلمانوں کے لیے ابتلاء و آزمائش کا دور تھا۔ منگول حکمران ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کو صرف پانچ برس گزرے تھے اور عالم اسلام کا بڑا حصہ منگولوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ تھا۔

امام ابن تیمیہ نے اپنی عمر کے ابتدائی سات برس حران میں بسر کیے۔ آپ کی تعلیم کا آغاز حران میں ہی ہو چکا تھا۔ جب آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے دمشق پہنچے تو وہاں آپ کو بڑے بڑے علماء کرام کے وسیع علم سے استفادہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ آپ نے کم عمری میں ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرف توجہ فرمائی۔

خاندان ابن تیمیہ جب منگولوں کے حملے سے بچنے کی خاطر اپنا علمی سرمایہ لے کر دمشق منتقل ہوا تو وہاں پہنچتے ہی اس علمی گھرانے کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ امام ابن تیمیہ کے والد محترم شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ سے جامع اموی اور دارالحدیث سکر یہ میں درس دینے کی درخواست کی گئی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ امام ابن تیمیہ نے دارالحدیث سکر یہ کے علاوہ دمشق میں قائم مدرسہ (حنبلہ مدرسہ ابن عمر) میں بھی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے جن اساتذہ سے حدیث کی سماعت کی ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔

امام ابن تیمیہ نے حدیث کی مشہور ترین کتب صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد، مسند ابی داؤد، مسند نسائی اور مسند ابن ماجہ کو کئی اساتذہ سے کئی بار پڑھا۔ انہیں علم حدیث پر اتنی دسترس ہو گئی کہ یہاں تک کہا جانے لگا کہ جس حدیث کا علم امام ابن تیمیہ کو نہیں اس حدیث کے حدیث نبوی ہونے میں شک ہے۔

امام صاحب نے فقہ اور اصول فقہ کی کتب اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ تفسیر کلام پاک سے خاص دلچسپی تھی آپ خود فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آیت کو سمجھنے کے لیے میں نے سو سو تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے صرف قرآن و حدیث اور فقہ ہی نہیں بلکہ دیگر تمام رائج علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔ آپ نے عربی زبان و ادب کی تاریخ کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ فرمایا۔

اسلامی حکومتوں کی تاریخ پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ کو قدیم و جدید عربی شعراء کے ہزاروں اشعار از بر تھے۔ آپ نے حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، فلسفہ، علم کلام، منطق، معانی و بیان کا علم بھی حاصل کیا اور خوشنویسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ وہ جس عالم کی شہرت سنتے تھے ان کے پاس جاتے اور ان کے علم سے استفادہ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ان کے استاد کس مسلک، مکتب یا فقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں امام نووی، ابن دقیق، جمال الدین یوسف، کمال الدین ابوالعالی اور کئی ممتاز علماء کرام شامل ہیں۔

لڑکپن ہی میں ابن تیمیہ نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ حفظ قرآن کے بعد علم حدیث و قرآن، علم فقہ، علم الاصول اور علم الکلام کے موضوعات پر کثیر کتب کا مطالعہ کرنے سے ابن تیمیہ کی نظر میں کشادگی، ذہن میں وسعت اور یقین و آگہی میں گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی۔

ابن تیمیہ کو فقہ کے چاروں مذاہب میں ایک جیسی علمی دسترس حاصل تھی۔ وہ ان کے باہمی اختلافی مسائل کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ ابن تیمیہ جب فتویٰ دیتے تو کسی ایک مذہب کے پابند رہ کر فتویٰ نہ دیتے بلکہ وہ پہلے تمام آراء کو مد نظر رکھتے، پھر دلائل کا جائزہ لیتے۔ وہ ہر شخص کی بات کا جواب دلائل کے ساتھ دیتے۔

کمال الدین ابن الزمکانی لکھتے ہیں۔

ابن تیمیہ سے کوئی شخص کسی سند کے بارے میں سوال کرتا تو ابن تیمیہ اس قدر بھرپور علمی دلائل کے ساتھ جواب دیتے کہ سوال کرنے والے کو یقین ہو جاتا کہ اس کا سوال جس علمی شعبے سے تعلق رکھتا ہے ابن تیمیہ کو اس میں پوری مہارت حاصل ہے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں: قرآن مجید کی تفسیر جمع کرنے کے زمانے میں ابن تیمیہ جامع مسجد دمشق میں اپنے والد کے مقام پر فائز ہو گئے تھے۔ انہوں نے تفسیر قرآن کو اول سے شروع کیا۔ اس علمی مجلس میں وہ اپنے حافظے کی مدد سے اتنا کچھ لکھتے لکھاتے تھے کہ دو بڑی کتابوں سے بھی زیادہ تحریریں تیار ہو جاتی تھیں۔ جمع تفسیر کے زمانے میں سورہ نوح کی تفسیر تو کئی سال جاری رہی۔

بزار لکھتے ہیں: مسند امام احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد سجستانی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور سنن وار قطنی میں سے ہر ایک کو ابن تیمیہ نے کئی بار سنا۔ کسی فن پر لکھی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس کا ابن تیمیہ نے جائزہ نہ لیا ہو جس عبارت پر ابن تیمیہ کی نظر پڑ گئی وہ ان کے حافظے میں محفوظ ہو گئی ایسی نقش ہوئی کہ پھر کبھی لوح حافظہ سے محو نہ ہو سکی نہ لفظی اعتبار سے نہ معنی کے اعتبار سے۔ صحاح ستہ کے بارے میں کوئی بھی معلومات حاصل کرنا ہوتی تو تمام علماء ابن تیمیہ سے ہی رجوع کرتے۔ اسی طرح مسند امام حنبل کے بارے میں بھی ابن تیمیہ کی رائے حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

امام ابن تیمیہ کی مشہور کتابوں میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

توحید الوہیت، توحید ربوبیت، مجمل اعتقاد السلف، مفصل الاعتقاد، الاسماء والصفات، الایمان، القدر، المنطق، علم السلوک، التصوف، القرآن کلام اللہ حقیقہ، مقدمہ التفسیر، الحدیث، تفسیر سورۃ الاخلاص والمعوذتین، اصول الفقہ، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، منہاج السنۃ، فتاویٰ امام ابن تیمیہ (مقدمہ، مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، عبدالرحمن بن محمد بن قاسم)۔

ابن تیمیہ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین اسلام کی تعلیمات اور اس کے عقائد کو ان کی اصل شکل و صورت میں پیش کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ملاوٹ اور بدعت کی باتیں اور مفکرات جو کم عقل اور بے علم لوگوں کے ذریعے جو مسلمانوں نے اپنائی تھیں ان سب کو نکال باہر کیا اور ایسی تحریریں اور تقریریں ترتیب دیں جن میں اسلام اپنی خالص حالت میں مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔ اس طرح انہوں نے کوشش کی کہ اسلامی معاشرے کو ان خرافات سے بچایا جائے جو ثقافت کے نام پر ان کے ہاں رائج ہو گئی تھیں اور جن کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تاتاریوں نے 699ھ/1299ء میں شام پر حملہ کر دیا اور وہ دمشق میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے۔ اہل دمشق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ وہ شام کی حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی سفارت کا کام انجام دیں اور تاتاریوں کو دمشق کی سرزمین پر قدم رکھنے سے کسی نہ کسی طرح روک دیں۔ ابن تیمیہ نے تاتاریوں کے بادشاہ قازان سے ملاقات کی۔ حاضرین ابن تیمیہ کی شجاعت و بسالت دیکھ کر رنگ رہ گئے۔ حتیٰ کہ قازان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ اس کا ان جیسے شیخ الاسلام سے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور نہ ہی ان جیسے قوی اور مضبوط دل والے مسلمان عالم کو دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کی باتوں نے ان سے زیادہ اس پر گہرا اثر چھوڑا اور نہ اس نے کسی ایسے عالم کو دیکھا کہ جس کی پیروی کرنے والے لوگوں کی اتنی کثرت ہو۔

امام ابن تیمیہ نے اخلاقی امراض کا بھی علاج کیا۔ انہوں نے سلطان وقت کو لکھا کہ کسی شخص کو رشوت یا ناجائز حمایت کے ذریعے نوکری نہ دی جائے بلکہ ہر شخص کو اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی کے مطابق مناسب نوکری دی جائے اور ہر ایک کے لیے نوکری کا انتظام کیا جائے۔

امام ابن تیمیہ نے منگولوں اور اسلام دشمن نظریات کے خلاف ہر میدان میں جہاد کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی پر کسی قسم کی آنچ آئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے تاتاریوں کے مظالم دیکھے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ دشمنان اسلام نے کس طرح مسلمانوں پر ظلم ڈھائے، انہیں کس بے دردی سے قتل کیا اور ہزاروں بے وطن ہوئے۔ انہوں نے اپنی تقریر و تحریر کے علاوہ بذاتِ خود بھی جہاد میں

حصہ لیا۔

702ھ/1302ء میں شغب کی لڑائی میں تاتاریوں کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو بہت قربانی دینی پڑی۔ ان کی قوت کو مضبوط رکھنے کے لیے ابن تیمیہ نے فتویٰ صادر کیا کہ دشمن کا مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ اس کو شکست نہیں دے دی جاتی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ رمضان کا روزہ نہ رکھا جائے تاکہ لشکر اسلام کمزور ہو کر شکست نہ کھا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ابن تیمیہ نے خود روزہ افطار کیا اور پھر وہ تاتاریوں کے خلاف میدان جہاد میں کود پڑے۔ آپ راتوں کو جاگ کر مسلمانوں کی بستیوں کا پہرہ دیتے اور دشمن کے حملوں کے خطرات سے نمٹنے کے لیے ہمیشہ چوکنا رہتے۔

ایک بار آپ نے قبرص کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی کیونکہ اس کا انسانی رویہ اس قابل تھا کہ اسلام میں اس کو کافی پذیرائی مل سکتی تھی۔ اس خط کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس نے قبرص کے مسلمانوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں نرمی کر دی اور اس بات پر بھی آمادہ ہو گیا کہ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے یا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابن تیمیہ جس قدر زیادہ آزمائش میں مبتلا ہوتے اسی قدر زیادہ شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتے۔ 707ھ/1307ء میں سلطان کے حکم پر ابن تیمیہ کو قید کرنے کا پروانہ جاری ہوا، ان پر الزام تھا کہ وہ صوفیاء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور ان پر تنقید کرتے ہیں۔ سلطان نے اس سلسلے میں تمام قاضیوں اور فقہاء سے فتویٰ مانگا۔ کسی فقہیہ یا قاضی کو ابن تیمیہ کے خلاف ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ ان کی گرفتاری اور قید کا حکم دے سکتے۔ ان سب کے چہروں پر کٹکٹش کے آثار تھے۔ ابن تیمیہ نے ان کے چہروں کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ ان پر حاکم وقت کا دباؤ ہے اور وہ ان کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی کیفیت میں نہیں ہیں اس لیے انہوں نے خود ہی قید خانے جانا قبول کر لیا۔

ربیع الاول 707ھ/ستمبر 1307ء میں امیر حسام الدین مہنا بن یحییٰ خود چل کر امام ابن تیمیہ سے جا کر ملے اور ان سے کہا کہ آپ کو ہر طرح کے قول و فعل کی آزادی ہے، آپ قید خانے سے باہر آجائیے۔ تب ابن تیمیہ بلا شرط و قیود قید خانے سے باہر آ گئے، پھر علمی خدمات انجام دینے کی غرض سے انہیں مصر بھیج دیا گیا۔

بعض صوفیاء کی تنگ نظری کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ابن تیمیہ کی سوچ پر پہرے لگانا چاہے، حتیٰ کہ حیلے بہانے سے قتل کرنے کے منصوبے بھی بنائے گئے لیکن اللہ نے ان کی حفاظت کی اور وہ اپنے خلاف قتل کی ہر سازش سے بچ نکلے۔ ایک بار پھر ان کو اسکندریہ کے قید خانے میں قید کر دیا گیا۔ اس مرتبہ ان کے ہم خیال شاگرد بھی ان کے ساتھ تھے۔ شوال 709ھ/مارچ 1310ء میں سلطان محمد بن قلاوون کے حکم پر ابن تیمیہ کو باعزت بری کر دیا گیا۔

10 شعبان 726ھ/میں چند جھوٹے الزامات کی بنا پر ان کو پھر قید خانے بھیج دیا گیا۔ ان کو قید میں ڈالنے کا فتویٰ چند مفاد پرست لوگوں نے دیا تھا، ابن تیمیہ نے یہاں بھی اپنا جہاد بالقلم جاری رکھا۔ دشمنوں نے آخری حربے کے طور پر ان سے قرطاس و قلم چھین لیا، انہیں دین اسلام کے سچے عقائد کی تفصیل لکھنے سے روک دیا گیا۔ دو سال اور چند ماہ کی قید کے بعد ہی مجاہد اسلام 20 ذوالحجہ 728ھ (26 اکتوبر 1328ء) کو وفات پا گئے۔

امام صاحب کی وفات کی خبر عام ہوتے ہی سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ لاکھوں افراد جمع ہو گئے۔ امام صاحب کے لوگ احسان مند تھے۔ کیونکہ انہوں نے دمشق والوں کو تاتاریوں کا شکار ہونے سے بچایا تھا۔ امام صاحب کی نماز جنازہ کئی باراد کی گئی پھر آپ کو مقابر صوفیاء میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

☆☆

امام ابن تیمیہؒ دیگر علماء کرام کی نظر میں

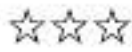
البرزالی کہتے ہیں: ابن تیمیہؒ کی تصانیف چھ ہزار سے زائد ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ دوسرے علماء کیا خود ابن تیمیہؒ اپنی تصانیف کو گننا چاہیں تو نہ گن سکیں گے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں: ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ تین سو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اس طرح جواب دیتے جیسے سنت نبویہ کو آپ اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے مطابق جواب دے رہے ہیں۔

جمال الدین اپنی الامالی نامی کتاب میں فرماتے ہیں: ابن تیمیہؒ کی قوت حافظہ بھی حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ کسی کتاب کا صرف ایک ہی بار مطالعہ کر لیں تو اس کا ایک ایک لفظ ان کی لوح حافظہ میں نقش ہو جاتا ہے پھر جب اس کتاب سے سوال دیتے ہیں تو نہ لفظ تبدیلی نظر آتی ہے نہ معنی کے لحاظ سے کوئی تغیر رونما ہوتا ہے۔

ابن تیمیہؒ کو تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور علم الکلام پر ہی دسترس حاصل نہ تھی بلکہ فلکیات، ریاضیات، تاریخ، جغرافیہ، طب، علم ہندسہ اور دیگر مروجہ علوم پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

حافظ المزنی فرماتے ہیں: ”نہ میں نے ابن تیمیہؒ جیسا کوئی عالم دیکھا ہے اور نہ خود انہوں نے اپنے جیسا کوئی پایا، اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی پابندی سے پیروی کرنے والا اور کتاب و سنت کو ان سے زیادہ جاننے والا میری نظر میں نہیں گزرا۔“



امام ذہبیؒ

امام ذہبی جنہیں ”مؤرخ اسلام“ اور ”محدث ازماہر“ کے القاب سے نوازا گیا

کتاب مکمل ہو چکی تھی۔!

یہ اسلامی تاریخ کی کتاب تھی۔ اس کا آغاز عہد نبویؐ سے ہوا تھا اور اس میں گزشتہ سات صدیوں کے واقعات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ یہ اس وقت تک کی سب سے زیادہ معلوماتی تاریخی دستاویز تھی۔ اس کتاب میں علماء، فقہاء خلفاء، قائدین، عمائدین، سلطین، وزراء، علم صرف و نحو کے ماہرین اور شاعروں کے بارے میں حوالے ان کے حالات زندگی اور کارنامے شامل تھے۔

یہ کتاب 21 جلدوں پر مشتمل تھی۔ ظاہر ہے اتنی مفصل اور طویل تاریخ دو تین جلدوں پر مشتمل کتاب میں نہیں سما سکتی تھی..... لیکن کتاب کے مؤلف کا کہنا تھا:

”میں نے اس کتاب میں صرف بڑے بڑے واقعات کو لیا ہے، اگر میں مزید تفصیل شامل کرتا تو میری یہ کتاب 100 بلکہ اس سے بھی زیادہ جلدوں تک پھیل سکتی تھی!“

اس کتاب کے مؤلف تھے امام ذہبی جنہیں ”مؤرخ اسلام“ اور ”محدث ازماہر“ کے القاب سے نوازا گیا۔ آپ ساتویں اور آٹھویں ہجری کی نہایت ذی علم شخصیت ہیں۔ آپ کا علمی کام محض تاریخ نہیں بلکہ متعدد جہتوں میں پھیلا ہوا ہے اور آپ کے چھوڑے ہوئے علمی سرمایہ سے طالب علم آج بھی استفادہ کر رہے ہیں۔

امام ذہبیؒ کا پورا نام محمد بن احمد بن عثمان بن قانماز (قیماز) الذہبی ہے۔ آپ کا لقب شمس الدین ہے۔ آپ ایک ترکمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

امام ذہبیؒ

آپ کے دادا نجار (بڑھئی) تھے۔ عمر بھر تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ لیکن امام ذہبیؒ کے والد احمد نے یہ پیشہ (نجاری) ترک کر کے سونے کے زیورات بنانے کا کام شروع کر دیا اور اس فن میں انہوں نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ ”ذہبی“ (سونے والا) یا ”سنار“ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ امام ذہبیؒ کے والد احمد کو فن حدیث سے گہرا شغف تھا۔ اس کی سماعت اور تلاش میں انہوں نے خوب دلچسپی لی۔

شیخ ذہبیؒ 673ھ (1274ء) میں کفر بطنا (دمشق) میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی میں انہیں احادیث روایت کرنے کی اجازت مل گئی۔ بعض روایوں کے مطابق ان کو یہ بتایا گیا کہ بالغ ہونے پر وہ علمائے حدیث کی کتب کی روایت کر سکتے ہیں۔ ان کی پھوپھی خاندان میں ایسی چھٹی خاتون تھیں جو حدیث کی روای تھیں۔ شیخ ذہبیؒ نے ان کا دودھ بھی پیا تھا۔ یوں وہ ان کے رضاعی بیٹے تھے۔ آپ کے ماموں کا نام علی تھا۔ اور وہ بھی فن حدیث میں یکتا تھے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ محمد (شیخ ذہبیؒ) چھوٹی عمر ہی سے علم دین کے حصول میں مشغول ہو جائیں اور وہ علم دین کے سوا کسی چیز کی طرف توجہ نہ دیں۔ شیخ ذہبیؒ نے ایک سعادت مند فرزند کی طرح ایسا ہی کیا۔

امام ذہبیؒ نے دینی مدرسے میں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ یہاں انہوں نے قرأت قرآن کے بنیادی اصول سیکھے اور قرآن کی تعلیم کو

پورے چار سال میں مکمل کیا۔ اس کے بعد امام ذہبیؒ نے قرآن کی قرأتوں کا علم سیکھا اور اس میں معرفت اور مہارت حاصل کی۔ شیخ مسعودؒ ان کے استاد تھے جنہوں نے امام ذہبیؒ کو اس فن میں طاق بنادیا۔ شیخ مسعودؒ، دمشق کی بستی شاغور میں قرآن کے معلم تھے۔ اس کے بعد امام ذہبیؒ نے ابن جبریل مصریؒ سے بھی سات قرأتوں میں مہارت حاصل کی۔ سات قرأتوں کی تعلیم کے دوران شیخ ذہبیؒ نے کتابوں تیسیر اور حرز الامانی سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ پہلی کتاب علامہ دانی کی ہے اور دوسری شاجلی کی۔

امام ذہبیؒ نے 691ھ (1292ء) میں دمشق ہی میں قاریوں کے استاد شیخ ابراہیم بن داؤد عسقلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کتاب 'المجمع الکبیر' کو سورہ قصص تک مکمل کیا۔

جب امام ذہبیؒ 18 سال کے ہوئے تو پھر انہوں نے علم حدیث میں خصوصی مہارت کے لیے نہایت سنجیدگی کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ آپؒ فن حدیث ہی کے ہو کر رہ گئے۔ بے شمار کتب حدیث کو سماعت فرمایا اور کثیر تعداد میں مشائخ حدیث سے ان کی ملاقاتیں بھی رہیں، یہاں کہ بارہ سو سے زیادہ رسوخ حدیث سے انہوں نے اچھی طرح استفادہ کیا۔ گویا شیخ ذہبیؒ کی زندگی کے ابتدائی 20 سال علمی ماحول میں گزرے۔ آپؒ کا خاندان بھی ایک علمی گھرانہ تھا۔ علم کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی فراخی بھی تھی، اور شہر بھی ایسا تھا جو، ان کے زمانے میں علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، جس کسی کو بھی قرآن و حدیث کے علم کے حصول کی خواہش ہوتی، وہ کفرطناہی کی طرف چلا آتا۔ امام ذہبیؒ نے قرآن و حدیث کو اولیت دی اور ساتھ ساتھ سیرت، تاریخ، اور علماء کی سوانح حیات کی طرف بھی برابر توجہ دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی امام ذہبیؒ اپنے زمانے کے علمی مرکز کے عہدہ صدارت کے لائق تصور کیے جانے لگے۔

امام ذہبیؒ بنیادی طور پر ایک معلم تھے اور ایسے مدرس، جس کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہو۔ اسلامی، اخلاقی اور روحانی اقدار کو جاننا، ان کو فروغ دینا، ان کی زندگی کا اولین مقصد رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ذہبیؒ نے قرآن کریم کے اندر اس کے مربیانہ یعنی تربیتی پہلو کو تلاش کیا، اور معاشرے کو بتایا کہ اسلامی شریعت کے امر و نہی کے اندر معاشرے کی اصلاح کے کون کون سے اصول کار فرما ہیں، امام ذہبیؒ کے نزدیک تعلیم و تدریس کے فریضے کی ادائیگی نفسی تربیت اور اصلاح احوال کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

حصول علم کے لیے امام ذہبیؒ شام کے مختلف شہروں میں گئے۔ بعلبک بھی پہنچے۔ حمص، حماة، حلب، معرہ اور طرابلس کے علاوہ، اخلیل، نابلس، رملہ، گویا تمام شمالی و جنوبی شہروں میں جا کر انہوں نے علم کے موتی اپنے دامن میں سمیٹے۔ امام ذہبیؒ پہلی بار 692ھ (1293ء) میں بعلبک گئے۔ یہاں انہوں نے علامہ نصیبیؒ کی خدمت میں رہ کر قرآن پاک کی جملہ قرأتوں میں مہارت حاصل کی۔ اخلیل شہر میں امام ذہبیؒ 695ھ (1296ء) میں پہنچے جہاں انہوں نے علامہ بصریؒ کا وہ قصیدہ ان سے سماعت کیا، جسے انہوں نے قرآن مجید کی دس قرأتوں کے بارے میں تخلیق کیا تھا۔

امام ذہبیؒ نے حصول علم کے لیے مصر کی سرزمین میں پہنچ کر قاہرہ، بلبیس، اور اسکندریہ میں بھی قرآن و حدیث میں فنی قابلیت حاصل کی۔ اس سلسلے میں موصوف رملہ بھی گئے اور پھر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جا کر علمی فیوض و برکات سے اپنا دامن بھر لیا۔

شمس الدین عراقی، دمشق کی جامع کبیر کے اندر واقع دینی مدرسہ کے سربراہ تھے، ان کی وفات کیب عدیہ گراں بار ذمہ داری امام ذہبیؒ پر آپڑی۔ اس وقت امام ذہبیؒ کی عمر صرف 26 برس تھی۔ اس مدرسہ کے سربراہ کی حیثیت سے امام ذہبیؒ نے اپنی علمی برکات کو عام کیا تو آپؒ نے عوام اور علماء دونوں حلقوں کو اپنی ذہانت، علمی قابلیت، اور قوت حافظہ (یادداشت) سے حیرت میں ڈال دیا۔

آٹھویں صدی ہجری کا آغاز ہی تھا کہ شیخ ذہبیؒ نے تاریخی کتب پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اپنے طرز کی اسلامی تاریخ کی تالیف شروع کر دی جو، ان کے دور کی سب سے زیادہ معلوماتی و تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تدریسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں، یہاں تک کہ امام

ذہبی گو کفر بطن کی جامع مسجد کا خطیب بنادیا گیا۔ مدرسہ ام صالح میں تدریس ان کی دیرینہ خواہش تھی، وہ پوری ہوگئی اور پھر انہوں نے اسی کے اندر اپنی رہائش کا انتظام بھی کر دیا، جہاں وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک رہے۔

امام ذہبی کو دمشق کے اندر حدیث کے چار مدارس کی سرپرستی کا اعزاز حاصل ہے۔ دارالحدیث اشرفیہ کی سربراہی کے لیے بھی آپ کا نام تجویز ہوا، اکثریت کی رائے بھی آپ کے حق میں تھی مگر مذکورہ مدرسہ اشعری مسلک کے پیروکاروں کا تھا اور شیخ ذہبی حنبلی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لہذا آپ کو یہ منصب نہیں دیا جاسکا۔

تنقید میں امام ذہبی نے بے لاگ اصول اور نقو بصر کو ملحوظ رکھا۔ مستدرک حاکم کی بعض احادیث اور اسناد پر تنقید کی، پھر اپنی موافقت اور مخالفت کے دلائل بھی فراہم کی۔ ساتھ ہی ساتھ الگ سے یہ بھی واضح کر دیا کہ فلاں حدیث ”صحیح ہے“، فلاں حسن ہے اور فلاں ضعیف، اس کے علاوہ امام جوزی کی کتاب ”تحفۃ احادیث التعلیق“ پر اپنی تنقیحات کا اضافہ کیا۔

دینی و علمی سرگرمیوں سے امام ذہبی کبھی تھکتے نہیں تھے، اگرچہ آخری عمر میں آپ کی نظر آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ آپ کی بینائی بالکل ختم ہوگئی تھی۔

امام ذہبی کو اللہ نے ایک ایسے مربی، معلم، اور مدرس کا دماغ بخشا تھا، جو اپنی ناقدانہ نظروں سے ہر امر و نواہی کے پیچھے دینی، اخلاقی، معاشرتی و معاشی مصلحتوں کا کھوج لگاتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کے زمانے کے اسلامی معاشرے کے اندر کن کن چیزوں پر زور نہیں دیا جاتا اور اگر اسلام نے کوئی حکم دیا ہے، یا کسی کام سے منع کیا ہے تو اس کے اندر انسان اور مسلمانوں کی اپنی بھلائی ہے۔

امام ذہبی نے قرآن کریم کی تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ، تقلید مذہب علم منطق، علم لغات، انشا پر وازی، شعر گوئی اور صرف و نحو کی مطلوبہ ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے اور ان کے جن گوشوں پر توجہ نہیں دی گئی ہے، ان کو نمایاں کر کے، ان کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا ہے۔

امام ذہبی کی اس خدمت کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں روزمرہ کے تجارتی حساب کتاب اور لین دین کا جائزہ بھی لیا ہے اور بتایا ہے کہ سرکاری دفاتر کی ضرورت کیا ہے اور وہ کس نوعیت کے ہونے چاہئیں۔

قرآن کی سات قرأتوں، حدیث اور تاریخ کا ذکر چلے تو امام ذہبی کی ذات نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ قرأتوں کے ضمن میں امام ذہبی نے جو کتاب مرتب کی ہے۔ اس کا نام ”طبقات القراء“ ہے۔ علامہ ابن جزری نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔ اسی فن میں امام ذہبی کی ایک اور کتاب ”مختصر القراءات“ (قرأت کی جمع: ”قراءات“) کے نام سے مشہور ہے۔

امام ذہبی فن حدیث کے امام زمانہ تھے۔ آپ کی تحریریں اور اقوال، منطقی حوالے سے بآسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں انہوں نے جو کچھ لکھا، ایک مربی کی حیثیت سے لکھا۔

فن حدیث میں امام ذہبی نے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، جن سے انسان اپنی دینی، فکری، عقلی، اخلاقی، اور معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اخلاص، امانت داری، علم کے حصول میں تواضع وغیرہ ان کی تحریروں کی بنیادی خوبیاں ہیں۔

امام ذہبی نے احادیث قدسیہ کی کئی کتب کا اختصار بھی لکھا۔ چنانچہ مستدرک حاکم، بیہقی کی سنن کبریٰ، اور القدر، اور مرّی کی ”تہذیب الکمال“ کا اختصار تحریر کیا۔ آخری کتاب کا نام انہوں نے ”تہذیب التہذیب“ رکھا۔ امام ذہبی کو اس بات کا اندازہ تھا کہ مصروف زندگی میں لوگوں کے پاس اس قدر وقت نہیں ہوتا کہ وہ طویل کتب کا باقاعدگی سے مطالعہ کریں، اس لیے انہوں نے ہر اس کتاب کا اختصار تیار کیا، جو ان کی نظر میں اسلامی معاشرے کے افراد کے لیے دینی، عقلی اور ادبی و اخلاقی اعتبار سے مفید ہو سکتی تھی۔ انہوں نے امام ابن حزم کی ”المحلی“، ابن عبد البر کی ”جامع البیان“ اور تاریخ السمعانی کا اختصار تیار کیا۔ امام ذہبی خود اپنی تحریروں کو بھی مختصر کرتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب تاریخ اسلام کو

سیر الاعلام النبلاء کے نام سے مختصر بھی کیا اور ”تہذیب التہذیب“ کو مختصر کر کے اس کا نام ”الکشف“ رکھ دیا۔ امام ذہبیؒ نے اور بھی مختصرات مرتب کیے ہیں۔

امام ذہبیؒ کی چند اور مستقل اور مختصر تحریریں بھی ہیں۔ مثلاً آیت الکرسی کی فضیلت ”جہنم کی آگ“، ”رویت باری“ (دیدار الہی) ”جہنم کی آگ کا ابدی ہونا“ اور ”مسئلہ شفاعت“ کا شمار امام ذہبیؒ کی مختصر کتب میں ہوتا ہے۔

تاریخ پر اپنی کتاب میں امام ذہبیؒ نے خلفاء، قائدین، عمائدین، قاریان قرآن، فقہاء، علماء، سلاطین، وزراء، نحو یوں (علم صرف و نحو کے ماہرین) اور شاعروں کے بارے میں حوالہ جات اور ان کے حالات زندگی اور کارناموں کا ذکر کیا ہے، پھر ان کے اساتذہ و شیوخ کی طبقاتی تقسیم کو ان کے زمانے اور علمی کارناموں کے اعتبار سے بھی ملحوظ رکھا ہے۔ 21 جلدوں پر مشتمل یہ وہی کتاب ہے، جس کا تذکرہ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں کیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے خود اپنی کتاب ”تاریخ الاسلام الکبیر“ کو مختصر کر کے بھی لکھا۔ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے 37 حوالہ جات کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خاص طور پر دوسری اور تیسری صدی ہجری کی کتب پر انحصار کیا ہے۔

امام ذہبیؒ نے درج ذیل کتب تاریخ کو بھی مختصر کر کے لکھا ہے۔ 1۔ تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) 2۔ تاریخ مصر (ابن یونس) 3۔ تاریخ دمشق، (ابن عساکر) 4۔ ذیل الطبری (سمعانی) 5۔ وئیات الاعیان (ابن خلکان) 6۔ وئیات المندری 7۔ تاریخ نیشاپور 8۔ تاریخ خوارزم 9۔ تاریخ ابن جزری۔

شیخ ذہبیؒ کی ایک اور تالیف ہے: ”کتاب الکبائر“، جس میں آپؒ نے اصلاحی انداز کو اختیار کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کبیرہ گناہوں کا جائزہ مختلف عنوانات کے تحت لیا ہے۔ آپؒ نے بار بار فرمایا ہے کہ کبائر سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ کون کون سے گناہ کبیرہ ہیں، چنانچہ آپؒ نے اپنی اس کتاب میں اس کی وضاحت کی ہے تاکہ اہل ایمان ایسی برائیوں سے بچنے کا اہتمام کر سکیں۔

شیخ ذہبیؒ کی خداداد گہری بصیرت کا ایک نمونہ آپؒ کی فقہ میں خدمات بھی ہیں۔ آپؒ نے علم فقہ میں ایک نئے باب کا اضافہ بھی کیا ہے اور وہ باب ہے، ”فقہ و اسلام“ کی قانونی اور اجتماعی حیثیت، جس نے غیر اسلامی قوانین کے آگے اپنی قدر و منزلت کو نہ صرف بہتر طور پر منوایا، بلکہ اس کی قانونی افضلیت منوانے کا اصل سہرا بھی شیخ ذہبیؒ ہی کے سر بندھتا ہے۔

امام ذہبیؒ کی شہرت کا ذریعہ وہ کتابیں بھی ہیں، جو ان کی ندرت کلام اور اچھوتے موضوعات میں ان کی مدلل تحریروں کا ثبوت ہیں۔ آپؒ کی کتب میزان الاعتدال نقد الرجال المعنی فی الضعفاء، المقتنی فی الکنی، المشتبه فی الرجال (نام اور نسب نامے) ایسی کتابیں ہیں، جو احادیث کریمہ کے قبول یا رد کرنے کے لیے باقاعدہ اصول اور قاعدے فراہم کرتی ہیں۔

شیخ ذہبیؒ کی ایک اور کتاب ہے: ”بیان زغل العلم والطلب“ اس میں آپؒ نے مختلف علوم کے بارے میں اپنے ذاتی نقطہ نظر کو پیش کیا ہے اور مختلف کلامی، فکری، اور علمی و فقہی مذاہب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ کون کون سے اسباب و محرکات ہیں، جن کی موجودگی میں انسان کو بات سمجھنے میں غلطی لاحق ہوتی ہے اور اصل مطلب پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں امام ذہبیؒ نے اپنے زمانے کے علماء کے عادات و اخلاق کا اور ان کے علمی مقام کا جائزہ بھی لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر فن کے استاد اور ہر مذہب کے امام کی مثبت آراء سے بھرپور استفادہ بھی کیا ہے۔ ”بیان زغل العلم والطلب“ نامی کتاب ان موضوعات سے اساسی اور اصولی بحث کرتی ہے، جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے اس ایک عبارت میں پوری حکمت سمودی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

علم کی تلاش و حصول بہت ضروری اور اہم ہے۔ اس سے اہم یہ ہے کہ علم کے حصول کے بعد اس کو ذہن میں مستقل محفوظ رکھا جائے۔ ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ ذہن میں علم کو محفوظ کرنے سے زیادہ ضروری، اس پر عمل کرنا ہے اور عمل کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ عالم، غلط کاموں

گناہوں، خطاؤں اور زائل سیخ خود کو سلامت رکھے۔ علم و عمل کا بنیادی مقصد، خود کو برائیوں سے بچانا اور اچھائیوں سے آراستہ کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے خلوص اور نیک نیتی درکار ہے۔

امام ذہبیؒ کی ایک اور کتاب ”العلوم“ ہے، جس کا صرف تیسرا حصہ زمانے کی دستبرد سے بچ سکا ہے اور یہ رامپور کی لائبریری میں 1252 نمبر پر محفوظ ہے۔ ڈاکٹر منجد نے اس کتاب کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مکتبہ ظاہریہ میں اس کتاب کا ایک نسخہ 320 نمبر پر محفوظ ہے۔ تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبیؒ کی ایک اور شہرہ آفاق کتاب ہے، جس سے کوئی عالم، فقہ، محدث اور مؤرخ بے نیاز نہیں ہو سکتا، جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اس میں امام ذہبیؒ نے حفاظ قرآن و حدیث کا ذکر کیا ہے، علماء کرام کے ہاں اس کتاب کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ معجم شیوخ الذہبی (امام ذہبیؒ کے شیوخ) بھی اس پنج پر مرتب کی گئی ہے، جس پر مذکورہ تذکرہ الحفاظ کو مرتب کیا گیا۔ اس میں امام ذہبیؒ کے شیوخ کا تذکرہ ہے، جس کو دارالکتب مصریہ نے طبع کیا ہے۔

امام ذہبیؒ ان مدارس سے وابستہ رہے: 1۔ مدرسہ جامع اموی میں تدریس 2۔ مدرسہ أم صالح کے پرنسپل الشریش 718ھ میں فوت ہوئے تو امام ذہبیؒ نے یہ منصب سنبھالا۔ 3۔ دارالحدیث السکریہ میں ابن تیمیہ (718ھ) 1328ء کے بعد سربراہ۔ 4۔ دارالحدیث ظاہریہ کے رئیس خلف بن جہل (وفات: 729ھ) 1329ء کے بعد رئیس ادارہ۔ 5۔ 739ھ میں برزالی کی وفات کے بعد مدرسہ نفیسیہ کی امامت و سربراہی۔ 6۔ مدرسہ متکزیہ کی سرپرستی۔

شیخ ذہبیؒ کے زمانے کے تمام علماء، فقہاء، حکام اور قاضی و حج صاحبان اس امر پر متفق تھے کہ امام ذہبیؒ نیک، پارسا، متقی، عالم، دین اسلام کے سچے اور مخلص رہنما، علمی خدمات کا حد سے زیادہ احترام کرنے والے اور تدریسی خوبیوں کے مالک ہیں اور اپنے ہم عصر علماء پر فن تدریس کے شعبے میں افضلیت رکھتے ہیں۔

امام ذہبیؒ کا انتقال مدرسہ أم صالح ہی میں 748ھ (1347ء) میں ہوا اس وقت آپ کی عمر 75 برس تھی۔ حلب شہر میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور باب صغیر کے قبرستان میں آپ کو دفن کیا گیا، جو کہ دمشق ہی میں ہے۔

☆☆☆

اسماعیل پاشا

لائق، ذی علم اور بہترین منتظم حکمران جنہوں نے مصر کو فلاحی مملکت بنا دیا

بچی بہت خوبصورت تھی! اس کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر ذہانت کے آثار دیکھ کر حکمران وقت کو اندازہ ہوا کہ اگر یہ بچی اعلیٰ تعلیم حاصل کر جائے تو ان کے خاندان میں بہترین اضافہ ثابت ہوگی۔ اس بچی کا نام امیرہ خدیجہ تھا۔ حکمران وقت نے امیرہ خدیجہ کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اگر وہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ درجہ کی عالمہ بن جانے کا ثبوت فراہم کرے گی تو اسے بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔

”آپ کیا انعام دیں گے؟“ بچی نے ان سے سوال کیا۔

”میں تمہاری شادی اپنے بیٹے امیر حسن سے کر دوں گا۔ تمہیں اپنی بہو بنالوں گا!“ انہوں نے جواب دیا۔

اس بات کو کئی برس گزر گئے۔ ایک روز حکمران وقت مدرسے کے معائنے کے لیے چلے گئے۔ مدرسے کے تعلیمی معیار کی جانچ پرکھ اور طالبات کی علمی حیثیت کے امتحان کی غرض سے سب سے سوالات کیے۔ کچھ دیر کے بعد ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی، انہوں نے اس سے سوال کیا: ”تم نے قرآن مجید کی تعلیم کہاں تک مکمل کر لی ہے؟“ اس لڑکی نے کہا: ”اس آیت تک.....!“ اور پھر وہ آیت پاک پڑھی جس کا ترجمہ تھا: ”اور یاد کیجیے کتاب کے اندر اسماعیل کا واقعہ جو وعدے کا بڑا سچا تھا۔“

لڑکی نے جیسے ہی یہ آیت پڑھی، حکمران وقت کا ماتھا ٹھنکا اور انہیں یاد آ گیا کہ یہ تو وہی بچی ہے کہ جس سے انہوں نے انعام کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بچی امیرہ خدیجہ تھی اور وہ شخص حاکم مصر اسماعیل پاشا تھے جو علم کے شیدائی تھے جنہوں نے 1863ء سے 1879ء تک مصر پر حکمرانی کے عرصے میں ایسے عمدہ فیصلے کیے اور اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا ایسا بھرپور استعمال کیا کہ مصر کو ایک فلاحی مملکت بنا ڈالا۔

اسماعیل پاشا 31 دسمبر 1830ء کو قصر مسافر خانہ مصر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت ان کے والد ابراہیم پاشا اور دادا محمد علی پاشا کی سرپرستی میں ہوئی۔ اسماعیل نے قصر عینی کے اس مدرسے میں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی جسے محمد علی پاشا نے قائم کیا تھا۔ اسماعیل کو اس مدرسے میں ماہر اساتذہ کی خصوصی نگرانی میں ابتدائی علوم اور عربی، فارسی اور ترکی کے علاوہ ریاضیات اور طبیعیات کے موضوع پر بھی بہترین رہنمائی حاصل رہی۔

اسی زمانے میں اسماعیل پاشا کو آشوب چشم کی تکلیف ہوگئی علاج ہونے کے باوجود بھی انہیں پلکوں میں ایک طرح کی دکھن کا احساس رہتا۔ مصر کے تمام اطباء، اسماعیل کے اس مرض چشم کا علاج نہ کر پائے چنانچہ اسماعیل کو وی آنا بھیج دیا گیا تاکہ وہاں ان کا علاج ہو سکے۔ اس وقت اسماعیل کی عمر 16 برس تھی۔ اسماعیل نے وی آنا میں مسلسل دو سال رہ کر تعلیم بھی حاصل کی اور ان کی آنکھوں کا مرض بھی جاتا رہا۔ ان کے دادا نے پیرس میں قائم ایک مدرسہ میں انہیں داخل کروا دیا۔ اس مدرسے کے بانی محمد علی پاشا تھے۔

16 برس کی عمر میں اسماعیل اس مدرسے میں چلے گئے اور وہاں انہوں نے گرافکس اور پینٹنگ میں مہارت حاصل کی اس کے ساتھ فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی۔ علوم ریاضی اور طبیعیات کی تعلیم کو بھی مکمل کر لیا۔ اس کے بعد اسماعیل کو واپس مصر بلا لیا گیا جہاں اسماعیل کو عسکری تربیت

دلانے کے لیے فوجی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ یہ فوجی اسکول ان کے والد کا ہی بنایا ہوا تھا۔ اس میں اسماعیل کو خصوصی تربیت دی گئی۔ فنونِ حرب، دفتروں کے انتظامی امور اور معاملات کو سمجھنے کے لیے اسماعیل کو بہترین اساتذہ کی توجہ حاصل رہی۔

پیرس سے اسماعیل کے واپس مصر آنے کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے والد ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔

اسماعیل پاشا کے چچا محمد سعید پاشا نے اسماعیل کو اعلیٰ مجلس قانون ساز میں اعلیٰ عہدہ دیا۔ 1858ء میں سعید پاشا نے ایک شاہی مجلس کا اہتمام کیا، اس میں اسکندر یہ اور مصر کے دیگر علاقوں کے امراء کو شرکت کی دعوت دی، سب نے اس دعوت کو قبول کیا جبکہ اسماعیل نے معذرت کر لی، ان کو بخار تھا۔ تقریب سے واپسی میں جس گاڑی سے لوگ اپنے گھروں کو جا رہے تھے وہ گاڑی کفرزبات کے قریب دریائے نیل میں گر کر ڈوب گئی، یوں اسماعیل، مصری حکومت کے ولی عہد بن گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے بڑے بھائی احمد پاشا کی موت کے بعد اس گھرانے کی سب سے زیادہ سمجھ دار اور مدبر شخصیت تھے۔

سعید پاشا اپنے بھتیجے اسماعیل پاشا میں حکمرانی کے جوہر دیکھ کر ان کے مداح ہو گئے۔ 1859ء میں سعید پاشا، شام کے سفر پر روانہ ہوئے تو انہوں نے اسماعیل کو ہی اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اسی طرح سعید پاشا 1861ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے تو اسماعیل ہی کو امور حکومت سونپ کر گئے۔ اسماعیل نے اپنے مہربان چچا کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دی، سعید پاشا نے واپس آ کر اسماعیل کی حسن کارکردگی کے اعتراف میں ان کو چودہ ہزار فوجیوں کی رجمنٹ کا قائد بنادیا۔ اس کے ساتھ ہی مصری افواج کا سردار بھی مقرر کر دیا۔ (اس زمانے میں فوجی امیر کو مصری لوگ سردار ہی کہتے تھے) سعید پاشا کے کہنے پر اسماعیل نے سوڈان سے متصل حدود پر آباد سرکش قبائل کو خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر مطیع کر لیا۔

محمد سعید پاشا 1861ء کے آخری دنوں میں بہت بیمار پڑ گئے پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ اسماعیل کو مصر کا حاکم بنا گئے۔ اس وقت اسماعیل کی عمر تقریباً 33 برس تھی۔

برسرِ اقتدار آنے کے فوراً بعد اسماعیل پاشا نے عثمانی سلطنت کے دارالحکومت ”آستانہ“ جا کر عثمانی سلطان سے مصر کی حکومت کی رسمی اجازت حاصل کی۔ اس زمانے میں مصر بھی عثمانی سلطنت کے تحت تھا۔ امور سلطنت سنبھالنے کے بعد اسماعیل پاشا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دریائے نیل کے غربی کنارے پر اپنے والد کے نام سے ”نہر ابراہیمی“ نکالی جو اسیوط کے قریب سے نکالی گئی۔ یہ نہر پہلے تو دبروط واسطہ کے درمیان تھوڑی دور تک چلتی ہے پھر یہ دریائے یوسف کے متوازی نوے 90 میل تک اسیوط اور منیا کے علاقوں کو پانی فراہم کرتی ہوئی بہنسا اور سلسلہ عربیہ کے درمیان واقع ساری زمین کو سیراب کرتی ہے۔ پھر شمال کی طرف فرع رشید میں جا ملتی ہے۔

اسماعیل کا مقصد یہ تھا کہ جس قدر زمین کو آباد اور زندہ کیا جاسکے، ضرور کیا جائے۔ چنانچہ بولان اور سویر کے علاقے میں نہروں کا جال بچھا دیا گیا۔ ان دونوں شہروں کے درمیان پانی کا جو ذخیرہ بنایا گیا، اسے ”ذخیرہ اسماعیلیہ“ کا نام دیا گیا اور پھر اس کے پانی سے جسان کی سرزمین کو بھی سیراب و آباد کیا گیا جسے تورات کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام نے مختص کیا تھا۔

اسماعیل پاشا نے جدید تعلیمی منصوبے شروع کیے۔ 1864ء میں ایک انسٹیٹیوٹ بنایا گیا، جس میں بونا پارٹ کلچر، فوری جیسے دیگر 90 علماء کو تعینات کر کے ان کی خدمات حاصل کی گئیں اور ان سب نے مل کر مصر کے حالات اور جغرافیائی صورت حال کے مد نظر مختلف علوم پر کتابیں مرتب کیں۔ 1865ء میں سرائے عباس میں ایک عظیم مدرسہ تعمیر کیا گیا، اسماعیل نے 1865ء میں فنون و صنعت کے عنوان سے ایک مدرسے کے قیام کا کام نوبار پاشا کو سونپ دیا، جسے انہوں نے شریف پاشا کی مدد سے مکمل کیا۔

1867ء میں ایک جامع لائحہ عمل کے تحت تمام تعلیمی اداروں میں یکساں تعلیمی نظام رائج کر دیا گیا، پولی ٹیکنک اسکول اور کالج تعمیر ہوئے۔ پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے خصوصی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ اس سلسلے میں ’مدرسہ المہندس خانہ‘ کا ذکر بہت ضروری ہوگا، جس کو پہلے پہل العباسیہ کی گلی جمائیز میں شروع کیا گیا تھا اور بعد میں سرائے امیر مصطفیٰ فاضل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس مدرسے میں چھ سال میں تعلیم مکمل

ہوتی تھی۔ اعلیٰ ریاضی، کیمیا، طبیعیات (فزکس) ارضیات (جیولوجی) میکائکس، عربی، فرانسیسی یا انگریزی، جغرافیہ، تاریخ اور مصوری جیسے علوم سکھائے جاتے تھے۔ اسی سرانے امیر مصطفیٰ فاضل میں 1871ء میں طبیعیات کی ایک بہت بڑی تجربہ گاہ (لیبارٹری) بنائی گئی جو اپنی طرز کی واحد ایسی مشرقی تجربہ گاہ تھی جو یورپ کی بڑی بڑی تجربہ گاہوں کے ہم پلہ قرار دی جاسکتی ہے۔ پورے مصر میں کم از کم آدھے طلبہ کو مفت تعلیم فراہم کی جاتی تھی اس زمانے میں مدارس میں فرانسیسی، اطالوی اور عربی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی اور رائج علوم پڑھائے جاتے۔

ذہنوں کی عقلی و اخلاقی تربیت کے لیے تعلیمی نصاب میں مناسب تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ مصر کی تاریخ، اقتصادیات، معاشیات، جغرافیہ اور قدرتی وسائل کے بارے میں مصریوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچانے کے لیے ماہر انشا پردازوں اور علماء کا تعاون حاصل کیا گیا۔ قرآن مجید کی تفسیر و تعلیم کو اولیت دی گئی۔ انشا پردازی، زبان عربی، ترکی، فرانسیسی کے علاوہ ریاضیات، تاریخ، جغرافیہ، خطاطی اور پینٹنگ جیسے علوم و فنون کو نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا۔

1870ء میں نیل کے پانی میں طغیانی کے سبب تین بڑے گاؤں زیر آب آگئے اور اس طرح یہاں کی زمین کو خاصا نقصان پہنچا۔ اسماعیل پاشا نے حکم دیا کہ قریب کے پل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے اور پانی کے رخ کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ مستقبل میں کسی قسم کی طغیانی اس طرح زرخیز زمین کے لیے 'زرعی موت' کا سبب نہ بن سکے۔ اس طرح حکومت کو چار ملین فرانک کا خسارہ تو ہوا لیکن دوسری طرف گاؤں بچ گئے اور ان کے محصولات کی ادائیگی کا عدم قرار دے دی گئی۔

اسماعیل پاشا نے اپنے ملک میں بیرونی تاجروں کو بھی سرمایہ کاری کی اجازت دی تاکہ اس سے مصری عوام کو بھی فائدہ ہو اور دوسرے ممالک کے لوگ بھی مصری برآمدات کو پسند کریں اور ان کی کھپت ہو۔ تجارت کے سمندری راستوں کو محفوظ اور پرامن بنانے کے لیے اسماعیل پاشا نے بندرگاہوں کے آس پاس اور مناسب مقامات پر روشنی کے ستون تعمیر کروائے، اس سے قبل صرف دو مینار تھے ایک اسکندریہ اور دوسرا نہر سویز کے اندر متحرک نظام نور تھا۔ اسماعیل پاشا نے بحرا بیض کے کنارے سات بڑے بڑے روشنی کے ستون تعمیر کروائے سات بحیرہ احمر کے ساحل علاقوں پر اور ایک بحر ہند کے ساحل پر۔ ان کی وجہ سے تجارتی سفینے، بحری جہاز وغیرہ سب محفوظ ہو گئے۔

اسماعیل پاشا نے صنعتی پیشوں میں نئی روح پھونک دی۔ کئی شہروں میں کارخانے لگائے گئے اور کئی صنعتوں کو رواج دیا گیا۔ صرف الفیوم میں شکر کے تین کارخانے لگائے گئے۔ اسکندریہ میں روئی سے کپڑا بننے کے 38 کارخانوں کا قیام عمل میں آیا۔ اینٹیں بنانے کے کارخانے تعمیر کروائے۔ صرف قلوب کے کارخانے میں سالانہ 47 لاکھ سرخ اینٹیں تیار ہوتی تھیں۔ لوہے کو گلانے کے 85 کارخانے، تانبے اور پیتل کے 73 کارخانے اور 80 کارخانے دھاتوں کو صاف کرنے کے تھے۔ سونے کو گلانے کے 240 کارخانے تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار کارخانے ایسے تھے جن میں لوہے کو پگھلا کر اس سے عمدہ قسم کی اشیاء، اوزار اور دیگر عام استعمال کی اشیاء بنائی جاتی تھیں۔ اسماعیل پاشا کی اس طرح کی صنعت سازی کی مہم کی سرپرستی سے پورے ملک مصر میں خوشحالی کی گویا ایک لہر دوڑ گئی اور لوگوں کو اچھا اور اعلیٰ روزگار بآسانی ملنے لگا۔

قیمتی پتھروں کو صنعتی انداز میں بیچنے کے لیے کان کنی کے شعبے کو ترقی دی گئی۔ زیادہ اور وادی سقیط کے پہاڑوں میں زمرد کے پتھروں کی تلاش کا کام شروع ہوا۔ صحرائے سینا کے پہاڑوں کے اندر سے فیروزے کی کانیں تلاش کی گئیں۔ المہم مقام اور اسوان کے اندر زیر زمین چھپے ہوئے گریفائٹ کے ذخائر کو دریافت کیا گیا۔ عر حوب کی وادی سے سنگ مرمر نکالا گیا۔

نہر سویز کے سوئیل جنوب میں پیٹرول کے ذخائر دریافت کیے گئے۔ پھر اس مقام پر پیٹرول نکالنے اور اسے صاف کرنے کے کارخانے بھی تعمیر کروائے گئے۔ اسماعیل پاشا کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ملکی ترقی کے لیے ذرائع ابلاغ اور ترسیل و رسائل کا نظام مستحکم ہونا چاہیے اس لیے انہوں نے جہاں نئی سڑکوں کی ضرورت سمجھی وہاں نئی سڑکیں تعمیر کروائیں۔ قاہرہ کی مشہور سڑکوں کے نام یہ ہیں شارع عبدالعزیز، شارع نوبار پاشا، شارع کوپری قصر النیل، شارع سرانے اسماعیلیہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ عابدین سے سیدہ زینب تک ریلوے لائن بچھا دی گئی۔ اسماعیل پاشا نے جابجا

پل تعمیر کروائے، مساجد بنوائیں اور مصر کے تمام شہروں کو پانی کی برابر تقسیم کا نظام رائج کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیل پاشا کو آج بھی مصر کے لوگ اچھے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اسماعیل پاشا کا ایک اور کارنامہ غلاموں کی تجارت کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اسماعیل پاشا نے ستارہ شامی، جادو ٹونے، نجوم پرستی کے خلاف بھی مؤثر مہم چلائی۔

اسماعیل پاشا نے جب اقتدار سنبھالا تو دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ایک سب سے بڑا مسئلہ پیش آیا وہ حکومت عثمانی کی عسکری امداد کا تھا۔ ترکی کے دارالحکومت کی طرف سے یہ پیغام اسماعیل پاشا کو موصول ہوا کہ انقلابی آگ جو بلاد عرب میں پھیل رہی ہے اسے بجھانے کے لیے عثمانی حکومت کی فوجی امداد کے لیے جس قدر ممکن ہو اپنی فوجی طاقت بھیج دیں۔

عرب سرزمین میں اس وقت سے انقلابی تحریکیں گاہے گاہے اُٹھتی رہتی تھیں جب سے سلیمان قانونی برسرِ اقتدار آئے تھے اور یہ سلسلہ پہلی جنگ عظیم تک چلتا رہا۔ اسماعیل پاشا کی طرف سے منظم فوجی امداد اور ہر طرح کی طبی سہولتوں کی بروقت فراہمی نے اتنا بڑا کام کیا کہ چند ہی دنوں میں انقلابیوں کی عقل ٹھکانے آگئی۔

عثمانی سلطنت کے آخری فرمانروا سلطان عبدالحمید نے تخت خلافت پر بیٹھے ہی اسماعیل پاشا سے سابق خلفاء کی طرح فوجی امداد کی درخواست کی۔ اسماعیل پاشا نے عذر پیش کیا تو سلطان نے سخت رویہ اپنایا۔ اسماعیل پاشا اس مرتبہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ مصری فوجیوں کو خواہ مخواہ آتش جنگ کا لقمہ بنائیں چنانچہ انہوں نے عبدالحمید سے درخواست کی کہ جو مصری فوجی بھیجے جائیں گے ان کا پورا خرچ حکومت عثمانیہ برداشت کرے گی لیکن سلطان نے سختی سے منع کر دیا اور شدت سے یہ مطالبہ کیا کہ 12 ہزار فوجی، مصری حکومت کے خرچ پر فی الفور ترکوں کی امداد کے لیے روانہ کر دیے جائیں تاخیر کی صورت میں سلطان عبدالحمید، ہو برٹ پاشا کی قیادت میں مسلح عثمانی فوج کو مصر کی طرف روانہ کر دیں گے۔ اسماعیل پاشا مجبور ہو گئے اور مجبوراً ’جنگی ٹیکس‘ کے نام سے کسانوں پر مالی بوجھ ڈالنا پڑا، اس کے بعد سے اسماعیل پاشا کے بدخواہوں نے ان کے لیے مصیبتیں کھڑی کرنی شروع کر دیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جمال الدین افغانی جامع ازہر کے طلبہ کے اندر اپنے خیالات و افکار کو پھیلانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

اب منصوبہ شروع ہوا اسماعیل پاشا کو ان کے منصب سے ہٹانے کا آخر شریف پاشا عثمانی سلطنت کی جانب سے وہ تار لے کر اسماعیل پاشا کے پاس جا پہنچے جس میں اسماعیل پاشا کو خود یومصر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ (19 ویں صدی میں مصر کا حکمران ’خدیو‘ کہلاتا تھا) اسماعیل پاشا نے جب یہ تار پڑھا تو اپنے بیٹے توفیق پاشا کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ شریف پاشا نے جب توفیق پاشا سے رابطہ قائم کیا تو ان کو حیرت ہوئی کہ عثمانی سلطان نے توفیق پاشا کے نام الگ تار میں ان کو خود یومصر کے عہدے کو سنبھال لینے کا حکم دے رکھا تھا۔ شریف پاشا جب توفیق پاشا کو لے کر ان کے والد اسماعیل پاشا کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے بیٹے کا استقبال کیا اور اپنے بیٹے کو خود یومصر کے عہدے پر متعین کر کے خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

اسماعیل پاشا نے باقی زندگی ایک غریب الدیار کی طرح گزاری۔ وہ آخری دم تک مصر کی سرزمین کو دوبارہ لوٹ جانے کے لیے کڑھتے رہے لیکن کسی نے ان کی اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا حتیٰ کہ ایک بار ان کے پوتے عباس ثانی نے بھی اسماعیل پاشا کو مصر بلانے کا وعدہ کیا لیکن وہ نہ بلا سکے۔ آخر 2 مارچ 1895ء کو مصر کی سرزمین کا یہ آفتاب اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ تاریخ اسلام کا ایک سنہرے باب مرتب کر کے اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔



عبدالرحمن الداخل

انہیں فن تعمیر کے عظیم شاہکار ”مسجد قرطبہ“ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا

ان دونوں بچوں کی عمریں دس بارہ سال کے لگ بھگ ہوں گی۔ وہ دونوں اس عالیشان قصر کے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے جو دمشق کے علاقے قسریں میں واقع تھا۔ اسی وقت کوئی شخص گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ قصر کے دروازے پر پہنچ کر اس شخص نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ گھوڑا رک گیا۔ اس شخص نے قریب کھڑے خادم سے پوچھا۔ ”یہ کس کے بچے ہیں؟“

”معاویہ بن ہشام کے“ جواب ملا۔

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”یہ معاویہ مرحوم کے بچے ہیں؟“ اس کی زبان سے نکلا۔ ”انہیں گود میں اٹھا کر میرے قریب لاؤ۔“

خادم نے حکم کی تعمیل کی۔ دونوں بچے خوبصورت تھے لیکن ایک تو بہت ہی پیارا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، گھونگریا لے سنہری بال، صاف رنگت اور چہرے پر کھیلتا بھولپن۔

اس شخص نے بچے کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھالیا۔ اسی وقت اس شخص کے بھائی خلیفہ وقت ہشام بن عبدالملک، قصر کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ گھوڑے پر سوار شخص نے اپنے بھائی سے کہا ”میں اس بچے کی پیشانی پر اس کے حکمران بننے کی نشانیاں دیکھ رہا ہوں۔“

خلیفہ شام کے بھائی، مسلمہ بن عبدالملک کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ صرف پندرہ سال بعد وہی بچہ سرزمین اندلس کا فرمانروا بن چکا تھا۔ یہ بچہ اندلس میں اموی سلطنت کا بانی عبدالرحمن بن معاویہ تھا جسے دنیا آج بھی عبدالرحمن الداخل کے نام سے جانتی ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ عبدالرحمن الداخل نے اپنے ۳۳ سالہ عہد حکومت میں اندلس کو ایسی آب و تاب اور رعنائی بخشی کہ آنے والے ادوار یورپ اور افریقہ کے سنگم پر واقع اس سرزمین کی دلکشی اور چمک دمک میں اضافہ کی نوید لے کر آئے۔

یہ وہی عبدالرحمن الداخل ہیں جنہیں عظیم مسجد قرطبہ تعمیر کروانے کا شرف حاصل ہے۔ وہی مسجد قرطبہ جسے دیکھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال نے ایک لاجواب نظم کہی ۔

اے حرم قرطبہ عشق ہے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

عبدالرحمن ۱۱۳ھ/۷۳۱ء میں دمشق کے قریب پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالمطرف اور لقب ”الداخل“ ہے۔ یہ لقب آپ کو اس وقت ملا جب آپ نے سرزمین اندلس میں داخل ہو کر اموی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ عبدالرحمن ابھی صرف پانچ سال کے تھے کہ والد محترم، معاویہ بن ہشام کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا ہشام بن عبدالملک ان دنوں خلیفہ وقت تھے۔ عبدالرحمن کی ذہانت اور غیر معمولی صلاحیتوں نے شروع ہی سے انہیں

اوروں سے ممتاز کر رکھا تھا۔ انہوں نے کم عمری ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دور دور جا کر عالموں اور بزرگوں سے علم سیکھا۔ حکومت کے سرکردہ افراد کے درمیان رہ کر ملکی سیاست کی باریکیوں کو سمجھا اور کھلے میدانوں میں جا کر فنون حرب کی تربیت حاصل کی۔ نوجوانی ہی میں آپ اعلیٰ پائے کے شہسوار تھے اور تلوار چلانے میں ماہر تھے۔

جب 132ھ/750ء میں بنو امیہ کا دور ختم ہوا اور عباسی خاندان برسر اقتدار آیا تو عبدالرحمن نے دمشق سے کہیں اور چلا جانا بہتر سمجھا۔ وہ فلسطین چلے گئے۔ وہاں سے اپنے آزاد کردہ غلام بدر کے ساتھ مصر پہنچے اور پھر افریقہ کا رخ کیا۔ افریقہ کے حکمران نے ان کی آمد کو پسند نہ کیا تو وہاں سے بھی کوچ کیا لیکن قدرت شاید انہیں اچھی طرح آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی۔ عبدالرحمن کو کہیں پناہ نہ ملی۔ اس طرح انہوں نے پورا شمالی افریقہ طے کر ڈالا۔

عبدالرحمن کو اس طرح صحرائ نشینی کی زندگی گزارتے ہوئے ایک دوئیں پانچ سال بیت گئے بالآخر سینہ کے نواح میں بسنے والے بربر قبیلے نفرہ نے عبدالرحمن کی میزبانی قبول کر لی۔ جب قبیلے والوں کو علم ہوا کہ عبدالرحمن کی والدہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں تو اجنبیت کے پردے اٹھ گئے۔

اب عبدالرحمن نے اپنے وفادار غلام بدر کو ہسپانیہ روانہ کیا کہ وہاں جا کر سرکردہ رہنماؤں سے ملیں اور انہیں بتائیں کہ بنو امیہ کے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے پوتے عبدالرحمن بن معاویہ افریقہ آئے ہیں۔ بدر اندلس پہنچے اور وہاں کے چیدہ چیدہ رہنماؤں سے ملاقات کی اور انہیں عبدالرحمن کی حمایت پر آمادہ کیا۔ ادھر عبدالرحمن اپنے غلام کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک روز وہ ساحل سمندر پر عصر کے نماز ادا کر کے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ دور سمندر میں ایک جہاز چلا آتا ہے یہ جہاز رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا گیا اور جب وہ ساحل سمندر سے کچھ دور رہ گیا تو اس میں سے ایک شخص نے چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا ساحل پر آ پہنچا۔ یہ بدر تھے جو اپنے مالک کو خوشخبری سنانے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے آتے ہی عبدالرحمن کو مبارک باد دی کہ اندلس کے رہنما آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہیں اور ہم آپ کو لے جانے کے لیے یہ جہاز لائے ہیں۔

عبدالرحمن اندلس روانہ ہو گئے۔ یکم ربیع الاول 138ھ/14 اگست 755ء کو ان کا جہاز اندلس کی بندرگاہ المنب سے جا لگا۔ اندلس کی عنان اقتدار سنبھالنے سے پہلے عبدالرحمن کو کچھ معر کے سر کرنے پڑے۔ مختلف رکاوٹیں حائل ہوئیں لیکن بالآخر دس ذی الحجہ 138ھ/15 مئی 756ء کو عبدالرحمن قرطبہ پر اپنا پرچم لہرا چکے تھے۔

یہاں سے اندلس میں بنو امیہ کے اقتدار کا دور شروع ہوتا ہے۔ عبدالرحمن الداخل نے اندلس پر 33 سال چار مہینے حکومت کی اور اس عرصہ میں اندلس کو جو استحکام بخشا اس کے نتیجے میں بنو امیہ اندلس پر پونے تین سو سال تک حکومت کرتے رہے اور اس کے بعد بھی سینکڑوں سال تک اندلس پر اسلام کا پرچم لہراتا رہا۔

یہ مسلمانوں کا عہد زریں تھا جب اہل مغرب رہنمائی کے لیے اندلس کی طرف دیکھا کرتے تھے جو علوم و فنون کا ایک عظیم مرکز تھا۔ اندلس کے دامن میں ایسے بے شمار اہل علم کے نام محفوظ ہیں جو اپنے علم و فن میں یکتا تھے اور جن کے ناموں سے دنیا آج بھی اچھی طرح واقف ہے۔

عبدالرحمن الداخل نے اندلس کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد ملک کو انتظامی اعتبار سے چھ صوبوں میں تقسیم کر دیا ان میں طلیطلہ، مریدہ، سرقطہ، بلنسیہ، غرناطہ اور مرقسیہ شامل ہیں۔ ہر صوبے میں قاضی مقرر کیا گیا۔

ملک کو دفاعی اعتبار سے مستحکم بنانے کے لیے عبدالرحمن نے فوج کی تنظیم پر خصوصی توجہ دی۔ اور بالآخر ان کی فوج میں صرف سواروں کی

تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ انہوں نے بحری بیڑے کو بھی مضبوط بنایا۔ 155ھ/772ء میں عبدالرحمن نے قرطبہ کی فصیل تعمیر کروائی۔ قرطبہ میں قصر شاہی پہلے سے قائم تھا۔ قدیم زمانے میں گاتھ قوم سے تعلق رکھنے والے بادشاہ جب قرطبہ آتے تھے تو یہیں قیام کرتے تھے۔ عبدالرحمن نے اس قصر کو از سر نو تعمیر کروایا۔

162ھ/779ء میں فرانس کے بادشاہ شارلیمین نے اندلس پر چڑھائی کر دی۔ اس غرض سے شارلیمین نے فرانس میں پروپیگنڈہ کروایا کہ یہ عیسائیت اور اسلام کی جنگ ہے۔ اس طرح اس نے بڑی فوج اکٹھی کر لی اور اندلس کے شہر سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ سرقسطہ کے عوام نے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ اسی دوران خود فرانس میں شورشیں ہونے لگیں تو شارلیمین کو واپس جانا پڑا۔ واپسی پر جب اس کی فوج جبل البرانس کے تنگ دروں سے گزرنے لگی تو وہاں کے عیسائی باشندوں نے جو بشکنش (باسک) کہلاتے تھے اس کی فوج پر ہلہ بول دیا۔

عبدالرحمن الداخل سرقسطہ پہنچے تو شارلیمین محاصرہ ختم کر کے واپس جا چکا تھا۔ عبدالرحمن نے اس کا پیچھا کیا اور فرانس پر حملہ کر کے جنوبی علاقے کے تمام قلعے تباہ کر دیے۔ بعد میں شارلیمین نے صلح کی درخواست کی جسے قبول کر لیا گیا۔

شمالی اندلس میں سرحدی پہاڑی کے آس پاس آباد عیسائیوں نے عبدالرحمن کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ 164ھ/781ء میں عبدالرحمن شمالی اندلس کے صوبہ لوگرونو کے مشہور شہر قاہرہ پہنچے۔ اسے فتح کیا۔ پھر بلونہ پر حملہ کیا اس کے بعد بشکنش کی حدود میں داخل ہوئے اور ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر وہاں کے حکمران کاؤنٹ آف سرڈین نے جزیہ قبول کر لیا۔

عبدالرحمن الداخل اپنی رعایا سے بہت اچھا سلوک کرنے کے قائل تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو علم حاصل کرنے کی یکساں سہولتیں میسر تھیں۔ ان کے حسن سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ عبدالرحمن نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ عرب اور بربر قبائل میں خوشگوار تعلقات قائم کروا دیے۔ اس طرح ملک میں امن و امان ہو گیا۔

عبدالرحمن الداخل نے اندلس میں اقامت نماز کا خصوصی اہتمام کیا۔ چنانچہ ان کے دور میں صرف قرطبہ میں مساجد کی تعداد 490 تھی جو بعد کے ادوار میں بڑھ کر 837 تک جا پہنچی۔ ہر مسجد سے مدرسہ منسلک تھا۔ مسافروں کے لیے سرائے تھیں۔ مسجد سے ملحق دیوان تھا۔ جہاں سرکاری افسران آکر امور مملکت پر باہم مشورہ کیا کرتے تھے۔

قرطبہ کی عظیم جامع مسجد کی تعمیر عبدالرحمن الداخل کے نمایاں کارناموں میں سے ایک ہے۔ قدیم زمانے میں جب ہسپانیہ میں بت پرستوں کی حکمرانی تھی تو ان کا ایک بڑا بت خانہ قرطبہ میں واقع تھا جب ہسپانیہ میں عیسائی مذہب پھیلا تو عیسائیوں نے اس بت خانے کو گرا کر اس کی جگہ ایک بڑا کلیسا قائم کر لیا۔ جب طارق بن زیاد کی قیادت میں مسلمانوں نے اندلس کو فتح کر لیا تو جس طرح دمشق پر قبضہ کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم پر حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے وہاں گرجا کر مسلمانوں اور عیسائیوں میں مساوی تقسیم کر دیا تھا اس کلیسا کو بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مساوی تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح 98ء میں قرطبہ کو دار الحکومت بنایا گیا تو قدرتی طور پر شہری آبادی میں اضافہ ہو گیا اور مسجد قرطبہ بڑی تعداد میں آنے والے نمازیوں کے لیے نا کافی محسوس ہونے لگی۔ مسجد میں وسعت پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کی گئیں لیکن نمازیوں کو مسجد کی بالائی منزلوں تک پہنچنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

جب عبدالرحمن الداخل امیر اندلس بنے۔ انہوں نے مسجد کو وسیع کرنے کے لیے عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں کو بلایا اور انہیں پیشکش کی کہ وہ مسجد کے ساتھ واقع کلیسائی زمین، حکومت کو فروخت کر دیں۔ کچھ بحث کے بعد عیسائی رہنما اس شرط پر راضی ہو گئے کہ شہر میں دیگر جتنے کلیسا

مسما کر دیے گئے تھے انہیں از سر نو تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ عبدالرحمن نے یہ شرط منظور کر لی اور عیسائیوں کو زمین کی قیمت کے طور پر ایک لاکھ دینار بھی ادا کیے۔

دمشق کے ایک بڑے ماہر تعمیرات نے مسجد کا نقشہ تیار کیا۔ عبدالرحمن خود بھی فن تعمیر سے واقف تھے۔ میریا کالیکٹ ”تاریخ اسپین“ میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمن اپنے ساتھ مشرق سے علم معماری اور عالی شان تعمیرات کا ذوق لائے تھے۔ وہ نہ صرف نقشہ جات بنانے سے واقف تھے بلکہ عمدہ معمار بھی تھے۔ انہوں نے مسجد کی تعمیر کے لیے پہاڑوں کو کٹوا کر نہر تعمیر کروائی۔ انہوں نے مسجد کے پرانے میناروں کو گرا کر 108 فٹ بلند ایک نیا مینار بھی تعمیر کروایا۔ علامہ اقبالؒ نے مسجد قرطبہ کے اس مینار کو جلوہ گہ جبریلؑ کہا ہے

تیرے دروہام پر وادی ایمن کا نور

تیرا مینار بلند، جلوہ گہ جبریلؑ

اس قدیم عبادت گاہ کا شمالی اور مغربی حصہ اب تک محفوظ ہے۔ 633ھ/1236ء میں اندلس پر عیسائی قابض ہو گئے جس کے بعد اس مسجد کو کلیسا بنادیا گیا لیکن اس میں کئی تبدیلیوں کے باوجود اس کی وضع قطع اب بھی بالکل مسجد کی سی ہے۔ حکام نے اس کے ایک حصہ کو اب سیاحوں کے لیے کھول دیا ہے اور آنے والے مسلمان سیاح، یہاں دو رکعت نماز نفل ادا کر لیتے ہیں۔ یہ مسجد مستطیل کی شکل کی ہے جس کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ اس مسجد کو ایک منفرد انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے کے اوپر بنی ہوئی دہری محرابوں سے تعمیر کا طریقہ کسی اور مسجد میں نہیں ملتا۔

اس مسجد کی تعمیر پر عبدالرحمن الداخل نے صرف دو سال کے عرصے میں 80 ہزار دینار صرف کیے۔ مسجد کے گرد مدرسے، سرائیں اور ہسپتال کا خاکہ بھی تیار کیا گیا۔ دو سال بعد مسجد اس قدر تعمیر ہو گئی کہ اس میں نماز ادا کی جاسکے۔ عبدالرحمن الداخل نے نماز جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی اور جب 25 ربیع الاول 172ھ/12 اکتوبر 788ء کو عبدالرحمن الداخل نے اپنا سفر حیات مکمل کیا تو اسی مسجد میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور قرطبہ کے قصر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

عبدالرحمن الداخل نے قرطبہ کے قریب ایک شاندار باغ بھی لگوایا۔ اس کا نام انہوں نے ”رصافہ“ رکھا۔ دمشق میں عبدالرحمن کے دادا ہشام بن عبدالملک نے جو باغ لگوایا تھا اس کا نام بھی رصافہ تھا۔ رصافہ میں عبدالرحمن نے دور دور سے نایاب قسم کے پودے منگوا کر لگوائے۔ انہوں نے یہاں ایک خوبصورت قصر بھی تعمیر کروایا۔ عبدالرحمن کی ایک بہن ام الاصغ دمشق سے اپنے بھائی کو میوے اور پودے وغیرہ بھیجا کرتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے نہایت خوش ذائقہ انار بھیجے۔ عبدالرحمن نے یہ انار اپنے احباب میں بھی تقسیم کیے۔ ایک حصہ سفر بن زید الکلامی کو دیا گیا۔ سفر بن زید اس خاندان انصار سے تھے جو رسول اللہ کا علم بردار رہا تھا۔ ان دنوں وہ ریہ کے گاؤں میں تھے انار لے کر وہ گھر آئے اور اس کے بیج اپنے باغ میں بودیے ان بیجوں کی کونپلیں پھوٹیں ان کونپلوں نے آہستہ آہستہ درخت کا روپ دھارا اور پھر ان پر پھل بھی آ گیا۔

سفر بن زید یہ انار لے کر امیر عبدالرحمن کے پاس پہنچے یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ اتنا خوش ذائقہ انار اندلس کی سرزمین میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اس انار کے بیج رصافہ کے باغ میں بوئے جائیں پھر تو ایک وقت ایسا آیا کہ گھر گھر اس انار کے درخت نظر آنے لگے۔ چونکہ اس انار کا درخت اندلس میں پہلی بار سفر بن زید نے لگایا تھا اس لیے یہ انار ”رمان سفری“ کے نام سے مشہور ہو گیا (عربی میں انار کو رمان کہتے ہیں)۔

عبدالرحمن الداخل نے ہی اندلس کی سرزمین میں پہلی بار کھجور کا درخت لگایا۔ ایک فرانسیسی مؤرخ کا کہنا ہے کہ عربوں نے علم زراعت کو

انتہائے کمال تک ترقی دی۔ انہوں نے اسپین میں آبپاشی اور آب رسانی کے جو آلات استعمال کیے اسی قسم کے آلات سیکڑوں سال بعد یورپ میں استعمال کیے گئے۔ عبدالرحمن الداخل نے ملک بھر میں سڑکیں بنوائیں۔ ڈاک کا اعلیٰ انتظام کیا، محکمہ پولیس قائم کیا، جنوبی شہر المریہ میں سامان حرب تیار کرنے اور جہاز بنانے کے کارخانے قائم کروائے انہوں نے دارالحکومت میں ایک نکسال بھی تعمیر کروائی۔

عبدالرحمن الداخل اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے اس غرض سے وہ ملک بھر کے دورے کرتے تھے اور راتوں کو بھی بھیس بدل کر دورے کرتے۔ عام لوگوں کی شکایات سننے کے لیے خود بھی دربار میں بیٹھتے۔ مزاج کے بہت نرم دل، حلیم اور بردبار تھے۔ لوگ راہ چلتے ان کا ہاتھ تھام کر اپنا مسئلہ بیان کر دیتے تھے۔ امیر اندلس نے اپنے صاحب زادوں کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ سرکاری دفاتر اور عدالتوں کا اچانک معائنہ کرتے رہا کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کہیں کسی کو کوئی شکایت تو نہیں ہے۔

عبدالرحمن الداخل کی خصوصی توجہ کی بدولت چند سال میں قرطبہ کا حسن نکھر آیا۔ خوب صورت تعمیرات اور سرسبز شاداب باغات کی بہتات تھی۔ خصوصاً دارالعلوم کی عمارتیں بہت نفیس اور کشادہ تھیں امیر اندلس خود بھی علم کے جو یا تھے اور علم کی سرپرستی پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد حکومت میں اندلس میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ قرطبہ ایک بہت بڑا علمی مرکز بن گیا۔ دور دور سے اہل علم اور ماہرین فن یہاں اکٹھے ہو گئے۔

عبدالرحمن الداخل کے دربار میں علماء کرام اور اہل علم و دانش کا اجتماع رہتا تھا۔ لوگوں کا علمی ذوق اس قدر بلند تھا کہ وہ نظموں میں یا فصیح و بلیغ مراسلوں میں عبدالرحمن الداخل کو مخاطب کرتے اور عبدالرحمن اسی طرح علمی اور ادبی زبان میں انہیں جواب دیتے۔ ایسی بعض نظمیں اور مکالمے مؤرخین کے پاس محفوظ ہیں، امیر اندلس عبدالرحمن نے علم کو فروغ دینے کے لیے دنیا کے ہر حصہ سے علماء اور دانشوروں کو بلوایا۔ علمی تحقیقات کے لیے مجالس مقرر کیں۔ عوام میں علم کا شوق پیدا کرنے کے لیے مناظروں اور مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا اور اچھی نظموں اور مناظروں کی کامیابی پر انعامات دیے جاتے۔ عبدالرحمن خود بھی علمی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔

اندلس پر مسلمان سینکڑوں سال تک حکمران رہے۔ یہ دور بڑا تابناک، درخشاں اور یادگار ہے۔ اس دور کا جب بھی ذکر چھڑے گا، عبدالرحمن الداخل کا نام ضرور لیا جائے گا، جنہوں نے اپنے حسن سیرت، تدبیر اور خوش انتظامی کی بدولت اندلس کے گوشے گوشے کو علم و آگہی کی خوشبو سے مہکا دیا۔

اس خوشبو سے تاریخ کے اوراق آج بھی معطر ہیں۔!



ابو جعفر منصور

انہوں نے مسلمانوں کے ایک درخشاں عہد کی بنیاد ڈالی

مدینہ کی عدالت تھی!

محمد بن عمران طلحی جج کی مسند پر تشریف فرما تھے۔ مقدمات کی کارروائی جاری تھی۔ گواہیاں پیش ہو رہی تھیں۔ جرح کا سلسلہ چل رہا تھا اس اثناء میں چند اونٹ والے عدالت میں داخل ہوئے ان کا آپس میں یا اپنے ہم پیشہ افراد کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ وہ خلیفہ وقت کے خلاف ایک دعویٰ لے کر آئے تھے۔

جج صاحب نے دعویٰ سنا پھر اپنے پیش کار نمیر مدنی کو حکم دیا کہ وہ مدعا علیہ یعنی امیر المومنین کے نام عدالت میں طلبی کا پروانہ (سمن) جاری کر دیں تاکہ مدعا علیہ کو اپنی صفائی میں کہنے کا موقع دیا جائے اور اس کی موجودگی میں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔

پیش کار عجب شش و پنج میں پڑ گئے۔ امیر المومنین کے نام پروانہ جاری کرتے ہیں تو خدشہ ہے کہیں امیر المومنین ناراض نہ ہو جائیں پروانہ جاری کرنے سے انکار کرتے ہیں تو جج صاحب کے خفا ہونے کا اندیشہ ہے۔ نمیر مدنی نے کچھ جھجکتے ہوئے معذرت کی لیکن جج صاحب نے پھر حکم دیا کہ امیر المومنین کے نام پروانہ جاری کر دیا جائے چنانچہ پروانہ تیار ہو گیا۔ اس پر عدالت کی مہر ثبت کر دی گئی اور پیش کار صاحب پروانہ لے کر خلیفہ وقت کے پاس پہنچ گئے۔ نمیر مدنی کہتے ہیں کہ خلیفہ نے اپنے دربار میں مجھ سے پروانہ لے کر پڑھا تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اطراف بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ”کوئی میرے ساتھ نہ آئے۔ مجھے عدالت میں طلب کیا گیا ہے۔“

خلیفہ المسلمین مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے۔ اونٹ والے مدعیان بھی موجود تھے۔ حالت یہ تھی کہ نہ تو جج اور نہ کمرہ عدالت میں موجود کوئی بھی شخص امیر المومنین کی تعظیم کے لیے اُٹھا۔ اس وقت وہ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں جج کے روبرو پیش ہوئے تھے۔ کاشغری سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی اتنی بڑی مملکت اسلامیہ کا حکمران عدالت کے کٹہرے میں یکہ وتبا کھڑا تھا اس کے پاس خدام کی بھیڑ نہ تھی۔

مقدمہ پیش ہوا۔ ثبوت مانگے گئے۔ جج نے گواہیاں سنیں۔ سوال و جواب ہوئے اور بالآخر جج نے فیصلہ دے دیا۔ فیصلہ امیر المومنین کے خلاف ہوا تھا۔

یہ اسلام کا اعجاز ہے جس نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرایا ہے۔ عزت والا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ امیر المومنین نے فیصلہ سنا تو انہوں نے جج سے کہا۔ ”اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ مذہبی احکام اور حقوق کی پوری تعمیل کرتے ہیں اس سلسلے میں آپ کو دس ہزار اشرفیاں بطور انعام پیش کرتا ہوں۔“

یہ خلیفہ تھے ابو جعفر منصور۔ بنو عباس کے دوسرے خلیفہ جنہوں نے بائیس سال سے زیادہ عرصہ تک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکمرانی کی اور اپنی حکمت و تدبیر سے کام لیتے ہوئے بہت سے کارنامے انجام دیے۔ عباسی دور حکومت جو تقریباً پانچ سو سال کے عرصے پر محیط ہے اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن، شاندار اور ارتقائی عہد ہے۔ اس پورے دور میں محض اندرونی طور پر ہی دور رس تبدیلیاں نہیں آئیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کے اثرات نہایت ہمہ گیر اور وسعت پذیر تھے۔ اسلامی حکومت کے ان اثرات کو ہمہ گیری اور وسعت دلانے میں خلیفہ ابو جعفر منصور کا بڑا ہاتھ ہے۔

ابو جعفر منصور کا پورا نام جعفر عبداللہ بن محمد ہے۔ منصور ان کا لقب ہے۔ 95ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ سلامہ بڑی متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں، والد امام محمد بن علیؑ تابعی تھے، منصور نے ابوالعباس عبداللہ کے بعد ذی الحجہ 132ھ / جون 754ء میں خلافت کی ذمہ داری سنبھالی، اس وقت ان کی عمر 41 سال تھی۔ اس سے قبل وہ آرمینیا، آذربائیجان اور عراق کے والی تھے۔

تمام مورخین ابو جعفر منصور کے کمالات کے معترف ہیں۔ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ منصور، ہیبت و شجاعت، اصابت رائے اور سطوت کے لحاظ سے بنو عباس کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ مسعودی کے مطابق منصور خوبی تدبیر اور حسن سیاست کی معراج پر پہنچے ہوئے تھے۔ ابن طقطقی کا خیال ہے کہ منصور، عقل و دانش، علم، حسن تدبیر اور وقار و تمکنت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم حکمرانوں میں سے تھے۔

منصور کو علم سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی فقہ کے عالم تھے اور فصاحت و بلاغت اور شاعری سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ابن خلکان کے مطابق انہوں نے علم کے حصول کے لیے لمبے لمبے سفر کیے، جہاں کسی محدث کے بارے میں سنتے، ان کے پاس پہنچ جاتے اور علم حدیث حاصل کرتے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ منصور نے اپنے والد اور عطاء بن یسارؒ سے حدیث روایت کی۔ منصور ایک شاندار خطیب بھی تھے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں ”منصور نے میرے ساتھ اولین دور کے علماء اور بزرگوں کے بارے میں گفتگو شروع کی تو میں نے انہیں سب سے زیادہ علم والا پایا، فقہ اور دیگر علوم پر بات چھڑی تو وہ تمام مسائل کے بڑے عالم ثابت ہوئے، تمام روایتیں انہیں یاد تھیں۔“ منصور نے اپنے بیٹے مہدی کو امام مالکؒ کے پاس مدینے بھیجا، مہدی نے امام صاحب سے موطاء پڑھی۔

منصور کے عہد سے پہلے رواج یہ تھا کہ علماء کرام اپنی یادداشت کی مدد سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ خلیفہ منصور کے دور میں علم کو کتب کی صورت میں محفوظ کرنے کا باقاعدہ آغاز ہوا اور حدیث، فقہ اور تفسیر کی تدوین اور ترتیب بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی۔

ابن جریرؒ مکہ میں تھے۔ مدینہ میں امام وزاعیؒ تعلیم دے رہے تھے، بصرہ میں ابن ابی عروبہؒ اور حماد بن سلمہؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا اور کوفہ میں سفیان ثوریؒ علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ 143ھ / 760ء میں ان تمام علماء کرام اور فقہاء نے حدیث و فقہ اور تفسیر کو مرتب اور مدون کرنا شروع کر دیا۔ ابن اثیرؒ نے مغازی (جنگوں کے حالات اور غازیوں کے اوصاف) اور امام ابو حنیفہؒ نے فقہ اور قیاس پر کتابیں تالیف کیں۔ کچھ عرصہ بعد یتیم، لیثؒ پھر ابن مبارکؒ، امام ابو یوسفؒ اور ابن وہبؒ نے اپنی تصنیفات پیش کیں۔ اس کے علاوہ ادب، تاریخ، لغت اور سیرت پر کئی کتابیں لکھی گئیں، اس طرح پوری اسلامی مملکت علم و ادب کا گہوار بن گئی۔ منصور نے سریانی اور دیگر زبانوں میں کتب کے پہلی بار عربی ترجمے بھی کروائے اس سلسلے میں انہوں نے قیصر روم سے بھی کہا کہ اہم علمی کتب کے عربی ترجمے کروا کے بھیجیں۔ قیصر نے کئی کتب کے ترجمے بھجوائے اس طرح علم کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ منصور کے دور میں علم طب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ طبی کتب کے ترجمے ہوئے، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔

ایک بار کسی نے منصور سے پوچھا ”آپ کو کوئی تمنا ہے؟“ جواب ملا: ”میری آرزو یہ ہے کہ ایک چبوترہ ہو اور اصحاب حدیث میرے چاروں طرف موجود ہوں، جن سے میں احادیث نبویؐ سن سکاں اور اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔“

منصور کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ دن بھر امور مملکت انجام دیتے تھے، نماز عصر کے بعد کا وقت اپنے گھر والوں میں گزارتے تھے۔ رات میں پہلے سے طے شدہ ملاقاتیں ہوتیں۔ عشاء کے بعد مختلف مقامات سے آئے ہوئے خطوط کا مطالعہ کرتے۔ کچھ دیر آرام کے بعد رات کے آخری پہر تہجد کے لیے کھڑے ہو جاتے اور نماز فجر تک اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے، نماز فجر کی خود امامت کرتے اور دن چڑھنے پر دربار میں آکر سرکاری کاموں میں منہمک ہو جاتے۔

منصور مملکت کے انتظامات کو خدا خوفی کے بھرپور جذبہ کے ساتھ چلانے کے خواہشمند تھے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے۔ ”میں چاہتا ہوں چار آدمی نہایت دیانت دار اور پاکباز میرے پاس ہوں۔“ ایک بار لوگوں نے پوچھا۔ ”وہ چار آدمی کون ہیں۔“

جواب ملا! ”وہ جن کے بغیر کسی مملکت کا انتظام درست نہیں چل سکتا۔ ان کی مثال تخت کے چار پایوں کی سی ہے۔ جب تک وہ چاروں پائے عمدہ، مضبوط اور سیدھے نہ ہوں، تخت مضبوط نہیں رہ سکتا۔ ایک تو ایسا قاضی ہے جس پر اللہ کی راہ میں کسی لعنت ملامت کا اثر نہ ہو سکے۔ دوسرے کو تو ال جو قوی کے مقابلے میں ضعیف کے حق میں انصاف کر سکے۔ تیسرے وہ افسر ہے جو پوری مال گزاری وصول کرے لیکن رعایا پر ظلم نہ کرے اور چوتھے.....“ یہ کہہ کر خلیفہ وقت نے اپنا انگوٹھا تین مرتبہ دانتوں سے دبایا اور ہر مرتبہ ان کے منہ سے ”اف“ کی آواز نکلی۔ لوگوں نے پوچھا۔ ”چوتھا شخص کون ہے؟“ جواب ملا۔ ”وہ افسر ڈاک جو ان تمام افسران کی نہایت دیانتداری سے سچی خبریں مجھے لکھتا رہے۔“ منصور کے عہد میں ڈاک کے افسروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ اشیاء کے نرخوں کی نگرانی کرتے رہیں کہ کہیں حکومت کے مقرر کردہ نرخوں سے زیادہ قیمت پر اشیاء فروخت نہ ہو رہی ہوں۔

منصور کو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا بڑا احساس تھا۔ ایک بار وہ عرصہ تک منظر عام پر نہیں آئے تو عوام میں چرچا ہونے لگا کہ امیر المومنین بیمار پڑ گئے ہیں۔ ایک صاحب منصور کے پاس جا پہنچے اور ان سے عوام میں پھیلی ہوئی اس خبر کا تذکرہ کیا۔ منصور تھوڑی دیر سر نیچا کیے سوچتے رہے پھر بولے: ”عوام کو اب ہماری کیا ضرورت رہی؟ ہم نے ان کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے منصف مقرر کر دیے۔ ان کے راستوں کو محفوظ کر دیا، وہ دن رات بلا خوف و خطر سفر کر سکتے ہیں اور ہم نے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر دیا ہے۔ اب عوام کو ہماری کیا ضرورت ہے۔“

چند روز بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ سواری کا انتظام کیا جائے۔ پھر وہ سواری پر برآمد ہوئے اور عوام نے خلیفہ کو دیکھ لیا۔ منصور ذاتی طور پر سادگی پسند تھے۔ ایک بار ان کی خادمہ نے انہیں پیوند لگا ہوا کرتہ پہنے دیکھ لیا اور بولی ”خلیفہ اور پیوند لگا ہوا کرتہ؟“ منصور نے جواب میں ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی کوئی شخص اس حالت میں عزت و شرف حاصل کر لیتا ہے جب کہ اس کی چادر پرانی ہوتی ہے اور اس کی قمیض میں پیوند لگا ہوتا ہے پھر بولے ”اے خادمہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔“

مسعودی کہتے ہیں کہ منصور کو جس معاملے میں نفع کی توقع ہوتی تھی اس میں بے دریغ رقم صرف کر دیتے تھے اور جہاں رقم ضائع ہونے کا امکان ہوتا وہاں تھوڑا سا پیسہ بھی صرف نہ کرتے۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ مال بیکار ضائع نہ کیا جائے اپنے لڑکے مہدی کو حکم دیا تھا کہ خزانے کو کفایت شعاری سے خرچ کیا جائے۔ بعض افسران نے شاعروں کو بڑے بڑے انعامات دیے۔ منصور کو اطلاع ملی تو انہوں نے افسران کو سختی سے انتباہ کیا اور شاعروں کو کچھ انعام دے کر باقی رقم واپس لے لی۔ ایک بار وہ اپنی رہائش گاہ کے دروازے سے داخل ہوئے تو دیکھا تین قندیلیں روشن ہیں۔ فوراً سوال کیا کہ ”کیا ایک قندیل کافی نہ تھی۔“

حضر موت کے گورنر اکثر شکار کے لیے جایا کرتے تھے۔ منصور کو اطلاع ملی تو سختی سے انتباہ کیا کہ ہم نے آپ کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے مقرر کیا تھا نہ کہ جانوروں کو تکلیف دینے کے لیے اور گورنر کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا۔

اصمعی کہتے ہیں کہ خلیفہ منصور نے ایک بار ایک شخص کو سزا دینے کے لیے بلایا۔ اس شخص نے کہا ”امیر المومنین بدلہ لینا عدل و انصاف ہے اور معاف کر دینا اس سے بھی زیادہ بہتر کام ہے۔“ یہ سن کر منصور نے اسے معاف کر دیا۔

عباسیہ خاندان کے اس دوسرے خلیفہ کے عہد حکومت میں لوگوں کو عام آزادی تھی کہ اگر کسی کو کسی حاکم یا افسر سے تکلیف پہنچے تو وہ کسی روک ٹوک کے بغیر خلیفہ تک پہنچ کر شکایت کر سکتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے ایک افسر کی شکایت کی کہ اس نے اس کی جائیداد کا کچھ حصہ اپنی جائیداد میں شامل کر لیا ہے۔ خلیفہ نے فوراً اس افسر کو لکھا کہ اگر تم عدل کرو گے تو سلامتی ہمیشہ تمہارا ساتھ دے گی۔

سوار بن عبد اللہ بصرہ کے جج تھے۔ انہیں ایک دن منصور نے پیغام بھیجا کہ زمین کے بارے میں گھوڑے ہانکنے والے اور تاجر کا جو مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے اس میں آپ گھوڑے ہانکنے والے کے حق میں فیصلہ دے دیں۔ وہاں سے جواب آیا کہ شہادتوں سے ثابت ہے کہ زمین

تاجر کی ہے۔ میں شہادتوں اور ثبوت کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔ منصور نے پھر پیغام بھجوایا کہ گھوڑے ہانکنے والے کے حق میں یہ فیصلہ دے دیں لیکن سوار بن عبداللہ نے جواب بھجوایا کہ خدا کی قسم میں یہ فیصلہ نہیں دے سکتا۔ منصور نے یہ جواب سنا تو کہا ”بخدا میں نے روئے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیا ہے۔“ سب سے پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ بھی منصور نے قائم کیا۔ اس عہدے پر قاضی ابن ابی لیلیٰ مقرر ہوئے جو تیس سال تک اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔

خلیفہ منصور کے عہد میں مختلف بغاوتوں کو فرو کیا گیا اس کے علاوہ سندھ کے مختلف حصوں میں فوجیں روانہ کی گئیں۔ طبرستان اور دیلمہ میں بھی مہمات بھیجیں اور وہاں عرب والی مقرر کیے۔

132ھ میں قیصر روم نے ملطیہ پر چڑھائی کر دی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ ملطیہ اسلامی اور رومی سرحد کا اہم مورچہ تھا۔ خلیفہ منصور نے الطاکبہ کے گورنر عباس محمد کو مقابلے پر بھیجا جنہوں نے رومیوں کو مار بھگا یا۔ 136ھ میں عباس نے ملطیہ کو دوبارہ تعمیر اور آباد کیا۔ 140ھ میں منصور نے ملطیہ میں قلعہ تعمیر کروایا۔ 155ھ/772ء تک قیصر روم سے کشمکش جاری رہی۔ بالآخر قیصر نے منصور سے مصالحت کی درخواست کی اور ہر سال ایک بڑی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ منصور نے سرحدی دفاع پر خصوصی توجہ دی۔ سرحدی قلعے تعمیر کروائے۔ انہوں نے دو شہروں ملطیہ اور المسیہ کو ازسرنو تعمیر کروایا۔

منصور ذی الحجہ کے مہینے میں پیدا ہوئے۔ ذی الحجہ میں خلافت کی مسند پر بیٹھے اور ذی الحجہ ہی میں انہوں نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ آخری عمر میں وہ علیل رہنے لگے تھے ان کو معدہ میں خرابی کی شکایت تھی۔ طبیعوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ علاج تو ممکن ہے لیکن جو دوائیں استعمال ہوں گی وہ بذات خود گرم ہوتی ہیں۔ ان کا فوری اثر تو ہوگا لیکن بعد میں نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ اسی زمانے میں ہندوستان سے ایک طبیب آئے انہوں نے کئی سفوف اور جوارش تیار کیں۔ منصور نے انہیں استعمال کیا تو کھانا ہضم ہونے لگا تاہم دیگر معالجوں کا کہنا تھا کہ ان دواؤں سے خلیفہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ذی الحجہ 158ھ/ اکتوبر 775ء میں منصور احرام باندھ کر حج کے ارادے سے نکلے لیکن راستے ہی میں ان کی حیات کے دن پورے ہو گئے۔ مکہ مکرمہ سے چند میل پہلے بطن کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا انہیں باب معلیٰ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

منصور کی ذات میں ہمیں ایک خدا ترس اور صالح سوچ رکھنے والا حکمران نظر آتا ہے انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے جو طویل وصیت نامہ لکھا ہے اس میں انہیں امور مملکت کے بارے میں بہت سی نصیحتیں کی ہیں اس وصیت کے ایک حصہ میں انہوں نے لکھا۔!

”بیٹا! محمدؐ کی امت کی حفاظت، اس کے بدلے اللہ تمہارے کاموں کی حفاظت کرے گا۔ حرام خونریزی سے بچنا کہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے حلال کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ اس میں تمہارے لیے آخرت میں بھی ثواب ہے اور دنیا میں بھی بھلائی ہے اعتدال سے نہ بڑھنا کہ اس میں ہلاکت ہے۔“



سلطان محمد فاتح

سلطنت عثمانیہ کے ساتویں حکمران جنہیں قسطنطنیہ کا فاتح ہونے کا اعزاز نصیب ہوا

چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھا غلطے کے نواح میں واقع درختوں کے گھنے جھنڈ، ٹھنڈی اور پرسکون چاندنی میں نہائے ہوئے تھے ہوا کے نرم جھونکے پتوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے لیکن موسم گرما کی اس رات فضا میں ایک اضطراب سا تھا۔ ہزاروں افراد زمین پر لکڑی کے تختے بچھانے میں مصروف تھے اور بہت سے ان تختوں پر گائے کی چربی مل کر انہیں چکنا بنا رہے تھے۔

چاند نے اس منظر کو حیرت سے دیکھا اور شاید اپنی حیرت رفع کرنے کی خاطر آگے بڑھ آیا لیکن آنے والے لمحات اس کی حیرت میں اضافہ ہی کا باعث بنے کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ درجنوں بادبانی جہاز لکڑی کے ان تختوں پر چڑھائے جا رہے تھے جہازوں کو توپانی میں تیرنا چاہیے لکڑی کے تختوں پر انہیں سوار کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر چاند نے تعجب سے دیکھا کہ ہزاروں انسان کی مشترکہ قوت نے ان جہازوں کو چکنے تختوں پر دھکیلنا شروع کر دیا ہے خشکی پر بادبانی جہازوں کا یہ انوکھا سفر کوئی دس میل طویل تھا اور اس کے سفر اختتام پر سمندر کی پرسکون لہریں آنے والے کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

چوبی تختوں کے سینے پر بحری جہازوں کو سفر کروانے کا اچھوتا خیال جس حکمران کے ذہن رسا میں آیا تھا وہ تھے سلطنت عثمانیہ کے ساتویں حکمران، سلطان ابوالفتح محمد ثانی جنہوں نے اپنی اس لا جواب تدبیر کو اپنا کر اس شہر کو تسخیر کر ڈالا جس کو فتح کرنے والے کے لیے سرور دو جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت کی دعا فرمائی۔ ہماری مراد شہر قسطنطنیہ سے ہے جس کی فتح نے سلطان محمد ثانی کو فاتح کے لقب سے نوازا اور ان کا نام تاریخ کے سنہرے صفحات میں شامل کر لیا۔

سلطان محمد کو ثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے قبل عثمانی خاندان میں ایک اور محمد خان حکمران تھے لیکن سلطان محمد ثانی اب محمد فاتح کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ رجب 832ھ / اپریل 1429ء میں پیدا ہوئے ان کے والد مراد ثانی بھی سلطان تھے۔ محمد ثانی نے ہوش سنبھالا تو والد مغنیہ کے حاکم تھے۔ والد کی وفات کے بعد محرم 855ھ / فروری 1451ء میں محمد ثانی نے مملکت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔

سلطان محمد ثانی کا دور حکومت 855ھ / 1451ء سے لے کر 886ھ / 1481ء میں ان کی وفات تک تیس سال کے عرصے پر محیط ہے اس عرصہ میں سلطان نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے نہایت جرأت کے ساتھ وسیع علاقوں پر فوج کشی کی اور ان علاقوں کو فتح کر کے اسلامی مملکت کا حصہ بنا دیا۔ ان کی فتوحات کی بدولت سلطنت عثمانیہ کو بہت وسعت حاصل ہوئی اور سولہویں صدی میں اس کے مزید وسیع ہونے کے امکانات پیدا ہوئے۔ سلطان نے اپنے تیس سالہ عہد حکومت میں 12 سلطنتیں اور ریاستیں اور 200 سے زائد شہر اور قلعے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیے لیکن ان کا پہلا اور سب سے زیادہ درخشاں کارنامہ شہر قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ قسطنطنیہ اب ”استنبول“ کہلاتا ہے۔

قسطنطنیہ شہر کو روم کے شہنشاہ قسطنطین اول نے 330ء میں آباد کیا تھا۔ یہ شہر جو آبنائے باسفورس کے کنارے اس مقام پر آباد ہے جہاں سے یورپ کی سرحد شروع ہوتی ہے سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح ہونے کے بعد پونے پانچ سو سال سے زیادہ عرصے تک مملکت اسلامیہ کا دارالحکومت بنا رہا۔ اس شہر کو اس لیے بے حد اہمیت حاصل ہے کہ اس کو فتح کرنے والی فوج اور اس کے سالار کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ

و سلم نے بشارت دی ہے کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگا اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔ (بخاری) اس کے علاوہ مسلم، ابو داؤد اور ترمذی میں بھی یہ حدیث موجود ہے کہ ”تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کر لو گے۔ رحمت ہو اس حکمران اور اس لشکر پر جس کے ہاتھوں یہ فتح نصیب ہو۔“

قسطنطنیہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر ساتویں صدی عیسوی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی کے نصف اول تک اس شہر کو فتح کرنے کی مسلمانوں نے دس مرتبہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ قسطنطنیہ کو تسخیر کرنے کی سعادت پانے کے خواہشمند میں کئی بلند پایہ صحابہ کرامؓ سمیت بہت سے لوگ شامل تھے۔ 48ھ/668ء میں اس شہر کے محاصرے کے دوران صحابی رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے شہادت پائی اور قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے سپرد خاک کیے گئے۔

رب کائنات کا فیصلہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا اعزاز سلطنت عثمانیہ کے ایک حکمران سلطان غازی محمد ثانی کو حاصل ہو۔ سلطان محمد ثانی نے جب سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو قسطنطنیہ پر قیصر قسطنطین دوازدہم حکومت کر رہا تھا۔ اس زمانے میں رومی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا صرف قسطنطنیہ باقی تھا اگر یہ شہر تسخیر ہو جاتا تو یورپی ممالک کی فتوحات کا دروازہ مسلمانوں کے لیے کھل جاتا۔

6 ربیع الآخر 857ھ/6 اپریل 1453ء کو قسطنطنیہ کا تاریخی محاصرہ شروع ہوا سلطان محمد ثانی خشکی کی طرف سے قسطنطنیہ کے سامنے نمودار ہوئے ادھر عثمانی جہازوں نے بحیرہ مارمورا میں سمٹ کر بندرگاہ قسطنطنیہ یعنی شاخ زریں کے سامنے بحری محاصرہ شروع کر دیا۔ فسیل پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ دونوں جانب بڑا جوش و خروش تھا تیر برس رہے تھے اور توپوں سے آگ اور دھواں نکل رہا تھا۔ سلطان محمد ثانی نے اپنا خیمہ شہر کے دروازے سینٹ رومانوس کے سامنے نصب کروایا تھا اسی دروازے پر سلطان کی فوج اپنا زیادہ زور صرف کر رہی تھی۔ چند دن تک گولہ باری کے نتیجے میں فسیل میں کچھ شکاف پڑ گئے لیکن عیسائیوں نے انہیں جلد ہی پر کر لیا۔ مسلمان فسیل پر چڑھنے میں ابھی تک کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

سلطان محمد ثانی کئی دن کے محاصرہ کے بعد سمجھ چکے تھے کہ جب تک بحری اور بری دونوں جانب سے حملہ نہیں کیا جائے گا شہر کو تسخیر کرنا بہت مشکل ہوگا بحری سمت سے حملہ اس لیے دشوار تھا کہ شاخ زریں کے دہانے کے قریب قسطنطنیہ کے جہاز پہرہ دے رہے تھے۔ آخر سلطان کو ایک عمدہ ترکیب سوچھ گئی۔ شاخ زریں کی بندرگاہ سے مشرق کی سمت میں دس میل چوڑی خشک پٹی تھی جس کی دوسری جانب آبائے باسفورس میں سلطان کے جہاز نقل و حرکت کر رہے تھے۔ یہ پٹی غلطے کے نواحی علاقے کے پیچھے سے گزرتی تھی اور اس پر درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔

امیر لشکر محمد ثانی کے حکم پر اس راستے کی ناہمواری کو دور کیا گیا اور پھر اس پر لکڑی کے مضبوط تختے بچھا دیے گئے ان تختوں پر بھیڑوں اور گائے کی چربی مل کر انہیں خوب چکنا بنا دیا گیا۔ اب 80 سے زائد بادبانی جہاز جو پچاس اور تیس پتھاروں سے چلنے والے تھے باسفورس کے ساحل پر لگا دیے گئے جہازوں کو بڑی ہوشیاری سے لکڑی کے تختوں پر چڑھا دیا گیا۔ یہ 14 جمادی الاول 857ھ/23 مئی 1453ء کی رات تھی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ بادبان ہوا کے رخ پر کھول دیے گئے۔ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے رزمیہ نغمے الاپے جانے لگے۔ ہزاروں افراد نے جہازوں کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ ان کا شور و غل، انقلابی نعرے، رزمیہ گیت، اس رات قسطنطنیہ والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں لیکن صبح ہوئی اور آفتاب طلوع ہوا تو شہر والے یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے اسلامی فوج کے جہاز فسیل شہر کے نیچے پہنچ چکے ہیں اور سمندر کے تنگ حصہ پر لکڑی کے شہتیروں اور زنجیروں سے بنا ہوا ایک ٹھوس فرش تیر رہا ہے جس پر توپ خانہ بھی نصب ہے۔ قسطنطین اور اس کی فوج تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ مسلمان اتنے زبردست دفاعی حصار کو یوں توڑ کر شہر کی فسیل تک پہنچ جائیں گے۔

19 جمادی الاول 857ھ (28 مئی 1453ء) کو سلطان نے اپنی فوج میں اعلان کر دیا کہ کل صبح سویرے شہر پر فیصلہ کن حملہ ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ اسلامی فوج کو فتح سے ہمکنار کرے تو کوئی فوج اس طلب کرنے والی رعایا، ضعیفوں، بچوں وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائے اور سرکاری عمارتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ادھر قسطنطین کو بھی اطلاع مل چکی تھی کہ اگلے دن مسلمان بھرپور حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس نے اپنے تمام مشیروں اور افسروں کو طلب کر لیا۔ مورخ فرانزا خود بھی اس مجلس مشاورت میں موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور لوگ ایک

دوسرے سے گلے مل کر رہے تھے، مسطین نے سب کو دلاسا دینے کی کوشش کی اور آخری سانس تک لڑنے کا وعدہ لیا۔ کچھ دیر بعد سینٹ آیا صوفیہ کے کلیسا میں عشاء ربانی کی دعائیں گونج رہی تھیں۔

ادھر سلطان کی فوج بھی عبادت بھی مصروف تھی اور اللہ سے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ صبح کا اجالا پھیلا تو فضا نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعروں سے دہل اٹھی۔ دلوں میں شوق شہادت لیے مجاہدوں نے شہر کی فصیل پر زبردست حملہ کر دیا۔ یہ اتنا شدید تھا کہ فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا اور اس حصہ سے مسلمان سپاہی شہر میں داخل ہو گئے، دست بہ دست جنگ شروع ہو گئی۔ عیسائی فوج اس لڑائی میں زیادہ دیر نہ ٹک سکے۔ ادھر فصیل گری اور ادھر بندرگاہ کی طرف سے سلطان کے ایک بحری دستے نے ایک برج پر قبضہ کر کے اسلامی فوجی کا علم بلند کر دیا۔ گھمسان کارن پڑا اور لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اب تک تو جینوا کا کمانڈر جسٹینیائی، قسطنطنیہ کی فوج کو جوش دلارہا تھا لیکن لڑائی کے دوران جسٹینیائی زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے پر فوج میں بددی پھیل گئی یہ رنگ دیکھ کر قسطنطنیہ نے اپنی امتیازی سرخ عبا اتار پھینکی اور عام سپاہیوں کی طرح لڑتے ہوئے مارا گیا۔

ظہر کے وقت قسطنطنیہ تسخیر ہو چکا تھا۔ سلطان محمد شہر میں داخل ہوئے۔ سینٹ آیا صوفیہ کے کلیسا پہنچے۔ وہاں صفائی کروائی اور پہلی بار اس شہر کی فضاؤں میں یہ آفاقی کلمات گونج اٹھے ”اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔“ بے شک اللہ سب سے بڑا ہے اس نے اپنے ان کمزور بندوں کو طاقت و انسانوں پر غلبہ عطا کیا جو ہر حال میں اور ہر لمحے اپنے رب کو یاد رکھتے تھے اسی کی مدد چاہتے تھے اور اسی کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے تھے۔ باری تعالیٰ نے اپنے بھیجے ہوئے دین اسلام کے نام لیوا ان بندوں کی پکار پر لبیک کہا اور ان پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے وہ شہر قسطنطنیہ جس کو تسخیر کرنے والوں کے لیے رسول خدا نے بشارت دی تھی، جب مسلمانوں کے زیر نگیں آیا تو پھر مسلمانوں کو روکنا اہل یورپ کے لیے ممکن نہ رہا اور ایک ایک کر کے یورپی علاقے مسلمانوں کے زیر تسلط آتے چلے گئے۔

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے شہروں کے ساتھ حسن سلوک کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ آیا صوفیہ کے سوا باقی کلیساؤں کو قائم رکھا گیا۔ عیسائیوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ جنگی قیدیوں کو خود سلطان نے اپنے سپاہیوں سے خرید کر آزاد کیا۔

قسطنطنیہ کی فتح کے اگلے سال سلطان محمد فاتح جنوبی یونان کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں کی خود مختار ریاستوں کو فتح کیا۔ پھر بحیرہ اسود کے جنوبی ساحل پر طرابزون پر اسلامی پرچم لہرایا۔ 860ھ/1456ء میں واپس قسطنطنیہ آکر سربوہ اور بوسینیا کو عثمانی سلطنت میں شامل کیا 861ھ/1457ء میں اسلامی فوج ہنگری کی طرف بڑھی۔ بلغراد کا محاصرہ کیا گیا لیکن زبردست لڑائی میں خود سلطان زخمی ہوئے اور بعض وجود کی بناء پر بلغراد فتح نہ ہو سکا تاہم کچھ ہی عرصہ بعد سلطان نے البانیہ پر فوج کشی کی اور اسے بھی سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا دیا۔

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تشویش میں مبتلا ہو کر وینس نے بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ سلطان نے فوراً سمندر کے کنارے دور دور تک وینس کے علاقوں پر حملہ کر کے انہیں فتح کر لیا۔ یہاں تک کہ خود وینس والوں نے سلطان سے صلح کر لی۔ اب اسلامی حکومت، ساحل شام سے لے کر بحیرہ ایڈریا تک پھیل چکی تھی۔

879ھ/1474ء میں سلطان نے اپنے سپہ سالار احمد قیدوق کو کریمیا پر حملے کے لیے بحیرہ اسود کی جانب روانہ کیا۔ احمد قیدوق چالیس ہزار کی فوج لے گئے اور چار دن کے محاصرہ کے بعد یافہ کو فتح کر لیا۔ کریمیا کے خان نے عثمانی سلطنت کی اطاعت قبول کی اور پھر تین سو سال تک کریمیا کے خواتین، سلطنت عثمانیہ کے وفادار رہے۔

885ھ/1480ء میں سلطان محمد فاتح نے اپنے سپہ سالار احمد قیدوق کو جنوبی اٹلی روانہ کیا۔ چنانچہ احمد قیدوق نے اٹلی کے ساحل پر اتر کر شہر اوٹرانٹو کا محاصرہ کر لیا۔ 5 جمادی الآخر 885ھ/11 اگست 1480ء کو شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اوٹرانٹو کے مسلمانوں کے قبضہ میں چلے جانے سے پورے اٹلی میں کھلبلی مچ گئی اور زبردست دفاعی تیاریاں ہونے لگیں۔ سلطان کو فتح کی خوشخبری ملی تو انہوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ آبنائے باسفورس کے کنارے فوجی علم نصب کروا دیے گئے جو اس بات کی علامت تھے کہ سلطان فوج کے ساتھ کسی مہم پر روانہ ہونے والے

ہیں لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سلطان کی منزل کون سی ہے کیونکہ سلطان اپنے جنگی منصوبے ہمیشہ راز میں رکھتے تھے بہر حال گمان غالب یہی ہے کہ وہ اٹلی پر حملے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے ہی سلطان بیمار پڑے اور یہی بیماری ان کے لیے پیام اجل لے کر آئی۔ 3 ربیع الاول 886ھ / 2 مئی 1481ء کو قسطنطنیہ کے اس عظیم اور اولوالعزم فاتح نے موت کو گلے لگالیا۔ انہیں قسطنطنیہ واپس لایا گیا اور جامع فاتح کے قریب قسطنطنیہ کی خاک نے فاتح کے جسم کو اپنی آغوش میں چھپالیا۔

سلطان محمد فاتح کی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ان کی ذات بڑی ہمہ گیر نظر آتی ہے وہ نہ صرف ایک اولوالعزم، دانشمند اور دلیر قائد تھے۔ بلکہ اعلیٰ پائے کے منتظم بھی تھے۔ انہیں کتاب اللہ سے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے بہترین اساتذہ کی زیر نگرانی متعدد علوم و فنون حاصل کیے تھے۔ علم سے ان کے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد بھی حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہ زبردست عالم بھی تھے اور انہیں قرآن وحدیث، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعیات اور علم ہیئت پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ عربی، فارسی، ترکی، لاطینی اور عبرانی کے ماہر بھی تھے اور یہ زبانیں روانی سے بول سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی مملکت میں بھی علم و فن کے عام کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے جس کا اعتراف متعدد مؤرخین نے کیا ہے۔ کریمی کہتے ہیں کہ محمد ثانی کے پیش روؤں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے کا بڑا شوق تھا لیکن محمد ان سب سے آگے تھے انہوں نے سلسلہ علماء قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و تربیت کا ضابطہ مرتب کیا وہ جانتے تھے کہ عدالت کا نظم و نسق درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ قاضیوں کا احترام قائم کیا جائے اور وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے عہدہ پر مقرر ہوں اور افلاس کے وسوسوں اور پریشانیوں سے محفوظ کر دیے جائیں علامہ شبلی ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ میں لکھتے ہیں کہ ”ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولیٹیکل حیثیت رکھتا تھا وہ سلطنت کے لائق لائق عہدیدار پیدا کرتا تھا۔“

علماء کی جماعت کا رکن بننے کے لیے ”دانشمند“ کی سند حاصل کرنے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کا ایک طویل نصاب مکمل کرنا پڑتا تھا اور مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کرنا پڑتی تھی جو لوگ علماء کی اس جماعت کے رکن منتخب ہو جاتے تھے انہیں حکومت بڑے بڑے عہدے دیتی تھی اور انہیں خاص رعایتیں اور حقوق حاصل ہوتے تھے مدارس (کالجوں) کے اساتذہ علماء کی جماعت سے مقرر ہوتے تھے۔ یہ اساتذہ ”مدرس“ کہلاتے تھے علماء کی اسی جماعت سے عدالتوں کے تمام حکام کا انتخاب ہوتا تھا جن میں قصبوں، دیہات اور بڑے شہروں کے قاضی (جج) قاضی القضاہ (چیف جسٹس) اور مفتی شامل تھے۔ محمد فاتح نے اپنے دربار میں وزراء، سپہ سالار، پیش کار وغیرہ کے ساتھ علماء دین کی جماعت کی موجودگی لازمی قرار دی تھی اور علماء کا درجہ اراکین سلطنت میں سب سے بالاتر رکھا تھا۔

سلطان محمد ثانی ایک عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیرات کا بہت اچھا ذوق بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ اور دیگر شہروں میں نہایت خوبصورت مساجد تعمیر کروائیں ان میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے نام پر تعمیر کی گئی جامع مسجد ابوہیوہی خاص طور پر قابل ذکر ہے اس مسجد کو سلطان محمد فاتح نے 863ھ / 1458ء - 1459ء میں تعمیر کروایا تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر اسی مسجد کے قریب واقع ہے۔ اس کے علاوہ محمد فاتح نے قسطنطنیہ میں آیا صوفیہ کلیسا کو مسجد میں تبدیل کیا شاخ زریں پروان کہان کے اوپر ایک خانقاہ تھی۔ فتح کے بعد یہاں کچھ دن چھڑا رنگنے کا کارخانہ رہا بعد میں سلطان سے اسے مسجد جامع زریک بنادیا 870ھ / 1465ء میں جامع مرادپاشا تعمیر کی گئی۔ قسطنطنیہ میں چوتھی پہاڑی پر جامع محمدیہ (جامع فاتح) 867ھ / 63-1462ء میں تعمیر کروائی اس میں 8 مدرسے بھی شامل تھے۔ اسی مسجد کے قریب سلطان کو سپرد خاک کیا گیا۔

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے بچوں بچ تیسری پہاڑی پر ایک قصر تعمیر کروایا جو بعد کے دور میں ”اسکی سرای“ (قدیم محل) کہلانے لگا 1870ء میں اسے منہدم کر کے اس جگہ نئی عمارت کھڑی کر دی گئی لیکن اس کا قدیم نام اسکی سرای، عوام میں بدستور رائج رہا۔ 878ھ / 1473ء میں سلطان نے ایک اور قصر اس پہاڑی کی چوٹی پر بنانا شروع کیا جو بحیرہ مارمورا سے باسفورس میں داخلے کے دروازے اور شاخ زریں کے درمیان واقع ہے۔ 882ھ / 1477ء میں چینی محل کی عمارت بنوائی۔ اس عمارت کو اب عجائب خانوں سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ یہ محل الگ الگ عمارتوں کے

ایک پیچیدہ مجموعے پر مشتمل ہے اس میں تین بڑے صحن ہیں جن میں داخل ہونے کے تین بڑے دروازے ہیں جو باب ہمایوں، باب اسلام اور باب سعادت کہلاتے ہیں پہلے صحن میں دیگر عمارتوں کے علاوہ محل کا اسلحہ خانہ بھی تھا۔ 1032ھ/1623ء کے بعد یہاں نکسال بنائی گئی۔

محمد فاتح نے فتح کے چند سال بعد قسطنطنیہ کی فصیلوں کی مرمت کروائی اور سات برجوں کا قلعہ تعمیر کروایا جو ”یدی قلعہ“ کہلاتا تھا یہ قلعہ سترہویں صدی عیسوی تک خزانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا سلطان نے بلغراد کے قریب سیرمہ میں ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ سلطان نے قسطنطنیہ میں ایک مسقف (چھت دار) بازار بھی بنوایا اور متعدد شفا خانے اور کتب خانے قائم کیے۔ رومی شہنشاہوں نے باسفورس کے یورپی ساحل کے دور دراز چشموں سے نئے کاریز اور پائپوں سے پانی شہر تک پہنچایا تھا محمد فاتح نے آب رسانی کے ذرائع کو مزید ترقی دی۔

اسلام جس انداز کے رہن سہن، تہذیب و ثقافت اور طرز بود و باش کی اجازت دیتا ہے وہ دیگر مذاہب سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ سلطان نے زمام کار سنبھالتے ہی حکم دیا کہ چوراہوں اور عوامی مقامات پر لگے مجسمے ڈھا دیے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جسٹینین کا گھر سوار مجسمہ جو کانسی کا بنا ہوا تھا پگھلا دیا گیا اور اس کی توپیں ڈھال لی گئیں۔ سلطان نے شاخ زریں کے شمالی ساحل پر اوق میدان (تیر اندازی کا میدان) بھی بنوایا تھا۔ اس میدان میں بہت سے حکمرانوں اور سلاطین نے تیر اندازی کی مشق کی۔

سلطان محمد فاتح ایک اچھے شاعر بھی تھے اور ”عمونی“ تخلص کرتے تھے۔ وہ ہر سال خواجہ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کو قیمتی تحائف بھیجتے تھے۔ سلطان کو مشاہیر کے کارناموں سے بڑی دلچسپی تھی وہ سکندر اعظم اور قسطنطنیہ کی سوانح ہائے حیات پڑھا کرتے تھے۔ ان کے حکم پر یونانی سوانح نگار پلوٹارک کی مشہور تالیف کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب میں یونان اور روم کے مشاہیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

سلطنت عثمانیہ کی ابتداء 687ھ/1288ء میں اس وقت ہوئی تھی جب ایک ترک سردار ارطغرل کے بیٹے عثمان اول نے سعوت کے علاقے میں اقتدار حاصل کیا تھا۔ یہ چھوٹی سی اسلامی سلطنت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی اور دنیا کے بہت سے گوشے ضیائے اسلام سے روشن ہوتے گئے۔ چھ صدیوں سے زائد عرصہ تک عثمانی سلسلے سے وابستہ حکمران، مملکت اسلامیہ کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے انہوں نے اسلام کے پیغام کو عام کرنے اور مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ سلطنت عثمانیہ کو یہ دوام اور یہ استحکام دلوانے میں عظیم سلطان محمد فاتح کا کردار بلاشبہ ناقابل فراموش ہے۔

سلطان محمد فاتح نے پوری مملکت میں تعلیمی اداروں کا جال بچھا دیا تھا۔ باقاعدہ نظام تعلیم کے تحت تمام بڑے دیہات میں مکاتب (اسکول) کھول دیے گئے تھے اس کے علاوہ اونچے درجے کے مدارس کثرت سے قائم کیے گئے تھے۔ ان مدرسوں کا درجہ موجودہ دور کے کالجوں کے برابر تھا اور ان میں دس مضامین یعنی صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، لسانیات، بلاغت، طرز تحریر، فن خطابت، اقلیدس اور ہیئت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو طلبہ ان تمام مضامین کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر لیتے تھے انہیں ”دانشمند کی سند ملتی تھی۔ یہ سند کسی ابتدائی مدرسہ میں تدریس کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی۔

☆☆☆

ہارون الرشید

ان کا 23 سالہ عہد خلافت اسلامی تاریخ کا روشن اور فروزاں باب ہے

یہ ایک سردرات تھی۔

پہاڑی کے دامن میں آباد شہر ”رے“ کی گلیاں تاریک اور سنسان تھیں۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا کے جھونکے، درختوں کے پتوں کو بے کل کیے دیتے تھے۔ شہر کے تمام باشندے نرم و گرم بستروں میں سہانی نیند سو رہے تھے لیکن پہاڑی کی چوٹی پر بنے قلعہ نمائل، ”زیندی“ میں بڑی رونق تھی جہاں ایک کمرے میں ایک خاتون اپنے بچے کو متنا بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھوں والے گورے چٹے اور صحت مند، اس بچے نے کچھ ہی دیر قبل اس دنیا میں قدم رکھا تھا۔ یہ خیزراں کا دوسرا بچہ تھا..... خیزراں..... جو خلیفہ وقت ابو جعفر منصور کے صاحب زادے محمد بن منصور کی رفیقہ حیات تھیں۔

محمد بن منصور نے اپنے بچے کا نام ہارون رکھا۔

ہارون اپنی زندگی کے دوسرے سال میں داخل ہوئے تو بھائیوں اور اپنے ہم عمر دیگر بچوں کے ساتھ ”زیندی“ کے باغات میں کھیلنے کودنے لگے۔ انہیں فسیل پر جا کر شہر کا نظارہ کرنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاید ان کی آنکھوں کو وہ سرسبز شاداب کھیت بھاگئے تھے جو میدانوں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

یوں ہی تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ اچانک ہارون کے والد کو بغداد سے ان کے پدر محترم خلیفہ ابو جعفر منصور کی جانب سے حکم ملا کہ وہ اہل خانہ سمیت بغداد چلے آئیں۔ محمد بن منصور نے اہل خاندان کو تیاری کا حکم دیا۔ رخت سفر باندھا اور ایک فوجی لشکر کی حفاظت میں یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ ننھے ہارون بھی اس قافلے کے ایک مسافر تھے۔ جن کی معصوم نگاہوں نے اب تک ”رے“ اور اس کے مضافات سے آگے کچھ نہ دیکھا تھا۔

یہ سفر بڑا ہی تھکا دینے والا اور پر صعوبت تھا۔ راستے میں کئی بڑے پہاڑ آتے تھے۔ 151ھ کے ماہ شوال (اکتوبر 768ء) میں یہ قافلہ باب خراساں کو پار کر کے بغداد کی حدود میں داخل ہوا اور قافلے کے شرکاء بغداد کے نواح میں واقعی بستی ”رصافہ“ میں جا ٹھہرے۔

سفر کی تکان دور کرنے کے بعد محمد بن منصور اپنے والد ابو جعفر منصور کی خدمت میں اپنے تینوں بچوں سمیت حاضر ہوئے دادا نے تینوں پوتوں، موسیٰ، علی اور ہارون کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور انہیں بوسہ دیا۔ ان تینوں میں انہیں ہارون کی خوبصورتی نے بہت متاثر کیا اور پھر ان کی آنکھوں کی چمک۔ انہوں نے ہارون کو پھر سے گود میں بٹھالیا اور غور سے اسے دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے محمد بن منصور سے کہا:

”میرا یہ بیٹا انشاء اللہ سیر صالحہ کا مالک اور صاحب اقتدار اختیار بنے گا۔“ محمد بن منصور نے پوچھا: ”کیا آپ نے اس کی کسی ادا سے اندازہ کیا ہے؟“ منصور نے جواب دیا: ”میں ابھی سے اس طرح کے آثار دیکھ رہا ہوں۔“ اپنے باپ اور دادا کی گفتگو سے بے نیاز، ہارون بڑے مزے سے دادا کی گود میں بیٹھے دادا کو تکتے جا رہے تھے۔

ابو جعفر منصور نے دعا کے انداز میں اپنی جس خواہش کا اظہار کیا تھا وہ پوری ہوئی۔ تقریباً بیس برس بعد ہارون مسند خلافت پر متمکن ہو چکے تھے۔ انہوں نے تیس سال سے زائد مدت تک یہ گراں بار ذمہ داری انجام دی اور اپنی اچھی سیرت اور حسن انتظام کے ذریعہ پوری مملکت اسلامیہ کو

ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ علمی، سیاسی، معاشی، تمدنی غرض ہر لحاظ سے اوج کمال پر پہنچے ہوئے اس عہد کو بعض مورخین نے ”عہد عروس“ قرار دیا ہے۔

ہارون ذرا بڑے ہوئے تو ان کے والد نے ان کے لیے قابل اور لائق اساتذہ کا انتظام کر دیا۔ ان اساتذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان میں اہم ممتاز نام علی بن حمزہ کسائی کا ہے۔ کسائی بڑے زاہد، متقی، نیکو کار بزرگ تھے۔ قرآن پاک کی سات طرح سے قرأت کے ماہر تھے۔ لغت، ادب، نحو میں وہ اہل کوفہ کے امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ ایک اور استاد مفضل بن محمد تھے جن کا شمار روایات اور ادب کے شیوخ میں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ کسی اساتذہ سے ہارون نے اکتساب علم کیا۔

محمد بن منصور کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ہارون، جسمانی اعتبار سے بھی مضبوط اور توانا ہو، چنانچہ ماہر اساتذہ نے ہارون کو بچپن ہی سے گھڑ سواری اور تیر اندازی کی تعلیم دی۔ نیزے کی انی سے کام لینا اور تلوار چلانا سکھایا۔ ان تمام فنون کی تعلیم ہارون نے فوجی افسران سے حاصل کی۔ بچپن سے ان پر مشقت کھیلوں میں حصہ لینے کے نتیجے میں ہارون ایک خوش قامت، تندرست اور توانا جوان بن کر ابھرے۔ دس سال کی عمر میں ان کی مہارت کا عالم یہ تھا کہ منہ زور گھوڑے کو آسانی سے قابو کر لیا کرتے تھے۔

ذی الحجہ 158ھ / اکتوبر 775ء میں خلیفہ وقت ابو جعفر منصور کا انتقال ہو گیا۔ ہارون جن کی عمر اس وقت دس برس تھی، اپنے دادا کی وفات پر سب سے زیادہ روئے۔ کیونکہ دادا انہی سے بہت محبت کرتے تھے۔ منصور کے بعد ہارون کے والد محمد بن منصور خلیفہ بنے، جن کو مہدی کا لقب دیا گیا۔ خلیفہ بننے کے بعد مہدی نے جب فریضہ حج ادا کیا تو ہارون بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ہارون کا پہلا حج تھا۔ اس سفر میں ہارون کی تربیت اور رہنمائی کے لیے خلیفہ مہدی نے ایک قابل شخص ابان بن صدقہ کو مقرر کیا تھا۔ ابان بن صدقہ نے ہارون کو حج کے مناسک کی تعلیم دی اور جہاں وہ گئے وہاں کی تاریخ سے انہیں باخبر کیا۔ 14 سال کی عمر میں ہارون نے اس مبارک سفر سے بہت کچھ حاصل کیا۔

سولہ سال کی عمر میں ہارون کو پہلی بار ایک بڑی جنگ میں حصہ لینے کا موقع ملا وہ بھی اس شان سے کہ رومیوں کے خلاف ہونے والی اس جنگ میں اسلامی فوج کی قیادت انہی کو کرنی تھی۔ اس جنگ میں ہارون کی مدد کے لیے بڑے منجھے ہوئے ماہرین جنگ موجود تھے۔ ہارون فوج لے کر روانہ ہوئے اور حدود روم میں ایک بڑے قلعہ سالوکا محاصرہ کر لیا۔ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ محاصرہ 38 دن تک جاری رہا۔ قلعہ والوں نے بھوک پیاس سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیے۔ ہارون جزیہ اور مال غنیمت لے کر فاتحانہ شان سے لوٹ آئے۔

کچھ عرصہ بعد ہارون کے والدین نے فیصلہ کیا کہ ہارون کی شادی ان کی چچا زاد بہن زبیدہ سے کر دی جائے۔ زبیدہ کا اصل نام امۃ العزیز تھا۔ ان کے والد کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب امۃ العزیز صرف تین سال کی تھیں۔ اس کے بعد دادا منصور نے اس بچی کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ یہ بچی نہایت خوبصورت، نازک اندام، دراز قد اور گھنے بالوں والی تھی۔ دادا اسے پیار سے زبیدہ کہنے لگے ”زبد“ عربی زبان میں مکھن کو کہتے ہیں۔ امۃ العزیز کی جسمانی نزاکت اور رنگ و روپ کی وجہ سے ان کا نام زبیدہ پڑ گیا۔

زبیدہ بہت اچھی خاتون تھیں انہوں نے قرآن پاک پڑھا اور اس کا بڑا حصہ حفظ کر لیا تھا۔ ادب کی تعلیم حاصل کی۔ سیرت و تاریخ پر ان کی وسیع نظر تھی۔ وہ نماز اور روزہ کی پابند تھیں، اللہ سے ڈرنے والی اور نیکی کی طرف مائل تھیں۔ جس وقت بغداد میں ہارون کی شادی کے انتظامات ہو رہے تھے اور شہر میں جشن کا سماں تھا، اسی وقت ایک فوجی سردار عبدالکبیر بن عبد الحمید نے روم کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ ان کے ساتھ صرف تین ہزار سوار تھے۔ رومیوں نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا، اس پسپائی کی خبر سن کر خلیفہ مہدی نے حکم دیا کہ رومیوں سے زبردست جنگ کی تیاری کی جائے۔ چنانچہ ایک لاکھ سپاہیوں کا لشکر ترتیب دیا گیا۔ ہر دستے کا اپنا مخصوص شناختی پرچم تھا۔ لشکر کا سالار ایک نہایت اہل اور قابل ترین ماہر جنگ یزید بن مزید شیبانی کو بنایا اور ہارون کو لشکر کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا۔

ہارون کے لیے یہ ایک کڑی آزمائش تھی اور ان کی نوبیا ہتائیوی زبیدہ کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت، لیکن وہ جہاد کی اہمیت کو سمجھتی تھیں۔

انہوں نے پریم آنکھوں کے ساتھ اپنے شوہر کو الوداع کہا۔ جمادی الآخر 165ھ / جنوری 782ء میں ہارون لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ روم کی سرحد پر پہنچے۔ کئی علاقے فتح کیے۔ اب وہ قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس زمانے میں روم پر ملکہ ایرینی حکمران تھی جو نو عمر وارث تخت شہزادہ قسطنطین سادس کی ماں تھی۔ ملکہ ایرینی نے جو مسلمانوں کی فوج کی زبردست طاقت دیکھی تو صلح کی بات چیت شروع کر دی اور ہر سال جزیہ دینے کی پیشکش کی۔ ہارون نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ مال غنیمت اور جزیہ کی رقم کے ساتھ محرم 166ھ / اگست 782ء میں وہ فتح کے پھریرے لہراتے بغداد لوٹے تو ان کا والہانہ خیر مقدم کیا گیا۔ فضا تکبیر کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ لوگ فاتح لشکر پر پھول برسار رہے تھے۔ ہارون کی والدہ خیزراں قصر خلافت کی کھڑی سے عوام کا جوش و خروش دیکھ رہی تھیں اور ہارون کی شریک زندگی زبیدہ ایک کمرے میں بیٹھی آنے والے لمحات کے تصور میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ان کا محبوب شوہر آٹھ ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے کے لیے آگیا تھا۔

خلیفہ مہدی اپنے ایک بیٹے موسیٰ کو ولی عہد نامزد کر چکے تھے رجب 166ھ / فروری 783ء میں انہوں نے ہارون کو ولی عہد ثانی نامزد کر دیا۔ اس موقع پر انہوں نے ہارون کو رشید کا لقب دیا، قبل ازیں 165ھ / 781ء میں مہدی انہیں مشرقی علاقے کا گورنر مقرر کر چکے تھے۔ مہدی 169ھ / 785ء تک خلیفہ رہے پھر ان کے بیٹے موسیٰ نے زمام اقتدار سنبھالی۔ موسیٰ کا لقب ہادی تھا۔ وہ صرف ایک سال تین ماہ خلیفہ رہے اور پھر انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ 15 ربیع الاول 170ھ / 14 ستمبر 786ء کی وہ رات اس اعتبار سے نہایت منفرد ہے کہ اس رات ایک خلیفہ یعنی ہادی کا انتقال ہوا۔ اسی رات دوسرے خلیفہ یعنی ہارون نے امور مملکت سنبھال لیے اور یہی وہ رات ہے۔ جب ایک تیسرے خلیفہ یعنی مامون الرشید کی پیدائش عمل میں آئی۔ مامون کا نام عبداللہ تھا، ان کی والدہ ایک کنیز تھیں جنہیں ہارون نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔

بار خلافت سنبھالنے کے بعد ہارون بغداد پہنچے۔ جہاں ان کا زبردست خیر مقدم ہوا۔ نماز کا وقت آیا تو ہارون نے جامع مسجد میں نماز کی امامت کی۔ شوال 170ھ / اپریل 787ء میں زبیدہ بھی ایک لڑکے کی ماں بن گئیں جس کا نام محمد رکھا گیا۔ یہی محمد بعد میں امین کے نام سے خلیفہ بنے۔ ہارون نے اپنی خلافت کے پہلے ہی برس حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ حج سے واپس ہوئے تو انہوں نے امور مملکت کی طرف باقاعدہ توجہ دی اور پوری مملکت کا جائزہ لے کر مکہ، مدینہ، کوفہ، خراسان، آرمینیا، جزیرہ، موصل اور شمالی افریقا کے انتظامی عہدوں پر دور رس تبدیلیاں کیں۔ بغداد کی تعمیر دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ ہارون، نے اسے اوج کمال تک پہنچا دیا۔ اس زمانے میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن شہر سمجھا جاتا تھا۔

ہارون نے بحر ابيض متوسط (اب بحیرہ روم) کے ساحل پر شہر طرطوس کو آباد کیا۔ روم کی سرحد پر کئی شہر اور قلعے تعمیر ہوئے۔ بہت سے پل تعمیر کروائے گئے۔ نہروں کی بنیاد پڑی۔ ان تمام اصلاحات کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا۔ موسم گرما کے دوران بغداد میں شدید گرمی پڑی تھی۔ چنانچہ ہارون الرشید نے موسم گرما کا ایک صدر مقام مدینہ النجار کے نام سے بنوایا لیکن یہ بغداد سے دور تھا چنانچہ رقبہ کے مقابل اپنے والد کے بنوائے ہوئے شہر رافقہ پر توجہ دی۔ وہاں ایک بڑا قصر تعمیر کروایا جس کا نام قصر السلام رکھا گیا۔ ہارون کے ایماء پر یہاں دیگر صاحب ثروت لوگوں نے بھی عالیشان مکانات تعمیر کیے۔ یہاں گھڑ دوڑ اور چوگان (پولو) کے لیے میدان، شکار گاہیں، کشتیوں کے لیے لنگر گاہیں، تفریح گاہیں تعمیر کی گئی۔

ہارون الرشید نے وزارت کو دو قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وزارت تفویض اور وزارت تنقید۔ تفویض کا وزیر تمام امور میں خلیفہ کا مددگار ہوتا تھا اور انتظامی معاملات اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ تنقید کا وزیر احکامات پر عمل درآمد کروانے کا ذمہ دار تھا۔ کئی محکمے قائم کیے گئے تھے ان میں ایک اہم شعبہ ”دیوان زمام“ کے نام سے مشہور تھا جو آج کل کے لحاظ سے آڈیٹر جنرل کی طرح کا شعبہ تھا۔ جملہ سرکاری محکموں کے حسابات کی جانچ پڑتال یہیں ہوتی تھی۔ سیاسی خطوط کی تیاری اسی شعبہ کا کام تھا اس طرح کے خطوط پر مہر خلافت بھی یہیں لگتی تھی۔

ہارون الرشید نے قاضیوں کے سربراہ کے طور پر ایک نیا عہدہ ”قاضی القضاہ“ قائم کیا تھا جو آج کل کے وزیر انصاف کے عہدے سے بھی بڑا تھا۔ سب سے پہلے اس عہدے پر حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد حضرت امام ابو یوسفؒ کا تقرر ہوا۔ انہیں پوری مملکت میں قاضیوں کے تقرر کا

اختیار تھا اس محکمہ کی نگرانی ان کے سپرد تھی۔ خلیفہ کے خاص معاملات پر فتویٰ بھی دیا کرتے تھے۔ مجالس علماء میں شریک ہوتے تھے اور سفر پر خلیفہ کے ساتھ جاتے تھے۔ 182ھ تک وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

ہر شہر کا قاضی مقدمات کے فیصلے ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اوقاف کا نگران بھی تھا اور نابالغوں اور یتیموں کے ولی مقرر کرتا تھا۔ قاضیوں کو بہت معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ہارون اپنی رعایا کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کے مسائل حل کرنے کی طرح کی مجالس (مینگلز) منعقد کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان تمام مجالس کے آداب مقرر تھے ان میں لغو، لالیغی باتوں، غیر شائستہ گفتگو اور طنز و مزاح کی کوئی گنجائش نہ تھی البتہ بزم بے تکلف میں ہر شخص کو بات کرنے اور ظریفانہ گفتگو کی اجازت حاصل تھی۔ ہارون کا عہد خلافت خوشحالی اور فراخی کا عہد زریں تھا۔ ان کے دور میں خراج کی آمدنی سب سے اہم تھی۔ ذمیوں (غیر مسلموں) پر جزیہ (ٹیکس) فی کس 14 تا 18 درہم سالانہ تھا۔ تاہم ذمیوں میں نابینا افراد، بچوں اور عورتوں پر جزیہ معاف تھا۔ زکوٰۃ و عشر سے بھی خطیر رقم حاصل ہوتی تھی۔ زراعت کو بھرپور انداز میں ترقی دی گئی تھی۔ محاصل سے چار کروڑ بیس لاکھ دینار سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔

ہارون الرشید کا دور اس لحاظ سے دیگر ادوار سے ممتاز ہے کہ اس دور میں بے پناہ علمی اور تحقیقی کام ہوا۔ ہارون نے ”بیت الحکمت“ کے نام سے بغداد کے قصر خلد میں تالیف اور ترجمہ کا بے مثال ادارہ قائم کیا۔ اچھی تنخواہوں پر علماء اور مترجمین مقرر کیے۔ اس ادارے میں یونانی، فارسی اور دیگر متعدد زبانوں کی اہم اور بیش قیمت کتابوں کے عربی تراجم ہوئے۔ توریت اور انجیل کا عربی میں ترجمہ اسی عہد میں ہوا ہارون کے دور میں طب، فلکیات، فلسفہ حکمت، ادب اور افسانہ کی کتب کو عربی زبان کے قالب میں ڈھالا گیا۔ ہارون الرشید ہی کے دور میں امام مالک بن انس، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن نے فقہ پر بڑا کام کیا۔ تصوف کے موضوع پر کئی کتب تصنیف کی گئیں، احادیث کو جمع کر کے مرتب کرنے کا کام شروع ہوا۔ فلسفہ، حکمت، حساب، ہندسہ، طب اور نجوم کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ہارون الرشید کو جب بھی کسی عالم کے بارے میں علم ہوتا تھا وہ کوشش کرتے تھے کہ انہیں بغداد بلایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے دور دور سے علماء بلا کر انہیں بغداد میں قیام کی سہولتیں مہیا کیں۔ ہارون کے دور میں جن مشاہیر نے وفات پائی۔ ان میں امام مالک، مال لیث بن سعد، امام ابو یوسف، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن ادیس کوئی، قاسم بن معن، مسلم بن خالد، اسد کوئی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ امام مالک کے شاگرد صعصعہ بن سلام نے بھی اسی دور میں انتقال فرمایا۔

ہارون کی شخصیت علم و دانش، تقویٰ، خدا ترسی، حکمت و تدبیر، خطابت، حب رسول اور حمیت اسلام جیسے اوصاف کی منہ بولتی تصویر ہے۔ انہوں نے ناصرف مملکت اسلامیہ میں علم کو بھرپور انداز میں فروغ دیا۔ بلکہ اس علم سے خود بھی بے اندازہ استفادہ کیا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد سے علم حاصل کیا۔ وہ جب کبھی کسی داعظ یا متقی بزرگ کی تعریف سنتے تو خود ان کے پاس جاتے اور ان سے نصیحتیں سنتے۔

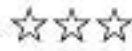
وہ بھیس بدل کر بغداد کے مساجد میں نامور اساتذہ کے حلقہ ہائے درس میں ایک عام طالب علم کی طرح شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے لغت، حدیث اور نحو کے مانے ہوئے اساتذہ بھی دار الحکومت میں جمع کر لیے تھے۔ وہ انہیں اپنی مجلس میں بلا کر ان میں علمی اور فنی بحثیں کیا کرتے تھے۔ ان اساتذہ میں کسائی، مبارک بن فضالہ، ابو معاویہ، امام ابو یوسف اور اصمعی جیسے لوگ شامل تھے۔ ہارون کہا کرتے تھے: ”ایک فرماں روا کے لیے اس سے بڑھ کر بری بات کوئی نہیں کہ وہ عالم نہ ہو۔“

ہارون الرشید کا عہد زریں فتوحات کے لحاظ سے بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ان کی حکومت مغرب میں اقصیٰ سے سرزمین سندھ تک مشرق میں ارض چین تک، شمال میں آرمینیا اور جنوب میں سواحل یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے روم پر پانچ حملے کیے۔ اپنے والد کے عہد خلافت میں وہ روم پر دوبار حملے کر چکے تھے۔ پھر مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے روم پر تین بار فوج کشی کی 181ھ/797ء میں انہوں نے صف صاف کا قلعہ فتح کیا۔ اسی سال ان کے ایک سالار عبدالملک بن صالح ایشیائے کوچک میں انقرہ تک بڑھتے چلے گئے اور مطمورہ کو فتح کر لیا۔

187ھ/803ء میں قاسم بن رشید نے قرہ اور عباس بن جعفر نے حصن سنان کا محاصرہ کیا۔ دونوں شہروں کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ تو یہ تک مسلمانوں کے قبضہ کے باعث خشکی کے راستے شام پر رومیوں کا حملہ ممکن نہ تھا چنانچہ وہ بحیرہ روم کے راستے شام کے ساحل پر حملہ کرتے تھے۔ ہارون نے ان حملوں کو روکنے کے لیے شام کے ساحل پر کئی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے بنوائے، شام اور مصر کے ساحلوں پر جنگی بیڑے تیار رکھے جاتے تھے کشتیاں، جہاز اور جنگی سامان تیار کرنے کے کارخانے بھی تھے۔

مسلل جنگوں میں مصروف رہنے اور خراب موسم میں دشوار گزار سفر کرنے کی بدولت ہارون کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ جمادی الآخر 193ھ/مارچ 809ء میں انہوں نے ایک مہم میں خراسان کا سفر کیا۔ جرجان پہنچے تو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ارادہ کیا کہ بغداد لوٹ آئیں لیکن واپسی میں طوس پہنچ کر علالت نے شدت اختیار کر لی اور اسی شہر میں یہ عظیم شخصیت اپنی حیات مستعار کے آخری لمحات گزار کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ انہیں طوس ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔

ہارون الرشید کا 23 سالہ دور خلافت تاریخ کا ایک ایسا روشن اور فرزاں باب ہے جس کی خیرہ کن چمک دمک اور آب و تاب صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اسی طرح باقی ہے اور زمانے کی گرد اس کو دھندلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اسلامی حکومت کو استحکام بخشنے اور مملکت اسلامیہ کو خوشحالی اور مسرت و شادمانی کا مرقع بنانے کے لیے ہارون الرشید نے جس خدا خونی اور احساس ذمہ داری سے کام کیا۔ اس کا اعتراف اسی عہد کے معروف زاہد بزرگ حضرت فضیل بن عیاضؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ”مجھے ہارون کی موت سے زیادہ صدمہ کسی امر کا نہیں ہوا۔ مجھے یہ گوارہ تھا کہ اللہ میری عمر کا حصہ ہارون کی عمر میں زیادہ کر دیتا۔“



محمد بن قاسم

نوجوان سپہ سالار جنہوں نے سندھ فتح کیا اور دلوں پر حکومت کی

وہ چھپتا چھپاتا آگے بڑھ رہا تھا!

اس کا تعلق چند قوم سے تھا اور اسے اس کی قوم نے دشمن کے فوجی کمپ میں جاسوسی کے لیے بھیجا تھا۔ اسے یہ پتا چلنا تھا کہ سیوستان کے قلعہ کو فتح کرنے والے لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ اس کے چاروں طرف دشمن کی فوج کے خیمے بڑی ترتیب سے تھے۔ انہی خیموں کی آڑ لے کر وہ بڑی احتیاط کے ساتھ حرکت کر رہا تھا اس کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور وہ بے چینی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کہیں دشمن فوج کا کوئی سپاہی اسے دیکھ نہ لے اور پھر نہ معلوم اس کا کیا حشر کرے۔

اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ اس کے کانوں سے کسی اجنبی زبان کے الفاظ ٹکرائے تھے۔ وہ یہ الفاظ سمجھ تو نہیں سکتا تھا لیکن اسے یوں لگا جیسے ان الفاظ میں بڑا ترنم ہے، نغمہ سنی ہے اور جو شخص ان الفاظ کو ایک خاص انداز سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کر رہا تھا اس کی آواز اسے گویا دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

جب یہ آواز آئی بند ہو گئی تو جاسوس نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو اسے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک کھلے مقام پر دشمن کا سارا لشکر جمع ہو رہا تھا۔ سپاہیوں نے صفیں بنالی تھیں۔ چند لمحوں بعد ایک خوش رونو جوان آگے بڑھا اس کی گلابی رنگت پر سیاہ داڑھی بے حد کھل رہی تھی۔ وہ صفوں کے آگے کھڑا ہو گیا اس نے کچھ کہہ کر ہاتھ اٹھائے اور پھر ہاتھ باندھ لیے جیسے کسی بہت بڑی ہستی کے سامنے حاضر ہو اور اپنے ادب کا اظہار کرنا چاہتا ہو۔ جاسوس نے دیکھا کہ اسی وقت پورے لشکر نے ہاتھ اٹھائے اور اس نوجوان کی طرح ہاتھ باندھ لیے۔

وہ بڑی حیرت اور دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑے غور سے دیکھا کہ صفوں کے آگے کھڑا ہوا نوجوان چند الفاظ کہہ کر کبھی جھک جاتا تو تمام سپاہی اسی کی طرح جھک جاتے وہ نوجوان کبھی زمین پر دوڑا نو ہو کر بیٹھ جاتا تو اس کے سارے سپاہی فوراً اس کی تقلید کرتے۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا لشکر اپنے افسر کے حکم کی سختی سے پابندی کرنا جانتا ہے۔

”یہ عجیب فوج ہے“ جاسوس نے دل میں سوچا۔ ”انہوں نے ابھی سیوستان کا قلعہ فتح کیا ہے۔ قلعہ چھوڑ کر بھاگنے والے واپس بھی تو آسکتے ہیں جب یہ سپاہی زمین پر اپنے ماتھے ٹیک دیتے ہیں تو کوئی بھی انہیں ہلاک کر سکتا ہے لیکن انہیں ذرا بھی خوف نہیں۔ یقیناً نہیں۔ ان کو بھلا کون شکست دے سکتا ہے؟“

جاسوس وہیں سے اٹھنے قدموں لوٹ گیا۔ اپنی قوم میں جا کر اس نے کہا ”میں نے ان لوگوں میں جو اتفاق اور اتحاد دیکھا ہے اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ ان پر کوئی فتح نہیں پاسکتا۔“

چند قوم کے بڑے بوڑھوں اور سرداروں نے جب اپنے ہم قوم کی یہ بات سنی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں قیمتی تحفے لے کر قلعہ کے فاتح سالار کے پاس چلنا چاہیے انہوں نے بیش قیمت تحائف اکٹھے کیے اور دشمن کے فوجی پڑاؤ کی طرف چل پڑے وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ دسترخوان بچھائے جا رہے ہیں اور پورا لشکر کھانا کھانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”اس فوج کا سپہ سالار کون

ہے؟“ سپاہیوں نے انہیں سپہ سالار تک پہنچا دیا۔

چنہ قوم کا جاسوس، سپہ سالار کو دیکھتے ہی حیرت زدہ رہ گیا یہ تو وہی خوش رونو جوان ہے کچھ دیر قبل جس کے اشارے پر صف بستہ پورا لشکر حرکت کر رہا تھا۔ اس نو جوان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں، پیشانی کشادہ تھی اس کا بھرا بھرا بدن اور چوڑی کلا یاں اس کی غیر معمولی قوت کو ظاہر کرتی تھیں۔ جب وہ ان سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز تو بارعب تھی لیکن لہجہ نہایت شیریں اور پھر اس کے چہرے کا حسین اور دل آویز تبسم۔

نو جوان سپہ سالار کی شخصیت نے آنے والوں پر سحر طاری کر دیا تھا! اس نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہیں اس آفاقی دین کی خوبیوں سے آگاہ کیا۔

کچھ دیر بعد چنہ قوم کے اس وفد کے ارکان کی زبانوں پر کلمہ توحید جاری تھا۔

دلوں کو فتح کر لینے والے یہ نو جوان سپہ سالار تھے..... فاتح سندھ محمد بن قاسم جن کی ولولہ انگیز قیادت میں سندھ کو باب الاسلام بننے کا شرف حاصل ہوا اور جن کی بے مثال جرأت، ہوش مندی اور فراست کی بدولت مختصر سے عرصے میں اسلام کی روشنی نے ایک وسیع علاقے کو منور کر دیا۔

عالم اسلام کا یہ عظیم جرنیل 75ھ (694-95ء) میں طائف کے مقام پر پیدا ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب عبدالملک بن مروان خلیفہ المسلمین تھے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کو 75ھ میں مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا۔ حجاج بن یوسف نے اپنے بھائی قاسم بن محمد یعنی محمد بن قاسم کے والد کو بصرہ کا گورنر نامزد کیا خیال ہے کہ اس کے بعد محمد بن قاسم کی تربیت بصرہ ہی میں ہوئی، آپ کی کنیت ابوالہبہ تھی کیونکہ آپ ایک خوشبودار پھول بہار البر کو بہت پسند کرتے تھے۔

اس زمانے میں بصرہ ایک بڑا علمی، ثقافتی اور عسکری مرکز تھا۔ صحابی رسول حضرت انس بن مالکؓ اس وقت بقید حیات تھے۔ اس کے علاوہ امام حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ بھی اپنے علم سے لوگوں کو فیضیاب کر رہے تھے۔

قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھنے والے اس بہادر سپوت کے سر سے والد کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا اور اس کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری والدہ حبیبہ پر آ پڑی۔ والدہ نے اپنے پیارے بچے کی بہت اچھی تربیت کی اور اسے دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ اوصاف سے مزین کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ محمد نے نو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو فوج کی ملازمت اختیار کی جہاں قابل اور تجربہ کار فوجی افسران کے زیر تربیت ان کی صلاحیتیں اور نکھر کر سامنے آئیں۔ اس کمسن نو جوان نے لڑائی کے تمام مروجہ طریقوں پر اتنی عمدگی سے اور اس قدر جلد دسترس حاصل کر لی کہ صرف 14 سال کی عمر میں اسے فوج کے اعلیٰ عہدے کے لیے موزوں قرار دے دیا گیا۔

90ھ/709ء میں ایران میں کردوں نے بغاوت کر دی حجاج بن یوسف نے باغی کردوں کے خلاف ایک فوج روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فوج کی قیادت کے لیے ان کی نگاہ اپنے مرحوم بھائی قاسم کے بیٹے محمد پر پڑی جن کی عمر گو کہ صرف پندرہ سال تھی لیکن اچھی صحت اور بچپن ہی سے فنون حرب کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں بڑے دکھائی دیتے تھے۔ محمد اپنی ذہانت اور قائدانہ صلاحیتوں کا بارہا اظہار کر چکے تھے۔ انہوں نے فوج کی کمان سنبھالی اور ایران پہنچ کر کردوں کو شکست فاش دی۔ پھر اصطخر کو تسخیر کیا اور جرجان کی طرف بڑھے اس کے بعد ایک خصوصی نقشہ تیار کروا کے شہر شیراز کی بنیاد ڈالی اور اسے فارس کا پایہ تخت بنایا۔ شیراز اس سے قبل ایک معمولی چھاؤنی تھی۔

محمد بن قاسم نے بے حد عمدگی سے شیراز میں امور مملکت کو انجام دیا۔ سترہ سال کی عمر میں آپ کو شیراز کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ محمد بن قاسم کو اسلام سے بڑی محبت تھی۔ اسلام کے پیغام کو دعا کرنے کی جو تڑپ اس صالح نو جوان کے دل میں جاگزیں تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محمد بن قاسم کو جو تنخواہ ملتی اس کا بڑا حصہ وہ اسلام کی دعوت کو پھیلانے پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ قدرت نے اس نو جوان سالار کی زبان میں ایسی مٹھاس بھردی تھی کہ جب وہ لوگوں کے سامنے تقاریر کرتے تو لوگ دم بخود ہو کر سنتے رہ جاتے۔

محمد بن قاسم کو حجاج کی طرف سے شہر ”رے“ پر فوج کشی کا حکم مل چکا تھا لیکن اچانک حجاج بن یوسف کا ایک اور حکم نامہ انہیں موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ رے کی بجائے سندھ جاؤ اور اس فوج کا انتظار کرو جسے میں تمہارے لیے خشکی کے راستے بھیج رہا ہوں۔

سندھ پر حملہ کرنے کا یہ فیصلہ دراصل اس مسلمان لڑکی کی پکار کا جواب تھا جس نے سندھ کے ساحل پر لیروں کے ہاتھوں اپنے قافلے کو لٹے دیکھ کر حجاج کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ یہ بحری قافلہ سراندیپ (موجودہ سری لنکا) کے مسلمان بادشاہ نے خلیفہ وقت ولید بن عبد الملک کے خدمت میں تحائف کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس قافلے میں چند مسلمان عورتیں بھی شامل تھیں جو کعبہ اللہ کی زیارت کے لیے جا رہی تھیں کہ سندھ کے ساحلی شہر دیبل کے قریب قزاقوں نے اس قافلے کو لوٹ لیا اور اس میں شامل افراد کو قیدی بنا کر لے گئے۔

قافلے کے چند مسافر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے عراق پہنچ کر حجاج بن یوسف کو اس واقعہ سے آگاہ کی۔ حجاج بن یوسف نے سندھ کے راجا داہر کو ایک خط لکھا کہ آپ نے جن مسلمانوں کو قید کر لیا ہے ان کو رہا کر دیں اور لوٹا ہوا مال و اسباب واپس کر دیں۔ راجا داہر نے نہایت مکاری سے جواب میں لکھا کہ یہ کام تو بحری ڈاکوؤں کا ہے جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔

داہر کا جواب آنے پر حجاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے سندھ پر حملے کی اجازت طلب کی۔ اجازت نہ ملی تو حجاج نے دوبارہ دمشق پیغام بھیجا کہ میرا خیال ہے کثیر اخراجات کی وجہ سے سندھ پر حملے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو رقم سرکاری خزانے سے صرف ہوگی اس سے دگنی رقم خزانے میں داخل کروں گا۔ اس پر خلیفہ وقت نے حملے کی اجازت دے دی۔

1300 سال قبل سندھ آج کی طرح ایک چھوٹا سا قصبہ نہ تھا بلکہ سندھ کے نام کا اطلاق ایک وسیع علاقے پر ہوتا تھا جو مغرب میں مکران تک، جنوب میں بحیرہ عرب اور گجرات تک، مشرق میں مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک اور شمال میں ملتان سے گزر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی حکومت مکران تک وسیع ہو چکی تھی اور دوسری جانب ان کی فتوحات کے پھریرے چین اور یورپ تک لہر رہے تھے۔

سندھ کی سرحد ایران سے ملتی تھی اور سندھ کا راجا داہر ایرانیوں کو مدد دیتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی اس کو سرکوبی مسلمانوں کے لیے ضروری تھی۔ اور پھر راجا داہر نے اپنی قوت کے گھمنڈ میں مسلمان عورتوں بچوں اور قیمتی سامان کو واپس نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا وہی اس کو کفر کردار تک پہنچانے کا باعث بن گیا۔

حجاج بن یوسف نے پہلے عبداللہ بن نبہان کی قیادت میں ایک فوج سندھ کے ساحلی شہر دیبل بھیجی لیکن عبداللہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے پھر بدیل بن طہفہ کو جو عمان میں تھے حکم ملا کہ مکران کے گورنر سے تین ہزار سپاہی لے کر دیبل پر حملہ کریں لیکن بدیل نے بھی لڑائی میں شہادت کا مرتبہ پایا۔ حجاج نے اپنے دو سپہ سالاروں کی شہادت کے بعد فیصلہ کیا کہ سندھ پر منظم حملے کی ضرورت ہے انہوں نے شامی لشکر سے چھ ہزار پیادے سپاہی اور چھ ہزار سوار لیے۔ بوجھ لادنے کے لیے کئی ہزار اونٹ فراہم کیے۔ ضرورت کی ہر چیز ساتھ کر دی حتیٰ کہ سوئی دھاگہ تک دیا۔ عرب سرکہ شوق سے کھاتے تھے۔ حجاج نے روٹی کو سرکہ میں بھگو کر سائے میں خشک کروایا اور پھر اس روٹی کے گٹھے بندھوا کر جہازوں کے ذریعہ روانہ کیے تاکہ جب بھی سرکہ کی ضرورت ہو روٹی کو تر کر کے اسے چھان لیا جائے۔ فوجی ساز و سامان دیگر کئی جہازوں پر لاد کر دیبل روانہ کیا۔ اس میں کئی منجیق بھی تھیں ایک بہت بڑی منجیق بھی تھی جسے عروس کے نام سے پکارا جاتا تھا یہ اتنی بڑی منجیق تھی کہ اسے پانچ سو آدمی حرکت میں لاتے تھے۔

حجاج بن یوسف نے سندھ پر فوج کشی کے لیے اب نوجوان محمد بن قاسم کا انتخاب کیا تھا۔

محمد بن قاسم کے دیبل پہنچتے ہی شہر والے تفصیل کے دروازے بند کر کے محصور ہو گئے۔ محمد بن قاسم کے حکم پر شہر کے چاروں اطراف خندقیں کھود دی گئیں اور جگہ جگہ مورچے قائم کر لیے گئے جنگ شروع ہوئی۔ تفصیل کئی مقامات پر منہدم ہو چکی تھی لیکن شہر فتح نہیں ہو رہا تھا ایک دن ایک برہمن کسی طرح سے شہر سے نکل کر محمد بن قاسم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کو مسلمان فتح کر لیں گے لیکن

جب تک یہ مندر برقرار ہے اس شہر کی فتح ممکن نہیں۔ آپ کوشش کریں کہ یہ مندر مسمار ہو جائے اور اس پر لہرانے والا پرچم گرا دیا جائے۔

محمد بن قاسم نے جعونہ سلمیٰ کو جو منجیق چلانے کے ماہر تھے حکم دیا کہ مندر کے گنبد پر لہرانے والے پرچم کو نشانہ بنائیں۔ دیبل کے نویں روز طلوع آفتاب کے ساتھ ہی سنگ باری شروع ہو چکی تھی۔ منجیق نے اپنا کام کر دکھایا اور گنبد ٹوٹ گیا۔ گنبد کا ٹوٹنا تھا کہ دشمن کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ شہر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ محمد بن قاسم کی فوج نے زبردست یورش کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ شہر پر قبضہ کے بعد محمد بن قاسم نے زمین کے قطعات مسلمانوں پر تقسیم کیے۔ شہر کا افسر اعلیٰ حمید بن وداع کو مقرر کیا اور شہر میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی، یہ سندھ میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد تھی۔ محمد بن قاسم نے جنگوں میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں داخل کیا۔ ارمن بیل کا مال غنیمت فوجیوں میں تقسیم کیا۔

سسیم میں محمد بن قاسم کو حجاج کا خط ملا کہ نیرون لوٹ جاؤ اور دریائے سندھ عبور کر کے راجا داہر سے مقابلہ کرو۔ محمد بن قاسم نیرون لوٹ گئے اور محرم 93ھ اکتوبر (711ء) میں قلعہ اشہبار (خیال ہے کہ یہ قلعہ ٹنڈو محمد خان کے قریب پہاڑیوں پر واقع تھا) پہنچے۔

اسی اثنا میں رمضان کا مبارک مہینہ برکتیں اور سعادتیں لیے آپہنچا۔ یکم رمضان المبارک 93ھ/11 جون 712ء کو راجا داہر اور محمد بن قاسم کی فوجوں کے درمیان اس فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہوا جس کے خاتمہ کے ساتھ ہی سندھ میں جبر و استبداد کے بت پاش پاش ہو گئے اور یہ سرزمین اسلام کے نور سے جگمگا اٹھی۔

راجا داہر کو محمد بن قاسم کی فوج کے دریا تک پہنچ جانے کی اطلاع ملی تو وہ بھی ہاتھی پر سوار ہو کر آ موجود ہوا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ مسلمان دریا عبور نہ کر سکیں اور اگر کوشش بھی کریں تو ان پر زبردست حملہ کیا جائے راجا نے اپنے سپاہیوں کو ضروری ہدایت دیں اور واپس جا کر اپنے بیٹے جے سینہ کو محمد بن قاسم کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج دے کر روانہ کیا۔

محمد بن قاسم کی فوج کو جھم اور کرہل (ٹھٹھہ کا نواحی) میں تقریباً پچاس دن رہنا پڑا۔ اس عرصہ میں خوراک کی کمی ہو گئی اور گھوڑے بیمار ہو کر مرنے لگے۔ محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو فوراً پیغام روانہ کیا جواب آیا کہ دو ہزار گھوڑے بھیجے جا رہے ہیں اور اسلامی فوج کو کشتیوں کا پل بنا کر دریا عبور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ساتھ ہی محمد بن قاسم کے کہنے پر حجاج نے سرکہ بھی روانہ کیا۔

اب محمد بن قاسم نے دریا عبور کرنے کی تدبیروں پر کام شروع کر دیا۔ کشتیاں حاصل کی گئیں انہیں ایک دوسریسے باندھ دیا گیا دریا عبور کرنے کے لیے اس مقام کا انتخاب کیا گیا جہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا اور پانی کی روانی بہت تیز تھی۔ کشتیوں کے ایک سرے کو مغربی کنارے پر باندھ دیا گیا اور دوسرا سر دریا میں چھوڑ دیا گیا جو خود بخود مشرقی کنارے پر پہنچ گیا جہاں سب سے اگلی کشتی پر سپاہیوں نے کشتی کو رسوں اور کھونٹوں کے ذریعہ مشرقی کنارے پر باندھ دیا۔ اس طرح محمد بن قاسم کی پوری فوج کشتیوں کے اس پل کے ذریعہ دریا کے دوسرے کنارے پر اتر گئی۔

داہر کو اطلاع مل چکی تھی کہ مسلمان دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں بلکہ انہوں نے راوڑ کے قریب ایک گاؤں جیور پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اب اس کے پاس لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا وہ بھی اپنا لاؤ لشکر لے کر اسلامی فوج کے مقابل پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک جھیل حائل تھی۔

جنگ کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں دونوں جانب سے دستے بھیجے گئے پھر باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ مسلمان اس جوش اور جذبہ سے دشمن کی صفوں پر ٹوٹ کر گرے کہ اس کی صفیں تتر بتر ہو گئیں۔ محمد بن قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر حملے کا حکم دیا۔ نوجوان سپہ سالار کی آواز نے اسلامی فوج میں نئی روح پھونک دی۔ تیروں کی بارش ہونے لگی۔ منجیقین پتھر برسائے لگیں۔ تلواروں کی جھنکار سے میدان جنگ گونج اٹھا۔ ایک مسلمان تیر انداز نے راجا داہر کی سواری کو نشانہ بنایا۔ مسلمان فوج آگ لگانے والے تیر استعمال کر رہی تھی۔ تیر سیدھا راجا کی سواری میں لگا اور ہاتھی پر راجا کے بیٹھنے کے لیے جو خوبصورت نشست گاہ بنائی گئی تھی اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ ہاتھی اس صورت حال سے حواس باختہ ہو کر قریبی جھیل میں جا گھسا اور بیٹھ

گیا۔ مہات نے بڑی مشکل سے ہاتھی کو کھڑے ہونے پر آمادہ کیا۔ راجا داہر اب مجبور ہو کر پیدل میدان میں کود پڑا۔ اس کے وفادار ساتھی اس کے اطراف موجود تھے لیکن اب داہر کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ادھر آفتاب غروب ہوا، ادھر راجا داہر کے اقتدار کا سورج بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا، ایک مسلمان سپاہی نے اس کے سر پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ تلوار سر کو کاٹتی ہوئی گردن تک اتر گئی۔ ایک مغرور اور خود پسند راجا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ راجا داہر کے مرتے ہی برہمنوں نے اس کی لاش کو کچھڑ میں چھپا دیا۔ ادھر اسلامی لشکر راوڑ کے قلعے میں داخل ہو گیا۔ بعد میں برہمنوں کی نشاندہی پر راجا داہر کی لاش برآمد کر لی گئی۔

راوڑ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے باغیوں کو تو سزائے موت دے دی لیکن پر امن شہریوں سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ انہیں زیادہ سہولت کے ساتھ شہر میں آباد کر دیا۔ اس فتح کے نتیجے میں بہت سا رمال غنیمت حاصل ہوا جس کا پانچواں حصہ محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو روانہ کر دیا۔

راجا داہر کے بیٹے بے سینہ کے دل میں باپ کے قتل کے انتقام کی آگ دہک رہی تھی۔ وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور برہمن آباد پہنچ کر چاروں طرف سے فوج اکٹھی کر رہا تھا۔ شوال/ جولائی کے مہینے میں محمد بن قاسم کی فوج نے برہمن آباد کی طرف پیش قدمی کی۔ راستہ کے قلعوں کو فتح کیا، دہلیہ میں قیام کیا، اسی دوران میں محمد بن قاسم نے ہندوستان کے راجاؤں اور دیگر حکمرانوں کے نام خطوط لکھ کر انہیں قبول اسلام کی دعوت دی۔

برہمن آباد کے مشرقی کنارے پر پڑاؤ ڈالنے کے بعد محمد بن قاسم نے بے سینہ کو پیغام بھیجا کہ یا تو اسلام قبول کر دیا پھر ہمارے مطیع ہو کر جزیہ دیا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بے سینہ برہمن آباد میں فوج کو تیار کر کے خود چنیر کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ فوج نے لڑنے پر آمادگی ظاہر کی تو رجب 94ھ کی پہلی تاریخ/ 2 اپریل 713ء کو برہمن آباد کی جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ چھ ماہ تک جاری رہی دشمن کی فوج قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ آخر برہمن آباد کے باشندے تنگ آ گئے اور انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ انہیں امان دے دی جائے۔

برہمن آباد کی فتح کے بعد فاتح سندھ نے اعلان کیا کہ جو لوگ خوشی سے مسلمان ہو گئے ہیں ان کے حقوق دیگر مسلمان کے برابر ہوں گے جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے انہیں جزیہ دینا پڑے گا، اس پر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے مندروں کے لیے قائم جائیدادوں میں کوئی دخل نہ دیا۔ جنگ میں تاجروں، کسانوں اور دیگر شہریوں کو نقصان پہنچا تھا، ان کی مالی امداد کی۔ مال گزاری وصول کرنے کے لیے جن برہمنوں کو مقرر کیا، انہیں تاکید کی کہ رعایا پر ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔

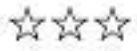
فتح ملتان کے بعد محمد بن قاسم نے شہر میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ اطراف کے علاقوں کے انتظامات کیے، اس کے بعد فاتح سندھ قنوج پر فوج کشی کرنے والے تھے کہ شوال 95ھ میں حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے مشرقی ممالک کے نئے حاکم اعلیٰ کے تقرر تک قنوج پر فوج کشی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بیلماں اور کیرج کے علاقوں کو فتح کر لیا۔

حجاج بن یوسف کی وفات کے آٹھ ماہ بعد جمادی الثانی 96ھ/ فروری 715ء میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنے۔ انہوں نے یزید بن مہلب کو مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ ان کے دور میں محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس عراق بلا لیا گیا، جہاں کچھ عرصہ بعد اس عظیم رہنما نے جوانی کے عالم میں موت کو گلے لگا لیا۔

نوجوان محمد بن قاسم نے سندھ کے وسیع و عریض علاقے پر صرف ساڑھے تین سال حکومت کی لیکن یہ ان کی غیر معمولی تدبیر اور خدا داد، انتظامی صلاحیت تھی جس کی بدولت انہوں نے پورے علاقے کو عدل و انصاف، خوشحالی اور مسرت وطمینان کی تصویر بنا ڈالا..... انہوں نے سندھ میں جو علاقے فتح کیے، عموماً ان کے قدیم حاکموں سے اطاعت کا اقرار لے کر انہی کو حکومت پر بحال رکھا۔ صرف انتظامات بہتر بنانے اور نظام انصاف کو تقویت دینے کے لیے ان کے ساتھ مسلمان افسران بھی مقرر کیے جاتے تھے۔ پولیس اور فوج میں زیادہ تر سندھ کے نو مسلم باشندے تھے۔

مالیات کی تحصیل کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ جو قوم میں مسلمان ہوئیں، ان کی زمینوں پر عشر وصول کیا جاتا تھا۔ لگان اور خراج سے جو رقم حاصل ہوتی تھی، اس کا بڑا حصہ ملک میں رفاہ عامہ کے کاموں پر صرف کیا جاتا تھا۔ مال گزاری کی وصولی، حساب کتاب وغیرہ برہمنوں کے ذمہ تھا، کسانوں کو طرح طرح کی سہولتیں دیں، جن کاشتکاروں کے ہاں پیداوار کم تھی، ان پر سرکاری لگان معاف کر دیا گیا۔ معاشرے میں بعض طبقوں کو پست اور ذلیل سمجھا جاتا تھا، محمد بن قاسم نے ان طبقوں کو عزت اور احترام دلوایا۔

تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں کہ ایک نو عمر سپہ سالار نے صرف ساڑھے تین سال کے عرصہ میں ایک ایسی قوم کو اپنا مطیع ہی نہیں بلکہ گرویدہ بنا لیا، جو اس کی کٹر دشمن تھی۔ یہ محمد بن قاسم کا مثالی حسن سلوک تھا، ان کی روداری تھی، ان کی نرم مزاجی اور رحم دلی تھی جس کی بدولت اہل سندھ اپنے نوجوان فرمانروا سے پرستش کی حد تک محبت کرنے لگے..... یہ محبت آج بھی زندہ ہے اور آنے والی نسلیں بھی اپنے محسن محمد بن قاسم کو یاد رکھیں گی۔



سلیمان اول

قانون سازی پر ترک ان کو سلیمان اعظم قانونی، اور مغربی مصنفین ”سلیمان ذی شان“ کہتے ہیں

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان اور پیارے صحابی حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار مبارک پر معمول سے زیادہ رونق تھی۔ شاید کسی تقریب کا اہتمام تھا، لیکن یہ تقریب بڑی پروقار اور سادہ تھی۔ تمام لوگ مودبانہ انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

مقررہ وقت پر لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی، شیخ الاسلام آگئے تھے۔ لوگ، محترم شیخ کی تعظیم کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیخ نے دولت عثمانیہ کے پہلے حکمران غازی عثمان خان کی تلوار اپنے ہاتھ میں لی اور ایک خوش شکل نو جوان کو اشارہ کیا۔ یہ نو جوان مردانہ وجاہت کا بھرپور نمونہ تھا اور اپنی شاندار شخصیت کی وجہ سے سیٹکڑوں میں ممتاز نظر آتا تھا۔

شیخ الاسلام کے اشارے پر نو جوان ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ شیخ الاسلام نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار نو جوان کی کمر میں باندھ دی اور فضا سبحان اللہ کے کلمات سے گونج اٹھی۔

عثمانیہ سلطنت کی تخت نشینی کی رسم ادا ہو چکی تھی۔

یہ نو جوان تھے سلیمان اول بن سلیم اول جنہوں نے 26 سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیے اور اپنے بے مثل عدل و انصاف اور لاجواب انتظام کی بدولت پوری مملکت اسلامیہ کو خوشحالی اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ انہوں نے مملکت کے لیے قانون سازی کا جو خصوصی اہتمام کیا، اس کی بنا پر ترک انہیں سلیمان اعظم قانونی کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان کی عظمت کے اہل مغرب اس قدر معترف ہیں کہ مغربی مصنفین انہیں سلیمان ذی شان یا سلیمان عالی شان کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کی حکومت میں سرزمین حجاز، ترکی، مصر، الجزائر، عراق، کردستان، یمن، شام، بیت المقدس، خلیج فارس اور بحیرہ روم کے ساحلی علاقے، یونان اور مشرقی و مغربی ہنگری شامل تھے۔

سلیمان 900ھ/1494-95ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلیم اول، دولت عثمانیہ کے نویں سلطان تھے۔ والدہ کا نام عائشہ تھا۔ سلیم اول نے آٹھ سال تک (918-926ھ) حکومت کی۔ سلیمان نے اپنے والد سے سولہ سال تک جنگی فنون کی تربیت حاصل کی تھی۔ سلیم اول نے اپنے بیٹے کو دینی اور دنیاوی تعلیم دلوانے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ سلیمان کی انتظامی صلاحیتوں کو اس وقت جلال ملی جب انہیں مختلف صوبوں میں حاکم مقرر کیا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے دادا سلطان بایزید ثانی کے زمانے میں کھن کی سبھا کی حکمرانی کے فرائض ادا کیے۔ سبھا سے مراد انتظامی یا جغرافیائی علاقہ ہے۔ والد سلیم اول کے عہد میں انہیں مغنیسیا کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اور نہ اور صاروخان کی حکمرانی کی ذمہ داریاں بھی ادا کیں۔ والد سلیم اول نے جب ایران پر حملہ کیا تو وہ سلیمان ہی کو نائب بنا کر قسطنطنیہ میں چھوڑ گئے تھے۔ قسطنطنیہ اب استنبول کہلاتا ہے۔

926ھ/1520ء میں سلیم اول کا انتقال ہو گیا جس کے بعد عثمانی سلطنت کی باگ ڈور سلیمان اول کے ہاتھ میں آئی۔ یہاں سے دولت عثمانیہ کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جو اپنی خوشحالی استحکام اور وسعت کے اعتبار سے یادگار ہے۔ سلیمان اول نے اپنے 26 سالہ دور حکومت میں خلافت عثمانیہ کو سیاسی برتری دلوانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے جو جدوجہد کی وہ بلاشبہ لائق صد تحسین ہے، ان کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے بھی بے حد ممتاز ہے کہ اس دور میں مسیحی اور مغربی طاقتیں بیدار اور متحد ہو رہی تھیں اور بڑی بڑی شخصیات سے ان کا مقابلہ تھا مثلاً شہنشاہ چارلس پنجم جو یورپ

کے نصف سے زائد حصے پر حکمران تھے۔ جس میں موجودہ اسپین، بلجیم، ہالینڈ، جرمنی شامل تھے ادھر انگلستان میں ملکہ الزبتھ حکمران تھیں۔ ہنگری میں شاہ لوئی اور فرانس پر شاہ فرانس کا سکہ چل رہا تھا۔

یہ یورپ کی بیداری کا زمانہ تھا۔ فرانس، انگلستان اور آسٹریا نے اپنے اختلافات ختم کر لیے تھے۔ اور مسیحی طاقتیں متحد ہونے کی فکر میں تھیں۔ چنانچہ حکومت سنبھالنے کے بعد سے اپنے 26 سالہ دور حکومت میں سلیمان کسی نہ کسی جنگ یا مہم میں مصروف رہے، اگرچہ درمیان میں مختصر وقفے بھی آئے لیکن جہاد کا جو جذبہ سلیمان کے سینے میں موجزن تھا اس نے انہیں آخر وقت تک میدان عمل میں مصروف رکھا، حتیٰ کہ ایک جنگ کے دوران ہی انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انہوں نے ذاتی طور پر 13 بڑی جنگوں میں شرکت کی، تین ایشیا میں اور دس یورپ میں اور اس طرح سلطنت عثمانیہ کی حدود میں 13 مرتبہ توسیع کی گئی۔

خلیفہ بننے کے بعد سلیمان کی زندگی کا پہلا معرکہ بلغراد کی فتح ہے۔ ہنگری کا بادشاہ لوئی ثانی، سلیمان کے والد سلیم اول کے عہد سے ہی شورشیں برپا کر رہا تھا۔ سلیمان نے خلیفہ بننے کے بعد شاہ ہنگری کے پاس اپنے سفیر بھیجے جنہوں نے سلیمان کی جانب سے خراج کی ادائیگی کا مطالبہ شاہ ہنگری تک پہنچایا۔ شاہ ہنگری طاقت کے نشہ میں چور تھا۔ اس نے ترک سفیروں کے ساتھ بہت بدسلوکی کی بلکہ بعض روایات کے مطابق انہیں قتل کروا دیا۔ سلیمان کو خبر ملی تو انہوں نے فوجی تیاریوں کا حکم دیا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں یہ مہم سر کی گئی۔ 927ھ/1521ء میں اسلامی فوج بلغراد پر قبضہ کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دریائے ڈینیوب پر واقع شہر بورغورڈن اور سرمیہ کو بھی فتح کیا جا چکا تھا۔ سلیمان نے بلغراد میں کسی کو نقصان نہ پہنچایا۔ وہاں بڑے کلیسا کی صفائی کروائی اور نماز ادا کی اور اس کلیسا کو مسجد بنا دیا۔ بلغراد کا انتظام کر کے وہ واپس چلے آئے۔

اگلے سال انہوں نے روڈس کے جزیرے کی طرف نظر کی، جہاں سینٹ جان کے سورما (نائٹ) موجود تھے۔ یہ لوگ عرصہ دراز سے سلطنت عثمانیہ کے لیے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ عیسائی بحری قزاقوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ سلیمان 20 رجب 928ھ/15 جون 1522ء کو قسطنطنیہ سے فوج لے کر روانہ ہوئے۔ 300 جنگی جہاز اور 400 بار برداری کے جہاز الگ روانہ کیے، بحری اور بری فوجیں آ کر خلیج مارمریس پر مل گئیں۔ 4 رمضان المبارک/28 جولائی کو سلطان ساحل پر اترے اور 8 رمضان المبارک/یکم اگست کو روڈس کا محاصرہ شروع کیا، یہ محاصرہ ایک دو نہیں بلکہ پانچ ماہ تک جاری رہا۔ آخر روڈس کے حاکم نے ہتھیار ڈال دیے۔ سلیمان نے جزیرہ والوں کو بارہ دن کی مہلت دی اور اعلیٰ ظرفی سے کام لیتے ہوئے انہیں اجازت دی کہ وہ اپنا سامان اور اسلحہ لے جاسکتے ہیں اور ضرورت پڑے تو عثمانی جہازوں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ روڈس کے مسیحی باشندے یہاں سے نکل کر جزیرہ کریٹ چلے گئے۔

چند سال بعد سلیمان نے ہنگری پر حملے کا فیصلہ کیا 932ھ/اپریل 1526ء میں ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج روانہ ہوئی 300 توپیں ساتھ تھیں۔ دریائے دراوہ کو عبور کرنے کے بعد مہاج کے مقام پر ہنگری کی فوج کے مقابل اسلامی فوج صف آراء ہوئی۔ مسلمان اس قدر جوش و جذبہ سے لڑے کہ صرف دو گھنٹے میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا، شاہ لوئی نے فرار کی راہ اختیار کی لیکن دریا میں ڈوب گیا اور یہ غرقابی اس کے لیے پیام اجل لائی۔ سلیمان نے اب ہنگری کے دار الحکومت بوڈا پر چڑھائی کر دی۔ 3 ذی الحجہ 932ھ/10 ستمبر 1526ء کو بوڈا پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شاہ لوئی لاؤد تھا اس لیے خلیفہ سلیمان نے مقامی امراء کے مشورے سے کاؤنٹ زاپولیا کو حاکم مقرر کر دیا اور واپس چلے گئے۔ بوڈا اب بڑا پست کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد شہنشاہ چارلس پنجم کے بھائی فرڈیننڈ نے ہنگری کا حکمران بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے اور اپنے ان خوابوں کو حقیقت بنانے کی غرض سے اس نے ہنگری پر حملہ کیا اور زاپولیا کو شکست دے کر پولینڈ بھاگ دیا۔ زاپولیا نے سلطان سے فریاد کی۔ فرڈیننڈ بھی سلطان سے امداد کا طالب ہوا لیکن اس تکبر سے کہ ہنگری کے جن شہروں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا وہ بھی واپس طلب کر لیے۔ ظاہر ہے کہ اس پر غرور و خواست پر سلطان توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے زاپولیا کی مدد کا فیصلہ کیا۔

12 رمضان المبارک 935ھ/20 مئی 1529ء کو سلطان ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوئے، بوڈا پہنچے۔ چھ روز محاصرہ کر کے قلعہ کو فتح

کیا۔ زاپولیا کو ان کے عہدے پر بحال کیا اور فتنہ کی جڑ کاٹنے کی غرض سے آسٹریا کا رخ کیا۔ 27 ستمبر کو سلطان نے ویانا کا محاصرہ شروع کیا۔ یہ محاصرہ طویل ہو گیا۔ موسم بہت خراب تھا۔ رسد کی کمی تھی۔ راستوں کی خرابی کی وجہ سے سلطان کو بڑی توپیں، ہنگری ہی میں چھوڑنی پڑی تھیں اس لیے یہ محاصرہ بے نتیجہ رہا اور سلطان کو واپس آنا پڑا لیکن یورپ میں اتنی دور تک مسلمانوں کے قدم پہنچے جس کے باعث مسلمانوں کی اہل یورپ پر بڑی دھاک بیٹھ گئی۔ تین سال بعد سلطان نے آسٹریا کا پھر رخ کیا لیکن ایک مقام گونز کو فتح کرنے میں تین ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ وہاں سے استریا کو فتح کیا۔

سلطان نومبر میں قسطنطنیہ واپس پہنچے اور پھر آسٹریا سے عارضی صلح ہو گئی۔ سلطان کا چھٹا بڑا حملہ ایران کے خلاف تھا۔ سلطان کے وزیر اعظم ابراہیم نے 941ھ / جولائی 1534ء میں تبریز پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر میں سلطان بذات خود اس شہر میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ یہاں سے ترک فوج نے ہمدان کے راستے بغداد کا رخ کیا۔ سلطان بغداد میں چار ماہ رہے پھر ایرانیوں نے چونکہ مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا اس لیے اسلامی فوج نے ایک بار پھر ایران کا رخ کیا آذربائیجان اور کئی قلعے فتح کیے۔ 23 رجب 943ھ / 17 جنوری 1532ء کو سلطان واپس قسطنطنیہ پہنچ گئے۔

اس کے بعد سلطان چند سالوں تک مختلف چھوٹی بڑی مہمات میں مصروف رہے۔ ادھر فرڈیننڈ اور زاپولیا نے ہنگری کو ایک معاہدے کے ذریعہ آپس میں تقسیم کر لیا تھا لیکن صرف ایک سال بعد زاپولیا کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد فرڈیننڈ اپنی حریص طبیعت سے مجبور ہو کر پھر پورے ہنگری پر قبضہ جمانا چاہتا تھا سلطان کو یہ اطلاعات ملیں تو انہوں نے ربیع الآخر 948ھ / اگست 1541ء میں ہنگری کا رخ کیا۔ شہر بوڈا اور دیگر کئی شہر فتح کیے اور انہیں اپنی مملکت میں شامل کر لیا صرف ٹرانسلوینیا کو زاپولیا کی بیوہ ملکہ ازابیلا کے لیے چھوڑ دیا۔ داپو، ہیکلوس، فونکلیرشن پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں ترک دستے متعین کر دیے گئے۔ ہنگری کو سختیوں (انتظامی علاقوں) میں تقسیم کر دیا گیا اور یہاں ترک گورنر مقرر کر دیے گئے۔

954ھ / 1547ء میں شہنشاہ چارلس پنجم اور فرڈیننڈ نے سلطان سے سات سالہ صلح کر لی۔ ہنگری اور ٹرانسلوینیا پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔ فرڈیننڈ نے ایک کثیر رقم سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد کے چند سالوں میں سلطان نے ایران کی مملکت میں اندر جا کر حملے کیے۔ بغداد، موصل، اریوان، آرمینیا اور میسوپوٹیمیا کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ادھر عدن پر قبضہ کیا اور بحیرہ روم میں اپنے طاقتور بحری بیڑے کی مدد سے الجزائر، طرابلس اور بحیرہ بلقان کے متعدد جزیرے فتح کر لیے۔ اس زمانے میں بری قوت کے اعتبار سے ایشیا یا یورپ کی کوئی سلطنت دولت عثمانیہ کے برابر نہ تھی اور بحری لحاظ سے بھی اس کا شمار دنیا کی چند بڑی مملکتوں میں ہوتا تھا۔

973ھ / 1565ء میں آسٹریا سے جنگ پھر شروع ہو گئی جس میں عیسائیوں نے کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔ سلطان اس زمانے میں بیمار تھے انہیں نقرس (گٹھیا) کی شکایت تھی اس کے باوجود وہ مردانہ وار افواج کی قیادت کے لیے نکل آئے۔ آسٹریا کے قلعہ سکووار کا محاصرہ 5 محرم 945ھ / 2 اگست 1565ء کو شروع ہوا جو 12 صفر / 8 ستمبر تک جاری رہا۔ 12 صفر 973ھ / 8 ستمبر 1565ء کو قلعہ فتح ہو چکا تھا اور لشکر اسلام کامیابی کے پھریرے لہراتا ہوا قلعہ میں داخل ہو رہا تھا لیکن سپاہی اس اندوہناک حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کا محبوب سلطان اب ان کے درمیان نہیں ہے بلکہ وہ 9 اور 10 صفر / 5 اور 6 ستمبر کی درمیانی رات ہی انہیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا ہے۔ سلطان کی وفات کی خبر وزیر اعظم سو قولی پاشا نے دانستہ مخفی رکھی اور فتح کے بعد اسے عام کیا۔ فتح کے شادیانے فوراً موقوف ہو گئے اور فضا سو گوار ہو گئی۔ سلطان کی میت واپس قسطنطنیہ لائی گئی جہاں خود ان کی تعمیر کردہ مسجد سلیمانہ میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

سلطان سلیمان اول کا 26 سالہ عہد حکومت امن و خوشحالی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان کی سلطنت میں 20 مختلف قومیں آباد تھیں لیکن کبھی کسی قوم یا گروہ کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی اور کسی جانب سے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمران بنتے ہی سلطان نے پوری مملکت میں حکام کو سخت ہدایات دی تھیں کہ ہر ایک سے عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے۔ انہوں نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کو 21 ولایتوں

اور پھر ان ولایتوں کو 250 سبھوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

جامع سلیمہ، سلطان نے اپنے والد سلیم اول کی یاد میں 928ھ/1522ء میں بنوائی تھی۔ سلیم اول اس مسجد میں مدفون ہیں۔ دیگر مساجد میں ”شاہزادہ جامع، خاصکی جامع، استنبول اور سقوطری“ کی مساجد قابل ذکر ہیں۔ جامع سلیمہ کے سوا باقی عمارتیں ایک مشہور معمار ”سنان“ نے تعمیر کیں۔ سلطان نے بغداد میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مزار، قونیہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار کے ساتھ ایک مسجد بنوائی۔ بیت المقدس کی دیواروں کو بحال کرایا اور مکہ مکرمہ میں پختہ کاریز بنوائیں سلطان بے حد خدا ترس اور دین دار تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کے آٹھ نسخے اپنے ہاتھ سے نقل کیے تھے۔ وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں سے بھی ان کی اسلامی عقیدے کی پختگی کا پتا چلتا ہے۔ وہ جنگ کے دوران روزمرہ کے واقعات لکھتے جاتے تھے۔ ان کے یہ روزنامے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان روزناموں سے ان کی بیدار مغزی، چوکی اور احساس ذمہ داری کا بھی پتا چلتا ہے۔ انہوں نے شعر و ادب کی بڑی سرپرستی کی اور نثر نگاروں کو تاریخ لکھنے کی جانب متوجہ کیا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ مسیحی طاقتوں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے آزما کر مسلمانوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی لیکن سلیمان اول کی اعلیٰ قیادت میں سولہویں صدی عیسوی کے دوران مسلمانوں کی حکومت پھیلتی چلی گئی۔ اس وسیع و عریض مملکت کی حدود بڈاپست سے بصرہ تک اور بحیرہ خزر سے بحیرہ روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھیں اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس سلطنت کا حصہ تھے۔

سلطان کی عظیم الشان فتوحات میں ان کی بحری فوج کے سربراہ خیر الدین باربروسہ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ خیر الدین باربروسہ کسی زمانے میں بحری قزاق تھے بعد میں وہ اپنے اس پیشے سے تائب ہوئے اور سلطان کے پاس آکر فوج میں شامل ہو گئے۔ ان کی فطری بہادری، جوان مردی اور لڑائی کے غیر معمولی صلاحیت اب مثبت رخ پر استعمال ہونے لگی۔ سلطان نے انہیں بحری بیڑے کا سربراہ یعنی امیر البحر بنادیا۔ امیر البحر کی حیثیت سے خیر الدین باربروسہ نے متعدد کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے بحیرہ بلقان کے تقریباً تمام جزائر پر قبضہ کر کے انہیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔ 934ھ/1528ء میں پوپ اور فرڈیننڈ نے ترکوں کے خلاف اتحاد مقدس قائم کیا۔ اتحادیوں کا زبردست بیڑا شہنشاہ چارلس کے مشہور امیر البحر انڈریا ڈوریا کی قیادت کی، پر یوسیا کے مقام پر عثمانی بیڑے کے مقابل آیا۔ خیر الدین باربروسہ نے اتحادی بیڑے کو شکست دی۔

سلطان نے حکومت کے اداروں کا انتظام اس قدر عمدگی سے کیا کہ اسے مثالی انتظام کہا جاسکتا ہے۔ ان کا دور ایک جمہوری دور تھا۔ انہوں نے شاہی خاندان کے افراد کی بجائے وزراء کو نظم و نسق سونپ دیا تھا۔ انہوں نے قانون سازی کی طرف خصوصی توجہ دی، فوج کی نظم و تربیت، فوجی نظام جاگیر داری، زمینی جائیداد کے قوانین پولیس اور فوج کی خدمات کے عوض جاگیر وغیرہ دینے کا ضابطہ اور آئین مرتب کروایا۔ انہوں نے ٹیکس کی مقدار خود مقرر کی تھی۔ قانون کی رو سے کاشت کار اراضی کا مالک تھا۔ کاشتکاروں کو میسر سہولتوں کی وجہ سے ہنگری کے علاقوں میں مقیم اکثر عیسائی کا کاشتکار بھاگ کر مسلمانوں کے علاقوں میں آباد ہو جاتے تھے۔ مختلف جرائم کے لیے سزائیں مقرر کی گئیں ان تمام قوانین کو بعد میں مجموعے کی شکل میں مرتب کیا گیا۔

سلطان نے ملک بھر میں اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کیں، محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات بنوایا۔ سرکاری دفاتر میں ریکارڈ کے لیے رجسٹر مرتب کروائے جو ”کوٹکات“ کہلاتے تھے۔ انہوں نے آب رسانی کے نظام کو بھی بہت ترقی دی۔ پانچ بڑی کاریزیں بنوائیں۔ قسطنطنیہ میں ایک نہر جاری کروائی۔ مکہ مکرمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کروائی، بڑے شہروں میں ہسپتال قائم کیے اور پل بنوائے۔

سلطان نے علم کی اشاعت پر بھی توجہ دی۔ مکہ مکرمہ میں چاروں فقہی مذاہب کے لیے چار مدرسے قائم کیے۔ متعدد شہروں میں خوبصورت مساجد تعمیر کروائی جن کے ساتھ مدارس کام کرتے تھے۔ کئی مدرسے اردو العلوم بنوائے۔ علماء کی تنظیم اور ان کے منصب سے متعلق بہت سی اصلاحات کیں۔ انہوں نے علماء کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا اور انہیں خصوصی مراعات دیں، طلبہ کے لیے وظائف بھی مقرر کیے۔

827ھ/1424ء میں سلطان مراد ثانی کے زمانے میں شیخ الاسلام کا عہدہ قائم ہوا تھا۔ سلطان سلیمان نے اسے برقرار رکھا۔ یہ عہدہ

دولت عثمانیہ میں 498 سال تک رہا اور اس پر 131 علماء فائز ہوئے، شیخ الاسلام تمام دینی اور تعلیمی معاملات کے نگران اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ عدالتوں کے سربراہ بھی وہی تھے ان کے اختیارات نہایت وسیع ہوتے تھے ججوں کو مقرر اور معزول وہی کرتے تھے اور شرعی امور میں حکومت کی رہنمائی کرتے تھے۔

سلطان نے فوج کو بہتر بنانے کا خاص اہتمام کیا۔ ان کے پاس مستقل تنخواہ دار فوج 24 ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی لیکن جنگ کے موقع پر دو لاکھ سپاہی اکٹھے کیے جاسکتے تھے۔ تاہم انہوں نے فوج کو محض انتقامی جذبہ سے کبھی کسی مہم پر روانہ نہیں کیا۔ جب بھی فوج جنگ کے لیے روانہ ہونے لگتی تو اسے سختی سے تاکید کی جاتی کہ وہ عوام کی جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

فن تعمیر وہ میدان ہے جس میں سلطان کے کارنامے آج بھی ٹھوس اور مستحکم شکل میں اپنی نوعیت اور جاہ جلال کی داستان بیان کر رہے ہیں۔ سلطان نے مفتی ابوالسعود کے فتوے کی بنیاد پر کعبہ اللہ کی از سر نو تعمیر کروائی۔ سلطان کی تعمیرات نے ترک ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ سلطان نے قسطنطنیہ، بغداد، قونیہ، دمشق اور دیگر کئی شہروں میں نہایت حسین اور عالیشان مساجد تعمیر کروائیں، ان میں سب سے بلند مقام جامع سلیمانیہ کا ہے جو 957ھ/1550ء اور 964ھ/1556ء کے درمیانی عرصہ میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ عظیم مسجد شہر قسطنطنیہ (اب استنبول) کی سب سے اونچی پہاڑی پر ہے۔ اس میں چار مدر سے، ایک عمارت اور دیگر مکانات تعمیر کروائے گئے۔ چاروں میناروں میں بل کھاتے ہوئے دس زینے تھے۔ سلطان کی قبر مسجد کے صحن میں ہے۔ وہیں سلیمان ثانی اور کئی دیگر عثمانی خواتین کی قبریں ہیں۔

صلاح الدین ایوبی

بیت المقدس کے فاتح جن کی زندگی کا بیشتر حصہ جہاد میں گزرا

باب داؤد کے سوا شہر کے تمام دروازے بند تھے۔ فضا میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ انسانوں کی ایک لمبی قطار تھی جو آہستہ روی کے ساتھ باب داؤد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس قطار میں لاکھیں ٹپکتے ہوئے بوڑھے بھی تھے اور وزنی سامان اٹھائے ہوئے جوان بھی۔ سفری لبادے پہنے عورتیں بھاری بھاری گٹھڑیاں اٹھائے چل رہی تھیں۔ بعض کی گودوں میں ننھے منے بچے تھے جو اپنی حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ نوکر مویشیوں کی رسیاں تھامے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے ان مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں دھیمے سروں میں بج رہی تھیں۔

یہ اس شہر کے سو گوار مکیمنوں کی قطار تھی جسے شہر القدس کہا جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کا قبلہ اول، مسجد اقصیٰ اور مقدس مقامات موجود ہیں۔ اس دن یہ شہر القدس، مسیحی تسلط سے رہائی حاصل کر چکا تھا۔ قدرت نے ایک عظیم جرنیل کی شکل میں اس شہر کے لیے ایک نجات دہندہ بھیجا تھا جس نے ناصرف شہر کو تسخیر کر لیا تھا بلکہ اپنے حسن سلوک اور عفو و درگزر سے دلوں کو بھی تسخیر کر ڈالا تھا۔

تقریباً 91 سال قبل اس شہر مقدس نے ایک اور منظر دیکھا تھا جب پوپ ار بن ثانی نے پورے یورپ سے صلیب کے نام پر اپیل کی تھی کہ بیت المقدس کو بہانہ بناؤ اور سرزمین مقدس کو مسلمانوں سے چھین کر اس کے خود مالک بن جاؤ اور پھر پوپ کی اس اپیل پر صلیب بردار یورپی فوجیں 489ھ/1096ء میں بیت المقدس پر چڑھ دوڑی تھیں۔ انہوں نے بچوں، بوڑھوں، جوانوں کو کسی امتیاز کے بغیر قتل کر ڈالا تھا، شہر کے گلی کو بچے ان بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ جابجا لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ شہداء کی تعداد ستر ہزار کے قریب تھی۔ مسلمانوں کا لہو اس قدر رازاں ہو گیا تھا کہ صلیبی فوج کے گھوڑوں کی ٹانگیں اس لہو میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس شہر کے درود یوار، قبا الصخرہ کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر اور مسجد اقصیٰ کی محرابیں آج پھر یہ منظر دیکھ رہی تھیں کہ عظیم سپہ سالار صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں مسلمانوں کی فوج نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر القدس کو فتح کر لیا ہے۔ کسی مسیحی کے ساتھ ذرا سی بھی زیادتی نہیں کی گئی اور جب ایسے بہت سے مسیحی شہری بیت المقدس میں رہ گئے جو فدیہ ادا نہ کر سکے تو رحمدل اور مہربان حکمران صلاح الدین ایوبی نے ان کا فدیہ معاف کر دیا ہے اور جب بہت سی ایسی عیسائی عورتیں آ کر فاتح بیت المقدس کے سامنے رونے لگی ہیں جن کے شوہر یا والد قتل یا قید ہو گئے تھے تو یہ شیردل حکمران خود بھی آبدیدہ ہو گیا ہے اور اس نے عورتوں کے عزیزوں کو ناصرف رہا کر دیا بلکہ کثیر رقم سے ان کی مدد بھی کی ہے۔

اسی صلاح الدین ایوبی کی مسحور کن شخصیت نے تاریخ کو اسیر کر رکھا ہے۔

عالم اسلام کے اس عظیم جرنیل نے 532ھ/1138ء میں تکریت کے مقام پر آنکھیں کھولیں۔ تکریت، دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ایک قصبہ ہے جو بغداد سے تقریباً 90 میل دور ہے۔ عراق کا یہ علاقہ شمالی سرحد سے قریب ہے۔ صلاح الدین نے تکریت میں اپنی زندگی کے چند ہی دن گزارے تھے کہ ان کے والد نجم الدین ایوب شام منتقل ہو گئے جہاں سلطان عماد الدین زنگی نے انہیں بعلبک کا گورنر مقرر کر دیا۔ صلاح الدین اور ان کے بھائیوں نے غفوان شباب کا عہد بعلبک ہی میں گزارا، وہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ دینی علوم میں دسترس پیدا کی اور جنگی فنون سیکھے۔

سلطان عماد الدین زنگی کے بعد سلطان نور الدین زنگی نے مسند اقتدار سنبھالی۔ صلاح الدین کی صلاحیتیں سلطان نور الدین زنگی کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکیں۔ 559ھ/1164ء میں نور الدین زنگی نے صلاح الدین کو ان کے چچا اسد الدین شیرکوہ کے ساتھ مہمات پر روانہ کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً پانچ سال بعد اسد الدین شیرکوہ نے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ ان کے انتقال کے بعد صلاح الدین کو مصر کا وزیر مقرر کر دیا گیا۔ مصر میں فاطمی خلیفہ العاضد حکمراں تھے جو بہت جلد انتقال کر گئے۔ اب صلاح الدین مصر پر خود مختار حکمراں تھے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں صلیبی فوجیں بیت المقدس پر قابض ہو چکی تھیں۔ ان کا وجود مسلمانوں کے دلوں میں کانٹے کی مانند تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی میں صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ نور الدین زنگی 1174ء میں انتقال کر چکے تھے اور قدرت صلاح الدین ایوبی کی شکل میں مسلمانوں کو ایک عظیم رہنما عطا کرنا چاہتی تھی۔

اس عظیم رہنما نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، انہیں ”جہاد“ جیسے اہم ترین فریضے کی جانب متوجہ کیا اور اپنی باتوں سے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر دی۔

اب صلاح الدین ایوبی کے پاس جوش جہاد سے سرشار جوانوں کی فوج تھی جو اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔ 572ھ/1177ء میں صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کا رخ کیا اور معرکہ خیبر و شرکا آغاز ہو گیا۔

صلاح الدین کی فوجوں اور بالذون چہارم کی فوجوں کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔ 876ھ/1180ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد سلطان محسوس کیا کہ فوج کو از سر نو منظم کرنے اور بہتر تیاری کرنے کے لیے جنگ بندی ضروری ہے۔ چنانچہ 1180ء میں بالذون پنجم سے عارضی صلح کر لی گئی۔ دو سال تک تیاری کے بعد موسم گرما میں سبز اور سیاہ علم بلند ہوئے اور سلطان کا لشکر پوری آن بان سے روانہ ہو گیا۔ لوگ گھروں اور دکانوں سے نکل نکل کر غازیوں کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہے تھے۔

صلاح الدین نے حصن یعقوب کے قلعے پر حملہ کیا اور اسے برباد کر دیا پھر کرک کے مضبوط قلعے پر دھاوا بول دیا جس کا حکمراں ایک مکار عیسائی رجبنا لڈ تھا۔ کرک کے قلعے کے اندر غلام گردشوں میں ایک ہزار گھوڑے باندھے جاسکتے تھے۔ اس کے گول برج خود قلعہ کی مانند تھے۔ ان برجوں میں علیحدہ دروازے اور پل اٹھانے والی کلیں نصب تھیں۔ یہ لڑائی مہینہ بھر جاری رہی حتیٰ کہ بیت المقدس کے سپہ سالار ریمینڈ کی قیادت میں فوج کی کمک آ پہنچی۔ ریمینڈ نے جو صورت حال دیکھی تو سلطان صلاح الدین سے صلح کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ سلطان نے بھی اس وقت صلح کو بہتر جانا اور 1184ء میں سرحد سے لوٹ گئے۔

صلح کو ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ شاہ بالذون کا انتقال ہو گیا۔ کرک کے حکمراں رجبنا لڈ نے گستاخانہ انداز میں کہا ”کہاں ہیں تمہارے محمد (نعمو باللہ) انہیں اپنی مدد کے لیے بلاؤ۔“ یہی نہیں رجبنا لڈ نے قافلے کے چند بے گناہ افراد کو قتل کر ڈالا۔

صلاح الدین ایوبی جو سرزمین کو صلیبیوں کے پنجے سے آزاد کروانے کے لیے پہلے ہی مضطرب تھے ان واقعات پر تڑپ اٹھے اور انہوں نے بلاتا خیر فوج مجتمع کی اور دریائے اردن کا رخ کیا۔ سلطان کی فوج بارہ ہزار سرفروشدوں پر مشتمل تھی۔

16 ربیع الآخر 583 / 26 جون 1187ء کو نماز جمعہ کے بعد سلطان کی فوج حرکت میں آگئی اور یکم جولائی کو وہ دریائے اردن عبور کر کے طبریہ سے چھ میل جنوب مغرب میں کفرسبت کی پہاڑیوں پر پڑاؤ ڈال چکی تھی۔ مسیحیوں کے لشکر میں بیت المقدس کے شاہ گائی اور کرک کے حکمراں رجبنا لڈ سمیت متعدد سردار تھے۔ دونوں جانب سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ مسلمان بڑی پامردی سے لڑ رہے تھے۔ دوپہر کو مسیحیوں کی قوت جواب دینے لگی۔ ان کے تمام سالار رجبنا لڈ کے گرد حطین کی پہاڑی پر جمع ہو گئے اور صلیبی جھنڈا اس پہاڑی پر لہرانے لگا۔ مسیحیوں کے ساتھ ایک مشکل اور تھی کہ مسلمان فوجیوں نے آس پاس کے پانی کے ذخائر پر قبضہ کر لیا تھا۔

لڑائی دیر تک جاری رہی۔ صلاح الدین کے بیٹے الافضل کہتے ہیں کہ ”میرے والد نے جب اپنے سپاہیوں کو لاکار کر دشمن پر حملہ کرنے

کے لیے کہا تو اسلامی فوج میں بجلی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے زبردست یورش کر کے دشمن کا شاہی خیمہ الٹ دیا۔ والد محترم یہ دیکھتے ہی گھوڑے سے اترے اور اپنے رب کے حضور سر پہ سجود ہو گئے اس وقت خوشی سے ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ سلطان صلاح الدین سرزمین مقدس کے بیشتر حصے پر اسلامی پرچم لہرا چکے تھے اور اب وہ گھڑی آنے والی تھی جس کا مسلمانوں کو بے چینی سے انتظار تھا یعنی بیت المقدس کی صلیبوں کے قبضے سے آزادی۔ 14 رجب 583ھ / 20 ستمبر 1187ء کو سلطان کی فوج بیت المقدس کے ایک مغربی دروازے باب داؤد کے مقابل پہاڑی پر خیمے گاڑ چکی تھی۔ مسیحی سرداروں نے دیکھ لیا تھا کہ اب وہ بیت المقدس پر زیادہ دیر قابض نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے سلطان کو پیغام بھجوایا کہ ہم جیتے جی یروشلم سے دستبردار نہیں ہوں گے اپنے تمام مویشیوں کو ذبح کر دیں گے حرم شریف کی عبادت گاہوں کے تمام سامان اور تبرکات کو آگ لگا دیں گے اور عورتوں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اسی دوران اسقف اعظم ہرقلیس، بالیان سے ملے اور انہیں مشورہ دیا کہ شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔

سلطان نے صلح کی درخواست منظور کرتے ہوئے شہریوں پر فدیہ عائد کر دیا۔ ہر مرد پر دس اشرفیاں، ہر عورت پر پانچ اشرفیاں اور ہر بچے پر ایک اشرفی فدیہ عائد کیا گیا۔ دوسرے دن سے شہریوں کا انخلاء شروع ہو گیا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے جس دن بیت المقدس فتح کیا اس روز رجب کی 27 تاریخ تھی۔ 27 رجب معراج النبیؐ کی تاریخ ہے اور معراج نبویؐ کو بیت المقدس سے خاص نسبت حاصل ہے۔ صرف اکیانوے سال بعد بیت المقدس مسیحی تسلط سے آزاد ہو چکا تھا اور اللہ کے نام لیوا، اپنے مالک کے حضور اپنی جبینیں جھکائے کھڑے تھے۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ کی خبر سنتے ہی پورے یورپ میں کھلبلی مچ گئی۔ شام کے اسقف اعظم ولیم صوری راہبوں کی جماعت لے کر ماتمی لباس میں روم جا پہنچے۔ انہوں نے اشتعال انگیز تقاریر شروع کر دیں۔ پاپائے رومانے فتویٰ دے دیا کہ جو شخص بیت المقدس کی بازیابی کی جنگ میں شریک ہوگا اس کے سارے گناہ دھل جائیں گے اور جو اس کا رخیہ میں حصہ نہ لے گا وہ مسیحیت سے خارج ہو جائے گا۔ فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں نے آپس کی رنجشیں فراموش کر دیں۔ شاہ انگلستان ہنری دوم، فرانس کے شاہ فلپ آگسٹس اور جرمنی کے شاہ فریڈرک باربروسہ، جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی دوران ہنری دوم کا انتقال ہو گیا تو اس کا لڑکا چرڈ جانشین بنا۔ جنگ کے مصارف پورے کرنے کے لیے انگلستان اور فرانس میں ”عشر صلاح الدین“ کے نام سے ایک عام ٹیکس عائد کیا گیا۔

قدرت عالم اسلام کے اس عظیم سپوت سے جو کام لینا چاہتی تھی وہ لے چکی تھی اور اب اس کی حیات مستعار کے دن پورے ہونے کو تھے۔ 15 صفر 589ھ / 20 فروری 1193ء کو سلطان حاجیوں کے استقبال کے لیے گئے۔ کچھ دن سے ان کی طبیعت خراب تھی۔ بارش کا موسم تھا۔ بخار نے آن گھیرا۔ اگلے چند دن میں بخار اور تیز ہو گیا۔ دسویں دن قدرے آفاقہ ہوا، لیکن دودن بعد پھر حالت خراب ہو گئی اس وقت ایک قاری ان کے قریب بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا جب وہ سورہ حشر کی اس آیت پر پہنچا ترجمہ یہ ہے:

”وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا وہ نہایت مہربان اور رحیم ہے۔“

تو سلطان نے آہستہ سے کہا ”درست“ اور یہ آیت قرآن پاک پڑھی انی تو کلت علیہ (میں اس (رب) پر توکل کرتا ہوں) پھر بیت المقدس کے فاتح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس اولوالعزم مجاہد نے مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگا لیا۔

27 صفر 589ھ / 4 مارچ 1193ء کو صلاح الدین ایوبی کا انتقال ہوا۔ اسی دن نماز عصر کے بعد عالم اسلام کے اس بطل جلیل کو دمشق کے قلعہ کے باغ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی وہ تلواریں بھی ان کے ساتھ ہی دفن کر دی گئی جس سے انہوں نے کتنے ہی معرکے سر کیے تھے۔

صلاح الدین ایوبی کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک بھر میں پھیل گئی۔ اس خبر کو جس نے سنا دل تھام کر رہ گیا۔ تدفین کے بد دمشق کی گلیوں پر ویرانی کا راج تھا اور بازاروں کی رونق اجڑ چکی تھی۔ صلاح الدین ایوبی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے رفیق، قاضی بہاء الدین ابن

شد اپنے زمانے کے نامور عالم تھے۔ انہوں نے صلاح الدین کو جیسا پایا اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”صلاح الدین دینی احکام کی پابندی اور شریعت کے امور کی حفاظت میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ نماز جماعت سے ادا کرتے تھے اور رات کے آخری پہر میں تہجد کے لیے اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے۔ قرآن پاک سننے کا بڑا ذوق تھا اور جب ان کے سامنے قرآنی آیات تلاوت کی جاتیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ حدیث سننے کا بہت شوق تھا۔ حافظ سلفی سے حدیث سننے کے لیے صلاح الدین نے کئی بار قاہرہ سے اسکندریہ تک کا سفر کیا۔

صلاح الدین نہایت نجی، شجاع، نڈر اور مستقل مزاج تھے۔ میں نے ایک کتاب جہاد کے آداب اور جہاد سے متعلق آیات اور احادیث پر لکھی تھی۔ یہ کتاب اکثر سلطان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔“

صلاح الدین ایوبی نے مصر و شام پر تقریباً 24 سال حکومت اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ عہد کے محاصرے کے دوران اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھانا نہ کھا سکتے تھے لیکن ان کا پورا دن گھوڑے کی پشت پر گزرتا وہ کہتے: ”میں گھوڑے پر بیٹھتا ہوں تو میرا درد جاتا رہتا ہے اور گھوڑے سے اترتا ہوں تو پھر درد میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔“

صلاح الدین ایوبی حسن سیرت کا مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لائق سپہ سالار اور زیرک سیاستدان بھی تھے۔ تحمل اور بردباری ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک جنگ کے دوران ان کے نوجوان لڑکے اسماعیل کے انتقال کی خبر آئی۔ سلطان نے یہ خبر کسی سے بیان نہ کی نہ اپنے طرز عمل سے کوئی ملال ظاہر ہونے دیا۔ ہاں جب وہ خط پڑھتے تھے جس میں انتقال کی خبر تھی تو آنکھیں بھرتی تھیں۔

سلطان صلاح الدین شام، مصر اور فلسطین جیسے زرخیز علاقوں پر حکمران تھے انہیں زندگی میں بہت کچھ آسائش حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے لیکن انہوں نے سادگی اختیار کی اور ان تمام آسائشوں کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے اپنے ترکہ میں کوئی محل یا جاگیر نہیں بلکہ صرف ایک دینار اور 47 درہم چھوڑے۔

صلاح الدین کی زندگی کا بیشتر حصہ صلیبوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے گزرتا تاہم انہوں نے اپنے عہد حکومت میں رفاہ عامہ کے بہت کام کیے۔ انہوں نے قاہرہ کو وسعت دی۔ تفریح گاہیں قائم کیں۔ شہر کے قریب کوہ مقطم کی مغربی پہاڑیوں پر ایک قلعہ تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا جسے بعد میں ان کے بھتیجے نے مکمل کروایا۔

علم کو بڑے پیمانے پر فروغ دینا صلاح الدین کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ دینی علوم کی سرپرستی کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے قاہرہ میں ایک دارالعلوم قائم کیا اور مصر، شام، فلسطین اور جزیرے کے تمام شہروں میں سینکڑوں مدرسے تعمیر کروائے۔ ابن جبر کے مطابق ان کے علمی ذوق کو دیکھ کر ان کے صاحبزادوں، اہل خانہ اور عورتوں میں بھی مدرسے قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ مصر کے مدارس میں مدرسہ صلاحیہ، مدرسہ صوفیہ مدرسہ شرقیہ، مدرسہ عالیہ، مدرسہ فاضلیہ، مدرسہ صالحہ وغیرہ شامل ہیں۔ شام کا علمی مرکز تھا جہاں کئی مشہور مدارس قائم کیے۔ ناداروں کے بچوں اور یتیموں کی تعلیم کے اخراجات حکومت خود برداشت کرتی تھی۔ حکومت کی جانب سے علماء کے لیے مقرر کیے گئے وظائف کی مالیت تین لاکھ دینار سالانہ تھی۔ سلطان نے کئی اوقاف قائم کیے تھے جن کے تحت مختلف منصوبوں کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ سلطان نے قاہرہ میں ایک بہترین ہسپتال اور دیگر شہروں میں کئی شفا خانے بھی تعمیر کروائے۔

صلاح الدین ایوبی عالم اسلام کے وہ قابل فخر اور عظیم رہنما ہیں جن پر مسلمان رہتی دنیا تک ناز کریں گے جن کے روشن و درخشاں کارنامے ہمیشہ مسلمانوں کے لیے سرمایہ افتخار بنے رہیں گے اور ہر دور میں دلوں میں جہاد کی تڑپ بیدار کرتے رہیں گے۔ صلاح الدین ایک پکے اور سچے مسلمان کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اپنے رب پر کامل بھروسہ جذبہ جہاد سے معمور اور سیرت اسلامی اوصاف سے مزین..... یہ تھے صلاح الدین ایوبی!

عماد الدین زنگی

انہیں صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے کا شرف حاصل ہوا

”ہمیں اب الرہا پر حملہ کر دینا چاہیے۔“ حکمران نے اپنے ماتحتوں سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس طویل قامت حکمران کا رنگ گندمی مائل سرخ تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور اس کا چہرہ پاکیزگی اور وجاہت کی منہ بولتی تصویر تھا۔

الرہا..... جسے صلیبی ایڈیسہ کے نام سے پکارتے تھے اس شہر کو اور بھی کئی نام دیے گئے تھے رہا، اعزاز، (آج کل اسے اورفا کہتے ہیں) یہ شہر کبھی دیار بکر (موجودہ ترکی) کے نواحی علاقے میں ایک نیم خود مختار عیسائی ریاست میں شامل تھا لیکن اب صلیبی اس پر قابض ہو کر یہاں پہلی صلیبی ریاست قائم کر چکے تھے۔ عیسائی اسے پانچواں مقدس شہر مانتے تھے۔ ان کے دیگر مقدس شہر یروشلم (بیت المقدس) انطاکیہ، روم اور قسطنطنیہ۔ صلیبیوں نے یہاں زبردست فوج قائم کر رکھی تھی اور وہ موصل، دیار بکر اور بغداد وغیرہ کے لیے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ دریائے فرات کے کنارے واقع یہ شہر مضبوط فصیلوں سے گھرا ہوا تھا۔

یہ 539ھ/1144ء کا ذکر ہے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل صلیبی مسلمانوں سے ان کا قبلہ اول بیت المقدس چھین چکے تھے اور اس صدمہ سے ہر مسلمان کا دل تڑپ رہا تھا۔ حکمران نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ فوج کے تمام سپاہی بڑی پھرتی کے ساتھ سامان جنگ سے لیس ہو کر صف بستہ ہو گئے۔ وہ اپنے سالار کے حکم کے منتظر تھے۔

سالار نے اشارہ کیا اور نعرہ تکبیر کی گونج میں اسلامی فوج الرہا کی طرف روانہ ہو گئی۔ ادھر الرہا (ایڈیسہ) پر حکمران عیسائیوں کے رہنما جوسلن ثانی کو خبر مل گئی کہ اسلامی فوج آرہی ہے اس کا چہرہ پریشانیوں اور تفکرات کی آماجگاہ بن گیا۔ اس نے فوج کے سالار کو بلا کر جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی دیر بعد جوسلن ثانی اپنے چند وفادار ساتھیوں سمیت فرار ہو کر کسی محفوظ مقام کا رخ کر رہا تھا۔

اسلامی لشکر جلد ہی الرہا کی فصیلوں تک پہنچا۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا اور مکمل ناکہ بندی کر دی گئی۔ اسلامی فوج کے سالار نے کہا ”شہر کے حکام کو پیغام بھیج دیا جائے کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں گے تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔“ پیغام بھجو دیا گیا، لیکن کچھ دیر بعد ہر کارے عیسائی حکام کا جوابی پیغام لا رہے تھے جس میں اسلامی لشکر کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا تھا۔ اب جنگ کرنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ اسلامی فوج کی منہ بولتی حرکت میں آ گئیں۔ شہر پر حملوں کا آغاز ہو گیا، شہر میں اسلحہ اور خوراک کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ چنانچہ شہر والے قلعہ بند ہو کر 28 دن تک مقابلہ کرتے رہے لیکن 29 ویں دن قلعہ میں محصور عیسائی فوجی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اسلامی فوج شہر کی فصیلیں توڑ کر شہر میں داخل ہو رہی ہے۔

الرہا فتح ہو چکا تھا۔ وہی صلیبی جنہوں نے کچھ عرصہ قبل بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے عورتوں کو ان کے سہاگ سے محروم کیا تھا، معصوم بچوں کے سروں سے والدین کا سایہ چھین لیا تھا اب مسلمان فوج کے رحم و کرم پر تھے۔ اسلامی لشکر کے سپاہی غم و غصہ سے بے چین تھے۔ ان کی آنکھوں میں صلیبی سپاہیوں کے لیے رحم کی کوئی علامت نہ تھی لیکن یہ اسلامی لشکر تھا جس کا ایک ایک سپاہی اپنے افسر اعلیٰ کے حکم کا پابند تھا

اور وہ منتظر تھے کہ دیکھیں سالارِ صلیبوں کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

سپہ سالار نے اپنی بڑی بڑی ملیح آنکھیں اٹھائیں، ان کے خوبصورت پرچہ پر سکون تھا۔ انہوں نے حکم دیا۔ ”جو لوگ ہتھیار پھینک دیں، انہیں کچھ نہ کہا جائے اور جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا ہے انہیں رہا کر دیا جائے۔“

یہ اس مسلمان حکمران کا اعلیٰ ظرف تھا اور ان کی مثالی رحم دلی تھی کیونکہ وہ اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے تھے جس نے 13 سال تک مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو فتح مکہ کے روز معاف کر دیا تھا۔

الربا کی فتح کوئی معمولی واقعہ نہ تھی اس کی خبر فوراً ہی پوری دنیا میں پھیل گئی اور تمام مسیحی ممالک میں صف ماتم بچھ گئی۔ مشہور مورخ علامہ ابن الاثیر کے الفاظ میں ایڈیسیہ (الربا) کی فتح، فتح الفتوح، فتح مبین تھی۔ ادھر پورے عالم اسلام میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اپنے بھرپور جذبہ ایمانی، مثالی غیرت اور بے پناہ جرأت سے کام لیتے ہوئے صلیبوں کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے والے یہ اولین حکمران تھے، عماد الدین زنگی جن کو بجا طور پر ملت اسلامیہ کا محسن قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ناصرف مسلمانوں کو صلیبوں کی زبردست طاقت کے خلاف متحد اور منظم بھی کیا بلکہ اپنے زیر انتظام علاقے میں اسلامی شریعت نافذ کر کے اسے ایک مثالی اسلامی ریاست بنادیا۔

عماد الدین زنگی نے جب اس جہان میں اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا تو اس وقت عالم اسلام کے بڑے حصے پر سلجوقیوں کی حکمرانی تھی۔ سلجوقی خاندان کے ایک بہت نامور حکمران سلطان ملک شاہ سلجوقی اس زمانے میں اس حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے دور میں مغرب میں شام، جنوب میں یمن اور عمان اور مشرق میں چین تک اسلامی مملکت کی حدود پھیل چکی تھیں۔ قسیم الدولہ آقسقر بن عبداللہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کے معزز مصاحب تھے۔ آقسقر ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی سفید باز کے ہیں۔ سلطان اپنے قابل وزیر نظام الملک طوسی کی رائے کا بڑا احترام کرتے تھے طوسی کے مشورے پر سلطان نے آقسقر کو 477ھ میں حلب اور حماہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ دونوں علاقے اب شام میں شامل ہیں۔ اسی سال آقسقر کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ آقسقر نے اس کا نام عماد الدین رکھا۔ عماد الدین ہی آقسقر کی اکلوتی اولاد تھے۔

485ھ (1092ء) میں ملک شاہ سلجوقی کی حیات مستعار کے دن پورے ہو گئے۔ ان کے بیٹے رکن الدین ابوالمظفر برکیاروق نے شوال 487ھ میں سلجوقی سلطنت کی زمام کار سنبھالی۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ میں بیداری کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس وقت تک عیسائیوں کی حکومت صرف براعظم یورپ تک محدود تھی لیکن سلطان ملک شاہ سلجوقی کے انتقال کے بعد عیسائیوں نے بیت المقدس، فلسطین اور دیر علاقوں کی طرف لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں فرانس کا ایک راہب پیٹروی ہر مٹ اٹھا۔ اس نے ملک ملک گھوم کر اپنی شعلہ بیانی سے مسیحیوں کے دلوں میں آگ بھڑکادی۔

نومبر 1095ء میں فرانس کے شہر کلیرمانٹ میں پوپ اربن ثانی نے مسیحیوں کا بہت بڑا اجتماع بلایا۔ اس اجتماع میں عیسائی راہبوں، پادریوں اور عام لوگوں نے اتنی بڑی تعداد میں شرکت کی کہ شہر بھر میں جہاں دیکھو لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ اسی اجتماع میں پوپ نے فتویٰ دیا کہ بیت المقدس کو ”کافروں“ کے قبضہ سے آزاد کروانے کے لیے خداوند یسوع مسیح کے ہر پیرو کا اولین فرض ہے کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا دے۔

بیت المقدس اور فلسطین پر قبضہ کرنے کے لیے عیسائیوں نے جو جنگیں لڑیں، وہ صلیبی جنگیں کہلاتی ہیں، کیونکہ کلیرمانٹ کے اجتماع میں پوپ اربن ثانی نے لوگوں کو ایک صلیب دکھا کر کہا تھا: ”خداوند یسوع مسیح“ خود اپنی قبر سے یہ صلیب تمہارے سینوں پر آویزاں کرنے کے لیے نکلا ہے، یہی تمہاری نجات کا نشان ہے اور یہی تمہاری فتح کی ضامن ہے۔“

صلیبی جنگوں کی کل تعداد آٹھ ہے اور ان کا عرصہ 1096ء سے لے کر 1271ء تک محیط ہے۔ صلیبیوں کا پہلا لشکر بیت المقدس کی سمت روانہ ہوا۔ جون 1099ء میں صلیبی مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس پر قابض ہو چکے تھے اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کی حکومت بالائی الجزیرہ میں مار دین سے لے کر مصر کی سرحد العریش تک پھیل چکی تھی۔ ارض مقدس میں عیسائیوں کی چار ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں جن کے صدر مقامات بیت المقدس، الرہا، انطاکیہ اور طرابلس تھے۔

یہ دور مسلمانوں کے لیے بڑا کٹھن اور کرب انگیز تھا، وہ اپنی نظروں کے سامنے صلیبیوں کو بیت المقدس پر قابض ہوتے اور مسجد اقصیٰ میں خون کی ندیاں بہاتے دیکھ چکے تھے۔ فی الحقیقت مسلمان بڑی بے بسی سے دوچار تھے۔

مسلمانوں کی اپنے رب سے دعائیں قبول ہوئیں اور ظلم و ستم کی اس سیاہ رات میں بالآخر اُمید کی ایک کرن چمک اُٹھی اور پھر اس کرن سے پھوٹنے والی کئی کرنوں نے دور دور تک اُجالا کر دیا۔ جبر و استبداد کے گھناؤں پاندھیرے بھاگ کھڑے ہوئے اور ارض مقدس، فلسطین نور اسلام سے جگمگا اُٹھی۔

سب ظلمت میں اُمید کی یہ پہلی کرن تھی، عماد الدین زنگی جنہوں نے اپنی عظیم قوت ایمانی بے مثال جرأت اور قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے پے در پے حملے کر کے صلیبیوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ ان کے مضبوط اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ صلیبیوں کے خلاف جس مقدس جہاد کا انہوں نے 507ھ میں آغاز کیا تھا اسے پھر ان کے بیٹے نور الدین زنگی اور پھر صلاح الدین ایوبی نے دوسری اور تیسری صلیبی جنگوں میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ فی الحقیقت صلیبی سیلاب کے آگے بند باندھنے کے جرأت مند انداز اقدام میں پہل عماد الدین زنگی ہی نے کی۔

عماد الدین نے رمضان المبارک 522ھ / ستمبر 1127ء میں موصل کا انتظام سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان محمود نے اپنے دونوں بیٹوں الپ ارسلان اور فرخ شاہ کی تعلیم عماد الدین زنگی کے سپرد کر دی اور انہیں اتابک کا خطاب دیا۔ اتابک دراصل ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ”بزرگ اور اتالیق“ کے ہیں۔ یہ لقب سب سے پہلے سلطان ملک شاہ سلجوقی نے اپنے قابل وزیر نظام الملک طوسی کو دیا تھا اس کے بعد سلجوقی سلطنت میں اس خطاب کو نہایت اہمیت حاصل ہو گئی اور یہ صرف اس امیر کو دیا جاتا جو بے حد محترم اور ذی عزت سمجھا جاتا تھا اور نوجوان شہزادوں کی تربیت، نگرانی اور نگہداشت بھی اسی کے سپرد کی جاتی تھی۔ مؤرخ ابن الاثیر کے مطابق یہ وہ دور تھا جب عیسائی حکمران شہروں پر آبادی کے لحاظ کیے بغیر خراج لگا رہے تھے۔ حلب کی نصف آمدنی اسی طرح وصول کر لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے شہر کے دروازے پر باغ کے قریب جو چوکیاں تھیں ان پر بھی خراج لگا دیا تھا۔

صلیبی جب چاہتے، دمشق اور حلب کی چراگاہوں میں آگھستے اور تباہی مچاتے، دمشق اور حلب کے نواحی علاقوں میں عیسائیوں کی ٹولیاں روزانہ لوٹ مار کیا کرتی تھیں۔ 522ھ میں حلب سے شہریوں کا ایک وفد عماد الدین زنگی کے پاس موصل آیا اور اس وفد نے شہریوں کی مظلومیت کی داستان سنائی۔ عماد الدین زنگی نے فوج کو تیار کرنے کا حکم دیا اور حلب پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر تند و تیز تھا کہ صلیبی حکمرانوں کے ہوش اڑ گئے۔ عماد الدین عیسائی علاقے میں دور تک بڑھے چلے گئے۔ یہ کسی عیسائی ریاست پر پہلا باقاعدہ حملہ تھا۔ دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور عماد الدین زنگی نے حلب کو مستقل چھاؤنی کی حیثیت دے دی۔ وہ تقریباً ایک سال تک یہاں مقیم رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے آس پاس کی عیسائی چوکیوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ اگلے سال انہوں نے عیسائیوں کے زیر تسلط علاقے کے سب سے بڑے سرحدی قلعہ، حصن الاثارب پر حملہ کر دیا۔

اس زمانے میں شیزر پر ابوالعسا کر سلطان ابن منقذ حکمران تھے۔ انہوں نے عماد الدین سے مدد طلب کی۔ عماد الدین نے فوراً فوج کو منظم

کیا اور شیزر کے قلعہ کا محاصرہ کرنے والی صلیبی فوج کی جانب روانہ ہو گئے۔ دریائے عاصہ کے کنارے پڑاؤ ڈال کر انہوں نے قیصر روم کو میدان جنگ میں آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آؤ ہم تمہاری تلواروں کا مزہ چکھیں اور تم ہماری تلواروں کا۔

شاہ روم کو قلعہ الاثارب کے عیسائیوں نے یہ کہہ کر خوفزدہ کر دیا کہ ابھی الاثارب کے معرکہ میں عماد الدین زنگی کا لشکر عیسائیوں کی فوج کا قلعہ فتح کر چکا ہے چنانچہ میدان میں مقابلہ سودمند نہ ہوگا۔ چنانچہ قیصر روم نے پہاڑوں کی بلندی سے مقابلے کو ترجیح دی لیکن انہیں شاید علم نہ تھا کہ زنگی بھی ان نشیب و فراز سے بخوبی آشنا ہیں۔ زنگی کا لشکر بھی پہاڑ پر چڑھ گیا اور اتنا زبردست حملہ کیا کہ دشمن اپنا سارا سامان اسلحہ، منجنیقیں وغیرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عماد الدین نے اپنی فوج کو لے کر صلیبیوں کا دور تک تعاقب کیا۔ ہزاروں صلیبیوں کو ہلاک، زخمی یا گرفتار کر لیا اور تعاقب اس وقت تک جاری رکھا جب تک قیصر روم کی فوج شام کے ساحل پر شاہی بیڑے میں سوار ہو کر روم کی طرف بھاگ کھڑی نہ ہوئی۔ اس لڑائی میں عماد الدین کی فوج نے بڑی مقدار میں مال غنیمت حاصل کیا۔ اس شاندار فتح پر بہت سے مسلمان شعراء نے مبارکباد کے قصیدے لکھے۔

شیزر کے بعد عماد الدین نے قلعہ عرفہ پر حملہ کیا جو طرابلس کے عیسائی نواب کے قبضہ میں تھا۔ چند ہی دن میں یہ قلعہ فتح ہو گیا پھر قلعہ بعین کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے قبل بعین کے مضافات میں شاہ یروشلم اور شاہ فرانس کی متحدہ فوج نے عماد الدین کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ قلعہ بعین کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا جس کے بعد عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

6 جمادی الاول 539ھ / 23 دسمبر 1144ء کا دن وہ تاریخی دن تھا جب عماد الدین نے پہلی صلیبی ریاست کے صدر مقام الرہا کو بھی تسخیر کر لیا۔ الرہا کی فتح کے بعد عماد الدین نے دریائے فرات کے مشرقی علاقے کی طرف پیش قدمی کی اور متعدد قلعے اور شہر فتح کیے ان میں سیروج کا مشہور قلعہ بھی قابل ذکر ہے۔

عماد الدین نے جس بھرپور طریقے سے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا، وہ پوری مسیحی دنیا کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ عماد الدین صلیبی فوجوں کو اراض مقدس سے پوری طرح نکال باہر کرنے اور بیت المقدس کی بازیابی کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اپنا یہ مشن جاری رکھتے لیکن 5 ربیع الآخر 541ھ / 14 ستمبر 1146ء کو انہیں کسی مملوک (غلام) نے شہید کر دیا۔ ان کی عمر تقریباً 60 سال تھی۔

اس بطل جلیل کی شہادت کی خبر پوری اسلامی دنیا میں انتہائی رنج کے ساتھ سنی گئی لیکن عیسائیوں میں مسرت کے شادیاں بجنے لگیں۔ فرانسسی مؤرخ مچاؤ کے مطابق: ”عماد الدین زنگی کی موت نے عیسائیوں کو حیات نو عطا کر دی۔“ عماد الدین زنگی شریعت کی پابندی کروانے اور قوانین حکومت پر عمل کروانے کے سلسلہ میں بہت سخت تھے وہ سرکاری حکام اور فوجی افسروں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ انہیں ذاتی جائیدادیں بنانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے فوج کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ کبھی فضلوں اور کھیتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور شہریوں اور دیہاتیوں سے معاوضہ ادا کیے بغیر کوئی چیز نہ لیں۔ وہ کہتے تھے ”جو سلطان اپنی فوج کو رعایا کی املاک اور زمین پر قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے وہ بڑا ظالم ہے اور ظلم کو رواج دینے کا موجب ہے۔“ ان احکام کا نتیجہ یہ تھا کہ علامہ بن الاثیر کے مطابق: ”جب عماد الدین زنگی کی فوج کسی دیہاتی علاقے سے گزرتی تو یوں محسوس ہوتا کہ دوریاں اس فوج کے دونوں جانب پھیلا دی گئی ہیں اور فوج ان کے اندر سے اپنی منزل کی طرف جارہی ہے اور کبھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتی۔ شہید اتا بک زنگی کا انصاف مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں تھا اور رعایا کا کوئی بھی فرد خواہ اس کا کسی مذہب سے تعلق ہو عماد الدین زنگی کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا۔“

عماد الدین زنگی نہایت سخی، رحم دل اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ وہ ہر جمعہ کو نماز سے قبل ایک سو سرخ دینار مستحقین میں تقسیم کرتے تھے۔

اس کے علاوہ بھی وہ اپنے قابل اعتماد ماتحتوں کے ذریعہ غریبوں کی امداد کرتے رہتے تھے انہوں نے اپنے ماتحت افسران کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کے علاقے میں کوئی فرد ایسا نہیں ہونا چاہیے جس کے پاس کھانے کے لیے خوراک اور پہننے کے لیے لباس نہ ہو۔ عماد الدین زنگی کی سخاوت کی وجہ سے بعض مؤرخین نے انہیں 'ابوالجود کا خطاب بھی دیا۔

علامہ ابن الاثیرؒ کا کہنا ہے کہ "شہید اتا بک زنگی کے دور میں موصل اپنے وقت کی بہترین اور انتہائی منظم حکومت تھی۔ زنگی کو اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی گزراوقات کا وسیلہ اور اس کے اخراجات کی کیفیت کا علم رہتا تھا۔ ان کے مقرر کردہ نگران ہر شہر ہر گاؤں اور ہر قریہ میں پھیلے ہوئے تھے جو انہیں رعایا اور بستوں کی صورت حال سے ہمیشہ باخبر رکھتے تھے۔"

عماد الدین ناصرؒ صاحب علم حکمران تھے بلکہ عمل کے میدان میں بھی آگے آگے تھے وہ نماز اور روزہ کو میدان جنگ میں بھی ترک نہ کرتے تھے۔

عماد الدین زنگی کی صورت میں ہمیں ایک نہایت متقی صاحب ایمان، غیر مند اور بے انتہا دلیر سالار نظر آتا ہے علامہ ابن الاثیرؒ نے اپنی کتاب "تاریخ الکامل" میں عماد الدین کو ہر جگہ 'شہید اتا بک' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابن الاثیرؒ لکھتے ہیں: "شہید اتا بک" کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر غیرت دینی اور شجاعت و دیعت کی تھی وہ بہت کم ناموران اسلام کے حصہ میں آئی ہے۔ ان کے جوش ایمانی کا یہ عالم تھا کہ وہ فوجوں کو لڑاتے لڑاتے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر تنہا دشمن کی صفوں میں جا گھستے تھے اور اپنی شمشیر خارا شکاف سے ان کو کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔"

عماد الدین زنگی چاہتے تو اپنے زیر تسلط علاقے پر اطمینان سے حکومت کر سکتے تھے لیکن ان کی غیرت ایمانی نے گوارہ نہ کیا کہ مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس، صلیبوں کے قبضہ میں رہے۔ انہوں نے انتہائی کم وسائل اور قلیل افرادی قوت کے باوجود ایک بڑی طاقت سے ٹکر لے کر اسے لرزہ بر اندام کر دیا اور اس عظیم جہاد مقدس کی بنیاد رکھ دی جس کے نتیجے میں مسلمان کچھ ہی عرصہ بعد بیت المقدس کو صلیبوں سے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

شہید اتا بک زنگی کے چار بیٹے تھے۔ ان میں نور الدین زنگی نے سب سے زیادہ نام پیدا کیا۔

محمد بن ابی عامر (المنصور)

شمالی اندلس میں اسلام کا پیغام پہنچانے والے پہلے حکمران

اتنی بڑی مسجد بھی اب نمازیوں کی کثیر تعداد کے سامنے بہت مختصر محسوس ہونے لگی تھی! جب بھی مؤذن کی دلنشین آواز بلند ہوتی۔ لوگ اپنے تمام کام چھوڑ کر رب عظیم کے حضور سر بسجود ہونے کے لیے مسجد کی سمت چل پڑتے، مسجد کا اندرونی ہال اور دالان دیکھتے ہی دیکھتے نمازیوں سے پڑھو جاتے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو مسجد سے باہر نماز ادا کرنی پڑتی۔

مسجد میں توسیع بے حد ضروری ہو گئی تھی۔!

ملک کے حکمران کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا، اسی لیے انہوں نے مسجد کی عمارت میں توسیع کا ایک منصوبہ تیار کروالیا تھا لیکن اس منصوبہ کی رُو سے مسجد سے متصل بہت سے مکانات ڈھادینے کی صورت میں ہی مسجد کی عمارت کو وسعت دی جاسکتی تھی۔

حکمران کے ایماء پر ان تمام مکانات کے مالکان کو بلایا گیا جن کو ڈھادینا مسجد کو وسیع کرنے کے لیے ضروری تھا۔ حکمران ایک ایک مکان کے مالک کو باری باری اپنے پاس بلائے، اسے نرمی سے سمجھاتے، مسجد کی اہمیت کا احساس دلاتے اور کہتے: ”آپ کے خیال میں آپ اپنے مکان کی کیا قیمت لینا پسند کریں گے، قیمت کم کر کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ جو قیمت سمجھتے ہیں بلا تکلف بتائیں۔“ مکان کا مالک سوچ کر جو رقم بتاتا، حکمران اس رقم سے دگنی رقم دلوادیتے۔

ایک ایک کر کے مسجد میں توسیع کے لیے درکار مکانات کے مالکان اپنی اپنی رقم وصول کر کے خوش و خرم چلے گئے لیکن ایک بوڑھی عورت نے اپنا مکان فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ مسئلہ نازک تھا، بوڑھی عورت کو مکان فروخت کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا اور مکان کو منہدم کیے بغیر مسجد کی عمارت میں توسیع ممکن نہ تھی۔

سرکاری کارندوں کی جانب سے اصرار اور بوڑھی عورت کے مسلسل انکار میں کئی روز بیت گئے۔ حکمران کے کہنے پر معلوم کیا گیا کہ بوڑھی عورت مکان فروخت کرنے پر رضامند کیوں نہیں ہے، معلوم ہوا کہ بوڑھی عورت کے مکان میں ایک باغ ہے جس میں کھجور کا ایک خوبصورت درخت ہے۔ بوڑھی عورت نے کہا کہ وہ اپنا مکان اسی صورت میں چھوڑ سکتی ہے جب اسے مکان کی قیمت کے ساتھ ساتھ ایسا مکان بھی فراہم کیا جائے جس کے باغ میں ایسا ہی خوبصورت کھجور کا درخت ہو۔ حکمران نے حکم دیا کہ ایسا مکان تلاش کیا جائے اور منہ مانگے دام دے کر خرید لیا جائے۔ حکم کے مطابق سرکاری کارندے ایسے مکان کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ بڑی تلاش کے بعد ایسا مکان مل ہی گیا۔ بھاری قیمت دے کر اسے خریدا گیا اور بوڑھی عورت کے حوالے کر دیا گیا اس طرح قرطبہ کی عظیم جامع مسجد میں توسیع کی راہ ہموار ہو گئی۔

اللہ کے گھر میں توسیع کی تک و دو کرنے والے یہ حکمران تھے محمد بن ابی عامر جنہوں نے اندلس (اسپین) کی سرزمین پر پچیس سال حکومت کی۔ اس عرصہ میں اسلام دشمنوں کے خلاف پچاس سے زائد جنگیں لڑیں، ہر ایک جنگ میں سرخرو ہوئے اور اللہ کی مہربانی سے انہیں کسی جنگ میں شکست کا منہ دیکھنا نہیں پڑا، یہی محمد بن ابی عامر ہیں جن کی قیادت میں مسلمانوں کے قدم ایسے علاقوں میں پہنچے جہاں اس سے قبل اسلام کا پیغام نہیں پہنچا تھا، مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس دور میں تمام عیسائی بادشاہ، بنی امیہ کے کسی حکمران سے اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا محمد بن ابی عامر سے ڈرتے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ محمد بن ابی عامر نہایت جری اور لائق سپہ سالار اور جنگ کے ماہر تھے۔ وہ انتہائی مدبر سیاست دان اور صاحب علم و فہم بھی تھے اور

ان سب سے بڑھ کر بچے اور سچے مسلمان تھے۔

عالم اسلام کے یہ قابل فخر فرزند 330ھ/942ء میں اندلس کے ایک مقام طرش میں پیدا ہوئے، انکا تعلق قبیلہ یمانیہ کے خاندان معافرے سے ہے، انکے جد اعلیٰ عبدالملک المعافری، اندلس کے فاتح طارق بن زیاد کی فوج کے ساتھ فتح اندلس کے معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ محمد بن ابی عامر کے دادا محمد بن عبداللہ آٹھ برس تک شہر اشبیلیہ کے قاضی رہے، انکے صاحبزادے یعنی محمد بن ابی عامر کے والد ابو حفص عبداللہ بھی بڑے دیندار بزرگ اور قابل فقیہ تھے، ابو حفص عبداللہ کا انتقال اس وقت ہوا جب محمد بن ابی عامر ابھی بطن مادر میں تھے۔ والدہ بریہا نے بچے کی پرورش کی، کم عمری کا زمانہ محمد نے طرش میں گزارا اور ذرا ہوش سنبھالا تو قرطبہ چلے آئے۔ قرطبہ اس زمانے میں علم و ادب کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ محمد بن ابی عامر نے نامور علماء کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا اور جامع مسجد قرطبہ میں علم کے موتی سمیٹے۔ نوجوان محمد کو تاریخ کی کتب سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔

تعلیم سے فارغ ہوئے تو قرطبہ کے محکمہ قضا (محکمہ انصاف) سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں خلیفہ الحکم اندلس پر حکمران تھے جن کا لقب مستنصر باللہ تھا۔ خلیفہ کو اپنے بڑے بیٹے عبدالرحمن کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے ایک منتظم کی ضرورت تھی، عبدالرحمن کی عمر اس وقت پانچ سال تھی۔ خلیفہ کے وزیر مصحفی کی نگاہ انتخاب محمد بن ابی عامر پر پڑی انہوں نے خلیفہ سے ذکر کیا۔ مقررہ دن خلیفہ کی اہلیہ سلطانہ صبح نے منتظم کی اسامی کے لیے تمام امیدواروں کا انٹرویو لیا۔ ابن ابی عامر کے شائستہ انداز اور ان کی پر اعتماد شخصیت سے سلطانہ صبح بہت متاثر ہوئیں چنانچہ 356ھ/967ء میں انہیں عبدالرحمن کی جائیداد کا منتظم مقرر کر دیا گیا۔ محمد بن ابی عامر نے عبدالرحمن کی جائیداد کا انتظام اس قدر عمدگی سے کیا کہ سلطانہ صبح نے انہیں اپنی جائیداد کا منتظم مقرر کر دیا۔ 357ھ/968ء میں خلیفہ نے انہیں چند اور املاک کا مہتمم بنایا اور تقریباً گیارہ ماہ بعد انہیں اشبیلیہ اور لبلہ کا قاضی (جج) مقرر کر دیا۔ بعد میں انہیں خلیفہ کے چھوٹے صاحبزادے ہشام کا اتالیق بنایا گیا اور 361ھ/972ء میں وہ فوج کے ایک دستے کے سالار مقرر کر دیے گئے۔

ربیع الاول 364ھ/974ء میں خلیفہ الحکم پر فالج کا دورہ پڑا اور صفر 366ھ/دسمبر 976ء میں انہوں نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔ انتقال سے قبل انہوں نے اپنے کسمن بیٹے ہشام کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ ہشام بہت کم عمر تھے چنانچہ مصحفی جنہیں حاجب (وزیر اعظم) کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، تمام امور مملکت کی نگرانی کرنے لگے۔ ابن ابی عامر کو وزیر بنایا گیا۔

خلیفہ الحکم کے انتقال کی خبر سن کر شمالی اندلس میں آباد عیسائی سرکشی پر اتر آئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ قرطبہ میں آکر ڈاکے ڈالنے لگے۔ اس صورت حال پر خلیفہ اور ان کے مشیروں نے غور کیا۔ تجویز دی گئی کہ شمالی علاقے کے عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے مہم روانہ کی جائے اس مہم کی قیادت کے لیے محمد بن ابی عامر کا انتخاب کیا گیا جمادی الآخر 367ھ/فروری 978ء میں محمد بن ابی عامر نے ملک کے ہر حصے سے مستعد اور بہادر سپاہی منتخب کیے اور شمال کی سمت روانہ ہو گئے۔ واپس لوٹے تو قرطبہ کے عامل (افسر اعلیٰ) بنا دیے گئے عامل بننے ہی محمد بن ابی عامر نے سخت احکامات جاری کیے اور بد انتظامی یا بد امنی کے خلاف کڑی سزاؤں کا نفاذ کیا۔ ملزم چھوٹا ہوا یا بڑا اس پر مقدمہ قائم کیا گیا اور جرم ثابت ہونے پر سزا دی گئی۔ محرم 368ھ/اگست 978ء میں انہیں پھر شمالی سرحد پر عیسائیوں کے خلاف مہم کی قیادت کرنے کے لیے بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ظلمت کے مضافاتی علاقے اور کئی قلعے فتح کیے اسی اثناء میں شمالی علاقے کے حاکم غالب کی بیٹی اسماء سے ان کی شادی ہو گئی 368ھ/978ء ہی میں ملک کے حاجب (وزیر اعظم) کا منصب محمد بن ابی عامر کے سپرد کر دیا گیا۔

371ھ/981ء میں محمد بن ابی عامر نے لیون کی شمالی عیسائی ریاست پر فوج کشی کی۔ وہاں کے عیسائی بادشاہ رومیر ثانی نے قشتالیہ کے قوس اور نبرہ کے غریبہ سے مدد طلب کی۔ تینوں بادشاہ متحد ہو کر مقابلے پر آئے۔ روطہ کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں عیسائیوں نے شکست کھائی۔ ابن ابی عامر آگے بڑھے۔ لیون کے شہر پر حملہ کیا مسلمان اس بے جگری سے لڑے کہ عیسائی فوجیں بھاگ کھڑی ہوئیں لیکن شدید برفانی طوفان کی وجہ سے ابن ابی عامر اپنی فوج لے کر واپس چلے آئے۔ اسی دوران لیون میں بادشاہ رومیر ثانی کے چچا زاد بھائی برمند کو بادشاہ بنا دیا گیا۔

محمد بن ابی عامر نے 376ھ/987ء میں برشلونہ (موجودہ بارسلونہ) قلمریہ، سمورہ کے علاقے فتح کیے۔ لیون کا بادشاہ برمند، سمورہ میں

موجود تھا لیکن وہ اسلامی فوج کے آتے ہی شہر سے بھاگ گیا اور شہر والوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ بعد میں برمند نے محمد بن ابی عامر سے امان طلب کی اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ کر لیا۔ محمد بن ابی عامر کی ان کارروائیوں کے نتیجہ میں اندلس میں اب امن و امان تھا۔

تقریباً دس سال بعد برمند نے پھر سرکشی کی راہ اختیار کی اور سالانہ خراج دینے سے انکار کر دیا۔ محمد بن ابی عامر نے فوجی تیاریاں کیں اور جمادی الآخر 387ھ / جولائی 997ء میں فوج لے کر قرطبہ سے روانہ ہو گئے۔ قوریہ سے ہوتے ہوئے شہر بازو میں پہنچے یہاں سے برتقال روانہ ہوئے جو دریائے دویہ کے پار واقع تھا۔ محمد بن ابی عامر نے پہلے ہی بحری بیڑہ روانہ کر دیا تھا جو دریا کے کنارے لنگر انداز ہو کر فوج کا منتظر تھا۔ محمد بن ابی عامر نے بحری جہازوں کو دریا کے عرض میں اس طرح لنگر انداز کروادیا کہ ایک پل سا بن گیا۔ اس پل کی مدد سے ساری فوج فوری طور پر دریا کے پار اتر گئی۔ دریائے دویہ اور دریائے مینہ کے بیچ وسیع علاقہ تھا جہاں عیسائی حکمران تھے۔ محمد بن ابی عامر نے اس علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا۔

ایک رات شدید سردی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اچانک محمد بن ابی عامر نے اپنے ایک قابل اعتماد سپاہی کو حکم دیا کہ وہ فوراً درہ طلیار ش جا کر پہرہ دے اور اگر کوئی شخص لشکر کی سمت سے درہ کی طرف آتا دکھائی دے تو اسے فوراً امیر لشکر کے سامنے حاضر کیا جائے۔ سپاہی حکم کی تعمیل میں رات بھر درہ کے دہانے پر کھڑا بارش میں بھیگتا رہا پو پھٹنے پر اس نے دیکھا کہ لشکر گاہ کی سمت سے ایک بوڑھا شخص گدھے پر سوار درہ کی طرف آرہا ہے سپاہی نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ میں لکڑہارا ہوں۔ سپاہی نے اسے جانے دیا لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ امیر لشکر کا حکم کیا تھا۔ اس نے دوڑ کر اسے پکڑا اور محمد بن ابی عامر کے پاس لے گیا محمد بن ابی عامر خود بھی رات بھر نہ سوئے تھے۔ انہوں نے بوڑھے کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ اس کے گدھے کے پالان میں ایک خط ملا جو لیون کے چند ایسے عیسائیوں نے لکھا تھا جو مسلمانوں کو اپنی حمایت کا یقین دلارہے تھے اس خط میں دشمن عیسائیوں کو بتایا گیا تھا کہ مسلمان فوج کا کون سا رخ ایسا ہے جس کی حفاظت کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے اور اس پر حملہ ممکن ہے۔

محمد بن ابی عامر نے باقی عیسائیوں اور بوڑھے کو قتل کروادیا اور اسلامی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ فوج کھلے میدانوں میں پھیل گئی۔ بیونہ اور تونکی کے درمیان دیر قسطن اور یرد امیان کو فتح کیا قلعہ شنت بلائیہ کو سرنگوں کیا۔ قریب ہی خلیج دیگو میں دو چھوٹے جزائر تھے ان میں سے ایک پر دشمن کی فوج نے پناہ لے لی تھی۔ محمد بن ابی عامر کے حکم پر فوج اس جزیرے تک بھی جا پہنچی۔ اب لشکر آگے بڑھا دریائے ایلہ کو عبور کیا اور شہر ایریا کو فتح کیا۔ شعبان 387ھ / اگست 997ء میں اسلامی فوج شنت یعقوب (کمپوستیلا) پہنچ گئی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر شہر والے گھربار چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں۔ شہر میں تمام گرجا مسمار کر دیے گئے ان میں سینٹ جیمز کا مشہور کلیسا بھی تھا۔ شنت یعقوب کا یہ کلیسا رومۃ الکبریٰ کے بعد پوری مسیحی دنیا میں نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا اور دور دور سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ مسیحیوں میں مشہور تھا کہ اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری یعقوب ابن زبدی کی قبر ہے وہ اس مقام کو بے حد مقدس مانتے تھے۔ محمد بن ابی عامر کے حکم پر اس مزار کو جوں کا توں رہنے دیا گیا۔

شنت یعقوب کو محمد بن ابی عامر نے اپنے 48 ویں جہاد میں فتح کیا یہ فتح ان کے نمایاں کارناموں میں سے ایک ہے۔ اسی فتح کی یادگار کے طور پر وہ المنصور کے لقب سے دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔

شنت یعقوب سے منصور کی فوج شنت مانکس تک جا پہنچی یہ شمال مغربی اندلس کا انتہائی کنارہ تھا اس سے قبل یہاں مسلمانوں کے قدم نہ پہنچے تھے۔ یہاں سے فوج نے لمبی قیہ کا رخ کیا اور بالآخر بہت سے قیدی اور مال غنیمت لے کر منصور کی فوج فاتحانہ انداز سے واپس قرطبہ پہنچ گئی۔ منصور کی ان زبردست فتوحات کے نتیجے میں عیسائیوں کی بغاوتیں سرد پڑ گئیں۔

392ھ / 1002ء میں منصور شمال کے عیسائیوں سے لڑنے پھر روانہ ہوئے۔ وہ ہمیشہ دعا کرتے تھے کہ ان کی زندگی کے دن میدان جہاد میں پورے ہوں انہیں اس دعا کے قبول ہونے کا اتنا زیادہ یقین تھا کہ وہ جب کبھی جہاد پر جاتے تو ان کے سامان میں کفن بھی شامل ہوتا جو ان کی بیٹیوں نے سیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہوا قرآن پاک کا نسخہ بھی اپنے ہر سفر میں ساتھ رکھتے تھے۔

شمالی اندلس کے علاقے قشتالیہ میں عیسائیوں کے خلاف ہونے والی یہ جنگ ان کی آخری جنگ تھی۔ قشتالیہ سے فاتح کی حیثیت سے قرطبہ واپسی کے سفر میں وہ بیمار پڑ گئے۔ عدالت اس قدر شدید تھی کہ گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے چنانچہ انہیں تخت پر سوار کر کے لے جایا گیا اور صوبہ سورہ کے شہر سرقسطہ سے 70 میل دور مدینہ السلام (میڈینا سیلی) میں لائے گئے جہاں 27 رمضان المبارک 392ھ/19 اگست 1002ء کو وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے انہیں اسی شہر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

منصور کے بہت سے نمایاں کارناموں میں ایک یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر خلافت کے ظاہری شکوہ کو قائم رکھا، خلیفہ ہشام کمسن تھے اور امور مملکت انجام دینے کے لائق نہ تھے، منصور نے خود کبھی خلیفہ بننے کی یا خود کو خلیفہ کہلوانے کی کوشش نہ کی۔

منصور اپنی رعایا سے بہت محبت کرتے تھے۔ راتوں کو شہر کا گشت لگاتے تھے۔ سب کا دکھ درد سنتے اور ان کے مسائل حل کرتے۔ ایک بار ایک شخص نے شکایت کی کہ آپ کے پیچھے آپ کا جو خادم کھڑا ہوا ہے اس نے مجھ سے عہد کر کے توڑ دیا ہے اور جب میں نے اسے عدالت میں بلوایا تو اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ منصور نے خادم کو اسی وقت عدالت بھجوا دیا اور کہلوا دیا کہ جرم ثابت ہو تو اس کی سخت سزا دی جائے یعنی اس بات کا خیال نہ رکھا جائے کہ یہ ملک کے حکمران کا ملازم ہے۔

منصور نے قرطبہ کی عظیم جامع مسجد میں تیسرا اور آخری بڑا اضافہ کیا انہوں نے پہلے سے موجود دس دس ستونوں والے 29 دالانوں کے ساتھ ملا کر شمالاً جنوباً سات سات ستونوں کے 29 دالان در دالان بنوا دیے اس طرح صحن مسجد میں قبلہ رخ کھڑے ہو کر دیکھنے پر سترہ ستونوں والے 29 دالان در دالان قبلہ کی دیوار تک نظر آتے تھے۔ انہوں نے جتنے بھی دالانوں کا اضافہ کیا ان میں ہر جگہ سنگ رخام پر طلائی کام کروایا۔ مسجد کے 9 دروازوں میں توسیع کر کے 21 دروازے بنوائے۔ مسجد کی تعمیر سے ان کی عقیدت اور دلچسپی کا حال یہ تھا کہ ملک کے حکمران ہونے کے باوجود عام مزدوروں کی طرح خود بھی کدال بیلچہ اور آری وغیرہ تھامے ہوئے کام میں مصروف رہتے تھے۔

مسجد قرطبہ میں توسیع کے ساتھ ساتھ منصور کے دور میں کئی مساجد تعمیر ہوئیں حتیٰ کہ ان کی تعداد 700 تک پہنچ گئی۔ منصور نے دیگر تعمیراتی کاموں پر بھی توجہ دی پورے اندلس میں دشوار گزار پہاڑیوں کو کٹوا کر متعدد سڑکیں اور شاہراہیں بنوائیں۔ شہر اسطیج میں دریائے شنیل پر اور قرطبہ میں وادی الکبیر پر پل تعمیر کروائے۔

قرطبہ کے مشرق میں وادی الکبیر کے کنارے ”مدینہ الزاہرہ“ کے نام سے ایک نئے شہر کی تعمیر کا شرف بھی منصور کو حاصل ہے اس شہر کی تعمیر 368ھ/978ء شروع ہوئی اور 370ھ/980ء میں یہ مکمل ہو گیا۔ اس وقت تک تمام سرکاری دفاتر مدینہ الزہراء میں قائم تھے۔ مدینہ الزہراء قرطبہ سے شمال میں تین یا چار میل دور واقع تھا اسے خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے 325ھ/937ء میں تعمیر کروا دیا تھا۔ خلیفہ کی سرکاری رہائش گاہ مدینہ الزہراء ہی میں واقع تھی۔ جب منصور وزیراعظم بنے تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ سرکاری دفاتر کسی اور جگہ منتقل کر دیے جائیں چنانچہ مدینہ الزہراء سے دس میل دور مدینہ الزاہرہ کے نام سے ایک شہر تعمیر کروانا شروع کیا۔ جلد ہی یہاں دفاتر عدالتوں کی عمارتیں، سڑکیں، بازار بن گئے اور اچھی خاصی آبادی ہو گئی اس شہر کو اتنی ترقی ملی کہ رات کے وقت مدینہ الزہراء اور مدینہ الزاہرہ کے درمیان دس میل طویل فاصلے پر کہیں تاریکی دکھائی نہ دیتی تھی اور پورا علاقہ روشنیوں سے جگمگا رہا ہوتا تھا۔

منصور نے صوبہ قاصرش کے شہر ترخالہ کو بھی از سر نو آباد کیا اور یہاں مسلمانوں کو بسنے کے مواقع فراہم کیے۔ منصور کے دور میں صنعتوں کو بھی خاصی ترقی دی گئی۔ اس زمانے میں اشبیلیہ اور قرطبہ میں ایسے کارخانے موجود تھے جن میں طراز، یعنی ریشم اور زربفت کے کپڑے تیار ہوتے تھے ان کپڑوں اور ان سے تیار کردہ خلعوں کا بہت قیمتی تحفوں میں شمار ہوتا تھا۔

منصور کے عہد میں فوج کو وسعت دی گئی ان کی فوج آٹھ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں دو لاکھ سوار اور چھ لاکھ پیدل سپاہی شامل تھے۔ فوجیوں کی اس کثیر تعداد کے پیش نظر منصور نے شہر قرطبہ سے باہر الگ چھاؤنی تعمیر کروائی تھی جس میں گھوڑوں کے لیے اچھے اصطبل بھی تھے۔ منصور گھوڑوں کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور اپنے ماتحتوں سے گھوڑوں کی خوراک وغیرہ کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے منصور

فوجی قواعد و ضوابط کی پابندی کے مقابلے میں بہت سخت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فوج میں مثالی نظم و ضبط پایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ماتحتوں کے لیے حد درجہ شفیق بھی تھے چنانچہ ان کے سپاہی ان پر جان چھڑکتے تھے۔

تاریخ ہمیشہ ایسے حکمرانوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کرتی ہے جنہوں نے اپنی ذات کو بنانے سنوارنے کی بجائے اپنی رعیت کو بنانے سنوارنے پر توجہ دی، اپنی بھاری ذمہ داریوں کو احسن طریقے پر پورا کرنے کی کوشش کی اور جن کی ذات سے خیر و فلاح کے چشمے پھوٹے۔ تاریخ نے محمد بن ابی عامر کا شمار بھی ایسے ہی حکمرانوں میں کیا ہے۔

ایک بار ایک شخص یمن سے کچھ جواہرات لے کر آیا۔ راستے میں ایک جگہ وہ اپنے کپڑے اور جواہرات کی تھیلی نہر کے کنارے رکھ کر نہر میں نہانے لگا۔ ایک چیل آئی اور جواہرات کی تھیلی اٹھا لے گئی وہ شخص نہر سے نکل کر رونے پینے لگا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے، واقعہ سن کر لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ آپ منصور کے پاس جائیں، وہ شخص مایوسی سے بولا: ”منصور کا انسانوں پر حکم چلتا ہے۔ پرندوں پر تو نہیں۔“ لیکن منصور کی رعایا کو اپنے حکمراں پر اس قدر بھروسہ تھا کہ انہوں نے اس شخص کو مجبور کر کے منصور کے پاس بھجوا دیا۔ وہ شخص منصور کے پاس پہنچا تو منصور نے کہا کہ آپ ذرا انتظار کریں۔ پھر انہوں نے اپنے اہلکاروں سے تحقیق کروائی کہ اطراف میں کوئی ایسا شخص تو نہیں جس کی مالی حالت گزشتہ ایک دو دن میں بہتر ہو گئی ہو۔ معلوم ہوا کہ ایک مزدور ہے جو تادار تھا لیکن اس نے ابھی ابھی اپنے اور بیوی بچوں کے لیے کپڑے بنوائے ہیں اور خچر بھی خریدا ہے۔

مزدور کو بلوایا گیا، پوچھ گچھ پر اس نے اعتراف کر لیا کہ جواہرات کی تھیلی اسے ملی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے تھیلی سے صرف دس مثقال سونا نکالا ہے۔ منصور نے تھیلی کے مالک سے کہا کہ تھیلی کھول کر دیکھیں، کیا یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے۔ تھیلی کے مالک نے تھیلی دیکھ کر تصدیق کی کہ واقعی دس مثقال سونا کم ہے پھر اس نے کہا کہ میں یہ دس مثقال سونا معاف کرتا ہوں۔ منصور نے کہا نہیں اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔ پھر انہوں نے دس دینار تو جواہرات کے تاجر کو دیے اور دس دینار مزدور کو دیے اور کہا کہ اگر یہ شخص تھیلی ملتے ہی میرے پاس چلا آتا تو میں اسے بڑا انعام دیتا۔

عیسائیوں کے خلاف پے در پے کامیابیوں اور منصور کی بے پناہ جرأت سے عیسائی ہمیشہ ہیبت زدہ رہتے تھے۔ ایک بار عیسائیوں کے علاقے میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک تنگ درے سے گزرے اس وقت عیسائیوں کی ہمت نہ ہو سکی کہ انہیں کچھ کہہ سکیں جب وہ واپس لوٹے تو دیکھا کہ درے پر عیسائیوں کا قبضہ ہے۔ منصور نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر خیمے نصب کروادیے اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ یہاں کا شکار شروع کر دیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ عیسائی گھبرا گئے اور منت سماجت کرنے لگے کہ وہ مال غنیمت لے کر یہاں سے واپس چلے جائیں۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کو بار برداری کے جانور بھی دیے اور ان کا سامان خود سرحد تک پہنچایا۔

ایک بار عیسائیوں کے ایک شہر کے سامنے ایک بلند پہاڑی پر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا جب منصور کی فوج وہاں سے کوچ کر گئی تو اسلامی فوج کا پرچم پہاڑی پر ہی لگا رہ گیا اور سپاہی اسے وہاں سے اتارنا بھول گئے یہ پرچم کئی دنوں تک پہاڑی پر لہراتا رہا اور کسی عیسائی کی ہمت نہیں ہوئی کہ پہاڑی پر چڑھ کر دیکھ لیتا۔

منصور خود بھی عالم تھے اور علماء کرام کے بے حد قدر کرتے تھے ان کے عہد میں ملک ہزاروں علماء موجود تھے جب وہ کسی مشہور عالم کا تذکرہ سنتے تھے تو وہ پھر کہیں بھی بستا ہوا سے بلوایتے تھے ان کے دور میں دین شریعت، فلسفہ، ہیئت، تاریخ جغرافیہ، شعر و سخن اور دیگر موضوعات پر متعدد کتب لکھی گئیں انہوں نے مدارس کی تعداد میں بھی اضافہ کیا، حصول علم کی پوری حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور ایسے تمام طلبہ کے تعلیمی اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی جو دوسرے ملکوں سے قرطبہ آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

☆☆☆

عبدالرحمن الاوسط

اندلس کو تباہی سے بچا کر خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کرنے والے حکمران

وہ شہر دریائے تاجہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا ہوا چلا گیا۔

دریائے تاجہ..... جو مشرقی اندلس کے پہاڑوں سے اپنا سفر شروع کرتا تھا اور مغربی سمت میں یہاں سے کچھ فاصلے پر دریا اور بحر اوقیانوس گلے ملتے تھے وہ شہر اسی تنگ پاٹ کے دائیں کنارے پر واقع تھا لوگ اسے ”لشیو نہ“ کہہ کر پکارتے تھے۔

لشیو نہ بڑا خوبصورت تھا۔ شہر کے اطراف کے پہاڑوں میں اصیل شہباز اڑتے پھرتے تھے۔ بازاروں میں خالص شہد ملتا تھا۔ وسط شہر میں صاف ستھرے حمام تھے۔ ہر طرح کی سہولتیں میسر تھیں۔ شہر میں بسنے والے بہت خوش، بڑی پرسکون اور نہایت مطمئن زندگی گزار رہے تھے..... لیکن..... ایک دن ان کی پرسکون زندگی میں بالکل سی مچ گئی ہر طرف شورا اٹھا..... ’نارمن آگئے نارمن آگئے.....!‘

ہاں..... لشیو نہ کے شہریوں کا خوف بجا تھا۔ نارمن آ رہے تھے۔ آتش پرست بحری قزاق، جو جرمنی کے رہنے والے تھے لیکن اسکینڈینیویا کے ساحلوں پر جا بے تھے۔ گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے ان کا یہی کام تھا اچانک حملے کر کے ہستی ہستی پر امن ساحلی آبادیوں کو اجاڑ دیتے، غلغلتہ چہروں سے ان کی مسکراہٹ چھین لیتے، لوگوں کو ان کی عمر بھر کی کمائی اور مال و متاع سے محروم کر دیتے اور فضا میں موت کے بھیا نک قہقہوں کی گونج چھوڑ کر رخصت ہو جاتے۔

نارمن تعداد میں تھوڑے نہ تھے۔ وہ اسی جہازوں میں آئے تھے۔ وہ نڈی دل کی طرح اندلس کے ساحلوں پر اترے اور لشیو نہ پر چھا گئے۔ جس بستی میں مسرت و شادمانی کا راج تھا وہاں اب آہوں اور سسکیوں کی حکمرانی تھی۔ نارمنوں نے 13 دن تک لشیو نہ اور نواحی علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے رکھا پھر ان کا رخ مغربی اندلس کے جزیرہ قادس کی سمت ہوا یہاں سے مدینہ شذونہ پہنچے پھر اندلس کے مشہور دریا وادی الکبیر کے دہانے سے گزر کر اشبیلیہ پر حملہ آور ہوئے۔ وہ جہاں جاتے تباہی مچا دیتے تھے۔ انسانوں کا خون بہہ رہا تھا، گلی کو چوڑے سے شعلے بلند ہو رہے تھے، فضا بے حد سوگوار تھی۔

ادھر قرطبہ کے سرکاری ایوان میں ایک باوقار حکمران اپنے وزیروں سے صلاح مشورے میں مصروف تھا۔ اس طویل القامت حکمران کا رنگ گندمی تھا، داڑھی گھنی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بے پناہ ذہانت جھلکتی تھی۔ وزراء حکمران کو بتا چکے تھے کہ نارمن قزاق ذی الحجہ کے مہینے سے لوٹ مار کر رہے ہیں۔ ان کو روکنے اور مار بھگانے کی اب تک جتنی کوششیں کی گئیں وہ کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ اشبیلیہ میں انہیں خاصا نقصان پہنچایا گیا لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آئے ہیں۔ ان کی دہشت اس قدر ہے کہ اشبیلیہ تقریباً خالی ہو چکا ہے اور شہریوں کی بڑی تعداد 25 میل دور شہر، قرمونہ چلی گئی ہے۔ سرحدی صوبے کے والی (گورنر) موسیٰ بن قسی کے مشورے سے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے تفت، قرطبہ اور مورور کی طرف بھیجے گئے تھے انہوں نے بھی قزاقوں کی ایک بڑی تعداد کو ہلاک یا زخمی کیا ہے لیکن ابھی تک ہم اس فتنہ کا سرکھلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

حکمران کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں سی تڑپنے لگیں اور انہوں نے نہایت بارعب آواز میں بحری بیڑہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ بحری بیڑہ تیار ہو گیا تو انہوں نے خود تمام انتظامات کا جائزہ لیا اور ضروری ہدایات کے ساتھ لشکر کو روانہ کر دیا۔ چند دنوں بعد قاصد آ کر حکمران کو خوشخبری سنار ہاتھ کہ اندلس کے بحری بیڑے نے کمال شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے نارمنوں کو مار بھگایا ہے۔ نارمن اندلس کی سرزمین کو چھوڑ کر بحر اوقیانوس میں کہیں دور نکل گئے ہیں۔

نارمنوں کی طرف اطمینان ہوا تو حکمران نے ان تمام شہروں میں نقصانات کی تلافی کا حکم دیا، جہاں نارمنوں نے لوٹ مار کی تھی اور تباہی پھیلانی تھی۔ اس کے بعد حکمران نے اپنے وزراء کو طلب کیا۔ آج ان کا چہرہ غیظ و غضب کی بجائے سکون و اطمینان کی ترجمانی کر رہا تھا۔ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے وزراء کو بتایا کہ نارمن قزاقوں کو مار بھگانے میں ہم تقریباً چار ماہ تک اس لیے کامیاب نہ ہو سکے کہ ہمارا بحری بیڑہ طاقتور نہ تھا۔ اب میرا فیصلہ یہ ہے کہ فوج کو بحری جنگ کی خصوصی تربیت دلوائی جائے گی۔ نئے جہاز بنائے جائیں گے۔ ساحل کے کنارے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برج بنوائے جائیں گے، جن میں محافظ مقرر ہوں گے۔ ساحل کے نزدیک حفاظتی انتظامات کا محکمہ قائم ہوگا۔ اشبیلیہ میں ایک دارالصناعہ قائم ہوگا جہاں جہاز تیار ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اندلس کا بحری بیڑہ دنیا کے بڑے بحری بیڑوں میں سے ایک ہو۔

ان تمام فیصلوں پر فوری طور پر عمل درآمد کیا گیا اور چند سال میں اندلس کی بحری طاقت دنیا کی عظیم بحری طاقتوں میں شمار کی جانے لگی اور 230ھ/845ء میں اندلس پر نارمنوں کی پہلی یورش کے 14 سال بعد جب نارمن پر دوسری بار حملہ آور ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اندلس کا عظیم بحری بیڑہ اندلس کے پانیوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ وہ ابھی اپنی حیرانی پر قابو نہ پاسکے تھے کہ ان کے جہازوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ اندلس کی بحری فوج نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ نارمنوں کے لیے فرار کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

اپنے مثالی حسن انتظام اور غیر معمولی تدبیر کی بدولت اندلس کو تباہی اور بربادی سے بچانے اور اس سرزمین کو ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کرنے والے یہ حکمران تھے عبدالرحمن بن الحکم..... جن کی روشن اور باوقار شخصیت آج بھی تاریخ کے صفحات کو جگمگا رہی ہے۔

آپ کا نام عبدالرحمن اور کنیت ابوالمطرف ہے۔ آپ کے والد الحکم اول 180ھ/796ء سے 206ھ/821ء تک اندلس پر حکمران رہے تھے۔ آپ کے دادا کا نام ہشام اور پردادا کا نام عبدالرحمن تھا جو عبدالرحمن الداخل کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں۔ اندلس کے حکمرانوں میں عبدالرحمن نام کے تین حکمران گزرے ہیں جن میں پہلے عبدالرحمن الداخل کہلاتے ہیں۔ جنہوں نے اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کی بنیاد ڈالی، دوسرے عبدالرحمن الاوسط کے لقب سے معروف ہیں جن کی شخصیت کا ہم اس مضمون میں جائزہ لیں گے۔ عبدالرحمن نام کے تیسرے حکمران عبدالرحمن الناصر کے نام سے مشہور ہیں۔

عبدالرحمن الاوسط 176ھ/792ء میں طلیطلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام حلاوہ تھا۔ آپ کے والد الحکم بن ہشام نے آپ کو بہت اچھی تربیت دلوائی تھی چنانچہ آپ نے قرآن پاک، دینی علوم، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ مورخ ابن اثیر، عبدالرحمن الاوسط کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”وہ ادیب و شاعر تھے اور علوم شرعیہ کے علاوہ علوم فلاسفہ کے عالم تھے۔“

مجموعہ اخبار اندلس کے مطابق انہیں ادب، فقہ، حفظ قرآن پاک اور روایت و حدیث میں حصہ عطا ہوا تھا۔

ذہنی علوم کے ساتھ ساتھ عبدالرحمن نے جسمانی فنون پر بھی توجہ دی اور لڑائی کے مروجہ طریقوں میں مہارت حاصل کی، انہوں نے اپنے والد کے دور حکومت ہی سے جنگوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر جنگ سے فتح کے پھریرے لہراتے ہوئے لوٹتے، اسی لیے لوگ انہیں ”مظفر“

یعنی کامیاب کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔ آپ کی طبیعت میں رحم دلی کی صفت بہت نمایاں تھی اور آپ مسکینوں اور مستحق افراد کی بڑھ چڑھ کر مدد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آپ سے محبت کرتے تھے اور آپ کا نام لینے کی بجائے ابوالمساکین، کہہ کر آپ کا ذکر کرتے تھے۔ قدرت نے ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ کو حسن انتظام کی صلاحیت سے بھی نوازا تھا۔ اپنے والد کے عہد حکومت کے آخری زمانے میں تقریباً سارا نظم و نسق ان ہی کے ہاتھوں میں تھا اور آپ نے نہایت عمدگی، بردباری اور تدبیر کے ساتھ ملکی معاملات کو سنبھال لیا تھا۔

جب آپ کی عمر 31 سال ہوئی تو آپ کے والد الحکم اول انتقال فرما گئے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد حکومت کا بار گراں آپ پر آن پڑا۔ آپ نے اندلس پر تقریباً 30 برس حکمرانی کی اور تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ آپ کا یہ دور اندلس کی ترقی، کامرانی اور خوشحالی کا دور تھا۔ آپ کا انتقال ربیع الثانی 238ھ (ستمبر 852ء) میں قرطبہ میں ہوا۔

آسودہ حالی اور سکون و اطمینان بھرے، آپ کے دور حکومت میں دو اہم واقعات پیش آئے اور دونوں مرتبہ عبدالرحمن الاوسط نے اپنی فراست اور بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے تمام مسائل پر قابو پا لیا اور مملکت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کی جو کوشش کی گئیں، انہیں ناکام بنا دیا۔

ان دو واقعات میں ایک تو 230ھ/845ء میں اسلامی مملکت پر نارمنوں (مجوسیوں) کا حملہ تھا جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے شروع میں کیا ہے۔ دوسرے واقعے کا تعلق مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی مسیحی تحریک سے ہے جو طلیطلہ اور قرطبہ سے اٹھی۔ مسیحیوں نے اس تحریک کے بارے میں اپنی کتب میں بہت کچھ لکھا ہے اس کی تفصیل پر بحث کیے بغیر مختصر یہ کہنا کافی ہوگا کہ عیسائیوں میں اس عقیدہ کو رواج دیا گیا کہ مذہب کی اصل روح تکلیف اٹھانا ہے اس لیے ایسے کام کیے جائیں جن سے حکومت مشتعل ہو تا کہ وہ سزاؤں کا نفاذ کرے اور سزا پانے والے مسیحی باشندے، روح کے تزکیہ کے عمل سے گزر سکیں۔ اس تحریک کے بانی قرطبہ کے ایک راہب یولوجیس تھے۔ انہوں نے مسیحی نوجوانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دین اسلام اور (نعوذ باللہ) حضور کریم کی شان میں گستاخی کریں تا کہ حکومت انہیں گرفتار کر کے سزائے موت دے اور یوں یہ مسیحی نوجوان شہادت کے مرتبہ بلند پر فائز ہو جائیں۔ یولوجیس کی اس تحریک میں قرطبہ کے ایک دولت مند عیسائی نوجوان الوار و اور ایک لڑکی فلور نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مسلمان اپنے پیارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت کی شان میں کسی مسیحی کی جانب سے گستاخی کے باعث مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا مشتعل ہونا فطری بات تھی۔ صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ عبدالرحمن الاوسط نے اس نازک صورت حال میں جبر اور دباؤ سے کام لینے کی بجائے حکمت اور تدبیر کا راستہ اپنایا۔ انہوں نے عیسائیوں کے بڑے پادریوں سے گفت و شنید کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ عام مسیحی باشندوں کو دین اسلام کے خلاف باتیں کرنے سے روکیں۔

عبدالرحمن الاوسط کو اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی 238ھ/852ء میں اشبیلیہ کے اسقف اعظم (مطران) کی صدارت میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ مسیحی پادریوں کی یہ کانفرنس قرطبہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں یولوجیس کی تحریک پر بحث و مباحثہ ہوا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے۔ اسقف اعظم نے تمام عیسائیوں کو ہدایت کی کہ وہ اس تحریک میں حصہ نہ لیں اور جو اس تحریک میں حصہ لے گا وہ گناہ گار ہوگا۔ کانفرنس میں اس تحریک کی مذمت کی گئی۔

پادریوں کی اس کانفرنس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور یہ فتنہ خاصی حد تک دب گیا، تاہم چھوٹے پیمانے پر یہ تحریک چلتی رہی اور سات سال کے بعد یولوجیس نے دوبارہ اس تحریک میں نئی جان ڈالنے کی کوشش کی چنانچہ اس وقت حکمران امیر محمد الاول کے حکم سے یولوجیس کو گرفتار کر کے

سزائے موت دے دی گئی۔

عبدالرحمن الاوسط نے تہائی صدی پر محیط اپنے دور حکومت میں متعدد بار مختلف علاقوں پر فوج کشی کی اور ظفر مند لوٹے۔ ان کے عہد میں لیوانت (شرق الاندلس) کا علاقہ فتح ہوا۔ 216ھ/831ء میں ایلو کے اہم شہر کی جگہ نیا شہر مرسہ بسایا۔ 222ھ/837ء میں طلیطلہ میں ہونے والے بغاوت کا خاتمہ کر کے شہر کو زیر نگین لایا گیا۔ انہی دنوں آپ نے اندلس کی سرحدوں پر عیسائیوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کی اور تقریباً ہر سال موسم گرم میں عیسائیوں کی لیونٹی سلطنت کے خلاف مہمات کی قیادت کرنے لگے۔

شمالی اندلس میں نبرہ (نوار) نام کا ایک علاقہ تھا۔ اس علاقے میں بشکنش (عیسائی جواب ”باسک“ کہلاتے ہیں) کی حکومت تھی۔ کوہ پائیرنیز کا سلسلہ اس علاقے میں مشرق تا مغرب پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے حکمران فرانس کی شاہی حکومت کے باج گزار تھے یعنی انہیں خراج ادا کرتے تھے۔ عبدالرحمن الاوسط حکمران بنے تو نبرہ کے حکمران نے فرانس سے بغاوت کر کے اپنی آزاد ریاست کی داغ بیل ڈالی، لیکن انہیں پڑوسی فرانس سے بھی اندیشہ تھا کہ وہ اس چھوٹی سی ریاست کو پریشان کرے گا۔ اس غرض سے نبرہ کے حکمران نے عبدالرحمن الاوسط کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور درخواست کی کہ اگر حکومت نبرہ پر کوئی طاقت و حملہ کرے گی تو اندلس کی حکومت اس کا دفاع کرے اور اگر اندلس سے کوئی لشکر کو پائیرنیز کے پار جائے گا تو نبرہ کی حکومت اس لشکر کو راہداری کی سہولتیں فراہم کرے گی، عبدالرحمن الاوسط نے یہ درخواست قبول کر لی۔

فرانس میں اس وقت حکمران، شہنشاہ لوئی کو یہ معاہدہ پسند نہ آیا اور اس کے حکم پر فرانسیسی فوج ریاست نبرہ کو روندتی ہوئی اندلس میں گھس آئی۔ فرانسیسی فوج نے چیلونہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر کے واپس جانے لگی تو دروں اور تنگ راستوں میں مسلمان سپاہیوں نے نکل کر فوج پر دھاوا بول دیا۔

فرانسیسی فوج بوکھلاہٹ کے عالم میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ آئندہ کے چند برسوں میں امیر عبدالرحمن الاوسط نے فرانس کے کئی شہر فتح کیے اور جلیقیہ کے متعدد علاقوں کو مطیع کیا۔

عبدالرحمن الاوسط نے 30 سال تین ماہ حکمرانی کی۔ مشہور مؤرخین ابن اثیر اور ابن خلدون کی رائے ہے کہ ان کا زمانہ عافیت اور سکون کا تھا اور ان کے پاس دولت کی بہتات ہو گئی تھی۔ ان کے زمانے میں اندلس کی حکومت کو سالانہ خراج کی مد میں دس لاکھ دینار کی آمدنی ہوتی تھی۔ انہوں نے قرطبہ میں ایک بڑی نکسال قائم کی تھی جس میں مختلف سکے ڈھالے جاتے تھے۔

مورخ ابن خلدون کے مطابق عبدالرحمن الاوسط نے مملکت کا آئین اور قوانین نئے سرے سے مرتب کروائے۔ وزراء کے اختیارات کا تعین کیا۔ وزراء کو مختلف ملکی معاملات پر صلاح مشورے کے لیے سرکاری ایوان میں طلب کیا جاتا تھا۔ انہیں کئی لائق اور ذہین وزراء کا تعاون حاصل ہو گیا تھا۔ آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب رکھنے اور مالی امور کے انتظامات کرنے کے لیے عبدالرحمن نے مالیات کا شعبہ قائم کیا تھا۔

مملکت میں انصاف کی سر بلندی قائم رکھنے اور رعایا کو اس کا حق دلوانے کی غرض سے قاضی مقرر تھے۔ قاضیوں کے تقرر کے سلسلے میں عبدالرحمن، مشہور فقیہ اور عالم شیخ یحییٰ اللیثی سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ وہ شیخ یحییٰ اللیثی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے سرکاری ایوان میں دیگر کئی فقہاء موجود رہتے تھے۔ ان کے دور میں سعید بن محمد، ابو عمر بن بشیر، صفوان قرشی، احمد بن زیاد، معاذ بن عثمان جیانی اور دیگر ممتاز علماء کرام قاضی (جج) کے منصب پر فائز رہے۔

عبدالرحمن الاوسط خود بھی اچھے عالم تھے اور علوم کی سرپرستی کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کی ہدایت پر ہر مسجد کے ساتھ ایک وسیع مدرسہ بنایا

گیا۔ اس مدرسہ کا انتظام مسجد کے امام اور اہل محلہ کی ایک مجلس کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ ایسے تمام مدرسوں کے اخراجات حکومت کے ذمے تھے ان مدارس میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دو یا تین محلوں کے درمیان شفا خانے قائم کیے گئے تھے جن میں ماہر طبیبوں کا تقرر کیا گیا تھا۔ ان شفا خانوں میں عوام کو مفت علاج معالجہ کی سہولتیں حاصل تھیں۔

عبدالرحمن الاوسط بہت نفاست پسند تھے۔ انہوں نے اندلس کو دل کش، سرسبز و شاداب اور خوبصورت بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے۔ سڑکوں کی مرمت اور صفائی پر خصوصی توجہ دی۔ ناقابل استعمال سڑکوں کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ سڑکوں کا ایک جال بچھا دیا گیا اور تمام سڑکوں کی پیمائش کروائی گئی۔ شہروں میں صفائی کا بہت اچھا انتظام کروایا۔ کوڑا کرکٹ جمع نہ ہونے پاتا تھا۔ قسطنطنیہ کے جنوب میں سیرامورنیا کے پہاڑی سلسلے میں واقع چشموں سے سیسے کے پائپوں کی مدد سے صاف پانی لایا جاتا اور شہریوں کو فراہم کیا جاتا۔ شہروں میں شاندار حمام بنوائے گئے۔ کئی باغ لگوائے گئے جن میں جابجا فوارے چلتے تھے۔

عبدالرحمن الاوسط بہت اچھے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے اور ستھرا شعری ذوق رکھتے تھے آپ کے دربار میں ممتاز علماء کرام کے علاوہ اچھا شعر کہنے والے کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ عبدالرحمن الاوسط کو قدرت نے تقریر کی زبردست صلاحیت بخشی تھی ان کی خطابت سامعین کو مسحور کر لیتی تھی ان کی تقریر میں بلا کی روانی تھی۔ دلائل و براہین کے انبار لگاتے ہوئے ان کی تقریر میں کبھی ابر باران کی شان ہوتی، کبھی نرم و نازک گل کی سی لطافت تو کبھی طوفانی لہروں کا سا غضب پایا جاتا وہ صاف ستھرا لباس زیب تن کرنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے لباس پر خود ہی طغرا کاڑھا تھا۔

امیر عبدالرحمن الاوسط کی نرم خوئی، انسان دوستی اور رحم دلی کے کیا مسلم اور کیا غیر مسلم سب مداح تھے۔ آپ کا یہی حسن سلوک مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کو اسلام کی جانب کھینچ لایا تھا، ایشیلیہ میں تو عیسائی اس قدر بڑی تعداد میں مسلمان ہوئے کہ وہاں موجود مسجد نمازیوں کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگی چنانچہ آپ نے ایک نئی عالیشان مسجد تعمیر کروائی۔

درحقیقت دلوں کو مسخر محض کتابیں نہیں بلکہ وہ انسان کرتے ہیں جو ان کتابوں کی عملی تفسیر ہوا کرتے ہیں۔



الپ ارسلان

قائدانہ صلاحیت، فوجی قوت اور وسیع مملکت کے لحاظ سے اپنے عہد کے سب سے بڑے فرمانروا

وہ شہر دو طرف پہاڑوں سے اور دو جانب دریا سے گھرا ہوا تھا۔ مسیحی آرمینیا کے اس شہر کے اطراف پہاڑوں پر زبردست قلعے ایستادہ تھے جن کی مضبوط فصیلوں پر چاق و چوبند سپاہیوں کی نقل و حرکت دیکھی جاسکتی تھی۔ شہر کے گرد مستحکم فصیل تھی اور واقف کاروں کا کہنا تھا کہ اس فصیل کے اندر ایک اور فصیل ہے۔

اسلامی لشکر شہر کو گھیرے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ گھوڑوں کی باگیں کھینچ لی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد امیر لشکر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لشکر کے سپاہی دریا پر کشتیوں کا پل باندھنے میں مصروف تھے۔ پل بندھ گیا تو لشکر بڑی تیزی سے دریا کے پار اتر گیا۔ شہر والوں کو لگا کر اگیا کہ ہتھیار ڈال دیں۔ اس لکار کے جواب میں تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اسلامی لشکر کے سپاہیوں نے سنبھل کر اپنی اپنی جگہ سنبھال لی اور زبردست جنگ کا آغاز ہو گیا۔ محاصرہ سخت کر دیا گیا اور شہر کو رسد پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔

لڑائی زور شور سے جاری تھی، اچانک شہر کی فصیل پر سفید پرچم لہرانے لگا۔ مجاہدین اسلام کوڑک جانے کا حکم ملا۔ شہر کی جانب سے دو آدمیوں نے اعلان کیا کہ ہم امان چاہتے ہیں، آپ اپنا ایک دستہ بھیج دیں جو شہر کا قبضہ حاصل کر لے۔ اسلامی فوج کا ایک دستہ روانہ کر دیا گیا، لیکن شہر والے بدعہد نکلے۔ اسلامی دستہ جوں ہی شہر کی فصیل عبور کر کے اندر داخل ہوا، دروازے بند کر دیے گئے اور شہر والوں نے اسلامی فوج کے دستے کے ایک ایک سپاہی کو شہید کر دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع بہت جلد اسلامی فوج تک پہنچ گئی۔ طبل جنگ بجنے لگے اور ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ امیر لشکر اس وقت نماز ادا کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے خیمے کے باہر مچی ہوئی ہلچل کی آوازیں ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں لیکن وہ پورے وقار سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔ اسلامی فوج میں شدید اضطراب اور بے چینی تھی۔

نماز ادا کرنے کے بعد امیر لشکر خیمے سے باہر نکلے۔ انہیں دشمن کی بدعہدی سے آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے فوج کو منظم کیا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوئے اور اسلامی فوج نے اس شہر کی مضبوط فصیلوں پر دھاوا بول دیا۔ اس وقت لشکر اسلام کا ایک ایک سپاہی شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا۔ جذبہ شہادت کے سامنے مضبوط سے مضبوط فصیلوں کی کیا حیثیت تھی۔ کچھ ہی دیر میں اسلامی فوج شہر میں داخل ہو چکی تھی، وعدہ کر کے پھر جانے والے بددیانت عہدیداروں کو قیدی بنایا جا رہا تھا اور امیر لشکر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ شہر کا جائزہ لے رہے تھے۔

یہ امیر لشکر تھے سلجوقی سلطنت کے دوسرے فرمانروا الپ ارسلان، جن کی بے مثال شجاعت اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیت نے مسلمانوں کو کل عالم میں سر بلندی عطا کی اور جن کا دس سالہ دور حکومت قوت و استحکام کی علامت بن کر تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔

الپ ارسلان کا نام محمد تھا۔ ”ابوشجاع“ ان کی کنیت تھی۔ انہیں عباسی خلیفہ کے دربار سے ضیاء الدین اور عضد الدولہ کے خطابات ملے تھے لیکن دنیا انہیں الپ ارسلان ہی کے نام سے جانتی ہے۔ ”الپ“ کا تلفظ ”آلپ“ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں شجاع، دلیر، طاقتور، ہیرو۔ الپ ارسلان کے لقب کے دوسرے حصے یعنی ارسلان کے معنی ہیں: ”شیر“ یہ خطاب ”الپ ارسلان“ (بہادر شیر) اس عظیم سلجوقی

فرمانروا کی بلند صفات کو دیکھتے ہوئے بہت موزوں نظر آتا ہے۔

الپ ارسلان کے والد کا نام پغری بیگ داؤد تھا جو سلجوقی سلطنت کے پہلے فرمانروا طغرل بیگ محمد کے بھائی تھے۔ طغرل بیگ محمد کی کوئی اولاد نہ تھی چنانچہ وہ اپنے بھائی پغری بیگ کے بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

الپ ارسلان کی تاریخ پیدائش میں مؤرخین کے مابین اختلاف ہے۔ کچھ مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ 424ھ میں پیدا ہوئے تھے (ابن اثیر عماد کاتب اور ابن خلکان) ابن الراوندی، حمد اللہ مستوفی اور میر خوند کے نزدیک الپ ارسلان کی تاریخ پیدائش 2 محرم 421ھ ہے جب کہ دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق الپ ارسلان یکم محرم 420ھ / جنوری 1029ء کو پیدا ہوئے۔

الپ ارسلان نے حکمران بننے کے بعد بغداد میں موجود عباسی خلیفہ کو پیغام بھیجا تا کہ خلیفہ کی طرف سے نئی سلجوقی سلطنت کو اذن حکمرانی مل جائے..... خلیفہ کو جب الپ ارسلان کا پیغام ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ 7 جمادی الاول 456ھ کو انہوں نے ایک دربار عام منعقد کیا جس میں باقاعدہ طور پر الپ ارسلان کی حکومت کو خلافت کی طرف سے تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ الپ ارسلان کو ضیاء الدین اور عضد الدولہ کے خطابات دیے گئے۔ ان کے لیے خلعتیں ان کے ایلچیوں کے حوالے کی گئیں اور بغداد میں الپ ارسلان کے نام کا خطبہ جاری کر دیا گیا۔

خلافت کی جانب سے اذن حکمرانی مل جانے کے بعد الپ ارسلان نے اپنے اطراف کے علاقوں پر نظر کی جہاں دشمن ریاستوں نے شورشیں برپا کر رکھی تھیں۔ ربیع الاول 452ھ / 1026ء میں سلجوقی لشکر آذربائیجان کی سمت روانہ ہوا۔

الپ ارسلان نے دریائے ارس عبور کیا اور سچو ان پہنچ گئے یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے ملک شاہ اور وزیر نظام الملک کو انجاز (جارجیا) بھیجا۔ ملک شاہ نے انجاز میں اپنی لیاقت کے جوہر دکھائے اور کئی قلعے فتح کر لیے حتیٰ کہ انجاز کے فرمانروا بقراط نے خوفزدہ ہو کر خود صلح کی درخواست کی اور سالانہ جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر الپ ارسلان نے ملک شاہ اور نظام الملک کو واپس بلا لیا اور اپنی مکمل فوج کے ساتھ ارمینیا کی مسیحی حصے پر چڑھائی کر دی۔ اس زمانے میں ارمینیا کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ اسلامی ارمینیا کہلاتا تھا جس کا دار الحکومت، دینیل، تھا دوسرا مسیحی ارمینیا کہلاتا تھا جس کا دار الحکومت آنی تھا۔

مسیحی ارمینیا کی فتح کے بعد الپ ارسلان نے جنگ کا سلسلہ روک دیا اور اصفہان چلے گئے۔ اصفہان سے وہ کرمان اور مرو گئے جہاں انہوں نے اپنے بیٹے ملک شاہ کی شادی ماوراء النہر (دریائے جیحون اور دریائے مسیحوں کا درمیانی علاقہ) کے بادشاہ طغفاج خان کی بیٹی سے کر دی دوسرے بیٹے ارسلان شاہ کے لیے انہوں نے سلطان ابراہیم غزنوی کی بیٹی کا انتخاب کیا۔ غزنوی خاندانوں سے رشتہ داری قائم کرنے کا فیصلہ بہت دانشمندانہ تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے درمیان اور زیادہ اتحاد و اتفاق ہو گیا۔

457ھ میں ارسلان اس علاقے کی طرف بڑھے جہاں ان کے آباؤ اجداد نے زندگی گزاری تھی۔ دریائے جیحون پار کر کے وہ مارواء النہر سے ہوتے ہوئے مسیحوں کے کنارے پہنچ گئے اور فاتحہ پڑھی۔ جند کے حکمران الپ ارسلان کی خدمت میں خود حاضر ہوئے اور اطاعت کا وعدہ کیا۔

ارسلان نے جند کی حکومت کو برقرار رکھا اور اس کے حکمران کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا۔ یہاں سے وہ صبران اور گرگانہ ہوتے ہوئے مرو واپس پہنچ گئے۔ اس مہم میں کہیں خون نہیں بہا اور کسی لڑائی کے بغیر الپ ارسلان کی حکومت دریائے سیحوں کی دوسری طرف ترکستان تک وسیع ہو گئی۔ 458ھ میں الپ ارسلان نے انتظامی امور کی جانب توجہ دی اور مختلف علاقوں میں والیوں کا تقرر کیا۔ اگلے سال کرمان اور فارس میں شورشوں کا قلع قمع کیا گیا۔ فارس کا مشہور قلعہ اضطخر فتح ہوا۔ قلعہ کے حکام نے اطاعت کا یقین دلایا، بہت سے قیمتی تحفے پیش کیے ان میں فیروزے کا ایک پیالہ بھی تھا جس پر ایران کے قدیم بادشاہ جمشید کا نام کھدایا ہوا تھا۔ اضطخر کے بعد دیگر قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ بہزاد کا مستحکم

قلعہ بھی تسخیر ہو گیا۔ یہ قلعہ ایک بلند پہاڑ پر بنا ہوا تھا اور اس کو فتح کرنا بے حد مشکل کام تھا۔

اس زمانے میں الپ ارسلان آذربائیجان کے شہر خوی میں مقیم تھے اور ان کے ساتھ بہت تھوڑی فوج تھی۔ ان کے بیوی بچے بھی ساتھ تھے۔ رومیوں کی اتنی بڑی فوج کے ملاؤ گرتک پہنچنے کی خبر بڑے سے بڑے حکمران کو پریشان کر دینے کے لیے کافی تھی لیکن دلیر سلجوقی حکمران ذرا بھی سراسیمہ نہ ہوئے۔ انہوں نے فوراً فیصلہ کیا کہ رومیوں کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے اہل و عیال اور خواتین کو نظام الملک کے ساتھ تبریز یا ہمدان بھیج دیا اور خود فوج لے کر ملاؤ گرد کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئے۔ اسلامی مورخین کے مطابق فوج صرف پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جبکہ یورپی مورخین نے زیادہ سے زیادہ تعداد چالیس ہزار لکھی ہے۔ رومیوں کی فوج کے پاس اسلحہ بھی اعلیٰ قسم کا تھا۔ بیسیوں ایسی منجنیقیں تھیں جن میں آٹھ درجے تھے اور ہر درجے میں ڈیڑھ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔

اتنی بڑی اور طاقتور فوج کے سامنے الپ ارسلان کا اسلامی لشکر محض مٹھی بھر سپاہیوں کا دستہ محسوس ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ قیصر روم اور اس کے جرنیل بڑے غرور سے کہتے تھے۔ ”آئندہ موسم سرما ہم ’رے‘ (سلجوقیوں کے دارالحکومت) میں گزاریں گے۔ موسم گرما عراق میں گزرے گا“ واپسی میں ہم شام کے علاقوں کا فیصلہ کرتے ہوئے آئیں گے۔“ قیصر روم نے تو اسلامی مملکت کو فتح کرنے سے پہلے ہی سارے اسلامی علاقوں کو عیسائی حکام کے درمیان تقسیم بھی کر دیا تھا۔

الپ ارسلان اپنے سے بیس گنا بڑی طاقت کو دیکھ کر قطعاً خوفزدہ نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک طاقت اور ہے جو کل زمینوں اور آسمانوں پر حکمران ہے۔ انہوں نے اپنی فوج سے کہا:

”اے مجاہدین اسلام! بے شک ہماری تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن صبر و ہمت سے کام لینا ہے اور اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے دشمن سے نہرواؤ زما ہونا ہے۔ اگر فتح پائی تو اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے ورنہ درجہ شہادت پر تو ضرور فائز ہوں گے۔“

4 ذی قعدہ 463ھ/1071ء کو خلاط کے قریب اسلامی لشکر کی رومیوں کے ایک ہراول دستے سے مدد بھیڑ ہو گئی۔ یہ ہراول دستہ بھی بہت بڑا تھا اور لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل رومی فوج کے لحاظ سے اس ہراول دستے میں بھی دس ہزار سے بیس ہزار سوار شامل تھے اور اس کی قیادت ایک رومی جنرل کر رہا تھا۔ اسلامی فوج کے سپاہی اس وقت جذبہ شہادت سے سرشار تھے۔ رومی ہراول کے سپاہی دیکھتے ہی دیکھتے تہ تیغ کر دیے گئے۔

الپ ارسلان کا ارادہ تھا کہ وہ ترکستان کے تمام علاقوں کو اسلامی مملکت میں شامل کریں اور پھر چین کا رخ کریں۔ چنانچہ وہ صفر 465ھ میں دولاکھ مجاہدین کا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ دریائے جیحون پہنچ کر کشتیوں کا پل بندھوایا۔ پورے لشکر اور ساز و سامان کو دریا پار پہنچانے میں بیس پچیس دن صرف ہو گئے، لشکر نے قریر کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

الپ ارسلان کی زندگی کے دن باقی ہوتے تو شاید وہ بلاد ترکستان کو تسخیر کر کے ایک وسیع علاقے کو اسلامی مملکت کا حصہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے لیکن قدرت فیصلہ کر چکی تھی۔ قریر کے مقام پر ایک سرحدی قلعے کے محافظ نے الپ ارسلان پر حملہ کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا۔ اس محافظ کو موقع پر مار ڈالا گیا اور الپ ارسلان کو فوراً طبی امداد فراہم کی گئی لیکن زخم بے حد گہرا تھا۔ 10 ربیع الاول 465ھ/24 نومبر 1072ء کو اسلام کے اس عظیم اور جری سالار نے اس دار فانی کو خیر باد کہا۔ ان کی میت مروے جائی گئی جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ انہوں نے چالیس یا پینتالیس سال کی عمر پائی۔

الپ ارسلان بلاشبہ اپنی شجاعت، قائدانہ صلاحیت اپنے عسکری نظام اور اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے اپنے عہد کے سب سے بڑے حکمران تھے۔ ایک وسیع اور مضبوط مملکت کے فرمانروا ہونے کے باوجود وہ بے حد منکسر المزاج، خلیق اور معتدل مزاج کے انسان تھے۔ وہ انصاف کو پوری قوت سے نافذ کرنا پسند کرتے تھے اور اس معاملے میں کوئی نرمی کرنا انہیں گوارہ نہ تھا۔ اگر کبھی انہیں شکایت موصول ہوتی کہ کسی سرکاری افسر

نے کسی عام آدمی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو شکایت کی تحقیق کرواتے اور جرم ثابت ہونے پر متعلقہ افسر کو سخت سزا دیے جانے کا حکم دیتے۔ اس سختی کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی سرکاری افسر کو عوام کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

انتظامی امور میں سخت ہونے کے ساتھ ساتھ الپ ارسلان بے حد رفیق القلب اور نرم دل حکمراں تھے ان کے دفتر میں بے شمار محتاجوں کے نام درج تھے۔ جنہیں سرکاری خزانے سے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ وہ جب بھی کسی مسکین یا محتاج کو دیکھتے تو آبدیدہ ہو جاتے تھے اور اس کی مدد کرتے تھے۔ ان کے مہلک میں مساکین اور ناداروں کے لیے روزانہ پچاس بکریاں ذبح کی جاتی تھیں۔ رمضان المبارک میں وہ پندرہ ہزار دینار صدقہ کیا کرتے تھے۔

انہوں نے ہدایت کی ہوئی تھی کہ رعایا پر کسی قسم کے ٹیکسوں اور محصولات کا بوجھ نہ ڈالا جائے اور اگر خراج کی ادائیگی کسی علاقے کی رعایا کے ذمہ ہے تو یہ خراج سال ختم ہونے پر یک مشت نہ لیا جائے بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے سال میں دو بار لیا جائے۔ وہ اپنے دشمنوں تک کے ساتھ فیاضانہ اور ہمدردانہ سلوک کیا کرتے تھے۔ ان کے خلاف مختلف افراد نے بغاوتیں کیں لیکن وہ تحمل کے ساتھ سب کو برداشت کرتے رہے اور کمال غفو سے کام لے کر انہوں نے سب کو معاف کر دیا۔ وہ بڑے اعلیٰ ظرف اور فراخ دل حکمراں تھے۔

الپ ارسلان ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے انہیں امام اعظم حضرت امام ابوحنفیہؒ سے بہت عقیدت تھی۔ 459ھ/1057ء میں انہیں اطلاع ملی کہ امام صاحب کا مزار خستہ حالت میں ہے تو انہوں نے ابو سعد محمد بن منصور کو حکم دیا کہ امام صاحب کی قبر پر ایک عظیم الشان گنبد تعمیر کیا جائے اور اس کے ساتھ ایک اچھا مدرسہ تعمیر کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ مدرسہ کی رسم افتتاح بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی اور یہ مدرسہ صدیوں تک کام کرتا رہا۔ الپ ارسلان نے نظام الملک طوسی جیسی عظیم شخصیت کو اپنا وزیر مقرر کیا جنہوں نے 457ھ/1065ء میں اس عظیم جامعہ کی بنیاد رکھی جو اب تک جامعہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔



بہلول لودھی

ایک دین دار، منکسر المزاج، حوصلہ مند اور مدبر حکمران، جنہوں نے برصغیر کی مملکت کو پارہ پارہ ہو جانے سے بچا لیا

اس مکان کی چھت گر پڑی تھی۔!

ملتان کے محلے کمانگراں کی اس گلی میں کہرام مچا تھا۔ لوگ دیوانہ وار، ملبہ ہٹانے میں مصروف تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ایک خاتون مکان میں موجود تھیں جو ملبہ تلے دبی ہوئی ہیں۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ خاتون اُمید سے تھیں اور چند ہی دنوں بعد ان کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔

بہت سے لوگ گرے ہوئے مکان کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے، ملبہ ہٹا کر خاتون کو باہر نکالا گیا، لیکن خاتون کی زندگی کے دن پور ہو چکے تھے۔ اس موقع پر خاتون کے غم زدہ رشتہ داروں نے رائے دی کہ جو ننھی سی جان خاتون کے جسم میں پل رہی تھی اس کو تو بچانے کی کوشش کی جائے، چنانچہ ہنگامی طور پر انتظامات کیے گئے اور خاتون کا شکم چاک کر کے بچے کو نکال لیا گیا۔ جس میں ابھی زندگی کے آثار موجود تھے۔

یہ ایک بہت نحیف و ناتواں بچہ تھا لیکن اس وقت کسی کو بھی علم نہ تھا کہ یہی نحیف و ناتواں بچہ چند برس بعد برصغیر کے ایک بڑے حصے کا حکمران بنے گا اور برصغیر کی مملکت اسلامیہ کو پارہ پارہ ہونے سے بچانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

یہ بہلول لودھی تھے جنہوں نے برصغیر میں لودھی خاندان کی حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے مملکت میں شدید سیاسی بد نظمی کا خاتمہ کیا اور ایک مستحکم اسلامی حکومت قائم کر دی۔ تمام مؤرخین نے بہلول کی متاثر کن شخصیت اور ان کے اعلیٰ اوصاف کی تعریف کی ہے۔

اس نحیف و نزار بچے کو اس کے افسردہ اور ملول رشتہ دار اپنے ساتھ لے گئے۔ مشکل یہ بھی تھی کہ بچے کے والد ایک جنگ میں مارے جا چکے تھے۔ بچے کے چچا سلطان شاہ نے اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش کرنے کا اعلان کیا۔ بچے کو لوگ پیار سے بلو کہنے لگے۔ بلو کے معنی مقامی زبان میں ’تیز دوڑنے والا‘ کے ہیں۔ بلو بچپن ہی سے نہایت شوخ، ذہین اور تیز تھے۔

بلو جب بڑے ہوئے تو انہیں لوگ بلو خان کہنے لگے۔ سلطان شاہ نے ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ بلو خان نے گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی۔ وہ افغانستان اور اس سے آگے کے علاقوں سے (جنہیں ولایت کہا جاتا تھا) گھوڑے خرید کر لاتے اور ہندوستان میں فروخت کر دیتے۔

اس دور میں بھی بہلول کے چچا سلطان شاہ (اسلام شاہ) سرہند کے حاکم (گورنر) تھے۔ وہ اپنے بھتیجے بہلول سے بہت متاثر تھے اور ان سے بہت محبت کرتے تھے حتیٰ کہ سلطان شاہ نے اپنے سگے بیٹوں پر بہلول کو فوقیت دیتے ہوئے اعلان کر دیا تھا کہ بہلول ہی میرا جانشین ہوگا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ بہلول کی شادی بھی کر دی تھی۔ کچھ عرصے بعد سلطان شاہ کا انتقال ہو گیا۔ بہلول اپنے چچا کے جانشین ہو کر سرہند کے حاکم ہو گئے۔ ابتدا میں انہیں کچھ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ محمد شاہ نے بھی ایک فوج بہلول کے خلاف بھیجی لیکن اس فوج نے شکست کھائی۔ اس کے بعد محمد شاہ نے سرہند اور اطراف کے علاقوں پر بہلول کی حکمرانی تسلیم کر لی اور انہیں فتح خان کا خطاب بھی دے دیا۔

محمد شاہ کی حکومت کمزور تھی چنانچہ آس پاس کے خود مختار حکمرانوں نے دہلی پر حملے شروع کر دیے۔ جو پور کے حکمران ابراہیم شاہ شرقی نے

تو بہت سے علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ بعض میواتی امیروں نے مالوہ کے حکمران محمود خلجی کو دہلی پر حملے کی دعوت دے دی۔ محمود خلجی نے فوج لے کر 846ھ (1442ء) میں دہلی پر چڑھائی کر دی۔ محمد شاہ نے بہلول کو مدد کے لیے بلایا۔ بہلول بیس ہزار سپاہی لے کر پہنچ گئے۔ صبح سے شام تک جنگ ہوئی۔ پھر محمود کو واپس جانا پڑا کیونکہ احمد شاہ گجراتی نے مالوہ پر چڑھائی کر دی تھی۔ بہلول نے مالوہ تک ان کا تعاقب کیا۔

محمد شاہ سید بہلول کی اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے بہلول کو اپنا بیٹا بنالیا اور انہیں خان خانان کا خطاب دیا۔ اس کے بعد بہلول لودھی کی حکمرانی لاہور، دیپال پور، ملتان پر بھی قائم ہو گئی۔ بہلول نے ہانسی، فیروز آباد اور ناگور پر بھی قبضہ کر لیا۔

محمد شاہ سید کا انتقال 849ھ (1445ء) میں ہوا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے علاؤ الدین عالم شاہ کو تخت نشین کیا گیا۔ وہ بہت ہی کمزور حکمران تھے۔ ان کے عہد میں سلطنت دہلی انتشار اور عدم استحکام کی انتہا کو پہنچ گئی۔

سید خاندان کے آخری حکمران علاؤ الدین عالم شاہ کی حکومت سٹ کر صرف دہلی تک محدود رہ گئی تھی۔ اس سلطنت کی حدود ایک جانب بارہ میل تک اور دوسری جانب محض ایک میل تک تھیں چنانچہ اس زمانے میں ایک فقرہ ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا تھا کہ: ”بادشاہی شاہ عالم، از دہلی تا پالم“ مزید طرفہ یہ کہ علاؤ الدین عالم شاہ بدایوں چلے گئے۔ کیونکہ انہیں بدایوں بہت پسند تھا۔ ان حالات میں بہلول لودھی نے پیش قدمی کی اور دہلی کی اس حکومت پر قبضہ کر لیا جو بظاہر اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی۔ 855ھ (1451ء) میں بہلول لودھی سلطنت دہلی کے فرمانروا بن چکے تھے۔ اس طرح برصغیر میں لودھی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ لودھی خاندان 855ھ سے 932ھ (1451ء سے 1426ء) تک برصغیر پر حکمران رہا۔ اس کے بعد ظہیر الدین بابر نے حکومت سنبھال کر مغلیہ خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ مرقع افغان میں مولوی اسرار حسین نے لکھا ہے: ”علاؤ الدین عالم شاہ تو دراصل 850ھ (1446ء) ہی میں حکومت سے دستبردار ہو چکے تھے اور بہلول لودھی 17 ربیع الاول 850ھ (12 جون 1446ء) کو ہی سلطنت دہلی کے سربراہ بن چکے تھے۔“

بہلول لودھی نے حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے پنجاب کی جانب توجہ کی۔ انہوں نے دہلی میں اپنے بیٹے بایزید کو قائم مقام مقرر کیا اور خود 856ھ (1452ء) میں دیپال پور کی طرف روانہ ہوئے۔ دیپال پور، پاک پٹن سے 28 میل مشرق میں تھا۔ خلجیوں کے عہد میں یہ پنجاب کا دارالحکومت تھا۔ چونکہ لاہور اور ملتان کے وسط میں تھا اس لیے بیرونی حملوں کی روک تھام کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ تیمور کے حملے کے وقت یہ ملتان کے مساوی شہر تھا۔ جو عناصر بہلول لودھی کے اقتدار کے مخالف تھے انہوں نے سید خاندان کے آخری حکمران علاؤ الدین عالم شاہ کو ترغیب دی کہ وہ بہلول کے خلاف کارروائی کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر ان عناصر نے جوینپور کے حکمران محمود شرقی کو حملے پر آمادہ کیا۔ محمود شرقی نے دولاکھ سپاہیوں اور ڈیڑھ ہزار جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی پر چڑھائی کر دی۔ بہلول کو اس فوجی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ بیچ راستے ہی سے لوٹ آئے۔ فریقین کے مابین جنگ ہوئی جس میں محمود شرقی کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ جوینپور واپس چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد مسلسل 26 برس تک بہلول لودھی اور جوینپور کے حکمرانوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔

محمود شرقی کی جانب سے اطمینان ہونے پر اب بہلول لودھی میوات کی طرف بڑھے۔ وہاں کے حکمران احمد خان میواتی نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد بہلول نے سنبھال، کول، برہان آباد، بھوگیاگاؤں اور راپڑی کو فتح کیا۔ پھر وہ اٹاواہ پہنچے۔ یہاں کے حاکم کو اپنی جگہ برقرار رکھا۔ کچھ عرصے بعد جوینپور کے حکمران محمود شرقی سے پھر اٹاواہ کے مقام پر معرکہ آرائی ہوئی۔ جنگ کے بعد صلح ہو گئی۔ محمود شرقی کے انتقال کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوئے۔ دریائے سرستی کے کنارے پھر جنگ ہوئی جس میں محمد شاہ کی فوج نے پسپائی اختیار کی اس دوران میں محمد شاہ کے چھوٹے بھائی حسین شرقی حکمران بن گئے۔ ان سے چار سال کے لیے صلح ہو گئی۔ صلح کی مدت ختم ہونے پر چندوارہ کے مقام پر حسین شرقی سے پھر جنگ ہوئی جو سات دن تک جاری رہی۔ آخرتین برس کے لیے صلح ہو گئی۔ اس معیاد کے اختتام پر حسین شرقی نے ایک لاکھ سپاہیوں اور ایک ہزار ہاتھیوں کے

ساتھ دہلی پر چڑھائی کر دی۔ بہلول نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آخر صلح ہوئی لیکن 883ھ (1478ء) میں حسین شرقی نے پھر جنگ چھیڑ دی۔ بہلول نے کپل، شمس آباد، سکیت، مارہرہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ حسین شرقی سے مزید چند جنگیں ہوئیں جن میں بہلول کو کامیابی حاصل ہوئی۔ حسین گوالیار چلے گئے۔

بہلول نے اناوہ پر قبضے کے بعد حسین شرقی کے لشکر پر چڑھائی کر دی جو ان دنوں کالپی میں تھے۔ دریائے جمنہ کے کنارے جنگ کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخر حسین شرقی جو پنپور کی طرف چلے گئے۔ بہلول نے ان کا تعاقب کیا۔ حسین بہرائچ کے راستے قنوج پہنچے قنوج کے نزدیک ایک ندی آب رہب کے کنارے جنگ ہوئی۔ حسین کو پھر شکست ہوئی۔ ان کی بیوی خوتزہ (خونزا) جو سلطان علاؤ الدین کی بیٹی تھیں گرفتار ہونے والوں میں شامل تھیں۔ بہلول نے خونزہ کے ساتھ بہت عزت کا سلوک کیا اور انہیں حسین شرقی تک بحفاظت پہنچا دیا۔ اس کے بعد حسین شرقی سے مزید سات معرکے ہوئے۔ حسین آخری بار شکست کھا کر بہار کی طرف چلے گئے۔ بہلول لودھی نے 893ھ (1488ء) میں جو پنپور کی سلطنت کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی نے جو پنپور کے سلطنت دہلی میں انضمام کا سال 884ھ (1479ء) درج کیا ہے۔

بہلول لودھی نے رانا اودے پور کو بھی شکست دی اور اجمیر کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سندھ میں احمد خان کوزیر کر کے اپنی سلطنت کی حدود کو مزید وسعت دی۔ اس طرح اپنے 38 سالہ دور حکومت میں بہلول لودھی نے کڑہ، بہرائچ، لکھنؤ، کالپی، بدایوں، دوآبہ کا تمام حصہ، اناوہ، گوالیار، سندھ، اودے پور، سنجل، میوات، کول (علی گڑھ) اور برہان آباد کو پھر سے سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور پنجاب میں بھی مستحکم اقتدار قائم کر دیا۔

بہلول لودھی نے 894ھ (89-1488ء) میں گوالیار کے سرکش راجا کے خلاف فوج کشی کی۔ راجا نے اسی لاکھ تنکے دے کر اطاعت کا یقین دلایا۔ بہلول لودھی جب اس مہم سے واپس دہلی لوٹ رہے تھے تو راستے میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ سکیت کے نواحی قصبہ بھداؤنی (اسے تلاولی بھی لکھا گیا ہے) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے سکندر لودھی نے ان کی میت دہلی بھیج دی جہاں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ بعد میں ان کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ یہ مقبرہ حضرت روشن چراغ دہلی کی درگاہ کے عقب میں واقع ہے۔ سکندر لودھی کے بنوائے ہوئے اس مقبرہ کی عمارت بہت سادہ ہے لیکن اس کی مجموعی ہیئت بہت خوبصورت ہے۔ نیچے کی سمت بارہ در ہیں اور اوپر پانچ برج تعمیر کیے گئے ہیں۔

بہلول لودھی کے نوٹڑ کے تھے۔ بہلول نے ان میں سے نظام خان کو اپنا جانشین مقرر کیا جو سکندر لودھی کے لقب سے سلطنت دہلی کے حکمران بنے اور انہوں نے بہت عمدگی کے ساتھ حکومت کی۔

تمام مؤرخین نے بہلول لودھی کی عمدہ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے بلند کردار، بردباری، شرافت نفس، رحم دلی اور احکام شریعت کی پابندی کی تعریف کی۔ بہلول لودھی اتنی بڑی مملکت کے سربراہ ہونے کے باوجود بے حد منکسر المزاج انسان تھے۔ وہ شاہی شان و شوکت کو پسند نہ کرتے تھے اور شاہانہ رکھ رکھاؤ کے قائل نہ تھے حتیٰ کہ وہ نجی یا سرکاری محفلوں میں سربراہ مملکت کے لیے مخصوص تخت پر بھی نہیں بیٹھتے تھے اور اپنے امراء، سرداروں اور مشیروں کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ وہ اپنے امراء اور ادنیٰ سپاہیوں کے ساتھ برادرانہ اور رحم دلانہ برتاؤ کرتے تھے۔ وہ عیادت اور تعزیت کے لیے لوگوں کے گھروں پر چلے جایا کرتے تھے۔ اپنے دسترخوان پر وہ ہر کسی کو بٹھا لیتے تھے۔ وہ خود سادہ غذا کھایا کرتے تھے۔ ان کے دروازے پر کوئی دربان نہ تھے۔ جب ان سے کوئی ملنے کے لیے آتا تھا تو وہ اسے کھڑا نہ رہنے دیتے تھے بلکہ اپنے قریب ہی بیٹھنے کی جگہ دے دیتے تھے۔ بہلول جب بھی اپنے ماتحتوں کو خط لکھتے تھے تو انہیں 'مسند عالی' لکھتے تھے۔

بہلول لودھی نہایت علم دوست انسان تھے۔ علماء اور فضلاء کی ہم نشینی پسند کرتے تھے۔ اہل علم کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ بہلول کو علوم اسلامی میں اسلامی قانون کے علم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور اسلامی قوانین پر کتب کا وہ اکثر مطالعہ کرتے تھے۔ بہلول لودھی نے

متعدد مدارس اور مساجد تعمیر کروائیں۔ انہوں نے بعض مقبرے بھی تعمیر کروائے۔ مساجد میں خطیبوں اور مؤذنین کا اور مدارس میں اساتذہ کا تقرر خود کیا اور ان کے اخراجات بھی حکومت کی جانب سے برداشت کیے۔ بہلول لودھی نے بدایوں میں بھی مساجد، مقبرے اور مدارس قائم کیے۔ اس طرح دہلی سے سو میل کے اندر علم کا ایک اور مرکز قائم ہو گیا۔

بہلول انصاف پسند حکمران تھے ان کے دور میں ظلم اور نا انصافی کی شکایتیں بہت کم ملتی ہیں۔ بہلول لودھی خود بھی مقدمات کی سماعت کیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انکسار اس حد تک تھا کہ وہ ناراض امراء کی ناراضگی دور کرنے کے لیے ان کے گھروں پر چلے جایا کرتے تھے۔ بہلول کے مزاج میں تحمل بھی بلا کا تھا۔ ان کی نرم دلی اور رواداری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو پور کے حکمران حسین شرقی نے دہلی پر کئی بار حملے کیے اور پھر جنگوں میں شکست کھا کر کئی بار صلح کی درخواست کی اور ہر بار بہلول نے اسے قبول کر لیا۔ بہلول انتہا کے نرم دل اور بردبار تھے اور جنگ میں کبھی پہل نہیں کرتے تھے مگر جب جنگ شروع ہوتی تو وہ انتہائی دلیری سے لڑتے۔ وہ کبھی کوئی معرکہ نہیں ہارے۔

بہلول لودھی کے عہد کی مساجد اور مقبروں میں بلند گنبد تعمیر کیے گئے تھے لیکن وہ گاؤں نہ ہوتے تھے۔ ان تعمیرات کو خالص وسط ایشیائی طرز کے کتبوں اور گہری کھدی ہوئی منقوش مسالے دار گچ کی گل کاری کے حاشیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کاشی کاری کی اینٹوں، طاقتوں اور عجیب و غریب وضع کے کنگروں کے استعمال سے ان کی تزئین کی گئی تھی۔ مقبرے ہشت پہلو ہوتے تھے جو کھلے محرابی برآمدے سے گھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مقبروں کے گنبد تو نیم کردی شکل کے ہوتے تھے لیکن ان کے بھاری پن کو کم کرنے کے لیے برج کے اطراف میں چھوٹی چھتیاں بنائی گئی تھیں۔

بہلول لودھی علماء کرام کی بہت عزت کرتے تھے۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد جب پنجاب میں نظم حکومت شدید متاثر ہو گیا تو سہروردیہ سلسلے کے مشائخ نے شیخ بہاء الدین زکریا کی خانقاہ کے سجادہ نشین شیخ یوسف کو ملتان کا حاکم نامزد کر دیا، لیکن لنگاہ قبیلے نے ان کی مخالفت کی اور انہیں اقتدار سے ہٹا دیا۔ شیخ یوسف چند رفقاء کے ساتھ دہلی آ گئے۔ بہلول لودھی نے ان کو بڑے احترام سے اپنے پاس ٹھہرایا۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی اور اپنی ایک بیٹی کی شادی شیخ یوسف کے صاحبزادے شیخ عبداللہ سے کر دی۔

شیخ یوسف نے بہلول کو مشورہ دیا کہ وہ لنگاہ قبیلے کے خلاف فوجی کارروائی کریں تاہم بہلول مصلحت کے تحت ایسا کرنے سے گریز کرتے رہے۔ جب لنگاہ قبیلے کے افراد میں آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو بہلول نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ گو کہ اس حملے کو کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا لیکن سہروردی علماء اور اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کی نظر میں بہلول کا مقام بہت بلند ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سہروردیہ کے تذکروں میں بہلول لودھی کا ذکر احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ شیخ سماء الدین سہروردی کا شمار بہلول لودھی کے عہد میں مشہور ترین مشائخ میں ہوتا تھا۔ جب ملتان میں لنگاہ قبیلے کے افراد نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو شیخ سماء الدین دہلی تشریف لے آئے۔ وہ حکمرانوں سے زیادہ میل جول پسند نہ کرتے تھے لیکن بہلول لودھی کے اعلیٰ کردار کے وہ بھی معترف تھے۔ بہلول ان کے پاس آیا کرتے تھے اور مختلف امور میں ان سے رہنمائی کی درخواست کرتے تھے۔ شیخ سماء الدین نے بہلول لودھی کو ان کی حکومت مستحکم بنانے میں مدد بھی دی۔

ایک بار بہلول لودھی شیخ سماء الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے بہلول لودھی کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ بہلول لودھی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: ”حضرت! اتنے سارے گناہوں کے باوجود میں اپنے دل میں درویشوں کی محبت پاتا ہوں مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان فقراء کی محبت کی برکت سے مجھے نجات عطا فرمائے گا۔“

☆☆☆

ولید بن عبد الملک

بنی امیہ کے پانچویں خلیفہ جن کا دور مملکت اسلامیہ کی توسیع کے حوالے سے بڑا یادگار ہے

اسے مدد کی ضرورت تھی!

اس کا تعلق قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔ اسے کسی قسم کی مدد درکار تھی چنانچہ وہ مدد لینے کے لیے اٹھا اور ایک جانب چل دیا۔ اسے اطمینان تھا کہ مدد تو بہر حال اسے مل ہی جائے گی۔

چلتے چلتے وہ ایک جگہ پہنچ کر رک گیا۔ یہ مملکت کے فرمانروا کی رہائش گاہ تھی۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اسے مملکت کے سربراہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے اپنی ضرورت بیان کی۔

سربراہ مملکت نے مدد مانگنے والے سے دریافت کیا:

”کیا آپ اس مدد کے مستحق ہیں؟“

”میں کیسے مستحق نہ ہوتا جبکہ میں آپ کا رشتہ دار ہوں۔“ مدد کے خواہش مند شخص نے فوراً کہا۔

”کیا آپ کو قرآن حکیم پڑھنا آتا ہے؟“ سربراہ مملکت نے دوسرا سوال کیا۔

”نہیں۔“ جواب ملا۔

”ہمارے پاس آئیے۔“ سربراہ مملکت نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا۔

مدد مانگنے والا شخص خوش خوش سربراہ مملکت کے قریب پہنچ گیا۔ اسے پہلے ہی یقین تھا کہ مملکت کے فرمانروا اس کی درخواست تو کبھی مسترد کر ہی نہیں سکتے۔

لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ قریب پہنچنے پر سربراہ مملکت نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کا عمامہ اتار لیا۔ پھر انہوں نے ایک چھڑی اٹھائی اور اب مدد کا خواہش مند شخص سربراہ مملکت کے ہاتھوں سے پٹ رہا تھا۔

چند چھڑیاں رسید کرنے کے بعد سربراہ مملکت نے ایک شخص کو بلایا اور حکم دیا کہ قرآن حکیم سے بے بہرہ اس شخص کو لے جائے اور اپنے ساتھ اس وقت تک رکھیے جب تک کہ یہ شخص قرآن حکیم پڑھنا نہ سیکھ لے۔

قرآن کریم سے بے حد محبت کرنے والے یہ حکم اس تھے اموی دور کے پانچویں فرمانروا خلیفہ ولید بن عبد الملک جن کا دور مملکت اسلامیہ کی توسیع کے حوالے سے بے حد یادگار ہے۔

ولید جو تھے اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ ولادہ بنت عباس کا تعلق قبیلہ عبس سے تھا۔ ولید 50ھ (670ء) میں پیدا ہوئے۔ عبد الملک نے اپنے بیٹے کی پرورش بڑے اہتمام سے کی اور ان کو تعلیم دینے کے لیے لائق اساتذہ اور علماء کرام

مقرر کیے۔

ولید بن عبد الملک اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کے والد عبد الملک بن مروان نے اپنے 21 سالہ دور میں تمام مخالفتوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور جب ولید 86ھ (705ء) میں اپنے والد عبد الملک کی وفات کے بعد مملکت کے فرمانروا بنے تو انہیں پورے اطمینان کے ساتھ مملکت اسلامیہ کو وسعت دینے کا موقع ملا۔ ولید کی دوسری خوش قسمتی یہ تھی کہ انہیں پانچ ایسے قابل اور اولوالعزم سپہ سالار میسر آ گئے تھے جو لشکر لے کر مختلف سمتوں میں پھیلے چلے گئے اور اسلامی مملکت کی حدود ایک جانب چین سے جا ملیں دوسری طرف شمالی بھارت کو چھوئے لگیں اور تیسری جانب اندلس کو مملکت کا حصہ بناتے ہوئے فرانس تک جا پہنچیں۔ یہ پانچ عظیم سپہ سالار تھے: قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور مسلمہ بن عبد الملک۔

ولید نے جب زمام حکومت سنبھالی تو فارس (ایران) کی جانب مملکت اسلامیہ کی حدود دریائے جیحون تک تھیں۔ 86ھ (705ء) میں قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں اگرچہ ترکستان کے ایک حصہ پر مسلمانوں کی حکمرانی تسلیم کی جا چکی تھی لیکن یہاں کے چھوٹے حکمران و قافو قاسر کشی اختیار کرتے رہتے تھے۔ سمرقند اور بخارا اور نواحی علاقوں کے حکمرانوں کا طرز عمل بھی ان دنوں معاندانہ تھا چنانچہ قتیبہ بن مسلم کو ان حکمرانوں کی سرکوبی کی ہدایت کی گئی۔

قتیبہ بن مسلم نے فوجی تیاریوں کا حکم دیا اور دریائے جیحون پار کر کے آگے بڑھے۔ صفغانہ کے حکمران نے اطاعت قبول کر لی اس کی دیکھا دیکھی شومان اور کفیان کے حاکم بھی مطیع ہو گئے۔ بادغیس کے حکمران نیزک نے بھی مسلمانوں سے صلح کر لی۔ 87ھ (706ء) میں قتیبہ نے بخارا کے شہر بیکندر پر فوج کشی کی۔ شہر والے قلعہ بند ہو گئے لیکن پھر انہوں نے بھی صلح کر لی۔ قتیبہ نے یہاں ایک مسلمان حاکم مقرر کر دیا تاہم جب اس مسلمان حاکم کو شہر والوں نے بغاوت کر کے قتل کر دیا تو قتیبہ نے پھر کارروائی کی اور شہر پر قبضہ کر کے سرکشوں کو سزائے موت دے دی۔

93ھ (712ء) میں ترکستان کے خوارزم شاہ نے قتیبہ کی اطاعت قبول کی۔ لیکن خوارزم شاہ کو خود ان کی رعایا نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد قتیبہ نے سمرقند پر فوج کشی کی۔ شہر کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ پھر اہلیان سمرقند کی مدد کے لیے اطراف سے فوجیں آ گئیں۔ قتیبہ نے ان فوجوں کو شکست دی اور شہر کا محاصرہ سخت کر دیا۔ پھر پتھر برساکر فصیل شہر توڑ دی۔ شہر والوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن آخر کار صلح پر مجبور ہو گئے اور کئی شرائط پر صلح ہو گئی۔

مسلمانوں نے شہر میں مسجد تعمیر کی۔ نماز ادا کی گئی۔ قتیبہ نے اعلان کر دیا کہ مسلمان صلح کے معاہدے میں طے شدہ رقم کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ سمرقند میں بت پرست رہتے تھے جو سفد کہلاتے تھے۔ بہت سے سفد مسلمان ہو گئے۔ قتیبہ نے اس کے بعد شاش اور فرغانہ فتح کیے اور چین کے سرحدی مقام استیجاب تک پہنچ گئے۔ ایک لشکر روانہ کیا جو کاشغر کو فتح کرتا ہوا چین کے اندر تک چلا گیا۔ چین کے شہنشاہ نے اہل سمرقند کا ساتھ دیا تھا اس لیے اس کے خلاف کارروائی بھی ضروری تھی۔ چین کے شہنشاہ نے جو خاقان چین کہلاتا تھا پہلے تو سخت رویہ اختیار کیا لیکن پھر جزیہ دے کر اطاعت کا اقرار کر لیا۔

ولید بن عبد الملک ہی کے دور میں مسلمان پہلی بار سندھ کی سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ گویا اس خطے میں جہاں پاکستان واقع ہے اسلامی حکومت ولید ہی کے عہد میں قائم ہوئی۔ سندھ پر باقاعدہ فوج کشی اس سے قبل نہیں کی گئی تھی البتہ اکاؤنٹ فٹو حات ہوتی رہی تھیں۔ اس فوج کشی کا محرک سندھ کے راجا داہر کی جانب سے کچھ عرب خواتین کے جہاز کو لوٹ لیے جانے کا واقعہ بنا۔

ابتدائی چند فوجی مہمات کی ناکامی کے بعد 92ھ (711ء) میں نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کو چھ ہزار سپاہی دے کر سندھ بھیجا گیا جو مکران ہوتے ہوئے خشکی کے راستے سندھ پہنچے۔ پہلے انہوں نے قنز پور (اب منجگور) فتح کیا پھر اربابیل (ارمن بیلہ) کو تسخیر کر لیا۔ ارمن بیلہ کے بعد انہوں نے کئی ماہ کے محاصرے کے بعد ساحلی شہر دبیل کو فتح کر لیا۔ دبیل سے محمد قاسم نیرون (حیدر آباد) پہنچے۔ یہاں کے راجا نے صلح کر لی۔ اس سے آگے دریائے سندھ کی شاخ تک کا علاقہ آسانی سے فتح ہوتا چلا گیا۔ دریا پار کرنے کے بعد محمد بن قاسم سیوستان (سیہون) پہنچ گئے اور محاصرہ اور سنگ باری کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہ سیہم گئے اور اسے بھی تسخیر کر لیا۔ پھر مرکز سے حکم ملنے پر وہ واپس نیرون گئے اور راجا داہر سے لڑ کر اسے شکست دی۔ پھر انہوں نے راوڑ (بدین کے قریب ایک قدیم شہر) بغرور (موجودہ بھکر) اور برہمن آباد کے علاقے فتح کیے۔ اس کے بعد راوڑ (روہڑی کے قریب ایک قدیم شہر) قلعہ بابیہ سکھ اور اسکلندہ اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ یہاں سے محمد بن قاسم دریائے چناب عبور کر کے ملتان کی سمت بڑھے۔ سخت جنگ کے بعد ملتان بھی فتح ہو گیا۔

محمد بن قاسم قنوج پر حملہ کرنے والے تھے کہ شوال 95ھ (جون 714ء) میں عراق کے حاکم حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا اور آٹھ ماہ بعد جمادی الثانی 96ھ (فروری 715ء) میں ولید بن عبد الملک بھی انتقال کر گئے۔ اس دوران میں محمد بن قاسم ہلیمان اور کیرج کے علاقے فتح کر چکے تھے لیکن ولید کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبد الملک کے دور میں محمد بن قاسم کو واپس عراق بلا لیا گیا۔

محمد بن قاسم نے اپنے ساڑھے تین سالہ دور حکومت میں سندھ کے وسیع و عریض علاقے کا بہت اچھا انتظام کیا۔ سندھ سے مراد اس دور میں مکران اور گجرات تک اور مالوہ سے ملتان تک کا علاقہ تھا۔ محمد بن قاسم نے مالیات کی تحصیل کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا، کسانوں کو سہولتیں دیں، انصاف کے حصول کے لیے تمام شہروں میں قاضی مقرر کیے، ہر علاقے میں مساجد تعمیر ہوئیں جو علوم کے مراکز کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ منصورہ، ملتان اور دیگر شہروں بھی مدارس قائم ہوئے۔

ادھر یورپ میں اندلس کی مملکت میں جہاں صدیوں سے گاتھ خاندان حکمران تھا۔ تہذیبی انحطاط عروج پر تھا۔ ایک یونانی سردار کاؤنٹ جولین نے جو گاتھ خاندان سے ناراض تھا، مسلمانوں کو اندلس پر حملے کی دعوت دی۔ اندلس کا ایک سرانجامی افریقا سے بہت قریب واقع ہے۔ شمالی افریقا میں موسیٰ بن نصیر حاکم تھے۔

کاؤنٹ جولین کی دعوت ملنے پر موسیٰ بن نصیر نے ولید بن عبد الملک کو خط لکھ کر ان سے اندلس پر حملے کی اجازت مانگی۔ ولید بن عبد الملک نے اجازت دینے میں تامل کیا اور جواب میں لکھا کہ کسی تجربہ کے بغیر مسلمان فوج کو سمندر کے خطرات میں الجھنا درست نہیں ہے۔ پہلے وہاں کے حالات معلوم کریں۔ اس کے جواب میں موسیٰ نے اطلاع دی کہ یہ سمندر نہیں بلکہ معمولی آبنا ہے اور دوسرے کنارے کی چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ اس پر ولید نے حملے کی اجازت دے دی۔

موسیٰ نے 91ھ (710ء) میں پہلے اپنے ایک غلام طریف بن مالک کو مختصر فوجی جمعیت دے کر اندلس بھیجا تا کہ صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکے۔ طریف نے بعض ساحلی شہروں پر کامیاب حملے کیے اور لوٹ آئے۔ اس کے بعد موسیٰ نے اپنے غلام طارق بن زیاد کو 92ھ (711ء) میں سات ہزار سپاہی دے کر اندلس روانہ کر دیا۔ 5 رجب 92ھ (28 اپریل 711ء) کو طارق اندلس کے ساحل پر اترے اور ایک پہاڑ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ پہاڑ جبل الطارق، یعنی ”طارق کا پہاڑ“ کہلایا۔

اندلس کا شہنشاہ راڈرک (لڑیق) ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج لے کر آ گیا۔ طارق نے موسیٰ سے کمک مانگی۔ انہوں نے پانچ ہزار

سپاہی مزید بھیج دیے۔ وادی لکہ یا وادی بکہ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں زبردست جنگ ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح میں عطا فرمائی۔ اس کے بعد طارق نے شذونہ، حصن المدور، قرمونہ اور استجہ کو فتح کیا۔ پھر قرطبہ کی مہم پر ولید نے ایک تجربہ کار غلام مغیث رومی کو فوج دے کر بھیجا۔ مغیث نے قرطبہ پر قبضہ کر لیا۔

ایک فوج تدبیر بھیجی گئی جس نے تدبیر کو فتح کیا۔ دارالحکومت طلیطلہ پر طارق نے خود حملہ کیا لیکن کسی خونریزی کے بغیر یہ شہر فتح ہو گیا۔ موسیٰ بن نصیر نے قرمونہ، اشبیلیہ اور بطیموس کو تسخیر کیا۔ پھر طلیطلہ سے سرقوسہ تک کا علاقہ زیر نگین آ گیا۔ اس کے بعد مسلمان فوج شمالی اندلس میں پھیل گئی اور ساحلی شہر برشلونہ (بارسلونا) کو فتح کرتی ہوئی فرانس کی سرحد دریائے رڈونہ تک جا پہنچی۔ مسلمانوں نے اربونہ، اوینون اور حصن لودون فتح کیے۔ اندلس کی فتوحات سے مسلمانوں کو بے پناہ مال غنیمت حاصل ہوا۔ اس میں سونے، چاندی اور جواہرات کے علاوہ بہت سے نوا اور بھی شامل تھے۔

ولید بن عبد الملک کا دور شاندار تعمیرات کی وجہ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے عہد میں مسجد نبوی کی عمارت میں بڑی توسیع کی گئی۔ 88ھ (707ء) میں ولید بن عبد الملک نے مدینہ کے حاکم کو ہدایت بھیجی کہ مسجد نبوی کی قدیم عمارت کو شہید کر کے اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کروائی جائے۔ مسجد سے متصل جو مکانات ہیں ان کے کینوں کو قیمت ادا کر دی جائے اور ان مکانات اور امہات المؤمنین کے حجروں کا رقبہ بھی مسجد میں شامل کر لیا جائے۔ اس زمانے میں مدینہ کے حاکم مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تھے۔ انہوں نے ہدایت ملتے ہی مسجد نبوی کے آس پاس کے مکانات میں بسنے والوں سے بات چیت کی۔ سروردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں توسیع ہونی تھی، لوگوں نے خوشی خوشی اپنے مکانات حاضر کر دیے۔ انہیں ان مکانات کا معقول معاوضہ دیا گیا۔

ولید بن عبد الملک نے بھاری رقوم مدینہ منورہ بھجوانا شروع کر دیں۔ شام اور مصر سے اعلیٰ درجے کے ماہر اسی معمار بلوائے۔ اسی اثنا میں روم کے شہنشاہ کو اطلاع ملی کہ مسلمان اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد از سر نو تعمیر کروانا چاہتے ہیں تو انہوں نے ایک لاکھ مشقال سونا اور چالیس اونٹوں پر لدا ہوا منبت کاری کا سامان (چنگی کاری کے لیے رنگارنگ پتھر) بھیجا۔ سوعدد رومی کاریگر بھی روانہ کیے۔ ان میں سے دس کاریگر ایسے تھے جن کی اجرت ایک لاکھ اسی ہزار دینار ادا کی گئی۔ جب تعمیر کا سامان پہنچ گیا تو مسجد نبوی کی قدیم عمارت کو شہید کرنے کے کام کا آغاز کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ منورہ کے علماء کرام کو بلوایا۔ ان میں قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم بن عبد اللہ، ابوبکر بن عبد الرحمن، عبید اللہ بن عبد اللہ، خارجہ بن زید، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر شامل تھے۔ ان علماء کرام کی موجودگی میں مسجد نبوی کی پرانی عمارت کو شہید کیا گیا، پھر انہی علماء کرام سے نئی عمارت کی بنیاد رکھوائی گئی جس کے بعد نئی عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

ولید کے دور میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ دمشق کے مشرق میں تقریباً ساٹھ میل دور ایک عمارت 'قصر جبل سیس' کے نام سے تعمیر کی گئی۔ اس عمارت کی دیواریں 67 گز طویل تھیں۔ طبریہ کے شمال مغرب میں ایک اور قصر تعمیر ہوا۔ بلقان کے صحرا میں قصر طوبی کے نام سے ایک اور عمارت تعمیر کروائی گئی۔ ولید نے ایک ایوان عام اور حمام کی عمارت بھی بنوائی جو آج کل شرق اردن میں قصیر عمرہ کے نام سے مشہور ہے۔ حمام کا ایک حصہ گرما بہ کہلاتا تھا جس کے فرش کے نیچے آتش دان تھے۔ گرما بہ کی چھت گنبد نما تھی۔ گنبد کو اندر سے آسمان کی شکل دی گئی تھی۔ جس میں مشہور ستاروں کی منڈلیاں دب اکبر، دب اصغر وغیرہ نظر آتی تھیں۔ منیا میں جھیل طبریہ کے کنارے بھی ایک محل بنوایا گیا تھا۔ یہ قصر باہر سے قلعوں کی مانند نظر آتے تھے۔

ولید بن عبد الملک کا دور مملکت کی توسیع و استحکام کے ساتھ ساتھ امن و امان اور خوشحالی کا دور بھی ہے۔ ان کے عہد میں عوامی بھلائی کے اتنے زیادہ کام انجام دیے گئے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے اس وقت تک کسی حکمران نے فلاح عامہ کی اتنی خدمات انجام نہ دی تھیں۔

ولید نے حکمران بننے کے دو برس بعد 88ھ (707ء) میں اپنی پوری مملکت میں سڑکوں کی تعمیر و مرمت کروائی۔ ان پر پیائش کے لیے پتھر (سنگ میل) نصب کیے گئے جن کی مدد سے مسافت کا تعین کیا جاسکتا تھا اور قافلوں کے بھٹکنے کا امکان نہیں رہا تھا۔ انہوں نے تمام راستوں پر کنویں بنوائے نہریں جاری کروائیں۔ مسافروں کو قیام کی سہولت دینے کے لیے جگہ جگہ مسافر خانے تعمیر کروائے۔

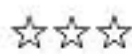
ولید بن عبد الملک سے قبل باقاعدہ شفا خانوں کا قیام عمل میں نہ آیا تھا۔ ولید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے پوری مملکت میں پہلی بار شفا خانوں کا ایک نظام قائم کیا۔ انہوں نے جذامیوں (کوڑھیوں) کو الگ رکھنے کے لیے بھی شفا خانے قائم کیے اور ان کے وظیفے مقرر کر دیے۔ ولید کا ایک اور قابل تحسین اقدام یہ ہے کہ انہوں نے پوری مملکت میں معذور اور اچانچ افراد کے لیے وظیفے مقرر کر دیے۔ معذوروں کے کام انجام دینے کے لیے خادم مہیا کر دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مملکت بھر میں بھیک مانگنے پر پابندی عائد کر دی۔ انہوں نے یتیموں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کے انتظامات بھی کیے۔

ولید بن عبد الملک نے عوام کو ارزاسنرخوں پر اشیائے صرف کی فراہمی کا بھی اہتمام کیا۔ وہ خود بازاروں کے اچانک دورے کرتے تھے اور اشیاء کے دام معلوم کرتے تھے۔ اگر کوئی شے مہنگے داموں فروخت ہو رہی ہوتی تو اس کے خلاف کارروائی کرتے تھے۔ ولید اپنی ذاتی زندگی میں مذہب کے بہت پابند تھے۔ وہ ہر تین دن یا سات دن میں قرآن پاک ختم کرتے تھے۔ انہیں قرآن پاک سے بہت محبت تھی اور وہ قرآن حفظ کرنے پر عطیہ دیا کرتے تھے۔ منگل اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔ رمضان المبارک میں روزہ داروں کے لیے کھانے کا اہتمام کرتے تھے۔

ولید ایک مشفق حکمران تھے۔ لوگوں سے محبت کرتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔ تاہم وہ ایک بیدار مغز انسان تھے اور فیصلوں کے نفاذ میں سخت گیری سے کام لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نرمی سے کوئی فائدہ اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ولید بن عبد الملک کا انتقال 5 جمادی الثانی 96ھ (25 فروری 715ء) کو شام میں دمشق کے نزدیک ایک گاؤں دیرمان میں ہوا۔ ان کی عمر 46 برس تھی۔ انہوں نے 9 سال آٹھ ماہ تک خلافت کے فرائض انجام دیے۔

ولید بن عبد الملک کے دور کی سب سے نمایاں خصوصیت مملکت اسلامیہ کی بے پناہ توسیع ہے۔ لیکن یہ صرف فتوحات نہیں تھیں۔ انہیں ہم ملک گیری کے خواہش مند کسی حکمران کی اندھا دھند کارروائیاں قرار نہیں دے سکتے بلکہ ولید نے جو علاقے فتح کیے ان علاقوں کو نہ صرف سماجی اور اقتصادی لحاظ سے بہتری بخشی بلکہ علمی اعتبار سے بھی انہیں اوج کمال تک پہنچا دیا۔



حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ

امام، فقیہ، مجتہد، حدیث کے ماہر اور معتبر حافظ

اس عورت کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ کفالت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سخت پریشان تھی کہ روزمرہ کے اخراجات کس طرح پورے کرے۔ بالآخر اس نے سربراہ مملکت کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔

طویل سفر طے کر کے وہ سربراہ مملکت کے شہر پہنچی، سربراہ مملکت کا مکان تلاش کیا۔ اسے توقع تھی کہ بہت عالیشان محل ہوگا جہاں دروازے پر دربان مقرر ہوں گے لیکن اس کی توقع کے برعکس اس معمولی سے مکان پر کوئی دربان نہیں تھا، وہ بلا کھٹکے اندر چلی گئی۔ سربراہ مملکت کی اہلیہ سے ملی۔ یہاں بھی اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مکان میں نوکروں کی فوج ظفر موج کہیں نظر نہ آتی تھی۔ سربراہ کی اہلیہ خود ہی بیٹھی روٹی ٹھیک کر رہی تھیں۔ گھر کا ساز و سامان بے حد معمولی تھا، اس عورت کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا، میں اس ویران گھر سے اپنا گھر آباد کرنے آئی تھی۔؟

اسی اثناء میں دروازہ کھلا اور باہر سے ایک شخص اندر آ گیا اس نے گھر کے کنویں میں سے پانی کے ڈول نکال کر ایک طرف پڑی مٹی پر ڈالنا شروع کر دیئے۔ وہ عورت تو ایک طرف ہو گئی لیکن سربراہ مملکت کی اہلیہ وہیں بیٹھی روٹی ٹھیک کرتی رہیں۔ اس عورت نے کہا: ”اس مٹی بنانے والے مزدور سے پردہ تو کر لو یہ تمہاری طرف ہی گھور رہا ہے۔“

سربراہ مملکت کی اہلیہ نے بتایا: ”یہ میرے شوہر اور امیر المومنین ہیں“ یہ اس مملکت اسلامیہ کا سربراہ تھا جو بلا دروم سے دیوار چین تک اور اندلس کے آخر گوشوں سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔

امیر المومنین کام سے فارغ ہوئے نماز ادا کی پھر اہلیہ سے پوچھا: ”یہ عورت کون ہے؟“ جواب ملا ”عراق سے آئی ہے۔ عورت کہنے لگی ”میری پانچ بے کس و بے سہارا لڑکیاں ہیں میں آپ سے حسن شفقت کی تلاش میں آئی ہوں۔“ عورت کا یہ کہنا تھا کہ امیر المومنین ”بے کس و بے سہارا“ کے الفاظ دہرا کر رونے لگے پھر کاغذ قلم لیا اور عراق کے گورنر کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔ عورت سے کہا: ”بڑی لڑکی کا نام بتاؤ“ اس نے نام بتایا۔ امیر المومنین نے بڑی لڑکی کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے کہا ”الحمد للہ“ پھر دوسری، تیسری اور چوتھی لڑکی کا نام دریافت کرتے گئے اور وظیفہ مقرر کرتے گئے عورت ہر وظیفہ پر الحمد للہ کہتی جاتی، چوتھے وظیفے پر خوش ہو کر اس نے امیر المومنین کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔ امیر المومنین نے ہاتھ روک لیا اور فرمایا: ”جب تک تم حمد کے مستحق یعنی اللہ کا شکر یہ ادا کرتی رہی تھیں، ہم وظیفہ لگاتے رہے لیکن اب تم نے میرا شکر یہ ادا کیا تو اس کے بعد کا وظیفہ نفسانیت پر مبنی ہوگا چنانچہ ان چاروں لڑکیوں سے کہنا کہ اپنے وظیفوں میں سے پانچوں لڑکی کو بھی دے دیا کریں۔“

عورت تحریر لے کر خوش خوش عراق جا پہنچی۔ گورنر کو خط پیش کیا تو خط پڑھتے ہی گورنر رونے لگا، اتنا رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی، عورت تعجب سے گورنر کو دیکھتی تھی کہ اس خط میں کون سی ایسی بات ہے جس کو پڑھ کر گورنر پر رقت طاری ہو گئی ہے۔ گورنر نے روتے ہوئے کہا: ”اللہ صاحب خط پر رحم فرمائے۔“ عورت نے بے اختیار پوچھا ”کیا ان کا انتقال ہو گیا؟“ گورنر نے کہا ”ہاں“ عورت یہ سن کر روتے ہوئے واپس جانے لگی تو گورنر نے اسے روک لیا۔ کہنے لگا: ”ٹھہرو، فکر نہ کرو میں کسی بھی معاملے میں ان کی تحریک و نہیں کر سکتا۔“ اور چاروں لڑکیوں کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

عراق کے گورنر نے جس شخصیت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چار لڑکیوں کا وظیفہ مقرر کیا تھا وہ تھے اموی دور کے خلیفہ حضرت عمر بن

عبدالعزیز جن کا دور خلافت اس قدر تابناک اور روشن ہے کہ لوگ آپ کو پانچویں خلیفہ راشد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کا دور خلافت اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اس نے حضرت عمر بن خطابؓ کے دور کی یاد تازہ کر دی چنانچہ آپ کو عمر ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

آپ کا نام عمر اور کنیت ابو حفص ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ اُم عاصم خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کی پوتی ہیں۔ آپ نے ہجرت کے اسیٹھویں سال مدینہ منورہ میں آنکھ کھولی۔ یہ بنو اُمیہ کی خلافت کا زمانہ تھا اسلامی مملکت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ افریقہ اور مغرب کے تمام شہر سندھ کابل اور فرغانہ، روم قسطنطنیہ، قبرص اس مملکت میں شامل تھے گویا اندلس کے آخری گوشوں سے سندھ تک اور بلادِ روم سے چین کی دیواروں تک اسلامی مملکت کا سکہ چل رہا تھا۔

آپ کے والد محترم عبدالعزیز بن مروان اس زمانے میں مصر کے گورنر تھے انہوں نے اہلیہ کو لکھا کہ عمر کو لے کر مصر چلی آؤ۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو آپ کی والدہ اُم عاصم کے چچا تھے کہنے لگے کہ اس بچے کو ہمارے ہاں چھوڑ دو کیونکہ یہ تم میں سب سے زیادہ ہم سے مشابہت رکھتا ہے چنانچہ وہ اکیلی مصر چلی گئیں۔ شوہر نے پوچھا ”عمر کہاں ہے؟“ انہوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ہے عبدالعزیز بہت خوش ہوئے اس طرح مدینہ منورہ میں اس بچے کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا جسے بڑے ہو کر مملکت اسلامی کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔ بلند پایہ محدث حضرت صالح بن کیسان گوان کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ اپنے اتالیق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بعد میں انہوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے حضرت صالحؓ ہی کو زحمت دی۔

آپ نے بچپن ہی میں قرآن پاک حفظ کر لیا، عربی زبان اور شعر و شاعری کی تعلیم حاصل کی۔ علم حدیث مختلف شیوخ سے سیکھا تاہم زیادہ تر حضرت عبداللہ بن عتبہ سے استفادہ کیا۔ بڑے بڑے محدثین نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے علم و فضل کو سراہا ہے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ”وہ بڑے امام، بڑے فقیہ، بڑے مجتہد، حدیث کے بڑے ماہر اور معتبر حافظ تھے۔“ مشہور تابع حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: ”ہم لوگ انہیں تعلیم دینے گئے تھے لیکن کچھ دنوں بعد ہم خود ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔“

آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کے چچا عبدالملک بن مروان نے اپنی لڑکی فاطمہ سے آپ کی شادی کر دی۔ 86ھ میں ولید بن عبدالملک خلیفہ بنے تو انہوں نے ربیع الاول 87ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

ایک بار خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ سفر پر نکلے آپ نے اپنا سامان اور خیمہ پہلے سے نہیں بھجوا یا تھا۔ منزل پر پہنچے تو ہر شخص اپنے اپنے خیمہ میں چلا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کہیں نظر نہ آئے۔ خلیفہ نے تلاش کروایا تو ایک درخت کے نیچے اس حال میں ملے کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ خلیفہ نے بلوا کر دریافت کیا کہ ”ابو حفص“ رونے کی کیا بات ہے!“ جواب ملا: ”رونے کا سبب یہ ہے کہ مجھے قیامت کا دن یاد آ گیا۔ دیکھیے میں نے گھر سے کوئی چیز پہلے سے نہ بھیجی تھی۔ منزل پر پہنچ کر مجھے کچھ نہ ملا، اسی طرح یوم قیامت کے لیے جس نے جو چیز بھیج دی ہوگی اس روز اسے وہی ملے گی۔“

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک 99ھ میں بیمار پڑے تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے بعد عمر بن عبدالعزیزؓ اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بخدا اب میں ایسی نامزدگی کروں گا جس میں شیطان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

خلیفہ سلیمان عبدالملک کے انتقال کے بعد ان کی وصیت پر تمام اہل بنو اُمیہ سے بیعت لی گئی پھر وصیت کا اعلان کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کو خلیفہ بنائے جانے پر کچھ لوگ جزبہ تو ہوئے لیکن کچھ نہ سکے ادھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا حال یہ تھا کہ آپ صدمہ سے نڈھال تھے آپ نے خلافت کی ذمہ داری یوں ہی نہیں اٹھالی۔ پہلے آپ نے اپنی رعایا کی رضامندی لینا ضروری سمجھا۔ آپ نے مسجد میں سب کو طلب کیا اور خطبہ دیا جس میں آپؓ نے فرمایا کہ ”مجھ پر مجھ سے اور عام مسلمانوں سے رائے لیے بغیر خلافت کا بار ڈال دیا گیا ہے۔ اب آپ جس کو پسند کریں اپنا

خلیفہ مقرر کر دیں۔“

سب لوگوں نے بلند آواز سے کہا: ”ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔“

خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کی تجہیز و تکفین اور خلافت کے ابتدائی مرحلے مکمل کر کے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اپنے گھر لوٹے تو تھوڑی دیر آرام کرنا چاہا۔ اسی وقت آپ کے صاحبزادے عبد الملک نے آکر پوچھا: ”آپ ان اموال کی واپسی سے پہلے سونا چاہتے ہیں جن پر خلفائے بنو امیہ نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔“ آپ نے کہا: ”میں رات کو جاگا ہوں نماز ظہر کے بعد یہ کام کر لوں گا۔“ صاحبزادے نے کہا: ”ظہر کے وقت تک آپ کی زندگی کا کون ذمہ دار ہو سکتا ہے؟“ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ پر اس فقرے کا اس قدر اثر ہوا کہ صاحبزادے کو پاس بلا کر گلے سے لگالیا، پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا: ”اللہ کا شکر ہے اس نے مجھ کو ایسی اولاد دی ہے جو مجھ کو دین کے کاموں میں مدد دیتی ہے۔“ اسی وقت منادی کروادی کہ لوگ اپنے اس مال و جائیداد کے بارے میں اپنی شکایتیں پیش کر دیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ اسے زبردستی ہتھ لیا گیا ہے۔

یہ کام بڑا خطرناک اور نازک تھا خود آپ کے پاس بڑی موروثی جاگیر تھی، بعض افراد نے آکر آپ سے کہا کہ اگر آپ نے اپنی جاگیر واپس کر دی تو اولاد کی کفالت کیسے کریں گے؟ آپ نے فرمایا: ”ان کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔“ اس کے بعد آپ نے تمام اہل خاندان کو بلوایا اور ان سے کہا: ”بنی مروان! میرا خیال ہے اُمت کا نصف یاد و تہائی مال تمہارے قبضہ میں ہے۔“

تمام اہل خاندان نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی بات کو بھانپ کر کہا: ”خدا کی قسم جب تک ہمارے سر تن سے جدا نہ ہو جائیں گے اس وقت تک یہ جائیدادیں واپس نہیں ہو سکتیں۔ خدا کی قسم نہ تو ہم اپنے آباؤ اجداد کو کافر بنا سکتے ہیں نہ اپنی اولادوں کو مفلس بنا سکتے ہیں۔“

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے نہایت سختی کے ساتھ فرمایا: ”خدا کی قسم اگر اس حق میں تم میری مدد نہ کرو گے تو میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑ دوں گا۔“

اس کے بعد آپ نے تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور اعلان کیا کہ اموی خلفاء نے جس مال، جاگیر یا جائیداد پر ناجائز قبضہ جمایا ہے وہ ان کے حقداروں کو واپس کی جارہی ہیں اس اعلان کے بعد جاگیروں کی دستاویزات منگوائیں آپ کے ایک ماتحت ان دستاویزات کو نکال کر پڑھتے جاتے تھے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ انہیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے تھے۔ صبح سے لے کر نماز ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے اپنی اور اہل خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی اور اس میں کسی کے ساتھ کسی قسم کی رعایت سے کام نہ لیا نہ آپ کو دوستیاں متاثر کر سکیں نہ قربت داریوں نے مرعوب کیا۔

آپ نے اپنے مختصر سے دور خلافت میں رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے آپ کے خلیفہ بننے سے پہلے نو مسلموں سے بھی جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا آپ نے نو مسلموں سے جزیہ وصول کیے جانے کی ممانعت کر دی اس پر صرف مصر ہی میں اتنے لوگ مسلمان ہو گئے کہ جزیہ کی آمدنی گھٹ گئی اور وہاں کے حاکم نے آپ سے شکایت کی کہ آمدنی کم ہونے کی وجہ سے مجھے قرض لے کر مسلمانوں کے وظیفے ادا کرنے پڑ رہے ہیں۔ آپ نے جواب میں لکھا: ”جزیہ بہر حال ختم کر دو حضور ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے محصل بنا کر نہیں۔“

ملک میں جتنے معذور مجبور تھے ان کی فہرست تیار کروا کے ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ شیر خوار بچوں کے وظیفے مقرر کیے۔ اگرچہ آپ نے نو مسلموں پر جزیہ معاف کر دیا تھا جس سے آمدنی گھٹ گئی اور سرکاری خزانے سے حاجت مندوں کے وظائف مقرر کیے لیکن ناجائز آمدنیوں کی روک تھام ظلم کے سد باب اور مال کی دیانت دارانہ تقسیم کے نتیجے میں صرف ایک سال بعد یہ نوبت آگئی تھی کہ لوگ صدقہ لے کر آتے تھے اور صدقہ لینے والے نہ ملتے تھے۔ بیت المال کی آمدنی کم ہونے کی بجائے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

آپ نے ذمیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ ذمی ان غیر مسلم افراد کو کہتے ہیں جو اسلامی مملکت میں رہتے ہیں اسلامی حکومت کو جزیہ

ادا کرتے ہیں اور حکومت ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے آپ نے ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر قرار دی۔ تمام حکام کے نام آپ نے فرمان جاری کیا کہ ”نماز کے وقت ہر کام اور کاروبار چھوڑ دیا کرو جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے فرائض کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔“

آپ نے اپنے دور میں علم کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی آپ نے حکام کو ہدایت کی کہ مساجد میں علم کو عام کیا جائے جو علماء کرام علم کی تدریس و اشاعت میں مشغول تھے انہیں فکر معاش سے بے نیاز کر دیا۔ ان کے لیے بیت المال سے بھاری وظیفے مقرر کر دیے۔ مختلف ملکوں میں دین کا علم پھیلانے کے لیے علماء بھیجے۔ اسلامی مملک کے زیر نگین آنے والے تمام ممالک میں واعظ اور مفتی مقرر کیے۔

آپ کا سب سے بڑا تعلیمی کارنامہ احادیث نبویؐ کی حفاظت اور اشاعت ہے۔ آپ نے جب یہ دیکھا کہ حدیثوں کے حافظ دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں تو آپ نے مدینہ کے گورنر قاضی ابوبکر بن حزم کو ہدایت کی کہ احادیث نبویؐ تلاش کرو اور تحقیق سے ان کے مستند ہونے کے بارے میں اطمینان کر کے انہیں لکھ لو۔ احتیاط رہے کہ صرف مستند احادیث قبول کی جائیں اسی قسم کا حکمنامہ تمام صوبوں کے گورنروں کے نام بھیجا نتیجہ یہ نکلا کہ صحیح احادیث کا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدا ترسی، بلند پایہ سیرت اور دیانتدارانہ حسن انتظام کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ پورے معاشرے پر اسلام کا رنگ غالب آ گیا پانچویں خلیفہ راشد نے سلام کے پیغام کو دنیا میں عام کرنے کی جانب بھی بھرپور توجہ دی کہ دراصل امت مسلمہ کا اصل کام ہی یہی ہے۔ آپ نے فوجی افسروں کو ہدایت کر دی کہ رومیوں کی کسی جماعت سے اس وقت تک جنگ نہ کریں جب تک اسے اسلام کی دعوت نہ دے لیں اس طرح والی خراسان جراح بن عبداللہ حکمی کی تبلیغ سے ان کے ہاتھ پر چار ہزار ذمی مسلمان ہو گئے۔ والی مغرب اسمعیل بن عبداللہ کی تبلیغ سے سارے شمالی افریقہ میں اسلام پھیل گیا۔

آپ نے سندھ کے حکمرانوں اور زمینداروں کو اسلام کی دعوت دی اکثر نے اسلام قبول کر لیا ان کی جائیدادیں اور زمینیں ان ہی کے قبضہ میں رہنے دی گئیں۔ راجہ داہر کا لڑکا بے سنگھ بھی انہی میں تھا۔ آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر بعض ملکوں نے وفد بھیج کر اپنے ہاں اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے علماء بھیجنے کی درخواست کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی شخصیت میں ہمیں ایک بے حد متقی، پرہیزگار، دانا اور کمال کا منتظم نظر آتا ہے جس کے پورے جسم پر خشیت الہی غالب ہے اور جس کا دل فکر آخرت سے ہر لمحہ معمور ہے۔ آپ کا ایک ایک عمل اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس آپ پر ہر لمحہ طاری تھا۔

روزانہ نماز عشاء کے بعد تنہائی میں بیٹھ جاتے اور رورور دعائیں کیا کرتے۔ جب لوگ اس بارے میں کچھ کہتے تو فرماتے ”تم لوگ رونے پر مجھے ملامت نہ کیا کرو اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلے عمر پکڑا جائے گا۔“

بیت المال کی جانب سے فقراء اور مساکین کے لیے جو مہمان خانہ تھا اس کے باورچی خانے سے اپنے لیے پانی تک گرم نہ کرواتے تھے ایک بار آپ کی لاعلمی میں خادم ایک ماہ تک اسی باورچی خانے سے پانی گرم کرتا رہا آپ کے علم میں یہ بات آئی تو جتنی لکڑی خرچ ہوئی تھی اتنی ہی لکڑی خرید کر باورچی خانے میں رکھوا دی۔

ایک بار بیت المال سے بہت سے سیب آئے آپ انہیں عام مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ کا چھوٹا بچہ ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ آپ نے اس کے منہ سے سیب چھین لیا بچہ سیب چھین جانے پر روتا ہوا ماں کے پاس چلا گیا۔ ماں نے بازار سے سیب منگوا کر دے دیا۔ آپ گھر آئے تو سیب کی خوشبو آئی پوچھا ”سرکاری سیب یہاں تو نہیں آیا؟“ اہلیہ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا: ”خدا کی قسم میں نے اس کے منہ

سے سبب نہیں چھینا تھا بلکہ اپنے دل سے چھیننا تھا لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا کہ مسلمانوں کے حصہ کے سبب کے بدلے خود کو اللہ کے حضور برباد کر لوں۔“

رجب 101ھ میں بیمار پڑے اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ آپ کی علالت طبعی تھی دوسرے یہ کہ بنو امیہ نے آپ کے ایک خادم کو ایک ہزار اشرفیاں دے کر آپ کو زہر دلوادیا تھا آپ کو علالت کے دوران ہی اس کا علم ہو گیا تھا لیکن آپ نے غلام سے کوئی انتقام نہ لیا بلکہ اشرفیاں اس سے لے کر بیت المال میں داخل کروادیں اور غلام کو آزاد کر دیا۔

طبیعت بہت خراب ہو گئی تو آپ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ یزید بن عبد الملک کے نام وصیت لکھوائی جس میں انہیں تقویٰ کی تلقین کی 25 رجب 101ھ کو آپ نے اپنا سفر حیات مکمل کر لیا اس وقت آپ کی عمر 40 سال تھی آپ کو حلب کے قریب در سمعان میں سپرد خاک کیا گیا۔



اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے آپ دل میں ابتداء ہی سے خشیتِ الہی کا مادہ رکھ دیا تھا۔ شاید آپ کے اسی تقویٰ سے متاثر ہو کر خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے آپ کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کیا۔

دستور تھا کہ خلیفہ کے انتقال کے بعد اس کے استعمال شدہ ملبوسات اور عطر اس کے اہل و عیال کا حق سمجھے جاتے تھے اور غیر استعمال شدہ اشیاء آنے والے خلیفہ کے حوالے کر دی جاتی تھیں۔ خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہوا تو اس کے اہل و عیال رات بھر تیل اور خوشبو ایک شیشی سے دوسری میں انڈیلتے رہے اور جو ملبوسات استعمال نہ ہوئے تھے انہیں پہن پہن کر مستعمل کرتے رہے صبح ہوئی تو تمام چیزیں حضرت عمر بن عبد العزیز کے سامنے حاضر کر دیں اور کہنے لگے: ”یہ چیزیں آپ کی ہیں اور یہ ہماری ہیں“ آپ نے پوچھا: ”یہ اور وہ“ کا کیا مطلب ہے؟“ اس کی وضاحت کی گئی تو دو ٹوک لہجے میں فرمایا: ”یہ ساری چیزیں نہ میری ہیں نہ سلیمان کی نہ تمہاری“ غلام سے کہا ”یہ سب چیزیں بیت المال میں پہنچا دو۔“

غضب شدہ اموال اور جاگیریں ان کے اصل مالکان کو واپس دلوانا آپ کا سب سے اہم کارنامہ ہے آپ کے اس جرأت مندانہ فیصلے کے اثرات مختلف ہوئے۔ خارجیوں نے جو ہمیشہ خلفاء کے خلاف بغاوت کرتے رہتے تھے کہہ دیا کہ اب اس شخص سے جنگ ہماری لیے مناسب نہیں لیکن بنو امیہ کے لوگ سخت ناراض ہوئے انہوں نے آپ کے فیصلے کو بدلوانے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ صورت حال دیکھ کر بنو امیہ کے امراء اور وزراء سخت پریشان ہوئے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ دیکھو شاہی سواری ٹھکرادی، زینت و آرائش کی اشیاء ٹھکرادیں اب صرف کنیریں رہ گئی ہیں وہی پیش کر کے دیکھو شاید بات بن جائے چنانچہ ایک سے ایک خوبصورت کنیر آپ کی خدمت میں پیش کی گئی۔

درحقیقت یہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ آپ نے ذاتی عیش و آرام کو تو خیر باد کہہ ہی دیا تھا۔ سارے خاندان بنو امیہ کے قبضہ میں موجود غضب شدہ جاگیریں واپس کروا کے سب کی مخالفت مول لی تھی اور اب آپ کو خوب روکنیریں پیش کر کے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی..... لیکن قدرت یہ چاہتی تھی کہ اس مرد صالح کے ذریعہ اس قوم کو راہِ راست دکھائے جو دنیا کے عیش و آرام اور اس کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر اپنی منزل سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

آپ نے ہر کنیر سے اس کے مالک کا نام پتا پوچھا اور اسے اس کے مالک کے پاس بھجوادیا۔

جب اہل خاندان نے دیکھا کہ آپ کسی طور پر اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہیں ہیں تو انہوں نے آپ کی پھوپھی کو آپ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے آکر کہا: ”تمہارے رشتہ داروں کو شکایت ہے کہ تم نے ان کی روٹی چھین لی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔“

حکمرانی کے خواہش مند شخص کو اقتدار کی کرسی ملی جاتی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی کرسی بچانے کی فکر ہوتی ہے اس غرض سے وہ اپنی رعایا

کے بااثر حلقوں کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا ہے چاہے اس کے لیے اسے ان بااثر حلقوں کو کچھ بے جا مراعات دینی پڑیں لیکن درویش صفت خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ ان باتوں سے بے نیاز تھے۔ آپ نے پھوپھی کی بات سن کر کوئی جواب دینے کی بجائے ایک اشرفی، ایک گوشت کا ٹکڑا اور انگیٹھی منگوائی۔ اشرفی کو آپ نے انگیٹھی میں ڈال دیا جب وہ خوب سرخ ہو گئی تو اسے آپ نے اٹھا کر گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیا جس سے وہ بھیں گیا۔ اب آپ نے اپنی پھوپھی سے فرمایا: ”پھوپھی! آپ اپنے بھتیجے کے لیے اس قسم کے عذاب سے پناہ نہیں مانگتیں؟“

خلیفہ بننے سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی نفاست پسندی کا حال یہ تھا کہ نہایت بیش قیمت لباس زیب تن کرتے تھے اور تھوڑی دیر میں اسے اتار کر دوسرا قیمتی لباس پہن لیتے تھے وہ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس اور جامہ زیب شخص مانے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عیش و عشرت کے دلدادہ اس شخص پر جب بار خلافت ڈالا تو فلک نیلگوں پر طلوع ہونے والے سورج نے رات کی تاریکی میں چمکنے والے چاند ستاروں نے اور ڈالی ڈالی کھلنے والے خوش رنگ پھولوں نے دیکھا کہ اس شخص کی زندگی میں کتنا بڑا تغیر آ گیا ہے۔

عمر ثانیؓ نے خلیفہ بننے ہی گھر کا ایک ایک گنبد بیت المال میں داخل کروایا، خاندان کے تمام وظائف بند کر دیے، شاہی سواری پیش کی گئی تو فرمایا میرے لیے میرا فخر کافی ہے اپنی تمام سواریوں کو فروخت کر کے رقم بیت المال میں داخل کروادی، خلفاء کے ساتھ نقیبوں اور علمبرداروں کے چلنے کا سلسلہ بند کروادیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا دور خلافت صرف دو سال اور پانچ مہینے کی قلیل مدت پر محیط ہے لیکن اس مختصر مدت میں آپ نے حکمت اور جرأت سے بھرپور جو فیصلے کیے ان کی بدولت پوری مملکت اُمیہ کی کایا پلٹ گئی۔ آپ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ سے بہت متاثر تھے خلیفہ بننے کے بعد آپ نے حضرت عمر بن خطابؓ کے پوتے حضرت سالمؓ کو خط لکھا کہ ”میں چاہتا ہوں اگر اللہ مجھے اس کی استطاعت دے تو میں رعایا کے معاملات میں حضرت عمر بن الخطابؓ کی روش اختیار کروں اس لیے آپ میرے پاس ان کی وہ تمام تحریریں اور فیصلے بھیج دیجیے جو انہوں نے مسلمانوں اور ذمیوں کے بارے میں کیے ہیں اللہ کو منظور ہوا تو میں ان کے نقش قدم پر چلوں گا۔“

آپ نے بیت المال کی حفاظت کا نہایت سخت انتظام کیا دفتری اخراجات میں تخفیف کردی۔ ایک صاحب ابو بکر بن حزم نے خلیفہ سلیمان کے زمانے میں کاغذ، قلم، دوات اور روشنائی کے مصارف میں اضافہ کی درخواست کی تھی۔ دفتری کارروائی سے پہلے ہی خلیفہ سلیمان کا انتقال ہو گیا بعد میں اس درخواست کے جواب میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے لکھا ”قلم باریک کر لو اور سطریں قریب قریب لکھا کرو ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لیا کرو میں مسلمانوں کے خزانے سے کوئی ایسی رقم صرف نہیں کرنا چاہتا جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔“

آپ نے جگہ جگہ سرائیں بنوائیں ان میں مسافروں کی ایک دن اور بیمار مسافروں کی دو دنوں میزبانی کا حکم دیا۔ شراب کی دکانوں کو بند کروادیا اور حکم دیا کہ کوئی ذمی مسلمانوں کے شہروں میں شراب نہ لانے پائے اعلان کر دیا گیا کہ ”جو شخص کھلے عام شراب پیتا پایا گیا اسے سخت سزا دی جائے گی اور جو چھپ کر پیے گا اس کو اللہ عذاب دینے والا ہے۔“

☆☆☆☆

شاہ رخ

تیجوری دور کے قابل فخر حکمران جن کا دور علمی اور فنی ترقی کے حوالے سے بڑا تباہناک ہے

کھیل اپنے عروج پر تھا.....!

شترنج کی بساط پر میدان جنگ کا سا سماں تھا۔ ایک فریق کے مہرے پٹ رہے تھے، اس کی فوج مات کھا رہی تھی اور اس کا بادشاہ سخت مشکل میں تھا۔

جو شخصیت جیت رہی تھی، ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے، لیکن ان کی صحت غیر معمولی طور پر اچھی تھی۔ مضبوط جسم، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، چوڑے شانے، سرخ و سفید رنگ اور مرعوب کن چمک لیے ہوئے آنکھیں۔

اچانک ایک خادم نے حاضری کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر اس نے، جیتنے والی شخصیت سے مودبانہ عرض کیا:

”امیر محترم، اللہ نے آپ کو صاحبزادہ عطا کیا ہے۔“

امیر کے چہرے پر مسرت کی شفق پھوٹ پڑی۔ یہ ان کا چوتھا بیٹا تھا۔ پھر انہوں نے شترنج کی بساط پر نظر ڈالی، جہاں ان کا رخ فریق مخالف کے شاہ کومات دے رہا تھا۔ بازی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ امیر تیمور بازی جیت چکے تھے۔

یہ امیر تیمور تھے۔ دلیر، جنگجو اور لائق سالار جو اس وقت تک ترکستان، ماوراء النہر اور موجودہ افغانستان کے بڑے حصے کو فتح کر چکے تھے اور جنہوں نے اس کے بعد ایک بہت وسیع اراضی کو تسخیر کر کے اپنی مملکت قائم کر دی تھی۔ عملی میدان میں بھی فتح ان کے قدم چومتی تھی اور شترنج کی بساط پر بھی جیت ان کا مقدر بنی۔

امیر تیمور کو اپنے بچے کی پیدائش کی خوشخبری چونکہ ایسے وقت ملی جب شترنج کی بساط پر ان کا رخ، فریق مخالف کے شاہ کومات دے رہا تھا، اس لیے اس یادگار موقع کی مناسبت سے نومولد بچے کا نام ”شاہ رخ“ رکھ دیا گیا۔ اسی شاہ رخ نے چالیس برس بعد اپنے والد کی قائم کردہ مملکت کی باگ ڈور سنبھالی اور 43 برسوں تک اپنے علم، تدبیر، فراست اور قابل رشک انتظامی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس مملکت کو اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنادیا اور اسے فلاح و بہبود کی لذت سے ہمکنار کر دیا۔

آج ہم ان ہی شاہ رخ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیں گے۔

شاہ رخ 14 ربیع الآخر 779ھ (20 اگست 1377ء) کو سمرقند میں پیدا ہوئے۔ ابتداء ہی سے انہیں مروجہ علوم و فنون حرب کی تعلیم دی گئی۔ بہت کم سنی میں انہیں پوری مملکت کا انتظام سنبھالنے کا عارضی طور پر موقع ملا۔ انہوں نے کئی جنگی مہموں میں اپنی شجاعت، ذہانت اور دلیری کے جوہر دکھائے اور اپنے تدبیر اور فراست کا لوہا منوایا۔ 796ھ (1393ء) میں انہیں سمرقند اور نواحی علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ تین سال بعد انہیں ایران، شام اور ایشیائے کوچک کی مہمات میں شرکت کے لیے جانا پڑا۔ حلب کے محاصرے کے وقت نہایت نازک مواقع پر فوج کی کمان شاہ رخ کے ہاتھوں میں تھی۔ مملکت کا فرمانروا بننے سے قبل، وہ خاصے عرصے تک پورے خراسان پر حکومت کرتے رہے۔

شاہ رخ کے والد امیر تیمور کی فتوحات کی کثرت اور زبردست انتظامی صلاحیتوں کے تو ان کے مخالفین بھی معترف ہیں۔ انہوں نے ایک

وسیع مملکت قائم کی، جس کا ایک سرا موجودہ بھارت کے صوبہ اتر پردیش میں تھا تو دوسرا سرا موجودہ ترکی کے شہر از میر سے جاملتا تھا۔ ایک جانب ان کی سرحدیں موجودہ چین تک جا پہنچی تھیں تو دوسری جانب مصر تک ان کی مملکت کی حدود پھیلی ہوئی تھیں۔

17 شعبان 807ھ (18 فروری 1405ء) کو امیر تیمور کے انتقال کے بعد ان کی سلطنت ان کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ امیر تیمور کے چار بیٹے تھے۔ جہانگیر، عمر شیخ مرزا، میراں شاہ اور شاہ رخ۔ ان میں جہانگیر اور عمر شیخ مرزا کا انتقال امیر تیمور کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ امیر تیمور نے گوکہ بہت وسیع علاقہ فتح کیا تھا، لیکن ان کی عادت تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں کو مقامی حکمرانوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی)، شام، روس اور برصغیر پاک و ہند کے بہت سے علاقے امیر تیمور نے فتح کرنے کے باوجود اپنی مملکت میں شامل نہ کیے۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد آذربائیجان، عراق اور اس سے متصل علاقے امیر تیمور کے بیٹے میراں شاہ کو مل گئے، خراسان کا علاقہ امیر تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ رخ کو ملا۔ سمرقند اور ماوراء النہر میں امیر تیمور کے پوتے (جہانگیر کے بیٹے) پیر محمد برسر اقتدار آئے، لیکن میراں شاہ کے بیٹے خلیل سلطان نے انہیں ہٹا کر سمرقند پر قبضہ کر لیا۔

شاہ رخ صلح جو طبیعت کے حامل تھے۔ انہوں نے خلیل کو ملک کا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ لیکن جلد ہی امراء کو اندازہ ہوا کہ خلیل سلطان گوکہ علم دوست حکمران ہیں، لیکن ان کے اخراجات میں اعتدال نہیں۔ چنانچہ خلیل سلطان کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا اور خانہ جنگی کی سی صورتحال پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر بعض امراء نے شاہ رخ کو دعوت دی کہ وہ حکومت سنبھال لیں۔ شاہ رخ نے بھی محسوس کیا کہ خانہ جنگی کو روکنا اور مملکت کے شیرازے کو بکھرنے سے بچانا بہت ضروری ہے، اس لیے انہوں نے فوجی مداخلت کر کے پوری مملکت پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ شاہ رخ نے خلیل سلطان سے بہت اچھا سلوک کیا۔ خلیل کا انتقال 814ھ (1411ء) میں ہوا۔

امیر تیمور نے لاہور، دیباپور (ملتان) اور دہلی تک کا علاقہ فتح کیا تھا، لیکن بعد میں انہوں نے لاہور اور دیباپور کی حکومت خضر خان کو دے دی تھی، چنانچہ امیر تیمور کے انتقال کے بعد بھی ان کے جانشینوں نے یہی فرض کیا کہ پنجاب اور دہلی کے علاقوں پر اصل حکمرانی آل تیمور ہی کی ہے۔ شاہ رخ کی مملکت سمرقند سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ماوراء النہر (دریائے جیحون اور جیحون کا درمیانی علاقہ)، موجودہ افغانستان، ایران اور عراق کے علاقے شامل تھے۔

شاہ رخ بڑے علم دوست حکمران تھے۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے بڑے بڑے نامور علماء کرام اور اہل فن، دارالحکومت ہرات میں یکجا ہو گئے تھے۔ ان میں ایک اہم نام حافظ ابرو کا ہے۔ وہ بڑے پائے کے مؤرخ اور جغرافیہ داں تھے۔ ان کا نام عام طور پر خواجه نور الدین لطف اللہ بن عبد اللہ لکھا جاتا ہے لیکن دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق ان کا اصل نام عبد اللہ بن عبد الرشید الخوافی تھا۔ حافظ ابرو ہرات میں پیدا ہوئے۔ وہ امیر تیمور سے بہت قریب تھے۔ امیر تیمور کے انتقال کے بعد وہ شاہ رخ اور ان کے بیٹے بائے سفر کے ایوانوں سے وابستہ رہے۔

شاہ رخ کی فرمائش پر 817ھ (1414ء) میں حافظ ابرو نے جغرافیہ کی ایک بہت اہم کتاب لکھی۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں المغرب سے کرمان اور فارس کے اہم جغرافیائی حالات اور سیاسی تاریخ شامل ہے۔ پہلی جلد کا ایک قلمی نسخہ برطانیہ میں محفوظ ہے۔ دوسری جلد مکمل طور پر دستیاب نہیں ہے، تاہم مؤرخین کے مطابق دوسری جلد میں صرف خراسان والا باب ہی پہلی جلد سے زیادہ ضخیم ہے۔

حافظ ابرو نے شاہ رخ کے حکم پر 820ھ/1417ء میں تاریخ عالم کی اہم ترین کتابوں کو ایک کتاب ”مجموعہ حافظ ابرو“ میں یکجا کر دیا۔ اس کتاب کی تدوین کے لیے انہوں نے تاریخ طبری، رشید الدین کی جامع التواریخ اور نظام الدین الشامی کے ظفر نامہ سے بھرپور مدد لی اور خود بھی اہم تاریخی حقائق قلمبند کیے۔

حافظ ابرو نے 826ھ (1423ء) میں زبدۃ التواریخ کے عنوان سے دنیا کی تاریخ بھی لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کا نام ”مجمع التواریخ السلطانی“ بھی لکھا گیا ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب 830ھ (1427ء) میں مکمل ہوئی۔ اس کی پہلی جلد میں زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ اور

ایران کے شاہان قدیم کے حالات درج ہیں۔ دوسری جلد میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور المختصم تک کے خلفاء کے حالات شامل ہیں۔ یہ پہلی دو جلدیں امپریل اکیڈمی سینٹ پیٹرز برگ میں محفوظ ہیں۔ تیسری جلد میں بعد از خلافت، سلجوقیوں اور منگولوں کے حالات ابوسعید ایلخانی کی وفات تک درج ہیں اور چوتھی جلد دو حصوں میں ہے جس میں پہلی جلد سوانح تیمور پر مشتمل ہے، جبکہ دوسری جلد میں شاہ رخ کے عہد 830ء (1426ء) تک کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسری اور چوتھی جلد کا پہلا حصہ اب ناپید ہے۔ البتہ چوتھی جلد کا دوسرا حصہ کتاب خانہ بوڈلین میں ہے۔ حافظ ابرو کا انتقال 3 شوال 833ء (25 جون 1430ء) کو زنجان میں ہوا۔

شاہ رخ کے عہد میں ان کے قابل بنے الغ بیگ نے بھی علم کی سرپرستی بہت اچھے انداز میں کی۔ انہوں نے سمرقند میں بہت شاندار مدرسہ قائم کیا جو مدرسہ الغ بیگ کہلاتا ہے۔ الغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہترین رصد گاہ بھی قائم کی تھی۔ سمرقند ہیئت کا مرکز تھا۔ یہاں علم ہیئت کے خصوصی کتب خانے بھی تھے۔ اسی دور میں کئی آلات رصد ایجاد کیے گئے اور چار ماہرین نے مل کر زیج الغ بیگ تیار کی۔ (زیج سے مراد ستاروں کی فہرست ہے جس میں ستاروں کے بارے میں تفصیل ہوتی ہے۔)

شاہ رخ کا دور فن تعمیر کے حوالے سے بڑا یادگار ہے۔ ان کے دور میں متعدد ایسی عمارتیں تعمیر ہوئیں جنہیں بجا طور پر فن تعمیر کے شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں سے جن نے عالمگیر شہرت حاصل کی وہ مسجد گوہر شاد، مدرسہ و مصلیٰ ہرات، مدرس خرگود، مسجد شاہ اور مقبرہ شاہ نعمت اللہ شامل ہیں۔ شاہ رخ نے علم و فن کے ماہرین کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ دارالحکومت ہرات میں اس زمانے کے نامور ترین معمار اکٹھے ہو گئے تھے۔ شاہ رخ کی ملکہ گوہر شاد کے ایماء پر 821ھ (1418ء) میں تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد، مشہد (موجودہ ایران) میں امام رضاؑ کے مقبرے کے قریب واقع ہے۔ یہ مسجد، اسلامی فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کا مسقف (چھت دار) دروازہ سمرقندی طرز تعمیر لیے ہوئے ہے اور اسے محراب در محراب بنایا گیا ہے۔ مسجد کے مینار برج نما اور مولے ہیں۔ یہ مینار دروازے کی منڈیر کے بیرونی گوشوں سے ابھرتے ہیں۔

صحن کے چاروں طرف روغنی اینٹوں اور رنگین چینی پتھروں کے ذریعے نہایت نفیس چٹکی کاری کی گئی ہے۔ اس میں گوکہ ہر طرح کے رنگ استعمال کیے گئے ہیں لیکن آسمانی اور فیروزی رنگ غالب ہیں اور پھر سفید، سبز، زرد، زعفرانی سنہری اور چمکیلا سیاہ رنگ مختلف تدریجی کیفیتوں کے ساتھ دکتے نظر آتے ہیں۔

مسجد میں جتنے بھی نقش و نگار بنائے گئے ہیں وہ بے حد واضح اور گہرے ہیں۔ ایوان عبادت کا رنگ بالکل سفید ہے۔ بقیہ تین ایوانوں میں زمین ہلکے سرخ رنگ کی ہے اور اس پر سفید خطوط کے اندر ہلکے فیروزی رنگ میں بڑے بڑے مستطیل کتبے بنے ہوئے ہیں جو کوئی خط میں ہیں۔ اس مسجد کو مشہور معمار قوام الدین شیرازی نے تعمیر کیا تھا۔ مسجد کی آرائش میں رنگوں کے استعمال کا جو سلیقہ جھلکتا ہے وہ بڑا منفرد و ممتاز ہے۔ مسجد کی تعمیر میں بارہ سال کا عرصہ صرف ہوا۔ آج کل یہاں ایک عجائب گھر ہے جس میں شاہ رخ کے دور کے نوادرات بھی رکھی گئے ہیں۔

تیموری فن تعمیر کے اثرات دور دور تک پہنچے۔ مغل اسے اپنے ساتھ لے کر برصغیر پاک و ہند آئے چنانچہ برصغیر کی قدیم مساجد میں ہرات کی مسجد گوہر شاد کی طرح چوڑی محرابیں بنائی گئی ہیں۔ مسجد کی تکمیل کے فوراً بعد ملکہ گوہر شاد نے ہرات میں کئی تعمیرات کی ہدایت کی جن میں ایک بڑا مدرسہ، ایک مسجد اور خود ملکہ کا اپنا مقبرہ شامل ہے۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ہرات میں سب سے خوبصورت جگہ شاہ رخ، گوہر شاد اور مشہور مصور بہزاد کا مقبرہ ہے، یہ تینوں افراد ایک ہی مقبرے میں مدفون ہیں۔ مقبرہ ایک دلکش باغ میں ہے جس میں صنوبر کے سیکڑوں درخت ہیں۔ مقبرے کا گنبد بہت حسین ہے۔ اس پر سیدھی اور نمایاں ابھری ہوئی دھاریاں ہیں، گنبد پر نیلی ٹانگیں ہیں۔ مقبرے کے گنبد کے نیچے چھ قبریں ہیں۔

شاہ رخ کے دور میں کاغذ سازی، خطاطی، صیقل گری (جلا نا اور صاف کرنا)، رنگ سازی، اتاشی اور جلد سازی نے بھی بہت ترقی کی۔ ان تمام فنون کے ماہرین کتب کی تیاری میں مل کر کام کرتے تھے اور کمال کی کتابیں تیار کرتے تھے۔ اس دور کی کتب کی شان و شوکت اور زیبائش کا اندازہ تہران میں محفوظ ”شاہ نامہ“ کے اوراق سے لگایا جاسکتا ہے۔ شاہ رخ کے بیٹے بائے سنغر مرزا جن کا انتقال 847ھ (1443ء) میں ہوا،

اپنے والد کے دور میں وزیر تھے۔ انہوں نے بھی دارالحکومت ہرات میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا۔

انہوں نے استرآباد میں کتب کا اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جہاں مولانا جعفر تبریزی کی نگرانی میں چالیس خطاط کتابوں کی نقلیں تیار کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ بائے سنغر مرزا خود بھی اپنے دور کے مشہور خطاط تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے خطاط جعفر بائے سنغری نے 833ھ (1429-30ء) میں بائے سنغر مرزا کے کتب خانے کے لیے شاہنامہ کی خطاطی مکمل کی۔ جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو کتاب سازی، کا ایک اعلیٰ ترین معیار بن گئی۔ کتاب میں جو خطاطی کی گئی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سنہری خطوط کے درمیان نہایت خوبصورت نقوش تخلیق کیے گئے ہیں۔ متن سے پہلے تین اوراق پر کمال کی آرائش ہے۔ آخر میں بھی زیبائش کی گئی ہے۔ آرائش میں مینا کاری کے رنگوں سے کام لے کر نیلی، سنہری، سبز اور سرخ گل کاری کر کے چین کی عجیب و غریب اشکال دکھائی گئی ہیں۔

اس دور میں کتابوں کی جلدیں بہت اہتمام سے تیار کی جاتی تھیں۔ ان پر عمدہ نقاشی ہوتی تھی۔ متن کے لیے رنگین دبیز کاغذ استعمال ہوتا تھا اور سونے کا برادہ افشاں کی طرح چھڑکا جاتا تھا۔ کتابوں میں بعض مقامات پر فطری مناظر کی عکاسی بھی کی جاتی تھی۔ کتاب کی بیرونی سطح کی آرائش کے لیے دھات کے بڑے سانچے استعمال ہوتے تھے۔ ابھرے ہوئے نقش بھی بنائے جاتے تھے۔ جلد سازی کے اس انداز نے اہل یورپ کو بہت متاثر کیا اور یہ طرز بہت مقبول ہوا۔

شاہ رخ نے تقریباً 43 برس حکومت کی۔ ان کی مملکت اپنے وقت کی نہایت مضبوط حکومت سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے دیگر ممالک کے سربراہوں سے سفارتی تعلقات بھی قائم کیے۔ 821ء (1418ء) میں دہلی کے حکمران خضر خان نے اپنا سفیر شاہ رخ کے پاس روانہ کیا۔ 822ھ (1419ء) میں انہوں نے چین کے بادشاہ کے پاس اپنا سفیر بھیجا۔ 840ھ (1436ء) میں انہوں نے مطلع السعدین (تاریخ کی مشہور کتاب) کے مؤلف عبدالرزاق سمرقندی کو ایک سفارتی وفد کا سربراہ بنا کر دکن (بھارت) بھیجا۔ چین، تیموری خاندان کی بالادستی کو تسلیم کرتا تھا اور خراج دیتا تھا۔ ہندوستان بھی ان کے اقتدار کو رسمی طور پر تسلیم کرتا تھا۔ شاہ رخ کے عثمانی ترکوں، مصر کے حکمرانوں اور تبت کے ساتھ سفارتی تعلقات تھے۔

شاہ رخ بہت نیک دل، سچے مسلمان اور عبادت گزار حکمران تھے۔ ان کی طبیعت میں حلم اور فیاضی بہت زیادہ تھی۔ تمام مؤرخین ان کی سخاوت اور امن پسندی کے معترف ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ شاہ رخ حرص و ہوس سے پاک تھے۔ وہ خود اچھے عالم، فنون لطیفہ کے ماہر اور شاعر تھے۔ ایام بیض (چاند کی 13، 14، اور 15 تاریخیں) اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ ہر جمعہ کی شام قرآن پاک کے حانظوں کو بلوا کر ان سے تلاوت کرواتے تھے۔

شاہ رخ اپنی فطرت کے اعتبار سے نرم دل اور امن پسند انسان تھے، لیکن وہ کمزور یا بزدل حکمران نہ تھے۔ باغیوں کی سرکوبی کا معاملہ ہوا دشمنوں سے ٹکر لینے کا سوال، وہ ہر محاذ پر ہمت و شجاعت کا مظاہرہ کرتے نظر آئے۔

شاہ رخ نے 810ھ (1407ء-1408ء) میں بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے متعدد مہمات روانہ کی تھیں۔ ان میں بلخ اور استرآباد کی مہمات شامل ہیں۔ 812ھ (1409ء) میں بدخشاں میں شاہ بہاء الدین کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ دو سال بعد شاہ رخ کو شیخ نور الدین کی سرکشی کے خاتمے کے لیے ماوراءالنہر جانا پڑا۔ خوارزم کو مطیع بنانے کے لیے بھی مہم بھیجی گئی۔

شاہ رخ کا انتقال صوبہ ”رے“ میں فشاورد کے مقام پر 25 ذوالحجہ 850ھ (13 مارچ 1447ء) کو ہوا۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ الغ بیگ، ابوالفتح، ابراہیم بائے سنغر، سیور غتمش اور محمد جوکی۔ ان میں سے صرف الغ بیگ نے اتنی عمر پائی کہ شاہ رخ کے انتقال کے بعد مملکت کے فرمانروا بن سکے۔

فیروز شاہ تغلق

برصغیر میں تغلق خاندان کے تیسرے فرمانروا جن کا دور فلاح عامہ کے کاموں کے لحاظ سے مثالی ہے

لڑائی کئی دنوں سے جاری تھی۔

ایک فریق شہر کی فصیل کے اندر محصور تھا اور دوسرا فریق شہر کی فصیل کے باہر مورچہ بند تھا۔ روزانہ شہر پر یلغار کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن فصیل مضبوط تھی پھر شہر کے اندر موجود فوج جوانی کا رروائی کر کے حملہ آور کو پیچھے دھکیل دیتی۔

ایک دن فصیل کا برج گر پڑا۔ دراصل برج پہلے ہی کچھ کمزور تھا۔ اس پر محافظوں کی بڑی تعداد چڑھ گئی تھی اتنے سارے آدمیوں کا وزن برج نہ سہار سکا اور گر پڑا۔

موقع بہت اچھا تھا حملہ آور فوج اب بڑی آسانی سے شہر میں داخل ہو سکتی تھی کیونکہ برج کے ٹوٹنے کی وجہ سے بڑا شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ حملہ آور فوج کے بڑے افسران فوراً فوج کے سپہ سالار کے پاس پہنچے اور شہر پر بھرپور حملے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے میدان جنگ کی تازہ ترین صورت حال اور شہر میں داخل ہونے کے لیے موزوں ترین موقع سے بھی سپہ سالار کو آگاہ کیا۔

سپہ سالار تمام صورت حال سے باخبر تھے۔ وہ چاہتے تو اسی وقت حملے کا حکم دے سکتے تھے لیکن انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ”ذرا ٹھہر جاؤ۔ اگر ہماری فوج شہر کے اندر اچانک داخل ہوگی تو زیادہ خونریزی ہوگی بھگدڑ مچے گی خواتین کی بے پردگی ہوگی شہریوں کو پریشانی ہوگی۔“ افسران یہ بات سن کر لوٹ گئے۔

چند ہی دن بعد شہر میں اناج کے ذخائر ختم ہو گئے محاصرہ سخت تھا باہر سے رسد آنہ سکتی تھی شہر میں محصور فوج کے سالار نے اطاعت کا پیغام بھیج دیا۔ چند شرائط پر اطاعت کا یہ پیغام منظور کر لیا گیا۔

فصیل شہر کے دروازے کھل چکے تھے۔ کسی بڑی خونریزی کے بغیر شہر فتح ہو چکا تھا اور سرکش حکمران نے اطاعت اختیار کر لی تھی۔ یہ حملہ آور فوج کے نیک دل اور دوراندیش سپہ سالار تھے، برصغیر پاک و ہند میں تغلق خاندان کے تیسرے فرمانروا فیروز شاہ تغلق۔ جنہوں نے اکدالہ (بنگال) کے محاصرے کے دوران اکدالہ اور اس کے شہریوں کو خونریزی اور تباہی سے بچا لیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا چالیس سالہ عہد حکومت فلاح عامہ کے کاموں کے لحاظ سے بڑا مثالی دور ہے۔

فیروز شاہ تغلق 709ھ (1309ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رجب تھا۔ رجب برصغیر میں تغلق خاندان کے پہلے فرمانروا غیاث الدین تغلق کے بھائی تھے۔

فیروز شاہ کی عمر سات برس کی ہوئی تو ان کے والد انتقال کر گئے۔ غیاث الدین تغلق نے انہیں اپنے بیٹے کی طرح پالا انہیں اچھی تعلیم دلوائی اور امور مملکت کے سچے ختم سے انہیں آگاہ کیا۔ جب غیاث الدین تغلق برصغیر کے حکمران بنے تو فیروز شاہ کی عمر 14 برس تھی۔ غیاث الدین تغلق نے کئی برس تک مختلف علاقوں کے دوروں میں فیروز شاہ کو اپنے ساتھ رکھا۔ غیاث الدین تغلق کے انتقال پر ان کے صاحب زادے محمد تغلق برسر اقتدار آئے۔ اس وقت فیروز شاہ 18 برس کے تھے۔ محمد تغلق نے فیروز شاہ کو امیر نائب مقرر کیا۔ نائب باربک کا خطاب دیا۔ بارہ ہزار سواروں کا

افسر بنایا۔ محمد تغلق کو فیروز شاہ سے بہت محبت تھی اور وہ انہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ محمد تغلق نے جب اپنی مملکت کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو ایک چوتھائی حصے کا انتظام فیروز شاہ کے حوالے کر دیا۔

21 محرم 752ھ (20 مارچ 1351ء) کو محمد تغلق ٹھنڈے کی مہم کے دوران میں بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد شورشیں ہونے لگیں۔ امراء نے اتفاق رائے سے فیروز شاہ کو ملک کا فرمانروا بنادیا۔ فیروز شاہ حکمران بننے کے خواہش مند نہ تھے۔ وہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن امراء کے مسلسل اصرار کے آگے وہ بے بس ہو گئے۔ 24 محرم 752ھ (23 مارچ 1351ء) کو فیروز شاہ نے مملکت کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

فیروز شاہ کی طبیعت میں سخت گیری کا عنصر نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں حکومت قدرے سٹ گئی اور دکن کے علاقوں میں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں، تاہم انہوں نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔

752ھ (1351ء) میں فیروز شاہ کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد منگولوں نے دریائے سندھ کے کنارے فوج کشی کی۔ فیروز شاہ کی ہدایت پر منگولوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ منگول پسپا ہو کر اپنے ملک واپس چلے گئے۔

فیروز شاہ کے ابتدائی دور حکومت میں لکھنوتی (بنگال) کے حاکم الیاس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ترہٹ پر فوج کشی کی اور رعایا کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ فیروز شاہ نے فوجی تیاری کی۔ 10 شوال 754ھ (8 نومبر 1353ء) کو وہ فوج لے کر لکھنوتی کی سمت روانہ ہو گئے۔ زبردست لڑائی ہوئی اس کے بعد الیاس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

760ھ (1359ء) میں الیاس نے پھر سرکشی کی اور لکھنوتی کے پورے علاقے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ فیروز شاہ پھر 80 ہزار کی فوج لے کر لکھنوتی روانہ ہوئے۔ اس دوران میں الیاس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا سکندر حکمران بن گیا۔ سکندر نے صلح کر لی۔

فیروز شاہ تغلق نے علم کی سرپرستی کے لیے اہم اقدامات کیے وہ برصغیر کے حکمرانوں میں غالباً پہلے حکمران ہیں جنہوں نے صنعت و حرفت کی تعلیم کا مستقل نظام قائم کیا۔ اس کام کا آغاز اس طرح ہوا کہ انہوں نے منتخب غلاموں کو طلب کیا۔ ایک لاکھ اسی ہزار غلاموں کا انتخاب کیا گیا۔ مختلف شہروں میں ان کے قیام کے انتظامات کیے گئے اور پھر انہیں ان شہروں میں بھیج دیا گیا۔ مختلف غلاموں کو مختلف ذمہ داریاں دی گئیں۔ بعض نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دینی علوم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ کسی نے کسی خاص فن یا ہنر میں مہارت پیدا کر لی۔ رفتہ رفتہ غلاموں کی تربیت کا خاص محکمہ قائم ہو گیا۔ اس محکمے نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ یہ تربیت یافتہ افراد مہیا کرنے کا ادارہ بن گیا۔ حکومت کی اہم ذمہ داریوں کو انجام دینے کی غرض سے قابل افراد اسی محکمہ کی جانب سے فراہم کیے جاتے تھے۔

752ھ (1351ء) میں فیروز شاہ تغلق نے فیروز آباد شہر میں مدرسہ فیروز شاہی قائم کیا۔ یہ ایک بہترین مدرسہ تھا۔ اس کی عمارت بھی بہت خوبصورت تھی۔ 776ھ (1374ء) میں فیروز شاہ تغلق نے اپنے بیٹے فتح خان کی خدمات پر اس کے مقبرے کے ساتھ ایصال ثواب کے طور پر ایک مدرسہ قائم کیا۔

مدرسہ فیروز شاہی میں دو بڑے علماء تعلیم دیتے تھے۔ ایک مولانا جلال الدین رومی (یہ وہ مولانا روم نہیں جن کی مثنویاں مشہور ہیں) جو تفسیر، حدیث اور فقہ کے جید عالم تھے۔ دوسرے ایک سمرقندی فاضل تھے۔ یہ مدرسہ وسیع دارالعلوم تھا۔ مدرسہ فیروز شاہی کی عمارت فیروز شاہ تغلق نے اپنے پیشرو حکمران علاء الدین خلجی کے بنوائے ہوئے تالاب کے بند پر تعمیر کروائی تھی۔ یہ عمارت ایک وسیع میدان میں اونچے اونچے ستونوں پر قائم تھی اور اس کے کئی گنبد تھے۔

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں علماء اور مشائخ کی تنخواہوں اور وظائف پر ماہانہ 36 لاکھ تنکے (اس دور کا سکہ) خرچ کیے جاتے تھے۔ ان

کے دور میں متعدد مدرسے قائم کیے گئے۔ ”جامع التواریخ“ کے مطابق ان مدرسوں کی تعداد چالیس اور ماثر رحیمی کے مطابق پچاس ہے۔ فیروز شاہ نے قدیم مدارس کی عمارتوں کی مرمت بھی کروائی مثلاً التتمش کے مدرسے کو اپنی اصلی حالت کے مطابق دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

دہلی میں فیروز شاہ تغلق نے ایک اور عمارت بالا بند سیری کے نام سے تعمیر کروائی تھی۔ یہاں بھی ایک عظیم درس گاہ قائم کی گئی۔ ایک بڑے عالم مولانا نجم الملت والدین سمرقندی یہاں تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ یہ درس گاہ اقامت گاہ بھی تھی۔

فیروز شاہ خود بھی صاحب علم شخصیت تھے۔ وہ ایک قابل فقیہ، علم الابدان کے ماہر اور کامیاب طبیب تھے۔ انہوں نے طب پر ایک کتاب ”طب فیروز شاہی“ کے نام سے لکھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی سوانح عمری ”فتوحات فیروز شاہی“ کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب کی عبارت کو پہلے جامع مسجد کے ایک مینار پر کندہ کر دیا گیا تھا، بعد میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ کر لیا گیا۔ فیروز شاہ کو علم ہیئت سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک رصد گاہ تعمیر کروائی، رصدی آلات میں اصلاح کی اور نئی زینج (ستاروں کی فہرست) مرتب کروائی۔ انہوں نے علم ہیئت پر تحقیق کی غرض سے بعض ماہرین کو بیرون ملک سے بلوایا۔ ان کے حکم پر حکیم حسن گیلانی، سید محمد گازیرونی اور چند دیگر علماء ہیئت کے علم پر تحقیق میں مصروف ہوئے لیکن حکیم حسن کے انتقال اور چند دیگر وجوہ کی بنا پر یہ کام جاری نہ رہ سکا۔

اسی دور میں ایک کتاب سیرت فیروز شاہی کے نام سے 772ھ (1370ء) میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں فیروز شاہ کے عہد کی تاریخ کے ساتھ ساتھ فیروز شاہ کے کردار ان کی اصلاحات اور تعمیراتی سرگرمیوں پر بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب ”فقه فیروز شاہی“ کے عنوان سے مرتب ہوئی۔ یہ قوانین کا خلاصہ ہے جسے یعقوب کرامی نے مرتب کیا اور فیروز شاہ کی نگرانی میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ اس میں انتظامی اور دیگر اہم مسائل پر شرعی نقطہ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی زمانے میں طبیعیات کی ایک کتاب بھی لکھی گئی جس کا نام ”کتاب فیروز شاہی“ رکھا گیا۔ مشہور مؤرخین شمس سراج عقیف اور ضیاء الدین برنی، فیروز شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ فیروز شاہ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اسی دور میں ”تاریخ فیروز شاہی“ لکھی گئی۔

فیروز شاہ تغلق نے تراجم کا ایک باقاعدہ شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کی ہدایت پر ہندی اور سنسکرت کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ ایک شاعر عزالدین خالد خانی نے فلسفہ نجوم اور الہیات پر ایک کتاب کا ترجمہ کیا جس کا نام ”دلائل فیروز شاہی“ رکھا گیا۔ فیروز شاہ کی فرمائش پر سنسکرت میں علم نجوم پر لکھی گئی ایک اور کتاب ”پرہم سمستھیا“ کا فارسی میں ترجمہ شمس سراج عقیف نے کیا۔ جب فیروز شاہ نگر کوٹ گئے تو انہوں نے وہاں سیکڑوں کتابیں دیکھیں۔ انہوں نے برہمنوں کو حکم دیا کہ ان کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ فیروز شاہ کے عہد کے بڑے شعراء کرام امیر خسرو کے صاحب زادے ملک احمد نمایاں ہیں جو بہت اچھے نقاد بھی تھے۔ مولانا مظہر کڑہ اور قاضی عابد بھی اچھے شاعر تھے۔

اسی دور میں ایک گھڑی ایجاد کی گئی۔ اس گھڑی سے ہر گھنٹہ مکمل ہونے پر ایک آواز سنائی دیتی تھی جو ترنم کے ساتھ ایک شعر پڑھتی تھی شعر کا ترجمہ یہ ہے:

”بادشاہ کے دروازے پر ہر گھنٹے جو گھڑیاں بجاتے ہیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ ختم ہو گیا۔“

فیروز شاہ ہی کے زمانے میں ایک اور گھڑی ایجاد کی گئی جو نماز کے اوقات، روزہ کھولنے کا وقت اور بعض دیگر اوقات کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس گھڑی کو فیروز آباد میں نصب کیا گیا۔ یہ گھڑی بہت مشہور ہوئی، فیروز شاہ نے کئی نئے شہر آباد کیے اور پرانے شہروں کو نئی آب و تاب دی۔ 755ھ (1354ء) میں انہوں نے دہلی کے نزدیک دریائے جمنا کے کنارے ایک عظیم شہر ”فیروز آباد“ کے نام سے تعمیر کروایا۔ اس کے علاوہ جوینور، فتح آباد، حصار فیروزہ، بدایوں کے قریب فیروز پور بھی بسائے۔ بنگال کی مہموں کے دوران میں انہوں نے اکدالہ کا نام آزاد پور اور پانڈوکا نام فیروز آباد رکھ دیا۔ انہوں نے نگر کوٹ کا نام محمد تغلق کے نام پر محمد آباد کر دیا تھا۔

فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں کئی ضابطے اور قوانین وضع کیے۔ ان میں سے ایک ضابطے کی رو سے سزائے موت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ ضیاء الدین برنی جو اسی زمانے میں موجود تھے لکھتے ہیں کہ سزائے موت کا قانون منسوخ ہونے کے باوجود امن وامان رہا، لوگ مذہب کی طرف مائل ہوئے اور خوشحالی آئی۔ دوسرے ضابطے کی رو سے خراج پیداوار کی بنیاد پر لینا لازمی کر دیا گیا۔ پہلے اندازے اور قیاس کی بنیاد پر خراج لے لیا جاتا تھا۔ اس طرح کاشتکار کو نقصان ہوتا تھا۔ تیسرے ضابطے کے مطابق تمام عہدوں پر نیک، خدا ترس، رحم دل افراد کا تقرر کیا جانے لگا۔

فیروز شاہ کا دور انتظامی لحاظ سے بہت مستحکم تھا۔ سرکاری امور انجام دینے کے لیے ایک بہت بڑا محکمہ تھا جس کے 36 شعبے تھے جو 'کارخانے' کہلاتے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں۔ 'راتبی' اور 'غیر راتبی' ہر وہ کارخانہ جس کا تعلق گلے سڑنے یا خراب ہونے والی اشیاء سے ہوتا تھا، پہلی قسم یعنی 'راتبی' کے تحت آتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ کارخانے جو اصطبلوں، سگ خانوں اور باورچی خانوں کے لیے خوراک اور چارہ مہیا کرتے تھے، 'راتبی' کہلاتے تھے۔ چراغ اور تیل فراہم کرنے والا کارخانہ جو 'شمع خانہ' کہلاتا تھا، وہ بھی 'راتبی' ہی کے ذیل میں آتا تھا۔ غیر راتبی کارخانوں میں 'کپڑے وردیاں، سامان رہائش، خیمے جیسی اشیاء مہیا کرنے والے کارخانے آتے تھے۔ ہر کارخانے کا امیر 'ملک' یا 'خان' کہلاتا تھا۔ کارخانوں کے حسابات کا الگ شعبہ تھا جس کے نگراں کو 'متصرف' کہا جاتا تھا۔ ہر سال کارخانوں کے منشیوں کو دیوان وزارت طلب کر کے حسابات کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

فیروز شاہ تغلق کا دور فلاح عامہ کے کاموں کے لحاظ سے بڑا یادگار اور لائق صد تحسین ہے۔ انہوں نے اپنے دور میں سو نہریں تعمیر کروائیں۔ جب 756ھ (1355ء) میں وہ دیپالپور (ملتان) کی طرف گئے تو انہوں نے دریائے ستلج سے جھجھر تک 48 کوس طویل نہر نکوائی۔ اگلے برس یعنی 757ھ میں انہوں نے کوہ مندتی اور سرسور کے نواحی علاقے میں سے نہر فیروز آباد تعمیر کروائی اور اس میں سات دیگر شہروں کا پانی شامل کروا کے اسے ہانسی تک پہنچا دیا۔ پھر اسے وہاں سے اراسن تک لے جا کر وہاں حصار فیروزہ کے نام سے ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی۔ فصیل کے اندر ایک محل میں بہت بڑا تالاب بنوایا اور اسے نہر کے پانی سے پر کروا دیا۔ ایک اور نہر دریائے کھکھر (گھاگھرا) سے نکلا کر قلعہ سرستی تک اور پھر نہر سرکھترہ تک پہنچائی۔ ان دونوں نہروں کے درمیان فیروز آباد کے نام سے شہر آباد کیا۔ دریائے جمنا سے ایک اور نہر نکال کر حصار فیروزہ تک پہنچائی اور پھر وہاں سے بھی اسے آگے تک لے گئے۔

فیروز شاہ تغلق نے غیر شرعی رسوم و رواج کو ختم کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے ظروف، تلواروں کی نیام اور ترکش وغیرہ میں سونے کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ قمار بازی بند کروادی۔ عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے فیروز شاہ نے دو کروڑ تنکے کے وہ تمام قرضے معاف کر دیے جو محمد تغلق کے عہد میں جاری کیے گئے تھے۔ عوام کو اطمینان دلانے کے لیے قرضوں کی تمام دستاویزات شاہراہ عام پر جلادی گئیں۔ فیروز شاہ نے تمام غیر اسلامی محصولات کی ممانعت کردی اور صرف قرآن پاک کے احکام کے مطابق چار قسم کے محاصل یعنی عشر، زکوٰۃ، جزیہ اور خمس لینے کی ہدایت کردی۔

تاجروں پر سے محصول اٹھا لیے گئے۔ اس سے آزادانہ تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کے نرخوں میں بڑی کمی ہو گئی۔ فیروز شاہ نے غیر شرعی سزاؤں پر بھی پابندی لگا دی۔ انہوں نے اپنے ماتحت حکام کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر کسی شخص کا راہ چلتے انتقال ہو جائے یا کسی کی لاش کہیں پڑی ملے تو علاقے کے حکام فوری طور پر قاضی کو مطلع کریں اور قاضی معائنے کے بعد اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ ایک صداقت نامہ جاری کرے کہ متوفی کے جسم پر کسی قسم کے زخم یا تشدد کا نشان نہیں تھا۔ اس کے بعد لاش کو اس کے وارثوں تک پہنچایا جائے اور لاوارث ہونے کی صورت میں تدفین کے انتظامات کیے جائیں۔

حکام کو فیروز شاہ کی ہدایت تھی کہ ملک میں جتنے بھی افراد بے روزگار ہیں، ان کی فہرست تیار کی جاتی رہے اور انہیں روزگار فراہم کیا جاتا

رہے۔ فیروز شاہ نے ایک قانون یہ بنایا تھا کہ کسی ملازم کے انتقال کی صورت میں اس کے بیٹے کو کسی طرح کی ملازمت دے دی جاتی تھی۔ اگر اس کا بیٹا نہ ہوتا تو اس کے کسی قریبی رشتہ دار کو ملازمت دی جاتی تھی۔ فیروز شاہ نے بہت سے نادار افراد کی رقوم سے امداد کی تاکہ وہ کاشت کاری شروع کر سکیں۔ انہوں نے گداگری کی حوصلہ شکنی کی اور گداگروں کو ترغیب دی کہ وہ کوئی مفید پیشہ اختیار کر لیں۔

فیروز شاہ تغلق مالی معاملات میں نہایت سخت گیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہدے دار، صوبوں کے حکام کو مالی امور میں راہ راست پر رکھنے کے لیے سختی سے پیش آتے تھے۔

فیروز شاہ کے فلاحی اقدامات کے نتیجے میں رعایا خوشحال ہو گئی۔ اس زمانے میں کوئی عورت ایسی نہ تھی جس کے پاس زیور نہ ہوں۔ ہر گھر سے فارغ البالی کے آثار جھلکنے لگے۔ دہلی کے شیخ الاسلام بہاء الدین کا کہنا تھا کہ انسان کو فکر ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ ان کی کفالت کون کرے گا؟ اس فکر کو فیروز شاہ تغلق نے دور کر دیا۔

فیروز شاہ نے نہری نظام کو بہت ترقی دی اور باغبانی پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے دور میں ہزاروں باغات لگانے کا اہتمام کیا گیا۔ صرف دہلی کے نواح میں میلوں دور تک سیکڑوں باغات کا سلسلہ تھا۔ ان باغات کا محصول ایک لاکھ اسی ہزار تک تھا۔ شاہدہ کے نواح میں اسی باغ اور چتور کے نواح میں چالیس باغ لگائے گئے تھے۔ ان میں صرف انگو ر سات اقسام کے لگتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باغبانی پر خصوصی تحقیق کی گئی تھی اور اس کام میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کی گئی تھی۔

نہری نظام کو ترقی دینے کی بدولت کھیتی باڑی کو بھی فروغ حاصل ہوا اور نئی نئی بستیاں آباد ہونے لگیں۔ صرف گڑگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں 52 نئے گاؤں آباد ہوئے۔ گیہوں، گنا، مسور کی فصلیں بہتر ہو گئیں۔ بہت سے ویران صحرا گلستانوں میں تبدیل ہو گئے۔ فیروز شاہ نے 175 کنویں کھدوائے اور بنجر اراضی پر کاشت کا خصوصی اہتمام کروایا۔ ایسی اراضی کی کاشت سے ہونے والی آمدنی تعلیمی مصارف پر خرچ کی جاتی تھی۔

فیروز شاہ تغلق نے مسافروں کو اچھی سہولتیں فراہم کیں۔ انہوں نے دہلی اور فیروز آباد میں ایک سو بیس خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ اس زمانے میں سرائے یا مہمان خانوں کا کام خانقاہوں سے لیا جاتا تھا۔ یہاں مسافر ٹھہر سکتے تھے۔ ان کے طعام کا بھی بندوبست تھا۔

فیروز شاہ نے نادار لڑکیوں کی شادیاں کروانے کی غرض سے ایک الگ محکمہ قائم کیا۔ ہزاروں ضرورت مند افراد نے اس محکمے میں اپنی بچیوں کے ناموں کا اندراج کروایا۔ محکمے میں دیانت دار افراد کا تقرر کیا گیا تھا جو امداد دینے سے قبل تحقیق کر لیتے تھے۔ اس محکمے کے ذریعہ ہزاروں تنگ دست افراد اپنی بچیوں کی شادیوں کے فریضے سے سبکدوش ہوئے۔

فیروز شاہ نے اپنی مملکت میں پانچ سو شفا خانے (ہسپتال) بھی بنوائے تھے۔ ان شفا خانوں کے مصارف پورے کرنے کی غرض سے بہت سے دیہات وقف کیے گئے تھے۔ اسی دور میں سوعد دہلی بنوائے گئے۔

فیروز شاہ نے 18 رمضان 790ھ (20 ستمبر 1388ء) کو 80 برس کی عمر میں اس دنیا کو خیر باد کہا۔



منصور ذہبی

مراکش کے سعدی خاندان کے سب سے ذہین، ذی علم مستعد اور منتظم حکمران

اہم اجلاس جاری تھا.....!

اس اجلاس کی صدارت خود سربراہ مملکت کر رہے تھے اور اس وقت وہ ممتاز علماء کرام، اپنے خصوصی معاونین، فوجی ماہرین، مشیروں اور وزراء سے ایک اہم مسئلے پر بات چیت کر رہے تھے۔ مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ صحرا کے پار واقع پڑوسی مملکت پر حملہ کیا جائے یا نہیں۔ فوجی ماہرین، مشیروں اور اجلاس میں موجود بیشتر افراد کی رائے یہ تھی کہ یہ حملہ خودکشی کے مترادف ہوگا، کیونکہ صحرا کا سفر بہت پر خطر اور طویل ہے، راستے بھی غیر محفوظ ہیں اور لوٹ مار کے اندیشے اپنی جگہ ہیں۔

بحث طویل ہو گئی، آخر سربراہ مملکت نے مدلل انداز سے اس مہم کے اغراض و مقاصد واضح کیے، صحرا عبور کرنے کے بارے میں ان کے ناسین جن اندیشوں اور تفکرات کا اظہار کر رہے تھے، انہیں، سربراہ مملکت نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ تاجروں کے قافلے بھی صحرا پار کرتے ہیں اور ان تاجروں کے مقابلے میں مہم کا زیادہ خوبی سے انتظام، ہم لوگ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم سے پہلے کسی نے صحرا پار کرنے کی ہمت نہیں کی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعد میں آنے والے ایسی کوئی کوشش نہ کریں۔

اس کے بعد سربراہ مملکت نے اس فوجی مہم کے جائز ہونے کے سلسلے میں علماء کرام سے فتوے لیے۔ جب وہ اس جانب سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے جنگی تیاریوں کا حکم دے دیا۔

یہ سربراہ مملکت تھے مراکش کے سعدی خاندان کے ساتویں حکمران احمد بن محمد المنصور الذہبی، جن کا 25 سالہ دور حکومت مراکش کی ہی نہیں، عالم اسلام کی تاریخ میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ان کے عہد میں چونکہ بلادِ سودان کو تسخیر کیا گیا اور وہاں سے بڑے پیمانے پر سونا حاصل ہونے کی وجہ سے خوشحالی آئی، اس لیے انہیں منصور ذہبی کہتے ہیں (عربی زبان میں 'ذہب' کے معنی 'سونا' ہیں)۔

سعدی خاندان کو حنسی شریفی خاندان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خاندان اس طرح برسرِ اقتدار آیا کہ 667ھ تا 875ھ (1269ء تا 1470ء) مراکش پر خاندان بنومرین کی حکمرانی تھی۔ 875ھ (1470ء) میں بنومرین کی ایک شاخ بنووطاس نے بنومرین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی دور میں مراکش اور اطراف کے علاقوں پر اسپین اور پرتگال نے حملے شروع کر دیے تھے۔ سبتہ، الجدیدہ، صافی، ازموور (بحر اوقیانوس کے ساحل پر مراکش کا شہر) اور اغادیر (مراکش کا ایک شہر جو بحر الکاہل کے ساحل پر واقع ہے) پر، پرتگال کا اور جبل الطارق اور طنجہ پر اسپین کا قبضہ ہو گیا۔ اندلس سے 898ھ (1492ء) میں مسلمانوں کو نکال دیا گیا اور مسیحیوں کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ بنومرین کی حکومت اتنی سمٹ گئی کہ صرف ایک شہر فاس پر انہیں اقتدار حاصل تھا۔ انتشار کا عالم یہ تھا کہ جب مراکش کے باشندے پرتگالیوں سے صلح کی بات کرتے تو طنزیہ لہجے میں جواب ملتا کہ تمہارا رہنما کون ہے، جس سے بات کی جائے.....!

اس سنگین صورتِ حال کے پیش نظر جنوبی مراکش کے علماء کرام اور سرکردہ رہنما اکٹھے ہوئے، انہوں نے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ ضلع درعہ کے ایک صاحب شریف محمد کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ شریف محمد، امام حسن کی اولاد میں سے تھے اور اپنے زہد اور پرہیزگاری کی وجہ سے

بے حد مشہور تھے۔ عوام نے شریف محمد کو لشکر ترتیب دینے کی غرض سے رقم بھی دی۔ اس طرح 917ھ (1511ء) میں مراکش میں حسنی شریفی خاندان کی حکمرانی کی داغ بیل پڑی، جو سعدی خاندان کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

شریف محمد کو مورخوں نے 'ابو عبد اللہ محمد' کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ انہوں نے بعد میں 'القائم' کا لقب اختیار کیا۔ شریف محمد نے اقتدار سنبھالتے ہی کفار کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ جہاد بیس سال تک جاری رہا، اس دوران میں شریف محمد کو پرتگالیوں کے خلاف خاصی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ انکے بعد انکے بڑے لڑکے احمد برسر اقتدار آئے لیکن جلد ہی احمد اور ان کے بھائی محمد الشیخ میں اختلاف ہو گیا۔ محمد الشیخ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ انہوں نے پرتگالیوں سے بعض علاقے واپس لے لیے اور آہستہ آہستہ پورے مراکش پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔

محمد الشیخ کے بعد محمد عبد اللہ الغالب باللہ حکمران بنے۔ ان کے بعد ان کے سب سے بڑے لڑکے محمد کے پاس حکومت آئی جنہیں متوکل باللہ کا لقب ملا۔ انہوں نے صرف دو سال حکومت کی تھی کہ ان کے چچا عبد الملک نے فاس اور مراکش پر قبضہ کر لیا۔ متوکل باللہ نے پرتگال سے جنگی امداد طلب کر لی اور وعدہ کر لیا کہ وہ اس امداد کے بدلے، فتح کے بعد مراکش کا تمام ساحلی علاقہ پرتگال کو دے دیں گے۔ پرتگال نے اس زریں پیشکش سے پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کی باہمی کشاکش کو صلیبی جنگ کی حیثیت دے دی۔ پورا یورپ فوجی امداد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جو مسیحی لشکر اکٹھا ہوا اس میں ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ سپاہی شامل تھے۔ اس میں پرتگال، اسپین، اٹلی اور جرمنی کی نمائندگی تھی۔ اس کے مقابلے پر مسلمانوں کی فوج 40 ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ مسیحی فوج طنجه کے ساحل پر اتری اور پیش قدمی کرتی ہوئی فاس کے قریب آ پہنچی۔ 30 جمادی الاول 986ھ (4 اگست 1578ء) کو قصر الکبیر کے قریب فریقین کا آمناسا منا ہوا اسی لیے یہ جنگ، جنگ الصقر کہلاتی ہے۔ مسلمان بڑی بے جگری اور منصوبہ بندی سے لڑے۔ پانچ گھنٹے میں مسیحی لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ عبد الملک دوران جنگ ہی جاں بحق ہو گئے، شاہ پرتگال کو لڑائی کے دوران ہلاک کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو بہت بڑی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا اور ہزاروں دشمن سپاہی مارے گئے۔

عبد الملک نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی احمد کو مملکت کا آئندہ حکمران مقرر کر دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی احمد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ عبد الملک کے انتقال کے بعد مملکت کا نظم و نسق احمد نے سنبھال لیا۔ یہی احمد، منصور ذہبی کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے 986ھ تا 1012ء (1578ء تا 1603ء) حکومت کی اور سعدی خاندان کے دور حکمرانی میں منصور ذہبی کا زمانہ سب سے زیادہ تابناک ہے۔

احمد بن محمد المنصور الذہبی 956ھ (1549ء) میں سپرد ہوئے۔ انہیں بچپن ہی میں اپنا شہر چھوڑ کر اپنے دو بھائیوں عبد الملک اور عبد المومن کے ساتھ تلمسان (اسے اغادیر بھی کہتے تھے) یہ مراکش کا ایک ساحلی شہر ہے) آنا پڑا، کیونکہ کچھ لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ عبد الملک الجزائر چلے گئے تھے منصور ذہبی بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس دوران میں عبد الملک کو منصور کی شخصیت میں پوشیدہ قابلیتوں کا علم ہوا۔ 982ھ (1574ء) میں عبد الملک اور منصور کے بھائی عبد اللہ کا انتقال ہو گیا، جو مراکش پر حکمران تھے۔ عبد الملک نے اس موقع پر کوشش شروع کی کہ انہیں مراکش میں اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس مل جائیں۔ اس غرض سے انہوں نے عثمانی حکمران مراد سوم سے مدد طلب کی 1574ء میں وہ خود قسطنطنیہ گئے۔

ادھر منصور ذہبی نے مراکش میں کئی امراء اور خصوصاً فاس شہر کی سرکردہ شخصیات سے مذاکرات کیے اور ان کی حمایت حاصل کر لی۔ انہوں نے اپنے بھائی کو بھی مطلع کر دیا۔ 982ھ (1574ء) میں عبد الملک، ایک ترک فوج کے ساتھ مراکش میں داخل ہوئے۔ منصور ذہبی نے مختلف لڑائیوں میں حصہ لیا اور جب مراکش میں حکمران متوکل (عبد اللہ کے بڑے لڑکے) شکست کھا کر بھاگے تو ان کے تعاقب کرنے والوں میں منصور بھی شامل تھے۔ مراکش پر عبد الملک نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی احمد (منصور ذہبی) کے آئندہ سربراہ مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔ منصور ذہبی نے اپنے بھائی کے نائب کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں اور امور مملکت کا تجربہ حاصل کیا۔

منصور ایک اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ مہذب اور صاحب تدبیر حکمران تھے۔ انہوں نے ایسی تمام مشکلات پر بڑی حکمت سے قابو پا لیا جو ہر

نئے حکمران کو پیش آیا کرتی ہیں، مثلاً فوجیوں کی سرکشی، قبائل کشمکش یا عوام کے مطالبات وغیرہ۔ جنگ الصقر میں مسلمانوں کی کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ اس فتح کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی اور پڑوسی ممالک نے منصور ذہبی کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور اپنے سفارتی وفد ان کی خدمت میں بھیجے۔ ان کے پاس آنے والے سفیروں میں الجزائر، پرتگال، ہسپانیہ (اسپین) ترکی، انگلستان اور فرانس کے سفراء شامل تھے۔ کئی سفیر اپنے ساتھ بیش قیمت تحائف بھی لائے۔ عثمانی ترکوں سے منصور کے تعلقات بہت خوشگوار ہو گئے۔

منصور نے جب بلادِ سودان پر فوج کشی کی تجویز اپنے امراء کے سامنے رکھی تو بیشتر امراء اور سرکردہ افسران کی رائے یہ تھی کہ یہ مہم بہت پر خطر ہے۔ اس موقع پر منصور نے اپنے امراء اور ساتھیوں کو پر جوش تقریر کے ذریعہ حوصلہ دلایا۔ آخر 990ھ (1582ء) میں جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ مضبوط اور توانا اونٹ، گھوڑے، خچر جمع کیے جانے لگے، توپیں ڈھالی گئیں توپوں کی گاڑیاں تیار ہوئیں، بڑی مقدار میں گولہ بارود اکٹھا کر لیا گیا۔ کشتیاں بنانے کے لیے فولادی اور چوبی اجزاء جمع کیے گئے۔ پانی ذخیرہ کرنے کے لیے پیپے لائے گئے۔ یہ کشتیاں دریائے ناگمر کے راستے روانہ ہونی تھیں۔

کیم محرم 991ھ (15 جنوری 1583ء) کو سپہ سالار جوڈر پاشا کی قیادت میں فوج نے بلادِ سودان کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ یہ ایک خطرناک مہم تھی کیونکہ صحرا میں سفر بڑا مشکل تھا۔ درعہ کے راستے یہ فوج کسی قسم کی لڑائی کے بغیر 135 دن میں ٹمبکٹو جا پہنچی جو اب مالی کا حصہ ہے۔ صوفائی قبیلے کے حکمران اسحق نے اس فوج کا مقابلہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی، لیکن منصور کی فوج توپوں اور آتشیں اسلحہ سے لیس تھی، مراکشی لشکر نے مختصر عرصے میں پورے سودان پر قبضہ کر لیا۔

سوڈان فتح ہونے کی اطلاع مراکش پہنچی تو ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تین دن تک جشن منایا گیا۔ ادھر جوڈر پاشا نے ٹمبکٹو اور گاؤ کو فتح کر لیا۔ اس طرح مملکت مالی، مراکش کی حکومت کا حصہ بن گئی۔ بلادِ سودان کیا فتح ہوا کہ مراکش کے لیے طلائی دروازے کھل گئے۔ بلادِ سودان میں سونے کی بہت بڑی بڑی کانیں تھیں اتنی بڑی مقدار میں سونا، مراکش آنے لگا کہ صرف اشرفیاں تیار کرنے کے کام پر ایک ہزار چار سو سنار مامور تھے۔ زیورات بنانے والے کاریگر الگ تھے۔ اب صورت یہ تھی کہ مراکش کے سونے کے سکے یورپی مالی منڈیوں میں زبردست قیمت اختیار کر گئے تھے۔

منصور ایک وسیع رقبہ کو مراکش کی اسلامی مملکت کے پرچم تلے متحد کرنے کے خواہش مند تھے۔ اندلس میں مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے خاتمے سے وہ بہت متاثر تھے اور ان کی تمنا تھی کہ اندلس پر ایک بار پھر اسلام کا پرچم لہرانے لگے۔ اس غرض سے انہوں نے 1008ھ (1599ء) میں مصر کے ایک عالم دین کو خط تحریر کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے بتایا تھا کہ وہ جلد ہی اندلس پر فوج کشی کریں گے۔ انہوں نے درخواست کی تھی کہ وہ دعا فرمائیں کہ اسلام کو پھر غلبہ حاصل ہو اور کفار کو شکست ہو اور اندلس کی سرزمین پر اسلام کے نام لیوا پھر حکومت کرنے لگیں، تاہم منصور کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

منصور اپنی مملکت کے امور سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ صوبوں سے آنے والی رپورٹس کا روزانہ مطالعہ کرتے تھے وہ اپنے ماتحتوں کے خطوط کے جواب میں ذرا بھی دیر نہ لگاتے تھے۔ ان کے خیال میں تاخیر نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ منصور نے نظام انصاف کو بھی بہت مستحکم بنا دیا تھا۔ وہ ہر بدھ کو عام عدالت منعقد کرتے تھے جس میں کسی بھی فرد کو اپنا مقدمہ پیش کرنے کی اجازت تھی۔

منصور، ترکی کے عثمانی سلاطین مراد سوم اور محمد سوم، دہلی کے مغل بادشاہ اکبر اور ایران کے سربراہ عباس اول کے ہم عصر تھے۔ انتظامی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ ان مذکورہ حکمرانوں کے برابر تھے۔ انہوں نے مراکش کو خانہ جنگی سے بچایا اور مملکت میں توسیع کی۔

بلادِ سودان کی ممتاز شخصیات کا ذکر احمد بابا کے بغیر ادھورا ہے۔ احمد بابا اس خطے کے بہت قابل احترام فقیہ، عالم اور سوانح نگار ہیں۔ آپ کا پورا نام ابو العباس احمد بن احمد التکروری ہے۔ آپ ٹمبکٹو کے ایک گاؤں آروان میں 21 ذوالحجہ 963ھ (27 اکتوبر 1556ء) کو پیدا ہوئے۔ آپ

کے خاندان کے بہت سے بزرگ قاضی کے منصب پر مامور رہے تھے۔ آپ کا شمار بھی بہت جلد مملکت کے مشہور فقہاء میں ہونے لگا۔

جب مراکش کے سعدی خاندان کے حکمران منصور ذہبی نے بلادِ سودان فتح کر لیا تو احمد بابا نے منصور کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ انہیں ان کے کئی ہم وطنوں کے ساتھ گرفتار کر کے مراکش بھیج دیا گیا۔ منتقلی کے اس عمل میں آپ کی 1600 کتابیں ضائع ہو گئیں جن کا آپ کو بہت افسوس ہوا۔ مراکش میں کچھ عرصے بعد آپ کو قید سے رہائی دے دی گئی اور آپ نیم راکش کی جامع الشرفاء میں حدیث اور فقہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ آپ کو متعدد بار قاضی بھی بنایا گیا۔ 1012ھ (1603ء) میں منصور ذہبی کی وفات کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے پھر وطن واپس آئے۔ 6 شعبان 1036ھ (12 اپریل 1627ء) کو آپ نے انتقال فرمایا۔

احمد بابا نے فقہ مالکی، صرف ونحو اور دیگر موضوعات پر پچاس کے قریب کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم کتاب مالکی فقہاء کا ایک تذکرہ ہے جس کا نام انہوں نے نیل الالبہاج بطریز الدیبا ج رکھا۔ احمد بابا کی یہ کتاب سولہویں صدی عیسویں کے آخر تک مغرب اقصیٰ کے مشہور علماء اور ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس میں اپنے دور کے بڑے مراکشی اولیاء اللہ کے متعلق بھی معلومات موجود ہیں۔ منصور ہر سال عثمانی حکمران کو تحفے ارسال کرتے تھے اور وہاں سے خلعتیں آتی تھیں۔ ہسپانیہ کی جانب سے تو ایک باقاعدہ سفیر، مراکش میں مستقل طور پر رہا کرتا تھا۔ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ سے منصور ذہبی کے بہت اچھے تعلقات تھے، تاہم ملکہ کے انتقال کے بعد جب جیمز اول انگلستان میں تخت نشین ہوئے تو انگلستان اور مراکش کے دوستانہ تعلقات میں کمی آ گئی۔

منصور نے اقتدار سنبھالنے کے بعد پہلی فوجی مہم 989ھ (1581ء) میں توات اور تیکرارین کے نخلستانوں کی سمت بھیجی جو زمانہ دراز سے مراکش کے شریفی خاندان کے حلقہ اثر سے آزاد تھے۔ ان نخلستانوں کو فتح کر لیا گیا۔ یہاں نمک کی کانیں تھیں جن پر منصور کی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ اس فتح سے بلادِ سودان کا راستہ کھل گیا۔ آج کل سوڈان صرف اس حصہ پر مشتمل ایک مملکت ہے جو کسی زمانے میں مشرقی سوڈان یا مصری سوڈان کہلاتا تھا، لیکن منصور ذہبی کے زمانے میں بلادِ سودان سے مراد وہ تمام علاقہ لیا جاتا تھا جہاں آج کل مالی، نائیجر، سینی گال، نائیجیریا اور دیگر چند ممالک واقع ہیں۔

بلادِ سودان میں ان دنوں صونغائی قبیلے کی حکومت تھی جس سے تعلق رکھنے والے حکمران اسکیا (بادشاہ) کہلاتے تھے۔ اس قبیلے کے ایک حکمران اسکیا محمد اول (اسکیائے اعظم) کا دور 897ھ تا 935ھ (1492ء تا 1528ء) بڑا یادگار رہا ہے۔ تاہم جب منصور نے بلادِ سودان پر فوج کشی کی تو صونغائی حکومت زوال پذیر تھی۔ اس وقت وہاں اسحق حکومت کر رہے تھے۔ بلادِ سودان اپنی سونے کی کانوں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ منصور چاہتے تھے کہ یہ دولت حاصل ہو جائے تاکہ ان مسیحی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جاسکے جو مسلمانوں کو اندلس سے نکال رہے تھے اور اب شمالی افریقا یعنی منصور کے زیر انتظام علاقوں پر ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

منصور ایک ذی علم حکمران تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ عربی کے اچھے عالم تھے۔ دائرۃ معارف اسلامیہ کے مطابق منصور ذہبی، عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب اور اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ کیا، یہی وجہ ہے کہ مراکش کے بعض علماء کرام، منصور ذہبی کو دسویں صدی ہجری کا مجدد قرار دیتے ہیں۔

منصور کو کتابوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک بہت شاندار کتب خانہ قائم کر لیا تھا۔ منصور نے خود بھی دو عدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ انہیں خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے ایک لباس بھی ایجاد کیا تھا جو ان کے نام پر 'منصور یہ' کہلاتا تھا۔ منصور کے عہد میں دینی علوم کی تدریس کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ علماء کرام تدریس کے علاوہ تحقیق میں مصروف رہتے تھے اور ان کا خاصا وقت درسی کتابوں کی تشریح اور ان پر حاشیے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔

منصور کے دور کے ممتاز علماء کرام میں القصار اور احمد الفاسی بڑے ممتاز ہیں۔ وہ حدیث کی دو مستند ترین کتابوں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے

حافظ تھے۔ ان کے علاوہ السراج، ابن عاشر اور الزیاتی نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ابوالقاسم الوزیر طب کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے طب کے موضوع پر کتاب المفردات لکھی جو بڑے عرصے تک نصاب تعلیم میں شامل رہی۔ سوانح اور تراجم میں ابن القاضی نے کام کیا۔ اس دور کے بڑے ادیبوں میں عبدالعزیز الفشتالی شعراء کرام میں الوزیر ابن علی، البورالی، ابوالحسن شامی، القاضی الشاطبی اور وزیر الشیطی قابل ذکر ہیں۔

منصور کا زمانہ فارغ البالی اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ متعدد نئے قلعے، محلات اور پل بنوائے۔ خاندان سعدی کے مشاہیر کے مقبرے منصور ذہبی کے دور میں تعمیر ہوئے، ان کے شاندار طرز تعمیر کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں تعمیرات کا فن کتنی ترقی کر چکا تھا۔ اپنے آخری زمانے میں منصور کا ارادہ یہ تھا کہ وہ فاس کے نمونے پر مراکش شہر کی از سر نو تعمیر کروائیں۔ منصور کو عمارتیں بنوانے سے خاصی دلچسپی تھی ان کے دور میں جو سب سے عالی شان اور پر شکوہ عمارت تعمیر ہوئی وہ مراکش کا قصر بدیع تھا۔ اس قصر کو بڑے اہتمام سے تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر کے لیے سنگ مرمر اٹلی سے منگوا یا گیا۔ اس خاص پتھر کو شکر کے مساوی تول کر خریدا جاتا تھا۔ منصور نے اس غرض سے ہزاروں ایکڑ اراضی پر سرکاری انتظام کے تحت گنے کی کاشت کروائی۔ قصر کی تعمیر سترہ برس جاری رہ کر (1011ھ) 1602ء میں مکمل ہوئی۔ منصور نے اس قصر کو تعمیر کے لیے ہسپانیہ اور یورپ تک سے معمار اور کاریگر بلوائے۔ ان کے خاندانوں کی کفالت کا انتظام کیا۔

قصر بدیع پر منصور نے دل کھول کر رقم خرچ کی۔ اس کی عمارت میں فرش سے لے کر گنبد تک سفید اور سیاہ اعلیٰ قسم کا پتھر اور سنگ رخام استعمال کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ سونے سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ قرطبہ کا قصر الزہرہ بھی اس قصر کے آگے پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس قصر کے ہر ایوان میں پانی کی نہریں تعمیر کی گئی تھیں۔ پر تکلف بارہ دریاں بنائی گئی تھیں جن کے گرد دلکش باغیچے تھے ان میں سینکڑوں فوارے لگے ہوئے تھے تاہم فن تعمیرات کا یہ شاہکار صرف ایک سو آٹھ سال تک قائم رہا۔ 1119ھ (1610ء) میں فلالی خاندان سے تعلق رکھنے والے مراکش کے حکمران مولائے اسماعیل نے اس شاندار قصر کو مسمار کروادیا اور اس کے ملبے سے دوسری عمارتیں تعمیر کروادیں۔

منصور کے دور میں زراعت نے بھی بڑی ترقی کی۔ نئی نئی اشیاء کاشت کی گئیں۔ انہوں نے گنے کی کاشت کو بہت فروغ دیا۔ ان کے عہد میں پوری مملکت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چینی بنانے کے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ یہ چینی بڑے پیمانے پر برآمد بھی کی جاتی تھی۔ منصور کے دور میں مراکش کے اچھے تجارتی روابط برطانیہ، فرانس اور دیگر ملکوں سے قائم ہو گئے تھے۔ مراکش سے غلہ برآمد کیا جاتا تھا۔ سوڈان کے علاقے سے سونا، قلمی شورہ، تانبا اور جانوروں کی کھالیں باہر بھیجی جاتی تھیں۔ باہر سے زیادہ تر کپڑا اور تعمیراتی سامان آتا تھا۔ انگلستان کے تاجر تعلقات بڑھانے میں پیش پیش تھے اور مراکش سے ان کی تجارت نے اتنی ترقی کی کہ 992ھ (1585ء) میں باقاعدہ نظام کے تحت ایک ادارہ باربری کمپنی کے نام سے قائم کیا گیا۔

منصور بہت کشادہ دل اور بردبار حکمران تھے۔ غیر مسلموں کے ساتھ ان رویہ رواداری پر مبنی تھا چنانچہ دوسرے ملکوں میں ان کی عالی ظرفی اور فیاضی کے چرچے عام ہو گئے۔ منصور نے اپنی حکومت میں نو مسلموں کو بھی بڑے عہدے دیے۔ منصور نے اپنی نجی تجارت کے انتظامات بھی بعض نو مسلموں کو سونپے تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں تک پیغامات پہنچانے کے فرائض بھی بعض مسیحی نو مسلم انجام دیا کرتے تھے۔

منصور کے چار بیٹے تھے۔ الشیخ، ابوفارس، زیدان اور ابوالحسن، تاہم ابوالحسن جن سے منصور کو بہت محبت تھی 1002ھ (1594ء) میں جاں بحق ہو گئے۔ الشیخ، المامون کے لقب سے زیادہ معروف تھے اور فاس میں نائب سلطنت تھے۔ 987ھ (1579ء) میں منصور نے المامون کو اپنا جانشین نامزد کیا، لیکن بعد میں تنازعات بڑھ گئے اور منصور نے ابوفارس کو جانشین قرار دے دیا مگر 1007ھ (1598ء) میں طاعون کی وبا پھیل گئی اور منصور اس کی لپیٹ میں آ کر 1012ھ (1603ء) میں انتقال کر گئے۔

☆☆☆

مسعود غزنوی

نہایت دلیر اور جرأت آزمایا حکمران جنہوں نے علم کی بھرپور سرپرستی کی

وہ ایک سوداگر تھا۔

کسی دور دراز شہر سے غزنی آیا تھا۔ یہاں اسے مشکلوں نے گھیر لیا تھا۔ اس نے اپنا اسباب تجارت ملک کے حکمران کے بیٹے کے ہاتھ ساتھ ہزار دینار میں فروخت کر دیا تھا لیکن اسے رقم موصول نہیں ہوئی تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور سوداگر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر وہ اٹھا اور مملکت کے حکمران کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ اس نے سربراہ مملکت تک اپنی شکایت پہنچائی، سربراہ مملکت کو شکایت سن کر بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے بیٹے کو پیغام بھجوایا کہ سوداگر کی رقم فوراً واپس کر دو ورنہ قاضی کے سامنے پیش ہو جاؤ۔

سلطان وقت کا یہ حکم جب ان کے بیٹے کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنے خزانچی سے پوچھا کہ تمہارے پاس کتنی رقم ہے۔ اس نے بتایا کہ بیس ہزار دینار ہیں۔ حکمران کے بیٹے نے کہا کہ یہ رقم تو سوداگر کو فوراً دے دو اور تین دن کی مہلت مانگ لو۔

سلطان نے مہلت کی درخواست سنتے ہی کہا کہ ہرگز نہیں، تم جب تک سوداگر کا روپیہ ادا نہ کرو گے، میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ سلطان کے بیٹے میں انکار کی مجال نہ تھی انہوں نے ادھر ادھر سے قرض لے کر اگلی نماز کے وقت تک تمام رقم ساتھ ہزار دینار سوداگر کو ادا کر دیے۔

یہ سلطان تھے، مشہور عالم رہنما محمود غزنوی، جنہوں نے اپنی مملکت میں انصاف کا پرچم سر بلند رکھا اور ان کے بیٹے تھے مسعود غزنوی، جنہوں نے اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں کسی تاخیر یا بہانے سے کام نہ لیا اور ثابت کر دیا کہ انصاف ہر شخص کے لیے یکساں ہے۔ محمود غزنوی کے بعد مسعود غزنوی ہی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ آج ہم انہی کی شخصیت اور کارناموں پر گفتگو کر رہے ہیں۔

مسعود غزنوی، سلطان محمود غزنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے دیگر بھائیوں کے نام محمد اور عبدالرشید ہیں۔ مسعود 388ھ (998ء) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائی محمد سے محض چند گھنٹے بڑے تھے۔ دونوں کی پیدائش ایک ہی دن عمل میں آئی تھی۔ مسعود کی صحت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے بڑے ہو کر اچھا قند کاٹھ نکالا۔ کم عمری ہی سے انہیں ورزش اور زور آزمائی کا شوق تھا۔ ان کی جسمانی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بڑے بڑے بھاری پتھر اکیلے اٹھا لیا کرتے تھے۔ انہیں کشتی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے سخت کوشی کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا۔ اپنی قوت برداشت میں اضافے کے لیے وہ سخت سردی کے موسم میں برف پر ننگے پاؤں چلنے کی مشق کرتے تھے۔

مسعود غزنوی کو شکار کھیلنا بھی بہت پسند تھا۔ بہادر اس قدر تھے کہ شیر سے دو بدو لڑ کر نیزے کی مدد سے اسے ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے تیر اندازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ان کا تیر اتنی قوت سے جاتا تھا کہ اس دور میں استعمال ہونے والے لڑائی کے مضبوط لباس برگستوان کو بھی توڑتا ہوا مخالف کے جسم میں جا گھستا تھا۔ مسعود کے پاس ایک نہایت بھاری گرز تھا جسے وہ محض ایک ہاتھ سے اٹھا لیتے تھے جب کہ دوسرے افراد اس گرز کو دونوں ہاتھوں سے بھی نہیں اٹھا پاتے تھے۔

محمود غزنوی اپنے بیٹے کی جنگجویانہ صلاحیتوں کے معترف تھے اور انہیں مختلف معرکوں میں ساتھ رکھا کرتے تھے۔ 405ھ (1014ء) میں محمود غزنوی، مسعود کو غور کی لڑائی میں اپنے ساتھ لے گئے۔ غور کے قلعے کو فتح کرنے میں مسعود غزنوی کی عمدہ تیراندازہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ محمود غزنوی کی زندگی میں مسعود غزنوی نے غور اور خراسان کی فتوحات میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ 'غور' سے مراد غزنی اور بامیان کے درمیان وسیع پہاڑی علاقہ ہے اور خراسان ایران کے مشرق میں ایک وسیع صوبہ کو کہتے ہیں جس میں دریائے جیحوں کے جنوب اور ہندوکش کے شمال میں واقع علاقہ شامل تھا۔ سیاسی طور پر ماوراء النہر (دریائے جیحوں اور سیحون کا درمیانی علاقہ) اور ہخستان اس میں شامل رہے ہیں۔

406ھ (1015-16ء) میں محمود غزنوی نے مسعود کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ دو برس بعد انہوں نے مسعود کو ہرات کا حاکم بنادیا۔ 411ھ (1020ء) میں مسعود غزنوی نے غور میں ایک جنگی مہم کی قیادت بھی اپنے والد کے حکم سے کی اور غور کا شمال مغربی حصہ فتح کر لیا۔ 420ھ (1029ء) میں رے کا صوبہ فتح کر لیا گیا تو محمود غزنوی نے مسعود کو رے کا بھی حاکم بنادیا۔ مسعود نے رے کے دور افتادہ حصوں کو مطیع کرنے کے بعد اصفہان اور ہمدان کو بھی 421ھ (1030ء) میں فتح کر لیا۔ اس سے قبل ان علاقوں پر آل بویہ کے علاء الدولہ بن کا کو بیہ کی حکمرانی تھی۔ اس کے بعد وہ مزید علاقوں کو تسخیر کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے کہ انہی دنوں ان کو اپنے والد محمود غزنوی کی وفات کی المناک خبر ملی۔

مسعود غزنوی کو اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد سلجوقیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ 421ھ (1030ء) میں مسعود تخت نشین ہوئے اور 422ھ (1031ء) میں سلجوقیوں نے ہرات پر حملہ کر دیا تاہم انہیں فراوہ کے میدان میں شکست اٹھا کر بلخان کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ کچھ عرصے ان کی سرگرمیاں ماند رہیں لیکن 425ھ (1033-34ء) سے انہوں نے خراسان پر باقاعدہ حملے شروع کر دیے۔ شعبان 426ھ (جون 1035ء) میں مسعود غزنوی نے سلجوقیوں کے خلاف اپنے دو سالہ راجہ بکتغر غدی اور حسین علی ابن میکائیل کو روانہ کیا۔ اس لشکر نے سلجوقیوں کو شکست تو دے دی لیکن آخری لمحات میں سلجوقیوں کے ایک تازہ دم دستے نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ اگر مسعود سلجوقیوں کی مخالفت کو ختم کرنے پر توجہ دیتے تو یہ ان کے لیے زیادہ مفید ہوتا لیکن وہ 427ھ (1036ء) میں برصغیر کے خلاف مہم میں مصروف رہے۔ ان کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر سلجوقیوں نے مزید طاقت حاصل کر لی۔ 428ھ (1036-37ء) میں انہوں نے بلخ پر قبضہ کر لیا۔ مسعود انہیں جواب دینے کے لیے پہنچے تو وہ مرو کی طرف ہٹ گئے اور صلح کی درخواست کی لیکن یہ صلح عارضی تھی۔

سلجوقیوں نے اب سرخس، نسا اور باورد (ایبورد) کے باشندوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ مسعود نے بھی جنگی تیاریاں کر لیں۔ سلجوقی اپنے سالار طغرل کی قیادت میں آگے بڑھے۔ دندانقان (مرو سے جنوب مغرب میں واقع شہر) کے مقام پر 8 رمضان 431ھ (23 مئی 1040ء) کو دونوں فوجوں کا آمناسامنا ہوا۔ مسعود بڑی بے جگری سے لڑے لیکن ان کی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ مسعود بڑی مشکل سے غزنی پہنچے۔ خراسان پر سلجوقی تسلط قائم ہو گیا۔

سلجوقیوں کے ہاتھوں اس شکست کے بعد مسعود نے اپنا دار الحکومت غزنی سے لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنا تمام ضروری مال اسباب اور خزانہ اکٹھا کیا اور لشکر کو لاہور کی سمت کوچ کا حکم دیا۔ غالباً ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ لاہور کو اپنا مستقر بنا کر اپنی قوت بحال کر لیں گے اور پھر کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیں گے لیکن بد قسمتی سے مسعود کے اپنے ساتھیوں نے ان سے وفاندہ کی۔ رباط ماری کلمہ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد مسعود کے بعض ماتحتوں نے بغاوت کر دی اور خزانہ لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار میں اور لوگ بھی شامل ہو گئے۔

مسعود کو گرفتار کر کے ان کے چھوٹے بھائی محمد کو اپنا رہنما بنالیا گیا۔ محمد نابینا تھے۔ انہوں نے مسعود کو قلعہ کیری میں نظر بند کروادیا اور حکمرانی اپنے بیٹے احمد کے سپرد کردی۔ احمد کی طبیعت میں خود سری بہت تھی۔ انہوں نے باپ سے مشورہ تک نہ لیا اور ان کے ایماء پر 11 جمادی الاول 432ھ (17 جنوری 1041ء) کو مسعود غزنوی جیسے جری اور شجاع رہنما کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔

مسعود نے دس سال تین ماہ حکومت کی۔

مسعود غزنوی کا دور خوشحالی کا دور تھا۔ انہوں نے غزنی میں ایک بہت عالی شان قصر تعمیر کروایا تھا۔ یہ قصر اور اس میں رکھا گیا قیمتی تخت عجائبات میں شمار ہوتے تھے۔ اس قصر کی تعمیر میں تین سال صرف ہوئے۔ شعبان 439ھ (مئی 1038ء) میں قصر کی تکمیل کا جشن منایا گیا۔ مؤرخ بیہقی بھی اس جشن میں شریک تھے۔ انہوں نے بھی اس محل کی آرائش کی بڑی تعریف کی ہے۔

جب 422ھ (1031ء) میں عباسی خلیفہ قادر باللہ کا انتقال ہوا اور قائم بامر اللہ ان کی جگہ خلیفہ بنائے گئے تو ایک سفیر غزنی آئے اس موقع پر پورے شہر کو بہت اعلیٰ پیمانے پر سجاایا گیا۔ میلوں تک پیادہ اور سوار فوجیوں کی صفیں، جنگی ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔

مسعود غزنوی بے انتہا دلیر اور بہت اچھی صحت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد فیاض بھی تھے۔ ایک بار انہوں نے رمضان المبارک کے مہینے میں تمام مستحق افراد میں فی کس ایک ہزار دینار تقسیم کیے۔ رمضان المبارک میں ان کی سخاوت عروج پر ہوتی تھی۔ وہ بہت اچھے شعری ذوق کے مالک بھی تھے اور شعراء اکرام کو اچھے اشعار بنانے پر خطیر رقم بطور انعام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے مشہور سائنس دان البیرونی کو کتاب 'قانون مسعودی' کی تصنیف پر ایک ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی انعام میں دینا چاہی تھی لیکن البیرونی نے انکار کر دیا۔

مسعود غزنوی کا دور علمی ترقی کے لحاظ سے بڑا اہم ہے۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق مسعود غزنوی نے اپنی مملکت کے تمام شہروں میں اس قدر مدارس اور مساجد تعمیر کروائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز ہے۔ علماء کی سرپرستی کی وجہ سے غزنی میں بڑے بڑے اہل علم اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی اور ابوالفضل بیہقی شامل ہیں۔

مسعود غزنوی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس دور کی کئی معرکتہ الآرا کتابیں یا تو ان کے حکم سے لکھی گئیں یا ان کے نام معنون کی گئیں۔ ان کتابوں میں سب سے مشہور کتاب 'القانون المسعودی فی البیہیۃ والنجوم' ہے جو ریاضی، ہیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیہ کے موضوعات پر ایک لا جواب کتاب ہے۔ اس کتاب کو البیرونی نے لکھا اور مسعود غزنوی کے نام معنون کیا۔ اس کے علاوہ ابوالفضل بیہقی نے تاریخ آل سبکتگین لکھی۔ امام ناصحی نے فقہ مسعودی کے نام سے ایک کتاب فقہ حنفیہ پر مسعود غزنوی کے حکم سے لکھی۔ علامہ تغلبی نے عربی شعراء کے ایک تذکرے کا ضمیمہ لکھ کر اسے مسعود کے نام معنون کیا۔

مسعود غزنوی کا دور حکومت جن علمی شخصیات کی وجہ سے تاریخ کے ایوانوں میں اجالا کر رہا ہے ان میں سرفہرست البیرونی ہیں۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی ریاضی، ہیئت، طبیعیات، مساحت و ہندسہ، ارضیات، علم کیمیا، تاریخ، جغرافیہ اور فلسفہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ بہت اچھے سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ معدنیات اور خواص الادویہ کے ماہر اور آثار قدیمہ کے عالم بھی تھے۔ انہوں نے مختلف علوم پر 175 کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں 'القانون المسعودی'، ریاضی، ہیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیہ پر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ 'کتاب الہند' کے نام سے معروف ہے۔ اس کتاب کے اسی باب میں ہندوؤں کے مذہب، فلسفہ، ادب، جغرافیہ، سنن، ہیئت، رسوم و رواج اور قوانین کا بیان ہے۔

البیرونی، عربی، فارسی، عبرانی، یونانی اور سریانی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ہندوستان آکر انہوں نے خاص طور پر سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور سنسکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ مرتب کیا۔ اس زمانے میں تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور طبیعی علوم میں البیرونی سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔

مسعود غزنوی نے البیرونی کے لیے غزنی میں ایک اچھی رصد گاہ بنوائی تھی۔ البیرونی نے کتاب ”قانون مسعودی“ یہیں تصنیف کی۔ البیرونی نے ایران کے زرتشتیوں، اہل خوارزم، اہل صغد اور اہل سمرقند کی تاریخ اور تقویم (کیلنڈر) کے بارے میں نادر معلوم فراہم کیے۔ البیرونی 3 ذوالحجہ 362ھ (4 ستمبر 973ء) کو پیدا ہوئے اور 2 رجب 440ھ (11 دسمبر 1048ء) کو انہوں نے اس دنیا کو خیر باد کیا۔

محمود غزنوی کے مشہور غلام ایاز، محمود غزنوی کے انتقال کے بعد بھی غزنوی حکومت سے وابستہ رہے۔ ابتداء میں مسعود نے انہیں رے کی حکومت سپرد کرنے میں تامل سے کام لیا حالانکہ امراء کا کہنا یہ تھا کہ ایاز کو رے کی حکومت دے دی جائے۔ البتہ پانچ برس بعد مسعود غزنوی نے ایاز کو 467ھ (1036ء) میں اپنے بیٹے مجدود کا اتالیق بنا کر لاہور بھیجا۔ مسعود نے مجدود کو لاہور کا نائب السلطنت مقرر کیا تھا۔ ایاز یہیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ ملکی امور میں عملاً انہی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کا انتقال 449ھ (1057ء) میں لاہور ہی میں ہوا۔

مسعود غزنوی کے دور حکومت ہی میں مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور تشریف لائے جہاں انہوں نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ کچھ عرصے تک درس دیتے رہے پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپؒ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ آپؒ کے ہاتھ پر کئی افراد نے اسلام قبول کیا۔ ان میں رائے راجو بھی تھے جو مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کے نائب تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے رائے راجو کے مسلمان ہو جانے کے بعد انہیں شیخ ہندی کا لقب دیا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس خطے میں اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ ایسی ہی عظیم المرتبت علمی شخصیات کی بدولت مسعود غزنوی کا دس سالہ دور تاریخ کا ایک روشن باپ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔



ملک الظاہر بیرس

ایک بیدار مغز عظیم مسلمان جرنیل جو اسلام دشمن قوتوں کے آگے سب سے پہلائی ہوئی دیوار بن گئے

وسط 658ھ کی ایک گرم صبح تھی۔

قاہرہ کے گلی کو چے ان مظلوم مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے جو وحشی تاتاری قبائل کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے کے بعد قرب و جوار کے ممالک سے پناہ لینے کے لیے مصر آ گئے تھے۔ اچانک ان مسلمانوں نے چند تاتاریوں کو قاہرہ کی حدود میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ تاتاری مخصوص سفاری لباس پہنے ہوئے تھے اور بڑی رعونت کے ساتھ چل رہے تھے۔ تاتاریوں کی آمد سے قاہرہ کے گلی کو چوں میں غم و غصہ اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمان بجا طور پر ایک بڑے خطرے کو اپنے سروں پر منڈلاتا دیکھ رہے تھے۔

تاتاری سفیروں نے حکمران وقت سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مصری سپاہیوں کے ایک دستے نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا اور مصر کے فرمانروا ملک مظفر کے ایوان میں لے گئے۔ تاتاری سفیروں کی ہر حرکت اور ہر ادا سے غور و ٹپکتا تھا۔ انہوں نے سفارتی آداب کا بھی خیال نہ کیا اور اپنے سالار ہلاکو خاں کا خط بڑی بدتمیزی کے ساتھ ملک مظفر کے سامنے پھینک دیا۔ مسلمانوں کے حکمران نے خط پڑھنے کا حکم دیا۔ خط کے مندرجہ جات کچھ یوں تھے۔

’یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی شہر پناہیں منہدم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں امن چین سے زندہ رہنے دیا جائے گا اور اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو پھر تم کو جو کچھ پیش آئے گا وہ بلند و بالا جاودانی آسمان کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خط سنتے ہی ملک مظفر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ان کی جبین شکن آلود ہو گئی لیکن انہوں نے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

’ہم نے ہلاکو خاں کا کچھ نہیں بگاڑا‘ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ہمارے امن و امان میں خلل نہ ڈالے۔‘ تاتاری سفیر یہ جواب سن کر غضبناک ہو گئے۔ انہوں نے درشت لہجے میں کہا: ”اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے آقا کی قوت لامحدود ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس سے ٹکر نہیں لے سکتی۔“

ملک مظفر نے تاتاری سفیروں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کا انداز گفتگو گستاخ سے گستاخ تر ہوتا چلا گیا۔

ایوان میں ملک مظفر کے کئی اعلیٰ مشیر بھی موجود تھے جو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ تاتاری سفراء کی ہرزہ سرائیوں کو سن رہے تھے۔

ملک مظفر نے اپنے مشیروں پر نگاہ ڈالی کہ اس معاملے میں ان کی کیا رائے ہے۔ بعض مشیروں کا تو کہنا تھا کہ ہمیں تاتاریوں کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے لیکن اس ایوان میں ایک دراز قد، قوی الاعضا اور خوش رو شخص موجود تھا جس کا پیہم اصرار تھا کہ ہمیں تاتاریوں کا ڈٹ کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس شخص کا چہرہ نہایت بارعب اور پروقار تھا اس کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ بال سرخ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ بڑے اعتماد سے ایوان کو بتا رہا تھا کہ تاتاریوں کے وعدے اعتبار کے لائق نہیں ہیں، مصر مسلمانوں کی امیدوں کا آخری مرکز ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ہمیں سردھڑکی بازی لگا

دینی چاہیے۔ اس دراز قد اور وجہہ شخص کی پر جوش اور مدلل تقریر سن کر ایوان میں موجود بہت سے امراء اور مشیر بھی اس کے ہم خیال ہو گئے۔

ملک مظفر خود بھی تاتاریوں کے آگے سپرد آلنے کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے جب اپنے اعلیٰ مشیروں کو بھی اپنا ہمنوا پایا تو انہوں نے محسوس کیا کہ اب فیصلے کی گھڑی آگئی ہے۔ اگر اس وقت مسلمان اپنی میراث کو بچانے کے لیے اٹھ کھڑے نہ ہوئے تو شاید صدیوں تک وہ سنبھل نہ پائیں گے۔ انہوں نے محافظہ دستے کو حکم دیا کہ تمام تاتاری سفیروں کو موت کی نیند سلا دیا جائے۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ سپاہیوں کا ایک دستہ تاتاری سفیروں پر ٹوٹ پڑا اور پلک جھپکتے میں ان کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔

چند گھنٹوں بعد قاہرہ کے مسلمان حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ چند گھنٹے قبل اکڑ کر چلنے والے تاتاری سفیروں کی خون آلود لاشیں قاہرہ کی اہم سڑکوں پر لٹکی ہوئی ہیں۔ تاتاری سفیروں کی لاشیں اہم مقامات پر لٹکانے کا جرأت مندانہ اور دانشمندانہ فیصلہ امیر بیہرس ہی کا تھا۔ بہت جلد ملک کے طول و عرض میں سرکاری اعلان کیا جا چکا تھا کہ ہر تندرست اور بالغ مرد کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ سالار اعلیٰ بیہرس فوجی تیاریوں کے ضمن میں دن رات مصروف تھے۔

تاریخ اسلام کی یہ حیرت انگیز شخصیت 619ھ/1223ء میں وسط ایشیا (موجودہ جنوبی روس) کے علاقے دشت قپچاق میں پیدا ہوئی۔ بیہرس نے ایک مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی اور ان کے والد تحقیق نے اپنے بیٹے کا نام محمود رکھا۔ محمود ابھی لڑکپن کی منزلیں سر کر رہے تھے کہ دشت قپچاق اور قرب وجوار کے علاقوں پر تاتاریوں کا قہر و غضب ٹوٹ پڑا۔ تاتاری ان علاقوں سے اُن گنت نوجوان اور بچوں کو پکڑ کر ساتھ لے گئے اور انہیں مختلف شہروں میں لے جا کر فروخت کر دیا، محمود کو مصر کے ایک امیر علی ابن الورقہ نے دمشق کی منڈی میں بیس دینار کے بدلے خرید لیا۔

علی ابن الورقہ ایک دوسرے مصری امیر کے قرضدار تھے۔ انہوں نے قرض اتارنے کی یہ تدبیر نکالی کہ محمود کو اپنے قرض خواہ کے حوالے کر دیا۔ دوسرے مصری امیر کی بیوی نے محمود کو ایک دن کسی غلطی پر مارا پیٹا۔ اس موقع پر امیر کی بہن فاطمہ بھی موجود تھی۔ اس نے اپنی بھابی سے کہا کہ اگر تمہیں یہ غلام پسند نہیں ہے تو اسے میرے حوالے کر دو۔ امیر کی بیوی راضی ہو گئی۔ فاطمہ کسمن محمود کو اپنے ساتھ اپنے گھر دمشق لے گئی۔ دراصل فاطمہ کا ایک بیٹا کچھ عرصہ قبل فوت ہو چکا تھا اس کی شکل محمود سے بہت ملتی جلتی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ فاطمہ کو محمود میں اپنے بیٹے کی شباهت پا کر اس سے انس ہو گیا ہو۔

فاطمہ کے مرحوم بیٹے کا نام بیہرس تھا فاطمہ محمود کو بھی بیہرس ہی کے نام سے پکارنے لگی۔ یہ نام اتنا عام ہوا کہ لوگ محمود کا اصل نام بھول گئے۔ فاطمہ کے ایک بھائی مصر کے حکمران الملک الصالح نجم الدین ایوب کی حکومت میں ایک اہم عہدیدار تھے۔ ایک دن وہ اپنی بہن کے پاس دمشق آئے تو وہاں انہوں نے بیہرس کو دیکھا۔ اس نوجوان کی عادات اور اوصاف انہیں اتنے پسند آئے کہ انہوں نے اپنی بہن سے اصرار کر کے بیہرس کو مانگ لیا اور اپنے ساتھ قاہرہ لے گئے۔ قاہرہ لے جا کر انہوں نے بیہرس کو اس وقت کے حکمران الملک الصالح کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ اس نے وسط ایشیا کے صحراؤں میں پلنے والے اور غلام بنا کر فروخت کر ڈالے جانے والے ایک لڑکے کے مصر کی قیادت تک پہنچنے کی راہ ہموار کر دی اور اس کے لیے جہاں بانی کا دروازہ کھول دیا۔

ملک الصالح نے 637ھ میں مصر کا اقتدار سنبھالا تھا۔ ان کے حکمران بننے سے پہلے ہی ساتویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں تاتاریوں نے دنیا بھر پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے اور بے شمار مسلمانوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جا رہا تھا۔ یہ لوگ مملوک (غلام) کہلاتے تھے۔ ملک الصالح نے ان کی تربیت کا خصوصی اہتمام کیا۔

ملک الصالح نے بیہرس کو بھی اسلامی علوم اور جنگی فنون کی اعلیٰ تربیت دلوائی۔ اپنی نمایاں صلاحیتوں غیر معمولی جسمانی قوتوں اور حیرت انگیز ذہانت کی بدولت بیہرس کو بہت جلد فوج کے ایک دستے کی کمان سونپ دی گئی۔ اسی زمانے میں ساتویں صلیبی جنگ چھڑ گئی، یہ جنگ شاہ فرانس لوئی نہم کی قیادت میں چھیڑی گئی تھی اور صلیبیوں نے اس بار مصر کو خصوصی ہدف بنایا تھا۔ صلیبیوں کا خیال تھا کہ مصر فتح ہو جانے کے بعد بیت المقدس اور شام و فلسطین کے دیگر مقدس مقامات پر قبضہ کرنا چنداں دشوار نہ ہوگا کیونکہ اس زمانے میں مصر ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ صلیبی فوج اور لشکر اسلام کے مابین منصورہ کے مقام پر زبردست جنگ لڑی گئی جس میں بیہرس نے مثالی شجاعت کا ثبوت دیا۔ صلیبیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔

652ھ/1254ء میں مصر پر مملوکوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ مملوکوں کی حکومت کا یہ عہد زیریں تقریباً پونے تین سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ پہلے مملوک حکمران کا نام معز الدین ایک تھا پھر الملک منصور نے زمام کار سنبھالی۔ یہ وہ دور تھا کہ تقریباً چالیس برس قبل اٹھنے والے تاتاری طوفان نے شدت اختیار کر لی تھی اور اس کی شوریدہ سر موجیں شام اور مصر کے دروازوں پر دستک دینے لگی تھی۔ ملک المنصور کم عمر تھے چنانچہ آنے والے خطرے کے پیش نظر تمام امراء نے سیف الدین قطوزی کو شوال 657ھ/1259ء میں مصر کا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ انہوں نے اپنے لیے ملک مظفر کا لقب پسند کیا۔

سفیروں کے قتل کی اطلاع ملتے ہی ہلاکو خان کا ہڈی دل لشکر مصر کی طرف بڑھنے لگا۔ تاتاری لشکر کی پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ہلاکو خان کو اپنے بھائی منگو خان کی وفات کی وجہ سے واپس جانا پڑا۔ اس نے اپنے سپہ سالار کتبغا کی قیادت میں ایک بڑی فوج کو یہیں انتظار کے لیے کہا۔ کتبغا نے مشہور فلسطینی شہر ناصرہ کے قریب عین جالوت کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

اچانک بیہرس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو جذبہ شہادت سے معمور دل اور انتہائی بیدار ذہن رکھنے والا کوئی مسلمان جرنیل ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ بجائے مصر کا دفاع کرنے کے ہم خود آگے بڑھ کر کتبغا کے لشکر پر حملہ کریں گے۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ بیہرس کے اس پر جوش اعلان سے پورے لشکر اسلام میں نئی امنگ اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

جمعہ 15 رمضان المبارک 658ھ/25 اگست 1260ء کا وہ تاریخی دن تھا جب دونوں لشکر زبردست قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ اللہ کی نصرت مجاہدین اسلام کے ساتھ تھی۔ تاتاریوں کو شکست ہوئی اور ان کا سالار کتبغا اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا، بیہرس نے کتبغا کی گردن مار دینے کا حکم دیا۔ عین جالوت کی یہ جنگ تاریخ کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے اس جنگ کے بعد بیہرس نے حلب، حماہ، دمشق اور شام کے دیگر شہروں میں جنگی کارروائی کر کے تاتاریوں کو مار بھگایا اور واپس قاہرہ پہنچ گئے۔

بیہرس واپس قاہرہ پہنچے تو ایک نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔ 658ھ/1260ء میں مملوک امراء نے اتفاق رائے سے بیہرس کو مصر کا فرمانروا منتخب کر لیا۔ بیہرس نے حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے لیے ملک الظاہر کا لقب پسند کیا۔ کچھ عرصہ بعد شام والوں نے بھی بیہرس کی دعوت پر انہیں اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ اس طرح شام بھی مملوک حکومت کا حصہ بن گیا۔ اس دور کے شام میں آج کا لبنان، اردن اور فلسطین بھی شامل تھے۔

ادولوا العزم مجاہد ملک الظاہر بیہرس کا قلب شوق جہاد سے معمور تھا۔ انہوں نے اپنے سترہ سالہ دور حکومت کا بڑا حصہ دشمنان اسلام سے جہاد کرتے ہوئے گزارا۔ جنگوں میں وہ ہمیشہ خود قیادت کیا کرتے تھے۔ وہ بے انتہاد لیر اور بے حد جری سالار تھے۔ ان کی شجاعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغربی مورخین تک ان کی بہادری کا اعتراف کرتے ہیں۔ مشہور امریکی مؤرخ ہیرلڈ لیم نے اپنی کتاب 'تاتاریوں کی یلغار میں

یہ اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ 'ایک سپاہی کی حیثیت سے بیہس کا مرتبہ جو بیس یزر سے کم نہ تھا۔ واضح رہے کہ رومی جرنیل جو بیس یزر (100 قبل مسیح تا 24 قبل مسیح) کا شمار عالمی تاریخ کے عظیم ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔

بیہس کو تیر اندازی، گھڑ سواری، پیرا کی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں کمال حاصل تھا۔ وہ اس قدر نڈر تھے کہ تنہا دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ جنگ کے دوران وہ پورے میدان میں تیزی سے گردش کرتے رہتے تھے اور اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ اسلامی فوج کسی اعتبار سے کمزور نہ پڑنے پائے۔ بیہس بے حد جفاکش تھے۔ سخت محنت ان کے کردار کا لازمی جزو بن چکی تھی۔ وہ گھوڑے کی پشت پر مسلسل کئی دن سفر کرتے تھے۔ موسم کی سختیاں ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھیں۔

بیہس ناصرف علم بلکہ عمل کے لحاظ سے بھی بلند درجہ پر فائز تھے۔ ان کے پہلو میں ایک سچے مسلمان کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ خود بھی نماز اور روزے کے پابند تھے بلکہ عام مسلمانوں کو شریعت کی پابندی کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ انہوں نے 667ھ میں حج کا فریضہ انجام دیا۔ اس موقع پر انہوں نے کعبۃ اللہ کو اپنے ہاتھوں سے عرق گلاب سے غسل دیا اور اس پر دیبا (ایک قیمتی کپڑا) کا غلاف چڑھایا۔ پھر انہوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے گرد ایک کٹہرا (مجر) بنوایا۔ ان کے حکمراں بننے سے چند سال قبل مسجد نبویؐ کا کچھ حصہ آتشزدگی کی وجہ سے گر گیا تھا، خلیفہ مستعصم باللہ نے اس کی تعمیر شروع کروائی تھی لیکن یہ کام نامکمل رہا اور اسے بیہس نے مکمل کروایا۔

بیہس بے حد فیاض اور کریم النفس حکمراں تھے۔ ان کے در سے سائل کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا، ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا، جہاں ہزاروں افراد کھانا کھاتے تھے، وہ فقراء اور مساکین میں ہزاروں من غلہ تقسیم کیا کرتے تھے۔ انہوں نے حرم شریف کے خادین کے لیے مستقل وظائف بھی مقرر کیے تھے۔ بیہس اپنی رعایا کے مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اکثر بھیس بدل کر مملکت کے طول و عرض میں نکل جاتے تھے اور لوگوں میں گھل مل کر ان کے حالات دریافت کر لیتے۔ حتیٰ کہ بھیس بدل کر انہوں نے دشمنوں کے متعدد علاقوں تک کا دورہ کیا اور دشمنوں کے اہم راز جان لیے، یہ کام تنہا کیا کرتے تھے۔ بیہس کوئی اہم دینی یا دنیوی کام علماء سے فتویٰ لیے بغیر نہ کرتے تھے۔ ان کی مملکت میں چاروں بڑے فقہی مسالک کے علماء کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔

بیہس نے مختلف ذمہ داریوں کے لیے بے حد بلند پایہ اور جلیل القدر علماء کرام کی خدمات حاصل کی تھیں۔ مشہور مؤرخ اور تذکرہ نگار علامہ ابن خلکان بیہس کے عہد سے عرصہ تک شام کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) رہے۔ وہاں سے پھر آپ قاہرہ آ گئے اور یہاں مدرسہ فخریہ میں تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ آپ نے 'وفیات الاعیان' کے نام سے ایک بہت اچھی تاریخی کتاب لکھی جس میں 18 برس صرف ہوئے، محدث امام نوویؒ بھی بیہس کے ہم عصر تھے اور بیہس ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بیہس مشہور صوفی بزرگ سید احمد البدویؒ کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان طبیب اور فقہ صرف و نحو اور منطق کے عالم ابن النفیس کو بیہس کے عہد میں رئیس اطباء مصر کا عہدہ دیا گیا تھا۔ ملک الظاہر بیہس نے قاہرہ میں مدرسۃ الظاہریہ بڑے اہتمام سے 662ھ میں تعمیر کروایا تھا۔

بیہس ایک عادل اور انصاف پرور حکمراں تھے۔ انہوں نے محکمہ قضا میں چاروں بڑے فقہی مسالک کے قابل ترین قاضیوں (ججوں) کو مقرر کیا تھا۔ ہفتہ میں دو یا تین دن 'دارالعدل' میں وہ خود بھی بیٹھ کر مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ فوج کے لیے بھی ایک قاضی مقرر کیے گئے۔ وہ عدالت عظمیٰ میں بیہس کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

بیہس نے رعایا کو مظالم اور زیادتیوں سے نجات لانے کی غرض سے صیغہ احتساب بھی قائم کیا تھا۔ اس محکمہ کے افسران 'محتسب' کہلاتے

تھے۔ مستبین بازاروں میں اشیاء کے نرخوں کی نگرانی کرتے تھے۔ اشیاء کے خالص ہونے اور ان کے درست تولنے کا اہتمام کرواتے تھے۔ مویشیوں کے ساتھ ظلم کا انسداد کرتے تھے۔ محتسب کے فرائض میں طبیبوں، دواسازوں اور امراض چشم کے ماہروں کا امتحان لینا بھی شامل تھا۔ اس امتحان میں کامیابی پر اجازت نامہ دیا جاتا تھا۔ جس کے بغیر طبیب اور دواساز کسی کا علاج نہ کر سکتے تھے۔ محتسب امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں سے باز پرس کر سکتے تھے۔ قرض خواہوں کو قرض واپس دلواتے تھے۔ ان کے اختیارات وسیع تھے اور وہ قوانین کی خلاف ورزی پر فوراً سزا بھی دے سکتے تھے۔

محتسب کے انتخاب میں بہت چھان پھٹک سے کام لیا جاتا تھا اور صرف اہل دیندار اور امانت دار فرد ہی محتسب بنایا جاتا تھا۔ پولیس کا محکمہ بھی قائم تھا جس کا افسر اعلیٰ والی کہلاتا تھا۔ کوٹوال شہر کو صاحب عس کہا جاتا تھا۔ آگ بجھانے کا محکمہ بھی کوٹوال شہر کے تحت کام کرتا تھا۔

بھرس کی حکومت میں مملکت کے سربراہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی تاہم وہ تمام معاملات میں اپنے اعلیٰ مشیروں سے مشورہ ضرور لیتے تھے۔ انہوں نے 'نائب سلطان' کا عہدہ قائم کیا تھا جس کی حیثیت وزیراعظم کے برابر تھی۔ بھرس کی غیر موجودگی میں نائب سلطان ہی ملک کے قائم مقام سربراہ ہوتے تھے۔ بھرس جب کبھی کسی جنگی مہم یا سرکاری دورے پر جاتے تھے تو ایک وزیران کے مشیر کے طور پر ساتھ ہوتے تھے جو وزیر الصحت کہلاتے تھے۔

بھرس کے عہد میں پیداوار پر لگان وصول کیا جاتا تھا زکوٰۃ کی وصولیابی سرکاری نگرانی میں ہوتی تھی۔ حکومت سامان برآمد بھی کرتی تھی۔ غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت فوجی خدمت سے استثناء اور دوسری سہولتوں کے بدلے معمولی جزیہ (ٹیکس) لیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار عام طور پر دس اور پچیس درہم کے درمیان ہوتی تھی۔ درآمدی سامان پر دس سے پینتیس فیصد درآمدی محصول عائد تھا۔

بھرس نے زراعت کو بھی خاصی ترقی دی۔ آبپاشی کے اچھے انتظامات کیے۔ دریائے نیل سے کئی نہری نکوائیں۔ کئی مقامات پر بند تعمیر کروائے اور تالاب بنوائے اس طرح قابل کاشت اراضی میں اضافہ ہو گیا۔



الغ بیگ

تیوری دور کے قابل فخر صاحب علم اور لائق حکمران

وہ موسم بہار کا ایک حسین دن تھا۔

سانولی رنگت، گھنے ابرو اور پرکشش آنکھوں کی مالک ایک شخصیت ایک جانب سے نمودار ہوئی۔ ایک سفید پوش بزرگ ان کے ہمراہ تھے۔ تمام طالب علم تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سانولی رنگت والی پر شکوہ شخصیت نے رو پہلا عمامہ زیب سر کر رکھا تھا اور ان کا لباس ان کی امارت کا مظہر تھا۔

وہ سفید پوش بزرگ کو لے کر چنار کی گھنی چھاؤں میں آ بیٹھے۔ ان کی درخواست پر سفید پوش بزرگ نے زری میں لپٹی ہوئی ایک موٹی سی کتاب کو اٹھا کر اسے کھولا اور اجرام فلکی پر اظہار خیال شروع کر دیا۔ بزرگ پیچیدہ ترین سوالوں اور دقیق ترین مسائل کو اس طرح کھول کر اور سادگی کے ساتھ بیان کر رہے تھے کہ طالب علم محسوس کرتے تھے کہ وہ پیچیدہ ترین بحث نہیں بلکہ دلکش موسیقی سن رہے ہوں جس کی مترنم لہریں ان کی روح تک کو سیراب کرتی چلی جا رہی ہوں۔

بزرگ نے اپنا بیان ختم کیا تو رو پہلے عمامے والے صاحب نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد تمام طالب علموں سے دریافت کیا: ”کیا سب لوگوں نے سب کچھ سمجھ لیا؟“

تمام طالب علموں نے سر جھکا کر اثبات میں جواب دیا۔ چھوٹی سی نوکیلی داڑھی والے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر جھپکتے ہوئے کہا: ”استاد محترم کا بیان نا صرف سمجھ میں آیا بلکہ اس نے بے حد لطف اندوز بھی کیا۔“

بزرگ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ رو پہلے عمامے والے صاحب نے کھڑے ہونے والے طالب علم کو دلچسپی سے دیکھا اور ان سے علمی انداز کے سوالات شروع کر دیے۔ سوالات کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ طالب علم ہر سوال کا جواب بہت تفصیل کے ساتھ اور بے حد جوش و خروش سے دے رہا تھا۔ اب رو پہلے عمامے والی شخصیت نے طالب علم کو اپنے پاس بلایا اور ان سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کس جگہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا خاندان کون سا ہے۔ کہاں تعلیم پائی ہے اور آئندہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

اسکے بعد انہوں نے طالب علم کو اپنے محل آنے کی دعوت دی اور سفید پوش بزرگ نے مسرت کے ساتھ اس طالب علم کی پیشانی چوم لی۔ یہ طالب علم تھے مولانا علی قوشچی جنہوں نے سفید پوش بزرگ قاضی زادہ رومی کا درس سن کر سوالات کے جوابات دیے اور سوالات کرنے والی شخصیت تھی تیموری سلطنت کے تیسرے فرماں روا الغ بیگ جن کی علمی خدمات تقریباً ساڑھے پانچ سو برس گزر جانے کے بعد بھی تاریخ کے ایوانوں میں اُجالا کر رہی ہیں۔ الغ بیگ محض ایک حکمران ہی نہیں ایک بلند پایہ عالم بھی تھے اور علم ہیئت کیلئے ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

الغ بیگ کا نام محمد تورغانی ہے۔ ان کے والد شاہ رخ تیموری سلطنت کے 807ھ تا 850ھ (1405ء تا 1447ء) حکمران رہے۔ الغ بیگ کی والدہ کا نام گوہر شاد ہے۔ الغ بیگ 796ھ (1393ء) میں سلطانیہ میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر موجودہ ایران کے شمالی حصے میں رے کے قریب واقع تھا۔ الغ بیگ کو کم عمری ہی میں سے امور جہاں بانی سیکھنے کے متعدد مواقع میسر آئے۔ 810ھ (1407ء) میں یعنی صرف 14 برس کی

عمر میں انہیں خراسان کے کچھ حصے اور مازندران کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ کم عمری کے باوجود انہوں نے اپنی خداداد ذہانت اور لیاقت کے بل بوتے پر ان علاقوں کا بہت اچھا انتظام کیا۔ ایک سال بعد شاہ رخ نے الف بیگ کو ترکستان اور ماوراءالنہر کا حاکم بنادیا اور وہ تقریباً تیس برس تک اس علاقے پر حکمران رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے سمرقند کو اسلامی تہذیب اور تمدن کا اعلیٰ مرکز بنادیا۔

الف بیگ خود بھی بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ تفصیل کے ساتھ کیا تھا اور وہ قرآن حکیم کے حافظ بھی تھے۔ انہیں قرآن پاک کی تمام قرأتوں پر بھی عبور حاصل تھا دینیات کا وسیع علم رکھتے تھے۔ انہیں شعرو سخن سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کے ایوانوں میں بڑے بڑے شعراء مثلاً خوجہ عصمت بخاری، برہان الدین برندق، رستم خوریانی اور طاہر ایبوردی موجود رہتے تھے۔ الف بیگ ایک مؤرخ بھی تھے۔ وہ ناصرف علمی تحقیقات اور تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ خود بھی تاریخ کے موضوع پر ایک کتاب کے مؤلف تھے۔ اس کتاب کا نام ”اولوس اربعہ چنگیزی“ تھا (یعنی چنگیزی خاندان کے چار بیٹوں کی تاریخ) یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

الف بیگ ریاضی کے ماہر تھے اور علم ہندسہ (جیومیٹری) کے مشکل سے مشکل مسائل حل کرنے کا فن جانتے تھے۔ ان کی ان تمام علمی خوبیوں اور صلاحیتوں سے بڑھ کر وہ علم ہیئت کے بہت بڑے عالم تھے۔ فلکیات کے موضوع پر ان کا مطالعہ اور معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں تحقیق (ریسرچ) کو ترقی دینے کے لیے الف بیگ نے بہت اہم اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے 832ء (1428ء) میں شہر کے جنوب میں واقع پہاڑی ”کوکہ“ کی دوسری جانب ایک رصدگاہ کی تعمیر شروع کروائی۔ یہ بہت عظیم الشان رصدگاہ تھی اور اپنے عہد میں دنیا کی بڑی رصدگاہوں میں اس کا شمار ہوتا تھا بلکہ اس عہد میں اسے دنیا کے عجائبات میں سے ایک قرار دیا گیا تھا۔ اس رصدگاہ میں فلکیات کے مشاہدے کے سلسلے میں بہت اہم تجربات کیے گئے۔

اس رصدگاہ کے قیام میں چار بڑے ہیئت دانوں نے الف بیگ کی معاونت کی۔ ان میں حسن چلپی تھے جنہیں قاضی زادہ رومی بھی کہتے ہیں۔ غیاث الدین جمشید تھے ملا علاء الدین علی قوشچی تھے اور معین الدین کاشانی تھے۔ ان ماہرین کی مدد سے الف بیگ نے فلکیاتی تحقیق کے دوران میں محسوس کیا کہ ان کے مشاہدات اور مشہور یونانی ہیئت داں بطلمیوس کے حسابات کے درمیان اختلاف ہے۔ انہوں نے بطلمیوس کے حسابات کی اصلاح کی۔

الف بیگ کی زیر نگرانی اس رصدگاہ میں زینج سلطانی مرتب کی گئی۔ زینج سے مراد ستاروں کی فہرست ہے۔ جس میں ستاروں کے بارے میں وسیع معلومات درج کی جاتی ہیں۔ اس زینج میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں:

☆ مختلف حسابات اور سنہ

☆ ستاروں کے راستے

☆ وقت کے بارے میں معلومات

☆ ثوابت کا مقام

ان ابواب سے قبل بہت علمی انداز کے مقدمات دیے گئے ہیں جس میں ان وجوہ پر بحث کی گئی ہے جنہوں نے الف بیگ کو اس مجموعے کی تالیف پر آمادہ کیا۔ اس عظیم کتاب نے یورپ بھر میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گریوز نے اس کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا۔ 1665ء میں ہانڈ نے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اے سیڈیلوٹ نے اس کتاب کے مقدمات کا ترجمہ کیا۔ ای بی نوئل نے ان تمام مخطوطات سے اس کتاب کا موازنہ کیا جو برطانیہ میں موجود ہیں اور پھر فارسی اور عربی کی فرہنگ کا اضافہ کر کے اسے ”کیٹیلگ آف اسٹارز“ کے نام سے شائع کیا۔ یہ زینج 841ھ (1437ء) میں مکمل ہوئی۔

الف بیگ کی رصدگاہ کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ اسے 1908ء میں دوبارہ دریافت کیا گیا۔ اس دریافت کا سہرا ایک روسی ماہر

آثار قدیمہ کے سر ہے۔ رصد گاہ کی مدور عمارت تین منزلہ تھی۔ اس عمارت میں ایک خمدار سرنگ بھی تھی جس میں نشانات لگے ہوئے تھے۔ لغ بیگ نے اس رصد گاہ کی مدد سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کی بنیاد پر جو کیلنڈر ترتیب دیا تھا اس میں اور موجودہ زمانے کے کیلنڈر میں صرف چھ گھنٹے کا فرق ہے۔

ایک ایرانی مصنف کے مطابق علماء و حکماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سکندر کے عہد سے لے کر لغ بیگ کے دور تک کوئی فرماں روا ایسا نہ تھا جو حکمت اور علوم و فنون کے معاملے میں لغ بیگ کا ہمسرہ ہو سکے۔ لغ بیگ نے جو شیج تیار کروائی تھی وہ آج بھی بہت اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور بعض ماہرین تو اسے طوسی کی مرتب کردہ زیج ایلخانی پر ترجیح دیتے ہیں۔

لغ بیگ کی رصد گاہ میں بہت نادر اور نایاب کتابیں بھی موجود تھیں۔ ان میں سے بعض کتابیں بغداد کے بیت الحکمت سے لائی گئی تھیں۔ کتب خانے میں الخوارزمی کی کتاب الجبر فی الحساب و المقابلہ، بوعلی سینا کی 12 کتابیں الفارابی کی 16 جلدیں البیرونی کی کتابیں القانون المسعودی اور دیگر سینکڑوں کتابیں موجود تھیں۔

لغ بیگ کا دور تعمیرات کے اعتبار سے بھی بڑا یادگار ہے۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارتوں کو فن تعمیر کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ لغ بیگ نے سمرقند میں دو بہت شاندار مساجد تعمیر کروائیں۔ ایک مسجد مقطع یا مسجد لغ بیگ کہلاتی ہے۔ اس کی اندرونی زیبائش چینی طرز کی منقش اور رنگ وار لکڑی سے ہوئی ہے۔ یہ مسجد 823ھ (1420ء) میں مکمل ہوئی۔ دوسری مسجد کو شاہ زندہ کی مسجد نام دیا گیا جو 838ھ (1434ء) میں تعمیر ہوئی۔ سمرقند ہی میں ایک خانقاہ بھی تعمیر ہوئی جس کا گنبد بہت بلند تھا۔ ترک باری اور دیگر کتب کے مطابق اتنا بڑا گنبد دنیا بھر میں کہیں نہیں تھا۔

لغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہت بڑا مدرسہ 828ھ (1424ء) میں تعمیر کروایا۔ اس مدرسے کے چار ایوان تھے۔ آج کل مسجد اور خانقاہ کی عمارتیں تو موجود نہیں لیکن مدرسے کی شاندار عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے جس کو دیکھ کر اس دور کے عمدہ طرز تعمیر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مدرسہ کی دیواروں پر رنگین ٹائلوں کا کام بہت نفاست سے کیا گیا ہے اور ان پر ہندی اشکال بڑی خوبصورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ یہ ٹائلیں پہلے مختلف رنگوں میں رنگی جاتی تھیں پھر انہیں ماہر معمار اپنی ضرورت کے شکل کے مطابق تراشا کرتے تھے۔ یہ ایک مشکل اور دقت طلب طریقہ تھا اور اس پر سرمایہ بھی زیادہ صرف ہوتا تھا، لیکن اس کے نتیجے میں جو غیر معمولی اور منفرد اشکال (ڈیزائن) ابھر کر آتی تھیں وہ بڑی متاثر کن اور دیر پا ہوتی تھیں۔

لغ بیگ نے ”کوبک“ پہاڑ کے دامن میں مغرب کی سمت ایک باغ میں ”چہل ستون“ کے نام سے ایک قصر بھی بنوایا تھا۔ اس کے نام ”چہل ستون“ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں چالیس ستون ہوں گے لیکن اس عمارت میں چالیس کی بجائے چار سو ستر ستون تھے اور ان میں سے ایک ستون سیدھا تھا دوسرا ترچھا تھا اور اسی طرح تمام ستونوں کی ترتیب تھی۔ ان ستونوں کی شکلیں اور جزیات عجیب و غریب تھیں۔ اس محل کی اطراف چار بلند مینار (برج) تھے محل کی آرائش سنگ مرمر کی سلوں سے بنے ہوئے مسقف (چھت دار) محرابی راستوں سے کی گئی تھی۔

لغ بیگ نے ایک اور عمارت ایوان تخت (کورنش خانہ) کے نام سے بنائی۔ (کورنش کے ترکی زبان میں معنی ہیں: وہ مکان جہاں لوگ جمع ہوتے ہوں) اس عمارت میں ایک بڑی بارہ دری تھی جس میں ایک بہت بڑا سنگی تخت تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ تخت ایک بہت بڑے پتھر پر مشتمل تھا۔ یہ پتھر پندرہ گز طویل، آٹھ گز چوڑا اور ایک گز بلند تھا۔ اتنے بڑے پتھر کو بہت دور سے لایا گیا تھا اور لانے کے عمل کے دوران وہ ایک جگہ سے ٹوٹ بھی گیا تھا۔

لغ بیگ نے ایک اور محل، چینی طرز تعمیر کے مطابق بنوایا تھا۔ اس کی دیواروں پر چینی فنکاروں میں سے ایک کی بنوائی ہوئی تصاویر آویزاں تھیں۔ لغ بیگ نے سمرقند میں امیر تیمور کے مقبرے اور دیگر عمارتوں پر مشتمل کمپلیکس، گورامیر کے داخلی دروازے پر پچی کاری اور نقاشی کا خوبصورت کام بھی کروایا۔ یہ کام محمد بن محمد الاصفہانی نے انجام دیا۔ لغ بیگ نے بخارا میں بھی ایک اچھا مدرسہ قائم کیا۔

اس دور کی تعمیرات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے طرز تعمیر سے برصغیر پاک و ہند کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ یہ برصغیر پر تیموری حملوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لغ بیگ کے دور میں تعمیر میں پتھر کا استعمال بہت گیا تھا۔ ناصرف بنیادوں میں بلکہ جنگلوں، کٹھروں، آرائشی خانوں، خوبصورت الواح مزار اور روشوں حتیٰ کہ گنبدوں کی بالائی چھتوں میں بھی پتھر کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا تھا۔ گنبدوں کی بالائی چھتوں میں پتھر کے جوڑ بڑی مضبوطی کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔

لغ بیگ نے ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقوں پر تو طویل مدت تک حکومت کی لیکن جب 850ھ (1447ء) میں انہیں پوری مملکت یعنی وسط ایشیا، ماوراء النہر، افغانستان اور ایران کا اقتدار ملا تو شورشوں اور بغاوتوں کی کثرت کے باعث سکون سے اپنے فرائض انجام دے نہ سکے۔ لغ بیگ بہت بہادر انسان تھے اور جنگوں میں عزیمت اور شجاعت کے ساتھ لڑتے تھے لیکن فطری طور پر انہیں لڑائی سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک علم دوست انسان تھے۔

لغ بیگ 25 ذوالحجہ 850ھ (13 مارچ 1447ء) کو اپنے والد شاہ رخ کی وفات کے بعد حکمران بنے۔ چند ہی روز بعد لغ بیگ کے اپنے بیٹے عبداللطیف، اپنی دادی گوہر شاد اور ان کے خدام کو قید کر کے سمنان لے گئے۔ وہاں سے وہ ہرات چلے گئے اور اس پر قبضہ کر کے اپنے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوسری جانب ایک شخص سلطان عبداللہ نے شیراز کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ادھر کابل اور غزنی میں ایک نئی ریاست قائم کر کے کچھ اور لوگوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ایک اور شہزادے بابر میرزا، جرجان اور مازندران میں اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ادھر عبداللطیف جب اپنے قیدیوں کو لے کر نیشاپور پہنچے تو ان پر حملہ کر دیا گیا۔ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور عبداللطیف کو گرفتار کر کے لغ بیگ کے عم زاد بھائی علاء الدولہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

لغ نے صورت حال کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے فوجی تیاری کی اور خراسان کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے دریائے جیحون کو عبور کیا۔ وہ عبداللطیف کو معاف کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنے وزیر نظام الدین میرک کو اس غرض سے ہرات روانہ کیا۔ اسی اثناء میں بابر میرزا نے خراسان پر حملہ کر کے علاء الدولہ کے ہراول دستے کو جام کے مقام پر شکست دے دی۔ جب علاء الدولہ نے دیکھا کہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تو انہوں نے مصالحت پر آمادگی ظاہر کی۔ عبداللطیف کو رہا کر دیا گیا اور علاء الدولہ کے ساتھ صلح ہو گئی لیکن یہ صلح زیادہ دن قائم نہ رہی۔ بعد میں لغ بیگ نے عبداللطیف کی سپاہ کی مدد سے علاء الدولہ کے خلاف کارروائی کی۔ ہرات سے چار میل دور ترناب کے مقام پر خونریز جنگ کے بعد علاء الدولہ کو شکست ہوئی۔ انہوں نے نیم شہد میں جا کر پناہ لی اور اطاعت قبول کرنے کا بہانہ کیا لیکن لغ بیگ ان کی چال میں نہ آئے۔ وہ آگے بڑھے انہوں نے ہرات اور اس کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے اسفرائن کی طرف پیش قدمی کی جہاں انہوں نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو میرزا عبداللہ شیرازی کے ساتھ بسطام کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ دوسرا حصہ عبداللطیف کی قیادت میں استرآباد کی سمت بڑھا۔ اسی موقع پر ازبکوں نے ماوراء النہر پر حملہ کر دیا۔

عبداللطیف بعض وجوہ کی بناء پر اپنے والد لغ بیگ سے خفا تھے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے والد کو راضی کیا کہ وہ بلخ کی حکومت انہیں دے دیں پھر انہوں نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کر دی۔ فوج لے کر دریائے جیحون عبور کیا۔ لغ بیگ نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ یہ جنگ شاہ رنجیہ کے مقام پر ہوئی۔ عبداللطیف نے اپنے والد کو اپنے ایک ملازم عباس کے حوالے کر دیا۔ عباس نے لغ بیگ کو 10 رمضان 853ھ (27 اکتوبر 1449ء) کو قتل کروا دیا۔ اس طرح علم و عرفان کا یہ دمکتا ہوا آفتاب صرف ڈھائی برس کی حکمرانی کے بعد گہنا گیا۔

لغ بیگ کو سمرقند میں اپنے دادا امیر تیمور کی قبر کے قریب ہی سپرد خاک کیا گیا۔

☆☆☆

ناصرالدین قباچہ

سرزمین سندھ و ملتان کے علم پرور حکمران

شہرت اور ناموری حاصل ہونے کے سوڈھنگ ہیں۔ تاریخ، مختلف شخصیات کو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے اوراق میں نمایاں مقام دیتی ہے کسی حکمران کے دور میں شاندار تعمیرات ہوئیں اور اس حکمران نے ان تعمیرات کے حوالے سے اپنا نام تاریخ میں محفوظ کروالیا، کسی حکمران کے دور میں فتوحات بہت زیادہ ہوئیں تو تاریخ نے فاتح عالم کے طور پر اس حکمران کو یاد کرنا شروع کر دیا، کسی حکمران کا دور صنعتی ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے مثالی رہا تو تاریخ نے اس حکمران کی انتظامی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس کا نام اپنے جھروکوں میں سجادیا، اور کچھ حکمران ایسے بھی تھے جنہوں نے ایک ایسی فصل کی آبیاری کی جس پر علم و عرفان کے برگ و بار آتے ہیں اور علم کا یہ خزانہ آنے والی نسلوں تک کے لیے خیر و فلاح کی نوید لے کر آتا ہے۔

ناصرالدین قباچہ، برصغیر پاک و ہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے والے مشہور حکمران شہاب الدین غوری کے ترک غلام تھے۔ شہاب الدین غوری کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیکڑوں غلاموں کو اپنے بیٹوں کی طرح پالا پوسا اور ان کو بہت اعلیٰ تربیت دی۔ اسی تربیت کا اعجاز تھا کہ شہاب الدین غوری کے غلاموں میں سے بڑے لائق غلاموں نے وسیع و عریض علاقوں کا انتظام سنبھالا اور اپنی دانش مندی، فراست اور اہلیت کی بدولت ان علاقوں کو ناصرف دشمنوں کی یلغار سے محفوظ رکھا بلکہ اپنی رعایا کو امن، سکون اور خوشحالی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

ان میں برصغیر کے اولین فرمانروا قطب الدین ایبک بھی شامل ہیں، غزنوی، غور اور بنیان (بنوں) کے علاقوں پر کامیابی سے حکومت کرنے والے تاج الدین یلدوز کا بھی نام آتا ہے اور برصغیر پاک و ہند کے نامور حکمران شمس الدین التمش بھی غلاموں کے سلسلہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناصرالدین قباچہ بھی شہاب الدین غوری کے غلام تھے۔ شہاب الدین نے ان کی صلاحیتوں کا بہت ابتدائی میں اندازہ کر لیا تھا۔

ناصرالدین بہت سلیجھے ہوئے، سمجھدار، دور اندیش اور مہذب انسان تھے۔ شہاب الدین کی صحبت میں رہ کر اور ان کے مقرر کردہ اساتذہ سے تربیت پا کر یہ جوہر اور بھی زیادہ آبدار ہو گیا۔ وہ کئی سال تک مختلف شعبوں میں اہم ذمہ داریوں پر فائز رہے اور انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ مختلف ذمہ داریاں نبھانے کے باعث ناصرالدین کی صلاحیتیں مزید نکھر گئیں، ان کے تجربہ میں بہت اضافہ ہوا اور ان کے انتظامی اسلوب میں بڑی پختگی آ گئی۔

شہاب الدین غوری 567ھ/1173ء سے 602ھ/1206ء تک برصغیر پاک و ہند، ایران کے کچھ حصوں اور افغانستان پر حکمران رہے۔ اس پورے عرصے کے دوران میں انہیں مختلف طاقتوں سے ٹکر لینی پڑی۔ کئی مقامات پر سرکش قبائل کی سرکوبی کے لیے اقدامات کرنے پڑے، ان تمام کارروائیوں کے نتیجے میں انہوں نے ایک بہت وسیع مملکت قائم کی، جس کے باسی امن و سکون کی فضا میں سانس لیتے تھے۔ شہاب الدین غوری نے تاج الدین یلدوز کو غور اور غزنی کا انتظام سونپا، اپنے لائق غلام قطب الدین ایبک کو برصغیر میں شمالی ہندوستان کا حاکم بنایا (بعد میں قطب

الدین ایک پورے برصغیر پاک و ہند کے حکمران بنے) اور اچ کا انتظام ناصر الدین قباچہ کے حوالے کیا۔

ناصر الدین قباچہ سے قبل اچ اور ملتان کے علاقے کی ذمہ داری ناصر الدین ایتم کے پاس تھی۔ اس دوران میں شہاب الدین غوری کو قرہ خطائیوں (ترکستان کی ایک غیر مسلم قوم) اور ترکستان کے حکمرانوں سے جنگ لڑنا پڑی۔ اس جنگ میں ناصر الدین ایتم نے بڑی بہادری اور بے خوفی کا ثبوت دیا اور شہاب الدین غوری کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے۔ خطائی ان کی اس دلیری سے بہت جھنجھلائے ہوئے تھے، موقع پا کر انہوں نے ناصر الدین ایتم کو شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد شہاب الدین غوری نے اچ کا علاقہ اپنے قابل غلام ناصر الدین قباچہ کے سپرد کر دیا۔

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اچ کے علاقے کے بارے میں چند باتیں تحریر کر دی جائیں۔ اس لفظ کا تلفظ اچ، اوچ، اوچہ، اوچہ، کئی طرح کیا جاتا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ نے تمام تلفظ درج کرنے کے بعد 'اچ' کو ترجیح دی ہے۔ یہ لفظ سنسکرت کے لفظ 'اوچا' سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونچا، بلند کے ہیں۔ یہ ایک عہد میں بہت بڑا شہر تھا، یہ شہر پاکستان کے موجودہ بہاولپور ڈویژن کی حدود میں واقع تھا۔ اس علاقے میں اچ نام کا ایک چھوٹا سا شہر آج بھی موجود ہے۔ یہ شہر دریائے چناب اور ستلج کے سنگم کے قریب ایک سطح مرتفع پر واقع ہے اور اس کا فاصلہ بہاولپور سے 38 میل ہے۔ ناصر الدین قباچہ نے اچ کو بہت ترقی دی۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کیا۔

قطب الدین ایک سے ناصر الدین قباچہ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ قطب الدین ایک اس ذہین نوجوان سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی ناصر الدین قباچہ سے کر دی اور جب اس بیٹی کا انتقال ہو گیا تو اپنی دوسری بیٹی بھی ناصر الدین قباچہ کی زوجیت میں دے دی۔ بڑی بیٹی سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام علاؤ الدین مسعود بہرام شاہ رکھا گیا۔ ناصر الدین قباچہ اپنے خسر، قطب الدین ایک کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے قطب الدین ایک کی بالادستی ہمیشہ تسلیم کی اور تمام امور میں ان کی اطاعت کرتے رہے۔ وہ اپنے خسر سے ملنے کے لیے اکثر اچ سے دہلی جایا کرتے تھے۔ 607ھ/1210ء میں قطب الدین ایک کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کے بعد شمس الدین التمش بھی قطب الدین ایک کے داماد تھے اور اس لحاظ سے ناصر الدین قباچہ کے قرابت دار تھے۔

ناصر الدین قباچہ نے قطب الدین ایک کی وفات کے بعد مناسب سمجھا کہ اپنی حکومت کو خود مختار بنادیں اور اسے وسعت دیں چنانچہ انہوں نے ملتان پر تسلط قائم کر لیا اور سیوستان اور دیول کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ سیوستان سے مراد سہوان کا علاقہ ہے اور دیول سے مراد دیہل کا مشہور ساحلی علاقہ ہے۔ گویا کہ پورا سندھ ان کے زیر نگیں آ گیا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے لاہور پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کو مشرقی پنجاب تک وسیع کر لیا اور سرستی، سرہند اور کہرام کے علاقے بھی ان کے زیر تسلط آ گئے لیکن تاج الدین یلدوز اور پھر التمش نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ بہر حال سندھ اور ملتان کے علاقوں پر ناصر الدین قباچہ کی حکومت اس کے بعد بھی اٹھارہ برس تک قائم رہی۔

ناصر الدین قباچہ نہایت ذہین، باصلاحیت، فیاض، اچھے منتظم اور علم دوست حکمران تھے۔ انہوں نے بائیس سال تک سندھ اور ملتان کی سرزمین کو اور اس طرح برصغیر کے باقی پورے حصے کو غیر ملکی حملہ آوروں سے محفوظ رکھا۔ اگر وہ چنگیزی لشکر کا جرات سے مقابلہ نہ کرتے تو ممکن تھا کہ تاتاریوں کا طوفان سندھ، ملتان اور پھر برصغیر کے باقی حصوں کو بھی لپیٹ میں لیتا..... لیکن..... تاریخ نے ناصر الدین قباچہ کو اس وجہ سے یاد نہیں رکھا کہ انہوں نے ایک کامیاب حکومت کی یا برصغیر کے اس حصہ میں امن و امان قائم رکھا بلکہ تاریخ نے ناصر الدین قباچہ کو علم سے ان کی والہانہ محبت اور شیفنگی کی وجہ سے یاد رکھا ہے۔

ناصر الدین قباچہ کا یہ کارنامہ نہایت قابل تحسین ہے کہ اچ اور ملتان میں علم کی ترویج و اشاعت کا باقاعدہ آغاز قباچہ ہی کے دور میں ہوا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا، تاتاریوں کے حملوں کے باعث وسط ایشیا اور ایران سے بہت سی علمی شخصیات نے برصغیر کا رخ کیا اور ان میں سے کئی افراد نے ملتان اور اچ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ ناصر الدین قباچہ نے ان افراد کی بہت تعظیم کی اور علم کے فروغ کے لیے صاحب علم افراد کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ بعض علماء اور دانشوروں کو تو خود قباچہ نے دعوت دے کر اپنے پاس بلوایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق برصغیر میں قائم ہونے والے اولین مدرسوں میں سے ایک ملتان میں ناصر الدین قباچہ کے عہد میں قائم ہوا۔ یہ حضرت بہاء الدین زکریا (575ھ.....661ھ) کی علمی درس گاہ تھی جو 605ھ میں قائم ہوئی۔ اس درس گاہ سے ہزاروں طالبان علم نے قرآن، حدیث، فقہ کے علاوہ خطاطی، علم قرأت اور تجارت کی تعلیم حاصل کی۔

قباچہ ہی کے عہد میں ایک بڑے مؤرخ اور فقیہ کا نام تاریخ میں ابھرتا ہے۔ یہ قاضی منہاج الدین بن قاضی سراج الدین ہیں جو منہاج السراج کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ غوری حکمرانوں کے دارالحکومت فیروز کوہ میں 589ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فیروز کوہ ہی میں حاصل کی۔ چنگیزی مظالم سے متاثر ہو کر 35 سال کی عمر میں برصغیر چلے گئے اس کے بعد منہاج السراج کو التتمش اپنے ساتھ دہلی لے گئے جہاں 645ھ میں انہوں نے ناصری نامہ لکھی یہ کتاب اب موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد 658ھ میں انہوں نے تاریخ کی مشہور کتاب طبقات ناصری مکمل کی۔ اس کتاب میں انہوں نے ناصر الدین قباچہ کے حالات بھی درج کیے ہیں۔

مشہور عالم دین مولانا قطب الدین کاشانی ناصر الدین قباچہ کی دعوت پر ترکستان سے ہجرت کر کے ملتان آئے تو قباچہ نے ملتان میں ان کے لیے بہت بڑا مدرسہ اور ساتھ ہی مسجد تعمیر کروائی اور مولانا کاشانی کو اس مدرسہ کا صدر معلم مقرر کر دیا۔ مولانا کاشانی کا یہ مدرسہ صدیوں تک قائم رہا۔ مولانا، اپنے ساتھ منطق اور علم کلام کی کتب کا بڑا ذخیرہ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ملتان میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔ ناصر الدین قباچہ اہل علم کو دوست رکھتے تھے۔ ان کی علمی محفلوں میں شمس الدین بلخی جیسے بڑے خطاط و شاعر، فضل ملتان جیسے عالم اور محمد بن یحییٰ العوفی جیسے علم الرجال اور جرح و تعدیل کے ماہر اور مشہور ادیب شریک ہوتے تھے۔ قباچہ کے وزیر عین الملک بھی بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بھی علم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

تاریخ میں عوفی کے کئی لقب درج کیے گئے ہیں جن میں نور الدین، سدید الدین اور جمال الدین شامل ہیں۔ عوفی، مشہور صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن عوف کی اولاد میں سے ہیں اسی نسبت سے عوفی کہلاتے ہیں۔ بخارا میں پیدا ہوئے وہیں ابتدائی تعلیم پائی اس کے بعد تحصیل علم کے لیے ماوراء النہر (دریائے جیحون اور سیحون کا درمیانی علاقہ) خراسان، سمرقند، خوارزم، ہرات، غزنی اور دیگر بہت سے علاقوں کا سفر کیا۔ 607ھ میں وہ تاتاری فتنہ سے بچنے کے لیے سندھ چلے گئے جہاں ناصر الدین قباچہ نے ان کا خیر مقدم کیا جو ان دنوں سندھ اور ملتان کے حکمران تھے۔ 617ھ میں ناصر الدین قباچہ نے عوفی کو سرکاری عہدہ دیا 625ھ تک عوفی اچ میں مقیم رہے اسی دوران میں انہوں نے کتاب 'لباب الالباب' تحریر کی اور اسے قباچہ کے وزیر عین الملک فخر الدین الاشعری کے نام منسوب کیا۔

'لباب الالباب' فارسی زبان کے شاعروں کا بہت اہم اور سب سے قدیم تذکرہ ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک کے تین سو ستر شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں ان حکمرانوں، علماء اور وزراء کے حالات زندگی بھی موجود ہیں جو کبھی کبھار شعر کہتے تھے۔ اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جن شعراء کے حالات اور اشعار درج کیے گئے ہیں ان میں سے بعض شعراء کے بارے میں کسی اور کتاب سے معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تاتاریوں کی یلغار کے وقت جو شعراء کرام اپنا دیوان مرتب نہیں کر سکے تھے

ان کا تذکرہ اور کلام بھی اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ناصر الدین قباچہ نے عوفی سے ایک اور اہم کتاب بھی لکھوائی۔ یہ کتاب 'جوامع الحکایات ولوامع الروایات' ہے۔ کتاب ابھی زیر تصنیف تھی کہ شمس الدین التتمش نے اچ پر حملہ کر دیا اور قباچہ بکھر چلے گئے۔ جو لوگ قباچہ کے ساتھ بکھر کے قلعے میں گئے تھے ان میں عوفی بھی تھے۔ قباچہ کے انتقال کے بعد عوفی التتمش کے ساتھ دہلی چلے گئے جہاں انہوں نے اس کتاب کو مکمل کیا اور اسے التتمش کے وزیر نظام الملک جنیدی سے منسوب کیا۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اس میں تاریخی کہانیاں شامل ہیں جن کو سبق آموز اور ادبی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایسی اہم معلومات موجود ہیں جو تاریخ کی بہت سی دیگر بڑی کتب میں نہیں ملتی ہیں، کیونکہ عوفی نے اس کتاب کی تیاری میں ایسی بہت سی کتب سے استفادہ کیا جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب اسلام، ایران اور برصغیر کی تاریخ میں مصنف کے زمانے یعنی ساتویں صدی ہجری کے ربع اول تک کے بڑے بڑے آدمیوں کے حالات کے لیے اہم ترین تاریخی ماخذ ہے۔ عوفی نے 620ھ میں عربی زبان کی ایک کتاب 'الفرج بعد الشدة' کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس میں بھی تاریخی حکایات تھیں تاہم عوفی کی یہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی۔ عوفی نے اپنی کتاب جوامع الحکایات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ناصر الدین قباچہ کے دور میں ایک اور اہم کتاب لکھی گئی۔ یہ کتاب سندھ کی سب سے قدیم تاریخ 'چچ نامہ' ہے۔ اس کتاب کو تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسویں میں قاضی اسماعیل بن علی ثقفی نے مرتب کیا تھا عربی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا نام 'الہندو السند ومنہاج المسالک' رکھا گیا۔ یہ کتاب نایاب تھی لیکن ایک شخص علی بن حامد بن ابوبکر کوفی کو جو عراق سے اچ آ گئے تھے اس کتاب کا ایک نسخہ بکھر میں مل گیا۔ 613ھ / 1216ء میں علی بن حامد نے اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور 613ھ / 1216ء میں اسے قباچہ کے اہل علم وزیر عین الملک کو پیش کیا۔ علی بن حامد کو اس کتاب کے اوراق، بکھر کے ثقفی خاندان سے حاصل ہوئے تھے۔ علی بن حامد نے 'چچ نامہ' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب وہ صحرا نوردی اور ملک ملک کی سیر کے بعد اچ پہنچے تو انہیں یہاں بڑا سکون ملا اور انہوں نے یہاں بڑی آسودگی کی زندگی بسر کی۔ 'چچ نامہ' سندھ کی بے حد اہم تاریخ ہے اس میں جغرافیائی معلومات بھی ہیں۔ بعد میں مرزا قليچ بیگ نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ناصر الدین قباچہ کے یہ علمی کارنامے ہیں جو قباچہ کا نام تاریخ کے ایوانوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

☆☆☆

سکندر لودھی

برصغیر کے ایک اچھے حکمران جنہوں نے مشہور شہر آگرہ آباد کیا

وہ شخص زمین کھود رہا تھا!

اتر پردیش کے شہر سنجل کے اس شخص کو شاید کوئی تعمیر کرنی تھی یا کوئی اور کام تھا، اچانک اس کی کدال کسی شے سے ٹکرائی۔ اس نے حیران ہو کر ہاتھ روک لیا۔ غور سے دیکھنے پر کوئی شے مٹی میں دبئی ہوئی نظر آئی۔ اس شخص نے احتیاط سے مٹی کھود کر اس شے کو نکال لیا۔

یہ ایک چھوٹی سی دیگ تھی۔ اس شخص نے دیگ کو کھولا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیگ میں بہت ساری اشرفیاں چمک رہی تھیں۔ اس شخص کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس غیبی امداد سے وہ بہت مسرور تھا۔ اب وہ اپنی تمام ضرورتیں پوری کر سکتا تھا، لیکن اس کی خوشی جلد ہی دم توڑ گئی۔ چند دنوں بعد کسی نہ کسی طرح یہ خبر عام ہو گئی کہ اس شخص کے پاس خزانہ نکلا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سنجل کے حاکم قاسم خان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اس شخص کو بلایا اور ساری دولت اس سے لے لی۔ پھر مملکت کے فرمانروا کو خبر کی۔ فرمانروا نے حکم دیا۔ ”ساری دولت اسی شخص کو واپس کر دی جائے۔“ قاسم نے عرض کی: ”حضور یہ دولت اس شخص کو ملی ہے جو اس کے لائق نہیں ہے۔“ فرمانروا نے کہا: ”اے نادان! اگر دینے والا اس شخص کو اس لائق نہ سمجھتا تو اسے نہ دیتا۔ لائق اور غیر لائق سب اسی کے بندے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ یہ دولت اسی کے حوالے کر دیجیے اور جب تک اس دولت کے لیے محفوظ جگہ تیار نہ ہو، اس کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہے۔“

یہ حکمران تھے۔ برصغیر میں لودھی خاندان کے دوسرے فرمانروا سکندر لودھی، جن کا 27 سالہ عہد علمی ترقی، امن، خوشحالی اور اعلیٰ انتظام کی خوبیوں سے عبارت ہے۔ سکندر لودھی نے اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے جو وسیع حکومت قائم کی تھی، اس میں پاکستان اور بھارت کے پنجاب (مغربی اور مشرقی پنجاب) ہریانہ، اتر پردیش، بہار اور کچھ ملحقہ علاقے اور راجستھان کے بعض حصے شامل تھے۔ ان کی اہم ترین فتوحات میں جو پور اور بہار شامل ہیں۔

سکندر لودھی کا اصل نام نظام خان ہے۔ ان کا سنہ پیدائش تاریخ کی کتب میں نہیں ملتا، البتہ تاریخ شاہی میں احمد یادگار نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی نے 17 شعبان 894ھ کو 18 سال کی عمر میں دہلی کی حکومت سنبھالی، اس لحاظ سے سکندر کا سنہ پیدائش 876ھ/1471ء بنتا ہے۔ سکندر کا انتقال 923ھ/1517ء میں ہوا۔ اس اعتبار سے انہوں نے تقریباً 46 برس کی عمر پائی۔ برصغیر میں لودھی خاندان کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کی انگلی تھام کر چھ سو برس قبل فیروز شاہ تغلق کے دور میں جانا پڑے گا۔

کابل اور اطراف کے علاقوں سے لودھی خاندان کے بہت سے افراد تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔ انہی میں سے ملک بہرام بھی تھے۔ برصغیر کے مشہور حکمران فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں (752ھ/1388ء.....790ھ/1389ء) ملک بہرام ملتان چلے آئے، جہاں انہوں نے ملتان کے حاکم ملک مردان دولت کی ملازمت اختیار کر لی۔ ملک بہرام کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک ملک کالا اور دوسرے ملک سلطان شاہ تھے۔ ملتان کے گورنر خضر خان تھے۔ ملک سلطان شاہ، خضر خان کے پاس ملازم ہو گئے۔ ملک سلطان کو اسلام خان کا خطاب ملا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں مشرقی پنجاب کے مقام سرہند کا حاکم بنادیا گیا۔ ملک کالا کو دورالہ کا حاکم بنایا گیا۔ ان کے باقی بھائی بھی ساتھ رہنے لگے۔

کچھ عرصے بعد ایک حادثہ پیش آیا۔ ملک کالا کامکان کسی وجہ سے مہندم ہو گیا اور ملے میں دب کر ملک کالا کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان دنوں امید سے تھیں ان کا بچہ بچا لیا گیا۔ اس بچے کا نام بہلول رکھا گیا۔ ننھا بہلول ماں کی آغوش سے تو محروم تھا ہی، تھوڑے دن بعد باپ کے سائے سے بھی محروم ہو گیا، ملک کالا تازعات میں مارے گئے۔ بہلول کے چچا اسلام خان نے اپنے معصوم بھتیجے کو سر ہند بلا لیا۔

بہلول بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ اسلام خان نے ان میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو محسوس کر کے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور ان کے بڑے ہونے پر اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔ اسلام خان کی یہی خواہش تھی اس زمانے میں دہلی پر سلطان محمد شاہ کی حکومت تھی جن کا تعلق خاندان سادات سے تھا۔ خاندان سادات، خاندان تغلق کی حکومت کے خاتمے کے بعد 816ھ/1413ء میں برسر اقتدار آیا تھا، لیکن اس خاندان کی حکومت سمٹ کر بہت چھوٹی سی رہ گئی تھی۔

بہلول نے سر ہند کا حکمراں بننے کے بعد محسوس کیا کہ برصغیر بہت سی چھوٹی چھوٹی غیر مستحکم حکومتوں کے درمیان بٹ چکا ہے چنانچہ ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم ہونی چاہیے لہذا انہوں نے پنجاب کے بیشتر علاقوں کو ایک ایک کر کے فتح کر لیا، جن میں لاہور اور ملتان بھی شامل تھے۔ خاندان سادات کے سلطان محمد شاہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے علاء الدین کو حکومت ملی اس وقت تک صورت حال اور بگڑ چکی تھی۔ بہلول لودھی کے پاس مشرقی اور مغربی پنجاب تھا۔ گجرات، دکن، مالوہ، جوئیور، اور بنگال میں الگ الگ حکمرانوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ علاء الدین کے پاس صرف دہلی کا شہر اور چند دیہات رہ گئے تھے۔ آخر بہلول نے دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔

17 ربیع الاول 855ھ/19 اپریل 1451ء کو بہلول تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے حکمراں بننے کے بعد جہاں نظم و نسق پر توجہ دی وہیں نئے علاقوں کو فتح کرنے یا ان کے حکمرانوں کو مطیع بنانے کا کام بھی جاری رکھا، چنانچہ ان کی اس مہم کے نتیجے میں میوات، سنہل، کول، برہان آباد، سکیت (اب یہ شہر سکیت کہلاتا ہے) کے حکمرانوں نے اطاعت قبول کی، بھون گاؤں کا راجا راجے پر تاپ مطیع ہوا..... بہلول نے مختلف علاقوں میں اپنے اہل عزیزوں اور بیٹوں کو حاکم بنادیا تھا۔ ان کے ایک بیٹے نظام کان بھی تھے جو بعد میں سکندر لودھی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ نظام خان کو دو آہ یعنی گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے کی حکومت ملی تھی۔ شعبان 894ھ/ جولائی 1489ء میں بہلول بیمار ہو گئے اور سکیت کے ایک نواحی قصبہ بھداؤنی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بہلول لودھی کے بعد ان کے لائق بیٹے نظام خان نے زمام کار سنبھالی۔ انہوں نے اپنے لیے سکندر لودھی کا لقب پسند کیا۔ سکندر کے سامنے بہت بڑی آزمائش تھی کیونکہ اس وقت بھی برصغیر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان ریاستوں کو یکجا کر کے ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ سکندر لودھی نے 17 شعبان 894ھ/16 جولائی 1489ء کو دہلی کی حکومت سنبھالی۔ ان کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ اپنے ہی خاندان کے افراد کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ ایک متحدہ حکومت کے قیام میں مدد دیں۔ ان کے چھوٹے بھائی عالم خان، راپری کے حاکم تھے۔ سکندر نے راپری کی طرف پیش قدمی کی۔ عالم خان راپری سے چلے گئے لیکن سکندر نے انہیں بلا کا اٹاواہ کا حاکم بنادیا۔ دوسرے بھائی باریک شاہ، جوئیور کے حاکم تھے۔ سکندر نے باریک کو اطاعت کی دعوت دی، لیکن باریک نے انکار کر دیا۔ اس پر قنوج کے قریب دونوں فوجوں میں لڑائی ہوئی جس میں باریک کو شکست ہوئی، لیکن سکندر نے فراخ دلی کے ساتھ باریک کو معاف کر دیا اور انہیں دوبارہ جوئیور کا حکمراں بنادیا۔

923ھ/1517ء میں سکندر کام کی زیادتی کی وجہ سے بیمار رہنے لگے۔ یہی بیماری ان کے لیے پیام اجل لے کر آئی۔ 7 ذی قعدہ 923ھ/21 نومبر 1517ء کو اس عظیم حکمراں نے آگرہ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ انہیں دہلی لے جا کر ان کے اپنے لگائے ہوئے باغ 'جود' میں ان کے والد کی قبر کے نزدیک سپرد خاک کیا گیا۔ بعد میں شیر شاہ سوری کے بیٹے اسلام شاہ سوری نے بہلول لودھی اور سکندر لودھی کی قبروں پر مقبرے تعمیر کروائے، جو آج بھی موجود ہیں۔ سکندر لودھی کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم لودھی نے حکومت سنبھالی۔ وہ 9 برس تک حکمراں رہے۔ ان کے بعد برصغیر کی حکومت 932ھ/1526ء میں خاندان مغلیہ کو منتقل ہو گئی۔

سکندر لودھی علم دوست اور علم پرست حکمران تھے اور علماء کو اپنا ہم نشین رکھنا پسند کرتے تھے۔ تاریخ ہندوستان کے مصنف مولوی ذکاء اللہ کے مطابق سترہ جید علماء کرام سکندر لودھی کے پاس رہتے تھے۔ سکندر لودھی کے دور میں ملتان سے دو بڑے علماء کرام شیخ عبداللہ تلنسی (تلنبہ، ملتان کے قریب ایک قصبہ ہے) اور شیخ عزیز اللہ دہلی تشریف لائے۔ سکندر نے ان بزرگوں کی بہت تعظیم کی۔ ان علماء کرام نے درس و تدریس کے معیار کو پہلے سے بھی بہتر بنادیا اور زیادہ کتابیں نصاب میں داخل کیں۔

سکندر، شیخ عبداللہ کی مجلس درس میں خود شریک ہوتے تھے، لیکن اس طرح کہ شیخ کے شاگردوں کو پتہ نہ چلے۔ وہ چھپ کر ایک گوشے میں بیٹھ جاتے تاکہ درس کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ جب درس ختم ہو جاتا تو سکندر اٹھ کر شیخ کے پاس بیٹھ جاتے اور دیر تک ان کی باتوں سے استفادہ کرتے۔ سکندر ہی کے زمانے میں مولانا رفیع الدین شیرازی جو اچھے محدث تھے شیراز سے دہلی آئے۔ سکندر نے ان کی بڑی توقیر کی۔ مولانا شیرازی نے آگرہ میں درس حدیث کا سلسلہ خاصے عرصہ تک جاری رکھا۔

سکندر لودھی کا ایک اہم کارنامہ فارسی زبان کا تحفظ اور اس کا فروغ ہے۔ سکندر نے جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو برصغیر پاک و ہند تہذیبوں کے عمل سے گزر رہا تھا۔ دہلی کی مرکزی حیثیت ختم ہو جانے کے باعث بہت سی خود مختار ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ ان ریاستوں میں بیشتر حاکم مسلمان تھے، لیکن ہر جگہ مقامی رجحانات غالب تھے مثلاً بنگال میں بنگالی زبان رواج پا رہی تھی، جنوبی ریاستوں میں دکنی زبان کا چلن تھا ایک دور ریاستوں میں مرہٹی زبان کو اہمیت دی جا رہی تھی یوں فارسی زبان اپنی سرکاری حیثیت تقریباً کھو بیٹھی تھی۔ سکندر لودھی نے ان تمام مقامی زبانوں کو مکاحقہ اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ فارسی کو سرکاری سطح پر رواج دیا۔

برصغیر میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد بھی حساب کتاب مقامی زبانوں میں رکھا جاتا تھا، ہندو پٹواری، قانون گو اور محاسب الگ الگ مقامی زبانوں میں ریکارڈ رکھتے تھے۔ سکندر لودھی نے حکم دیا کہ حسابات فارسی زبان میں رکھے جائیں، چنانچہ ہندو ملازمین کو فارسی زبان سیکھنی پڑی۔ بہت سے ہندوؤں نے فارسی میں کمال حاصل کیا اور ان میں فارسی کے بہت اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ مثلاً پنڈت ڈوگرمل فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ہندوؤں کے فارسی سیکھنے سے ایک اور بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شکریت کی کئی اچھی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں کیے گئے۔ سکندر لودھی خود بھی نئی کتابیں تصنیف کروانے اور تراجم کروانے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ علم کی ہر شاخ سے متعلق کتابیں لکھواتے تھے۔

سکندر لودھی کے دور کی ایک مفید اور اہم کتاب معدن الشفاء ہے جسے 'طب سکندری' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کو میاں بھوہ نے تحریر کیا تھا جو سکندر کے امراء میں سے ایک تھے انہوں نے سکندر سے کہا تھا کہ حکمائے ہند کی کتابوں کا فارسی زبان میں ایسا خلاصہ مرتب کیا جانا چاہیے جس میں تمام مشہور ہندوستانی طبیبوں کے نسخے اور دواؤں کا ذکر آجائے۔ سکندر کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے خراسان اور ہندوستان کے طبیبوں کو جمع کیا اور یونانی اور ہندوستانی طب کی کتابوں سے مضامین کا انتخاب ان اطباء سے کروایا۔ میاں بھوہ نے اس کتاب کو مرتب کیا۔ اس کتاب کے پانچ سو صفحات تھے اور اس میں گیارہ سوسات امراض اور ان کی دواؤں کا ذکر تھا۔ ہندوستان میں اسلامی طب کی تدوین میں اس کتاب کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب آج بھی استعمال ہوتی ہے۔ نولکشور پریش لکھنؤ نے اسے شائع کیا ہے۔ سکندر کے دور میں مختلف قسم کے قدیم مخطوطات بھی جمع کیے گئے۔ ایک فرہنگ، فرہنگ سکندری کے نام سے مرتب کی گئی۔

سکندر لودھی کے عہد کی سب سے مشہور ادبی شخصیت شیخ جمالی کی ہے۔ شیخ جمالی برے پائے کے صوفی شاعر اور تذکرہ نگار تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ سیر و سیاحت میں گزارا۔ وہ عراق، خراسان، روم اور شام گئے۔ ہرات میں وہ مولانا جامی سے ملے۔ مولانا جامی ان سے بہت متاثر ہوئے۔ سکندر نے بھی جب شیخ جمالی کے اشعار سنے تو وہ ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ جب شیخ جمالی دہلی آئے تو سکندر لودھی نے ایک قطعہ کہا جس میں شیخ جمالی سے 'سنبھل' آنے کی درخواست کی گئی تھی۔ ان دنوں سکندر 'سنبھل' میں تھے۔ سکندر نے یہ قطعہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دہلی بھیجا۔ انہوں نے شیخ سے ان کی مثنوی کی کتاب 'مہر و ماہ' کی بھی درخواست کی۔ شیخ خود تو نہ آئے البتہ مثنوی کی کتاب بھیج دی۔

سکندر نے شیخ جمالی کے استاد شیخ سماء الدین سے درخواست کی کہ وہ شیخ جمالی کو لے آئیں۔ شیخ سماء الدین نے شیخ جمالی کو راضی کر لیا۔ جب شیخ جمالی سنبھل کے قریب پہنچے تو سکندر لودھی نے دو میل آگے آکر شیخ کا استقبال کیا۔ بعد میں سکندر لودھی نے شیخ جمالی کو اپنے سے بہت قریب رکھا۔ شیخ بھی سکندر سے بھی متاثر ہوئے اور سکندر کی وفات پر انہوں نے بہت دردناک اشعار کہے۔

شیخ جمالی کی اہم کتاب 'سیر العارفین' ہے جس میں ہندوستان کے مشائخ کا تذکرہ ہے۔ یہ اولیاء کرام کی مستند سوانح عمری ہے۔ ان کا دیوان آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ سکندر کے دور میں جو پور کے ایک عالم شیخ الہدایہ تھے۔ انہوں نے فقہ کی شرح لکھی۔

سکندر لودھی خود بھی فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے اور 'کل رخ' تخلص کرتے تھے۔ وہ اپنے اشعار کے سلسلہ میں شیخ جمالی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ سکندر نے روزانہ چند گھنٹے اہل علم اور شعراء کے ساتھ بحث و مباحثہ کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔

سکندر علم کے شیدائی تھے اور عالموں کو دوست رکھنا پسند کرتے تھے۔ وہ عمومی علم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے خواہش مند تھے۔ سکندر علماء کی رائے کا بڑا احترام کرتے تھے اور شرعی مسائل ان سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں گو کہ تھوڑی سی سختی تھی اور مذہب کے معاملے میں وہ قدرے جذباتی ہو جاتے تھے لیکن جب انہیں شرعی احکام کا حوالہ دیا جاتا تو وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کر کے درست موقف اختیار کر لیتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب انہیں علم ہوا کہ کورو کھیشتر میں بہت سے ہندوؤں نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ وہ وہاں مندر میں پوجا پاٹ کرتے ہیں اور تالاب میں اشان کرتے ہیں۔ سکندر نے ایک بڑے عالم شیخ عبداللہ سے مشورہ کیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہنگامہ کرنے والے ہندوؤں کو قتل اور ان کے مندر کو مسمار کر دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ ذمیوں کی عبادت گاہ کو گرانا شریعت کے خلاف ہے۔ اس پر سکندر برہم ہو گئے اور کہنے لگے: "آپ بھی کفار کے ساتھی ہیں میں پہلے آپ کا اور پھر کفار کا خاتمہ کروں گا۔" شیخ نے اطمینان سے فرمایا: "زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے آپ نے جو کچھ پوچھا میں نے حضور کے احکام کے مطابق جواب دیا اگر آپ کو اس کی قدر نہ تھی تو آپ نے پوچھا ہی کیوں؟" شیخ کا یہ جرات مندانہ جواب سن کر سکندر نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

مشہور شہر آگرہ بسانے کا اعزاز سکندر لودھی ہی کو حاصل ہے۔ سکندر اپنا دار الحکومت کسی موزوں جگہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس غرض سے دریائے جمنا کے کنارے کا انتخاب کیا۔ 911ھ/1505ء میں وہ دہلی سے متھرا آئے۔ پہلے انہوں نے ماہرین کی ایک جماعت اس علاقے میں بھیجی جہاں نیا شہر بسانا مقصود تھا۔ ماہرین کشی میں سوار ہو کر دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلے۔ انہوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر وہ مقام پسند کیا جہاں آج کل آگرہ آباد ہے۔ انہوں نے سکندر لودھی کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

سکندر خود اس جگہ پہنچے۔ انہیں یہاں دو بلند ٹیلے نظر آئے۔ انہوں نے ایک ملاح سے پوچھا کہ ان دو بلند یوں میں سے کون سی بہتر ہے۔ ملاح نے کہا 'جو بھی آگرہ یعنی 'سعد' ہو۔ سکندر نے مسکرا کر کہا اس شہر کا نام 'آگرہ' ہوگا۔ یہ روایت تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی میں خواجہ نعمت اللہ ہروی کی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہندوستان میں مختلف بات لکھی ہے۔ ان کے مطابق ملاح نے سکندر کا سوال سن کر کہا تھا "وہ جو آگرہ" ہے یعنی وہ جو آگے والا ٹیلہ ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے کہ آگرہ کا لفظ "اگور" سے نکلا ہے جس کے معنی 'نمک دان' کے ہیں اس علاقے کو آگرہ اس لیے کہا گیا کہ یہاں کی زمین میں شوریٹ (نمک) بہت تھی۔

لودھی خاندان کے عظیم فرمانروا سکندر لودھی نے اپنے 27 سالہ دور حکومت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔ سکندر لودھی کے ان کارناموں کی وجہ سے تاریخ ان کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرے گی۔



اورنگ زیب عالمگیر

ذہین، بہادر، منتظم اور متقی حکمران جنہوں نے برصغیر کو ایک فلاحی ریاست بنادیا

وہ ایک تپتا ہوا دن تھا۔

گرمی شباب پر تھی اور شہر کے اس حصے میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ایک ہاتھی غضب ناک ہو کر ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا چلا آ رہا تھا۔ طیش میں آئے ہوئے ہاتھی نے کتنوں ہی کو کچل کر زخمی کر دیا تھا۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ وہ بگڑے ہوئے ہاتھی پر قابو پانے کی کوئی تدبیر کرے۔

اچانک ایک طرف سے ایک نوجوان نمودار ہوا۔ اسکی عمر بمشکل چودہ پندرہ برس ہوگی۔ اسنے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدست ہاتھی کا مقابلہ کیا اور اسے ایک جانب محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ہاتھی پر جلد ہی قابو پالیا گیا اور خوف زدہ شہریوں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ اس نوجوان کا نام اورنگ زیب تھا جو آگے چل کر اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے برصغیر کا حکمران بنا اور اس نے بے مثال لیاقت، ذہانت اور بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے برصغیر کو ایک زریں ریاست بنادیا۔

اورنگ زیب عالمگیر 15 ذی قعدہ 1027ھ (24 اکتوبر 1618ء) کی رات شاہزادہ خرم (مستقبل کے شاہ جہاں) کی بیوی ممتاز محل کے لطن سے پیدا ہوئے، بچے کے دادا، جہانگیر نے نام رکھا۔ اورنگ زیب کی عمر چار سال ہی تھی کہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں سے اختلافات کی وجہ سے ان کے بیٹے شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) نے اپنے والد (جہانگیر) کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کے نتیجے میں شاہزادہ خرم اپنے اہل و عیال سمیت دکن، اڑیسہ، بنگال اور بہار میں مارے مارے پھرتے رہے۔ شاہی فوجوں سے کئی بار شکست کھانے کے بعد بالآخر انہیں باپ سے معافی مانگنی پڑی، جہانگیر نے معذرت قبول کرتے ہوئے انہیں بالا گھاٹ کی نظامت کے علاوہ اسیر گڑھ اور رہتاس کے قلعے بھی عطا کیے تاہم شاہزادہ خرم کو اپنے دو بیٹوں، وارا شکوہ اور اورنگ زیب کو، جہانگیر کے پاس لاہور بھیجنا پڑا۔ ان کا ایک اور بیٹا شاہزادہ شجاع پہلے ہی سے جہانگیر کے پاس تھا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر تقریباً آٹھ برس تھی تاہم اس واقعہ کے ایک سال بعد ہی یعنی 1037ھ (1627ء) میں جہانگیر وفات پا گئے اور شاہزادہ خرم، شہاب الدین محمد، شاہ جہاں کے لقب سے ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔

شاہ جہاں نے اورنگ زیب کے لیے بہترین اساتذہ مقرر کیے چنانچہ اورنگ زیب نے سعد اللہ خان، محمد صالح، میر محمد ہاشم، ملا سید محمد قنوجی اور ملا احمد جیون ایسے علما و فضلاء سے مروجہ علوم حاصل کیے۔ حصول علم کا سلسلہ اورنگ زیب نے آخری عمر تک جاری رکھا۔

اورنگ زیب بچپن ہی سے ذہین، شجاع اور بہادر تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اورنگ زیب کو بندھیل کھنڈ (یوپی) کے باغی راجہ کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ اورنگ زیب دو سال تک اس مہم میں مصروف رہے۔ یہ ان کی عسکری تربیت کا بہترین وقت تھا ان دو برسوں میں اورنگ زیب کو دشوار گزار چٹانوں پر آگے بڑھنے اور فوج کو لڑوانے کا تجربہ حاصل ہوا۔ بالآخر وہ دو سال بعد فاتحانہ واپس آئے تو انہیں دکن کی صوبیداری سونپی گئی۔ دکن بذاتہ خود ایک مملکت تھی، دکن کے مغلیہ مقبوضات چار صوبوں یعنی دولت آباد، بالا گھاٹ (تلنگانہ)، خان دیش اور برار پر مشتمل تھے۔ ان چاروں علاقوں میں 64 قلعے تھے جن میں سے 53 پہاڑی مقامات پر واقع تھے۔ اورنگ زیب آٹھ سال تک ان علاقوں کے صوبہ دار رہے۔

اورنگ زیب کی شادی شاہ نواز خان صفوی کی بیٹی دلس بیگم سے 8 مئی 1637ء کو ہوئی۔ دلس جو اورنگ زیب کی پہلی بیوی تھیں، رابعہ

الدورانی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان سے اورنگ زیب کی پانچ اولادیں ہوئیں، زیب النساء، زینت النساء، زبدۃ النساء، محمد اعظم اور محمد اکبر، غالباً درس کا انتقال اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے سے قبل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب نے مختلف اوقات میں چھ شادیاں اور کیں۔

کچھ عرصے بعد شاہ جہاں کسی بات پر اورنگ زیب سے ناراض ہو گئے اور نظامتِ دکن سے معزول کر دیا۔ سات ماہ بعد اورنگ زیب کی بہن جہاں آراء کی مداخلت کے نتیجے میں باپ بیٹے میں صلح ہو گئی۔ دکن کی نظامت تو دوبارہ نہ مل سکی البتہ گجرات کی نظامت پر فائز کیا گیا۔ اورنگ زیب نے گجرات میں پھیلی ہوئی بد نظمی اور ڈکیتوں، چوریوں کے واقعات پر بڑی ذہانت سے قابو پایا۔

گجرات میں اورنگ زیب کی نظامت کا دوسرا سال تھا کہ شاہ جہاں نے انہیں بلخ و بخارا کی مہم کے لیے نامزد کیا۔ یہ مغلوں کی دیرینہ آرزو تھی کہ بلخ و بخارا کو اپنے زیر انتظام علاقوں میں شامل کر لیں کیونکہ یہ علاقہ کبھی ان کے جدا مجد، امیر تیمور کی سلطنت کا حصہ رہ چکا تھا۔ شاہ جہاں نے اس مہم پر پہلے اپنے بیٹے مراد بخش کو بھیجا تھا تاہم وہ یہ مہم سر نہ کر سکے۔ بغیر اجازت واپس آ گئے اور اپنا استعفیٰ شاہ جہاں کو پیش کر دیا۔ دوسری بار اس مہم کے لیے شاہ جہاں نے اورنگ زیب کا انتخاب کیا۔ اورنگ زیب اپنی پچیس ہزار کی سپاہ کے ساتھ ازبکوں کی شکست دیتے ہوئے بلخ پہنچ گئے۔

ازبک گوریلا جنگ کے عادی تھے اورنگ زیب نہایت ثابت قدمی اور بہادری سے مقابلہ کرتے رہے ایک موقع پر وہ محاذ جنگ سے واپس آ رہے تھے کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ امراء کے منع کرنے کے باوجود اورنگ زیب نہایت اطمینان سے گھوڑے سے اترے اور نماز باجماعت ادا کی۔ حاکم بلخ و بخارا، عبدالعزیز نے جب یہ سنا تو پکارا اٹھے۔ ”یا چنین کسے در افتادن، برافتادن است“ یعنی ایسے شخص سے لڑنا تو خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے چنانچہ انہوں نے صلح کی پیشکش کی۔ شاہ جہاں کے مشورے سے جو خود کابل میں بیٹھے وسطی ایشیا کے محاذ کی نگرانی کر رہے تھے، مشروط صلح کر لی گئی، حالانکہ اورنگ زیب آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

وسط ایشیا کی ان مہمات میں سرکاری فوجوں کا بھی خاصا نقصان ہوا لیکن اورنگ زیب نے اپنی جنگی صلاحیتوں کا لوہا ضرور منوالیا۔ اس مہم سے واپسی پر اورنگ زیب کو ملتان کا والی (گورنر) مقرر کیا گیا۔ اورنگ زیب کم و بیش چار سال تک صرف ملتان کے اور ڈھائی سال تک سندھ و ملتان کے والی رہے اسی عرصہ میں دو دفعہ انہیں قندھار کی مہم کے لیے بھی نکلنا پڑا اورنگ زیب نے ہر موقع پر اپنی صلاحیت ثابت کر دی لیکن شاہ جہاں کے دل میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ اس کی بہت بڑی وجہ اورنگ زیب کے بھائی داراشکوہ تھے۔ وہ اورنگ زیب اور شاہ جہاں کے درمیان اختلافات کو برابر ہوا دیتے رہتے تھے۔ اس کا اظہار ان تلخ خطوط سے ہوتا ہے جو شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو لکھے تھے اورنگ زیب نہایت ادب و تہذیب سے خطوط میں اپنی صفائیاں پیش کرتے رہتے۔

اورنگ زیب کے ایک اور بھائی شجاع بھی، داراشکوہ کے غلط طرز عمل سے دل برداشتہ تھے لہذا وہ اورنگ زیب کے کافی قریب ہو گئے یہ قربت بعد میں جنگ تخت نشینی کے دوران دارا کے خلاف متحدہ محاذ کی صورت میں سامنے آئی۔ تعلقات کی یہ کشمکش جاری تھی کہ اورنگ زیب کو دوبارہ نظامتِ دکن پر فائز کر دیا گیا اور وہ دکن پہنچ گئے۔ یہاں اورنگ زیب نے امن و امان قائم کرنے اور اصلاحات نافذ کرنے کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے۔ دکن میں راستے محفوظ نہ تھے خشک سالی کی وجہ سے عوام سخت مشکلات کا شکار تھے کئی بستیاں اجڑ چکی تھیں صوبہ کا سرکاری محصول پونے چار کروڑ روپے سے گھٹ کر صرف ایک کروڑ روپے سالانہ پر آ گیا تھا۔ اورنگ زیب نے دکن پہنچتے ہی امن و امان بحال کیا زرعی اصلاحات نافذ کیں کسانوں کو قرضے دیے، بارانِ رحمت نے بھی مدد کی کھیتیاں ہری بھری ہو گئیں۔ اورنگ زیب نے کئی کارخانے قائم کیے غرض خوشحالی کا دور واپس آ گیا۔

پانچ سال اسی طرح گزرے پھر ذی الحجہ 1067ھ (ستمبر 1657ء) میں شاہ جہاں کے بیمار ہونے پر اورنگ زیب اور ان کے بھائی داراشکوہ میں جنگ چھڑ گئی جو سیاسی ہی نہیں نظریاتی بھی تھی۔ داراشکوہ آزاد خیال طبقے کے قائد تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے وسیع المشرک صوفی ہونے کے مدعی تھے حضرت میاں میر لاہوری کے عقیدت مند اور ملا شاہ بدخشی کے مرید ہونے کے علاوہ مجذوب سرحد اور جوگی لال داس جیسے لوگوں کے معتمد بھی تھے۔ کئی کتابیں لکھ چکے تھے قرآن مجید اور بھگوت گیتا میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہندو اور آزاد خیال طبقے داراشکوہ کے

حامی تھے۔

دوسری طرف اورنگ زیب راسخ العقیدہ مسلمان تھے، لہذا اس جنگ میں راسخ العقیدہ امراء علماء اور عوام اورنگ زیب کی کھلم کھلا مدد کر رہے تھے۔

ایک سال تک جاری رہنے والی اس جنگ میں بالآخر اورنگ زیب عالمگیر کو فتح نصیب ہوئی اور وہ برصغیر کے حکمران بن گئے۔ اورنگ زیب نے ہندوستان پر پچاس سال حکومت کی۔

اورنگ زیب نے یکم ذی قعدہ 1068ھ (21 جولائی 1658ء) کو تخت نشینی کی رسم نہایت سادگی سے ادا کی۔ یہ تقریب دہلی کے قریب باغ آغرا آباد میں منعقد ہوئی جو بعد میں شالیمار باغ کہلایا۔ اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی بہت سے اصلاحی اقدامات کیے مثلاً بے حرمتی سے بچانے کے لیے سکوں پر کلمہ طیبہ کندہ کرانا ختم کر دیا۔ سشی کیلنڈر کی بجائے قمری کیلنڈر یعنی سنہ ہجری کو رواج دیا۔ جشن نوروز کا اہتمام ترک کر دیا۔ بھنگ کی کاشت ممنوع قرار دے دی، مسلمانوں کے اخلاق و اطوار کی اصلاح کے لیے ملک کے تمام شہروں اور قصبوں میں محتسب مقرر کیے گئے۔ غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ دربار میں گانے بجانے اور رقص و سرور کی محفلیں بند کر دی گئیں۔ رقاصوں اور بھانڈوں کو مناسب پنشن دے کر دربار سے فارغ کر دیا گیا۔ شعراء کی سرکاری سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا گیا، اور دربار سے ملک اشعراء کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ تاریخ نویسوں کو سرکاری سرپرستی سے آزاد کر دیا گیا۔ رمیں موقف کر دی گئیں۔ امراء کے لیے زیورات اور ریشمی کپڑے پہننا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ہندوؤں میں جاری 'ستی' کی رسم کو بھی ختم کیا، جس کے باعث شوہر کے مرنے پر بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جل مرنا لازمی تھا۔ یہ اصلاحات بتدریج کی گئیں۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے موقع پر ملک میں 80 کے قریب ناجائز ٹیکس وصول کیے جاتے تھے جن سے لاکھوں کی آمدنی ہوتی تھی، ان سب کو ختم کر کے مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد کی گئی اور غیر مسلموں پر جزیہ لگایا گیا۔ اورنگ زیب نے ملکی نظم و نسق، امن و امان، زراعت، تجارت اور صنعتی ترقی کے لیے مسلسل اقدامات کیے۔ 50 ہزار گھڑ سواروں سے لیس ان کی فوج مضبوط اور منظم تھی۔ وہ ایک عظیم مسلمان حکمران تھے جو رموز سلطانی سے پوری طرح آگاہ تھے۔

اورنگ زیب بہت باخبر حکمران تھے۔ ملک کے ہر حصے سے اطلاعات ہر ہفتے ان کے پاس پہنچتی تھیں۔ اورنگ زیب خود ان اطلاعات کو پڑھتے اور شکایات یا بے قاعدگیوں کو دور کرنے کے لیے ہدایات تحریر کرتے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ عوام سے رابطے میں رہتے تھے۔ جمعہ کی نماز عام لوگوں کے ساتھ مل کر ادا کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے خزانہ شاهی کو ایک امانت خیال کیا اور کبھی اس کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔ اورنگ زیب نے مالیاتی نظام کی بھرپور اصلاح کی چنانچہ ان کے عہد میں کل مالی گزاری 60 کروڑ روپے سے زیادہ ہو گئی تھی جبکہ شاہ جہاں کے دور میں یہ 40 کروڑ اور اکبر کے عہد میں 20 کروڑ تھی۔

اورنگ زیب کے عہد میں علمی و ادبی سرگرمیاں، فنون لطیفہ اور تعمیرات کے کام بھی جاری رہے عالمگیر بذات خود صاحب علم تھے، عربی، فارسی کے علاوہ ترکی، ہندوستانی (اردو) اور ہندی میں بھی دسترس رکھتے تھے، مروجہ علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث، تفسیر اور فقہ کے ماہر تھے۔ بارسلطنت سنبھالنے کے بعد انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا تقریباً تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جس شخص کو ایک بار دیکھ لیتے تھے اسے پھر کبھی نہ بھولتے تھے۔ عالمگیر کی علمی فضیلت ان کے رقععات سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ رقععات چنگلی، برجنگلی، دلنشینی اور حسن تحریر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔

اورنگ زیب کا عظیم کارنامہ 'فتاویٰ عالمگیری' کی تالیف کروانا ہے۔ اس کی تدوین کے لیے پچاس علماء پر مشتمل ایک مرکزی جماعت تشکیل دی گئی جنہوں نے تین سالہ کوششوں سے یہ کتاب تیار کی۔ ایک ایک مسئلے کی اچھی طرح چھان بین کی جاتی اور نظر ثانی کے لیے مسودات عالمگیر کے سامنے پیش کیے جاتے اگر کوئی فروگزاشت ہوتی تو عالمگیری کی ہدایت پر دور کی جاتی۔ اس کام کی تکمیل پر دو لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ فتاویٰ

عالمگیری کو نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ترکی، شام، مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ میں شرعی فیصلوں میں اسے بطور سند استعمال کیا جانے لگا۔

فتاویٰ عالمگیری کی طباعت کئی بار ہوئی، مثلاً قاہرہ، لکھنؤ اور کلکتہ میں۔ عربی سے اس کا اردو ترجمہ ”فتاویٰ ہندیہ“ کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ سے دس جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ سید امیر علی نے کیا۔ 1850ء میں اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ ہندوستان کی انگریزی عدالتوں میں مسلمانوں کے شرعی مقدمات کے فیصلے ایک مدت تک فتاویٰ عالمگیری کی بنیاد پر ہوتے رہے۔ فتاویٰ عالمگیری کے قلمی نسخے ہندوستان میں انڈیا کانگریس لائبریری اور بیرون ہند کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ 1109ھ (1697ء) کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ بھیرہ (پنجاب) کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کا فارسی ترجمہ کلکتے اور لکھنؤ میں کئی بار شائع ہوا۔

عالمگیر نے اپنے عہد کے صرف سرکاری مدارس ہی کی سرپرستی نہیں کی بلکہ وہ غیر سرکاری اور نجی مدارس کو بھی امداد دیتے تھے۔ عالمگیر کے دور میں فنون لطیفہ خصوصاً خطاطی میں بھی ترقی ہوئی، وہ خود بہت اچھے خطاط تھے۔ قرآن مجید کے نسخے بڑے شوق سے کتابت کیا کرتے تھے، وہ اچھے شاعر بھی تھے۔

تعمیرات کے سلسلہ میں عالمگیر کا عظیم الشان کارنامہ بادشاہی مسجد لاہور ہے، سنگ سرخ کی اس مسجد کا صحن اس قدر وسیع ہے کہ تقریباً 75 ہزار نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اورنگ زیب نے اکبر آباد میں سنگ مرمر کی حسین مسجد بھی بنوائی جس کی تعمیر میں آٹھ سال لگے۔ دہلی کے لال قلعے میں سنگ مرمر کی مسجد موتی مسجد کے نام سے بنوائی۔ اس کے علاوہ بے شمار مساجد، مدرسے، سرائیں، کنوئیں، محلات اور مندر تعمیر ہوئے۔ لاہور کو سیلاب سے بچانے کے لیے ایک بند تعمیر کروایا جو بوٹی بند کے نام سے مشہور ہے۔

عالمگیر پر بعض مؤرخین متعدد الزامات بھی لگاتے ہیں۔ جن کی اگر تحقیق کی جائے تو الزامات بے بنیاد قرار پاتے ہیں۔ اورنگ زیب برصغیر کے ایک عظیم حکمران تھے، سیرت و کردار کے لحاظ سے ہمہ گیر صفات کے مالک تھے، نوے برس کی عمر میں 28 ذی قعدہ 1118ھ (21 فروری 1707ء) کو بروز جمعہ انتقال کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا انتقال جمعہ کے روز ہو۔ اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کی۔ انہوں نے وصیت کر دی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین میں خلاف سنت کوئی رسم نہ ادا کی جائے۔ اورنگ زیب عالمگیر کو ان کی وصیت کے مطابق، مشہور صوفی عالم خواجہ برہان الدین غریب کے قریب دفن کیا گیا اور کوئی پکی قبر یا گنبد تعمیر نہیں کیا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر بے حد ذہین، معاملہ فہم اور مخفی حکمران تھے۔ وہ بہت متقی انسان تھے۔ ہفتے میں تین روزے رکھتے تھے۔ صبح صادق سے پہلے بیدار ہو جاتے۔ نوافل ادا کر کے نماز فجر باجماعت ادا کرتے۔ پھر قرآن وحدیث کے مطالعے کے بعد مسند عدالت پر بیٹھ جاتے۔ بعد میں فوج کا معائنہ کرتے، پھر دربار عام لگتا جس میں سلطنت کے اہم امور نمٹائے جاتے۔ کوئی ساموسم ہو، ان کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ ان کی صحت آخر عمر تک اچھی تھی۔ 78 برس کی عمر میں بھی وہ بغیر چشمے کے درخواستیں پڑھ کر دستخط کرتے تھے۔

اورنگ زیب بہترین منتظم تھے۔ جنگوں کے نقشے وہ خود تیار کرتے تھے۔ ہر کام منصوبہ بندی سے کرنے کے عادی تھے۔ اورنگ زیب بین الاقوامی سفارت کاری سے بھی غافل نہ تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے مملکت میں شریعت اسلامیہ نافذ کرنے اور اسے ایک فلاحی ریاست بنانے کی بھرپور کوشش کی اور اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ختم شد

☆☆☆☆☆

حوالہ کتب:

☆	القرآن الحکیم	
☆	الاسبقار	(ابن قدامہ)
☆	الاصابہ	(ابن حجر عسقلانی)
☆	البدایہ والنہایہ	(حافظ ابن کثیر دمشقی)
☆	الترغیب والترہیب	(حافظ ذکی الدین)
☆	دلائل النبوة	(ابو بکر بیہقی)
☆	الرحیق المختوم	(صفی الدین مبارک پوری)
☆	حیات الصحابہ	۞ (شیخ محمد یوسف کاندھلوی)
☆	سنن ابن ماجہ	
☆	سیرۃ النبی	۞ (عبدالملک بن ہشام)
☆	الشفاء	(قاضی عیاض الاندلسی)
☆	صحیح البخاری	(محمد بن اسمعیل)
☆	صحیح مسلم	(امام مسلم)
☆	معرفة الصحابہ	۞ (ابو نعیم الاصفہانی)
☆	المغازی	(محمد بن عمر بن واقد)
☆	نسبۃ بنت کعب المازنیہ	(اُمّ عمارہ) محمد حسن بریفش
☆	المعارف	(ابن قتیہ)
☆	اُمّ ایمنؓ حاضنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	
☆	مسند احمد	امام احمد بن حنبل
☆	احوال الرجال	جوزجانی
☆	فہرست	ابن ندیم
☆	فہرست	ابن خیر
☆	الصنعفاء	ابن زرعہ رازی
☆	الصنعفاء	امام نسائی
☆	السیرۃ النبویہ	ابن ہشام
☆	دلائل النبویہ	امام بیہقی
☆	اسنن الکبریٰ	امام بیہقی

☆	سفن ابی داؤد	☆	امام ابوداؤد
☆	وفیات الاعیان	☆	ابن خلکان
☆	میزان الاعتدال	☆	امام ذہبی
☆	معجم الادباء	☆	یا قوت الحموی
☆	الجرح والتعديل	☆	امام رازی
☆	انتقات	☆	ابن حبان
☆	ابن نفیس	☆	پول گلیونجی
☆	الافاده	☆	موفق الدین
☆	تاریخ الحكماء	☆	ابن القفطی
☆	تاریخ الطب عند العرب	☆	محمد عبدالحییم العقی
☆	تاریخ الطب عند العرب	☆	محمد کامل حسین
☆	شمشہ المختصر فی اخبار البشر	☆	ابن الوردی
☆	التعریفات الشریف	☆	الجرجانی
☆	شذرات الذهب	☆	ابن العمار الحسینی
☆	شرح موجز القانون	☆	جمال الدین الاحشرانی
☆	العلوم عند العرب	☆	قدری طوقان
☆	عیون الانباء	☆	ابن ابی صبیحہ
☆	المختار من بدائع الزهور	☆	ابن ایاس محمد بن احمد
☆	مختصر تاریخ الطب العربی	☆	ڈاکٹر کمال السامرائی
☆	مخطوطات دارالکتب الظاہریہ	☆	یوسف العیش
☆	مسالك الابصار	☆	فضل اللہ العمری
☆	الوفانی	☆	صلاح الدین ایبک الصفدی
☆	ابن النفیس	☆	ڈاکٹر رحاب عکادی
☆	ابن حزم	☆	(شیخ محمد ابو زہرہ)
☆	بن حزم:	☆	(ابو عبد الرحمن بن عقیل الظاہری)
☆	ابن حزم الاندلسی حیا وادیہ:	☆	(ڈاکٹر عبد الکریم خلیفہ)
☆	تاریخ الادب الاندلسی	☆	(ڈاکٹر احسان عباس)
☆	جوامع السیرة:	☆	(امام ابن حزم)
☆	جمعة النسب العرب:	☆	(امام ابن حزم)

☆	شرح العقیدہ الاصفیاء:	(امام احمد بن تیمیہ)
☆	نوادیر ابن حزم:	(ابو عبد الرحمن بن عقیل انصاری)
☆	الاتقان علوم القرآن	
☆	اخلاق النبی	(عبد اللہ بن محمد بن جعفر)
☆	ارشاد الساری شرح صحیح البخاری	
☆	البدایہ والنہایہ	
☆	تاریخ بغداد	
☆	تاریخ مکہ	
☆	تہذیب التہذیب	
☆	الثقات	(ابن حبان)
☆	الجرح والتعدیل	(ابو حاتم الرازی)
☆	صحاح ستہ	
☆	لستان المیزان	(ابن حجر العسقلانی)
☆	مسند الفاروق	
☆	طبقات الشافعیہ کبریٰ	
☆	علی بن المدینی	(ابراہیم محمد علی)
☆	مقدمہ کتاب التوحید	ڈاکٹر محمد السید الجلیہ
☆	مقدمہ مجموعہ فتاویٰ احمد بن تیمیہ	عبد الرحمن بن محمد قاسم
☆	سیر اعلام النبیل	امام ذہبی
☆	العقیدۃ الواسطیہ	ابن تیمیہ
☆	الاعلام العلیہ فی مناقب ابن تیمیہ	علامہ بزار
☆	تذکرۃ الحفاظ	امام ذہبی
☆	البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر
☆	شذرات الذہب	ابو الفلاح ابن العماد
☆	ذیل طبقات الختالہ	ابن رجب حنبلی
☆	دعوت شیخ الاسلام	ابن تیمیہ
☆	العقود الدرر	ابن ہادی
☆	البدرا الطالع	قاضی شوکانی
☆	حیاء ابن تیمیہ	محمد یوسف کوکن

☆	آئینہ حقیقت نما	☆	اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
☆	مختصر تاریخ ہندوستان (انگریزی)	☆	تارا چند
☆	التذکرہ	☆	ابوالکلام آزاد
☆	الامام الذہبی	☆	عبدالرحمن غلاوی
☆	تذہیب العہد یب الکمال:	☆	امام ذہبی
☆	معید النعم وعید النقم:	☆	تاج الدین سبکی
☆	اعلام:	☆	خیر الدین الزرکلی
☆	المستدرک:	☆	امام محمد بن عبداللہ الحاکم
☆	طبقات القراء:	☆	شمس الدین الجزری
☆	طبقات الشافعیہ الکبریٰ:	☆	تاج الدین سبکی
☆	الامام:	☆	محمد بن دقیق العید
☆	الاستذکار	☆	ابن عبدالبر
☆	مفتاح السعاده،	☆	طاش کبریٰ زادہ
☆	کشف الظنون،	☆	حاجی خلیفہ
☆	مقدمہ علی عمدۃ القاری،	☆	علامہ زاہد الکوثری
☆	مقدمہ الینایہ، شرح الہدایہ،	☆	امین صالح شعبان
☆	رمز الحقائق شرح کنز الدقائق،	☆	بدر الدین عینی
☆	مقدمہ الروض الزاہر،	☆	علامہ زاہد الکوثری
☆	نظم العقیان فی اعیان الاعیان،	☆	امام سیوطی
☆	الضوء اللیل مع،	☆	امام السخاوی
☆	البدر الطالع،	☆	امام الشوکانی
☆	محمد شا کرمن اعلام العصر،	☆	شیخ احمد شا کر
☆	نظام الطلاق فی الاسلام،	☆	شیخ احمد شا کر
☆	اعلام،	☆	خیر الدین الزرکلی
☆	مجلد الحکمتہ (سعودی عرب) احمد شا کر،	☆	ابو حسان الاثری
☆	مجلد المصریہ،	☆	شمارہ ذی الحجہ 1377ھ
☆	مجلد الابرار مصر، شمارہ	☆	15-6-1958
☆	مجلد المخطوطات،	☆	شمارہ نمبر 6